سراپا اعجاز

حیات و خدمات

عارف باللہ

حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب نور اللہ مرقدہ

(آمد: ۵؍فروری ۱۹۵۱ء وفات: ۲۸؍ستمبر ۲۰۱۳ء)

(بانی: مدرسہ سراج العلوم، چھپرہ، ضلع مئو یوپی)

ترتیب

محمد عرفات اعجاز اعظمی

ناشر
مدرسہ سراج العلوم سراج نگر، چھپرا
چریاکوٹ، ضلع مئو، یوپی۔ پن: 276129
موبائل نمبر: 9450732959

سراپا اعجاز

حیات و خدمات

عارف باللہ
حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب نور اللہ مرقدہ
(آمد: ۵؍فروری ۱۹۵۱ء   وفات: ۲۸؍ستمبر ۲۰۱۳ء)
(بانی: مدرسہ سراج العلوم، چھپرہ، ضلع مئو یوپی)

ترتیب
محمد عرفات اعجاز اعظمی

ناشر
مدرسہ سراج العلوم سراج نگر، چھپرا
چریاکوٹ، ضلع مئو، یوپی۔ پن: 276129
موبائل نمبر: 9450732959

تفصیلات

نام کتاب : سراپا اعجاز (حیات وخدمات مولانا اعجاز احمد اعظمی)
مرتب : محمد عرفات اعجاز اعظمی
صفحات : ۵۴۸
سنہ طباعت : ۲۰۱۶ء
ناشر : مدرسہ سراج العلوم سراج نگر، چھپرا۔ مئو (یوپی)
قیمت :
برقی پتہ : arfatazmi89@gmail.com

ملنے کے پتے

☆ مولانا اعجاز احمد اعظمی لائبریری، چھپرا، چریا کوٹ، ضلع مئو 9936029463
☆ مولانا محمد عابد اعظمی، مدرسہ شیخ الہند انجان شہید اعظم گڑھ 9450821635
☆ مولانا محمد خالد قاسمی مکتبہ دارارقم، اسلام آباد (ڈکہا) جون پور 9554983430
☆ حافظ محمد عارف اعظمی، جامع مسجد شہر اعظم گڑھ 9170893029
☆ مفتی روح اللہ صاحب، فلاح المسلمین گواپوکھر مدھوبنی 9852685298

شہسوار طریقۂ اسلاف   نو بہار حدیقۂ اسلام
جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز   جس کا ہر قول معنی الہام

غالبؔ

(قدرے تصرف کے ساتھ)

فہرست مضامین

یہ کتاب	محمد عرفات اعجاز اعظمی	۷

ابتدائیہ:

حمد باری تعالی	مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب	۸
پیغام	مولانا قاضی حبیب اللہ صاحب مدھوبنی	۹

حیات اعجاز: (صفات وکمالات کے عمومی تذکرے)

سوانحی نقوش	مولانا محمد عابد اعظمی صاحب	۱۱
وہ جو بیچتے تھے دوائے دل...	مولانا مفتی تبارک حسین صاحب	۲۷
فضل وکمال کی ایک جامع شخصیت	مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی	۵۴
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا	مولانا ولی اللہ مجید قاسمی صاحب	۷۰
چند تأثرات	اہلیہ محترمہ جناب نسیم احمد صاحب	۸۳
میں نے انہیں کیسا پایا	مولانا ضیاء الحق صاحب خیر آبادی	۸۹
بلند پایہ محقق ومصنف، عظیم مصلح	مولانا شرف الدین عظیم قاسمی اعظمی	۱۱۳
وہ مرد درویش..........	مفتی روح اللہ قاسمی صاحب مدھوبنی	۱۲۸
عظیم مربی وشفیق استاذ	مفتی شمیم احمد قاسمی صاحب	۱۳۸
حضرت مولانا کو میں نے کیسا پایا	مولانا رفیع الدین نعمانی صاحب	۱۵۳
رفیق مکرم۔ کچھ یادیں کچھ باتیں	مولانا ابو عبیدہ صاحب معروفی	۱۵۷

بندہ کامل	مولانا محمد عامر اعظمی صاحب	۱۶۳
مدرسہ تعلیم الاسلام سے مولانا کا تعلق	مولانا قمر الحسن صاحب	۱۶۹
رفاقت کے چند روز	محمد عرفات اعجاز اعظمی	۱۷۴
مکتوب	مفتی مجد القدوس خبیب رومی	۲۰۹

جہات اعجاز: (صفات وکمالات کے خصوصی تذکرے)

حضرت الاستاذ اور محبت نبوی	مفتی عطاء اللہ قاسمی صاحب	۲۱۵
حضرت مولانا کی فقہی بصیرت	مولانا ولی اللہ مجید قاسمی	۲۲۹
حضرت مولانا اور تصوف وسلوک	مفتی شرف الدین عظیم قاسمی اعظمی	۲۴۴
تعلیم وتربیت کے چند یادگار نمونے	مفتی اختر امام عادل صاحب	۲۶۶
حضرت مولانا کی شخصیت ''حدیث دوستاں'' کے آئینے میں	مفتی روح اللہ قاسمی مدھوبنی	۳۰۳
مولانا کا نثری بیانیہ	مفتی ابرار اجراوی مدھوبنی	۳۲۱
حضرت مولانا کی اداریہ نویسی	مفتی شرف الدین عظیم قاسمی اعظمی	۳۳۷
آئین جواں مرداں حق گوئی وبے باکی	مفتی روح اللہ قاسمی مدھوبنی	۳۵۱
حضرت مولانا بحیثیت والد	مولانا محمد راشد اعظمی صاحب	۳۷۲
شریعت وطریقت کا بہترین سنگم	مولانا قمر الحسن صاحب	۳۸۲

تصنیفات اعجاز: (تصنیفات کا جامع تعارف اور بعض تصانیف کا خصوصی تذکرہ)

حضرت مولانا کی تصنیفات کا تعارف	مولانا محمد عابد اعظمی صاحب	۳۹۰
مولانا اور ''حیات مصلح الامت''	مولانا انصار احمد صاحب معروفی	۴۱۶
مجموعہ مضامین ''علوم ونکات'' کا تعارف	محمد عرفات اعجاز اعظمی	۴۲۷

نگارشات اعجاز: (حضرت مولانا کی بعض قدیم وجدید تحریریں)

میرے استاذ، میرے محسن	حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب	۴۴۴
جانشین مصلح الامت	حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب	۴۷۱

اندھیرے کی اولاد	مرزا شاہین صحرائی	۴۸۱
بودم بے دال	راز دان	۵۰۴
مکالمہ	حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب	۵۰۹
مکالمہ	حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب	۵۱۶

حصہ منظوم:

تأثر بر وفات حضرت مولانا اعجاز احمد	مفتی عزیز الرحمان شہیدؔ فتح پوری	۵۲۲
شیخ طریقت کے انتقال پر ملال پر	مولانا فضل حق عارفؔ خیرآبادی	۵۲۵
ماہ علم مکین جناں حضرت مولانا اعجاز	مولانا ابو عمار اترانوی	۵۲۷
نالہائے غم اشکہائے پیہم	مولانا فضل حق عارفؔ خیرآبادی	۵۳۲
تیری رحلت پر قمرؔ تنہا نہیں سوگوار	مولانا حافظ قمر الدین صاحب نوناروی	۵۳۴

اختتامیہ:

غزل	حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب	۵۴۵

❑❑❑

یہ کتاب

اگر یہ کہا جائے کہ اس کتاب کے معرض وجود میں آنے میں کسی کے جدوجہد اور عمل کا اتنا دخل نہیں ہے جتنا کہ خود صاحب تذکرہ کی جانفشانی اور کدوکاوش کارفرما ہے، تو غلط نہیں ہوگا۔ صاحب تذکرہ اگرچہ اب اس دنیا میں نہیں رہے، ان کے ظاہری وجود اور جسد عنصری کا تعلق اس عالم رنگ وبو سے منقطع ہو چکا ہے، مگر ان کا فیضان اور ان کا عمل تلامذہ ومسترشدین کی صورت میں اب بھی زندہ وموجود ہے۔ یہ کتاب ماضی میں کی گئی ان کی جدوجہد ہی کا ثمرہ ہے۔ کیوں کہ اس کتاب کے بیشتر مشمولات کا تعلق انہیں لوگوں سے ہے جن کو زمانہ ماضی میں انہوں سے تراشا خراشا بنایا سجایا اور سنوارا ہے۔ ہم تمام تذکرہ نویسوں کے شکرگزار ہیں اور ان کے بھی جنہوں نے اس کتاب کی تیاری میں کسی بھی طرح کی معاونت کی ہے۔

یہ احساس اور اعتراف ہے کہ یہ کتاب صاحب تذکرہ کی شخصیت اور کمالات کے شایان شان نہیں ہے، نہ اس میں ان کی خدمات کا کماحقہ اعتراف ہے اور نہ ہی ان کی متنوع اور گونا گونی خدمات کا احاطہ۔ بس زیادہ سے زیادہ ایک سرسری تذکرہ کا نام اسے دیا جاسکتا ہے، مگر پھر بھی کچھ نہ ہونے سے ہونا بہتر ہے۔ اسی جذبہ سے یہ کتاب آپ کے سامنے پیش کرنے میں ایک گونہ مسرت ہو رہی ہے۔ واضح رہے کہ ان کی شخصیت وکمالات کے اعتراف کی یہ محض ایک ابتدا ہے، اس کے بعد بھی ان شاء اللہ ان کے تعلق سے وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ پیش کیا جاتا رہے گا۔ فی الحال ان کے تشنہ کام اور نا تمام رہ جانے والے عزائم پر کام چل رہا ہے، خاص طور سے ان کے خطبات اور بعض نا تمام تحریریں جلد ہی مرحلہ تکمیل سے گزر کر آپ کے ہاتھوں میں ہوں گی۔ ان شاء اللہ

اس کتاب کی تیاری میں جن لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور تعاون کی ہر ممکن کوشش کی، ان کے نام خصوصی شکریہ اور اس دعا کے ساتھ درج کئے جاتے ہیں کہ اللہ انہیں اپنے حفظ وامان میں رکھے اور اس تعاون پر بہتر سے بہتر اجر انہیں عطا فرمائے۔

(۱) برادر اکبر مولانا محمد عابد اعظمی صاحب (۲) مفتی روح اللہ قاسمی صاحب مدھوبنی بہار (۳) مفتی شرف الدین عظیم قاسمی اعظمی صاحب شیخوپور اعظم گڑھ (۴) مولانا اشہد اعظمی صاحب اعظم گڑھ۔

محمد عرفات اعجاز اعظمی

۲۰۱۶/۲/۱۲

ابتدائیہ:

حمد باری تعالیٰ

از: عارف باللہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی نور اللہ مرقدہ

قادرا! قدرت تو داری ہر چہ خواہی آں کنی
مردہ را تو جاں بہ بخشی زندہ را بے جاں کنی
گہ گدا را ملک بخشی گہ کنی شہ را گدا
از برائے نیم نانے در بدر حیراں کنی
آسماں را بے ستوں بر پا تو کردی اے حکیم
ابر را بہر تراوت بر زمیں گریاں کنی
گاہ یونس را دہی اندر شکم ماہی مکاں
گاہ یوسف را زکنعاں چاہ در زنداں کنی
از نگاہ لطف بخشی بر دوعالم را ثبات
باز چوں خواہی ہمہ را برہم و ویراں کنی
گر گلستاں را بخواہی وحشتِ صحرا دہی
ور بیاباں را بخواہی جنتِ رضواں کنی
گہ ہمہ سوزی تو گلشن را بآتش در خزاں
گہ گل و گلزار را تو سنبل و ریحاں کنی
تو دہی یک قطرۂ مہمل را صورت چوں پری
رُو پری را چوں تو خواہی لعنت شیطاں کنی
آں یکے بہر خلافت می کنی تو انتخاب
واں دگر گردن بطوقِ لعنت و عصیاں کنی
آں یکے را بولہب کردی تو از قہر و غضب
واں دگر از لطف خود تو مصدرِ ایماں کنی
بندات اعجاز را توفیق دادی بہر حمد
آرے آرے فضل تو بر پیکر عصیاں کنی

❑❑❑

پیغام

حضرت مولانا قاضی محمد حبیب اللہ صاحب قاسمی دامت برکاتہم
قاضی شریعت وصدر المدرسین مدرسہ فلاح المسلمین گواپوکھر بھوارہ مدھوبنی بہار

کسی یتیم ونادار طالب علم کو کسی باکمال استاذ کی راہنمائی، بے مثال مربی کی تربیت اور مشفق باپ کی شفقت کا سایہ یکجا مل جائے تو اس سے بڑھ کر اس کی خوش نصیبی اور کیا ہوسکتی ہے۔ اندھے کو دو آنکھ کے سوا اور کیا چاہئے۔ یہ سعادت میرے حصہ میں آئی کہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے شکل میں اللہ عزوجل نے مجھے اس عظیم استاذ سے ملا دیا جس سے اپنی یتیمی اور ناداری کا احساس جاتا رہا۔ اور یہ کسی بھی طالب علم کے لئے بجا طور پر فخر کی بات ہے۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب میں نوعمر تھا اور حضرت مولانا تازہ علم تازہ دم نوخیز جوان تھے مگر خدا جانے کیا گُن تھا ان میں کہ طلبہ ان پر پروانہ وار گرا کرتے تھے اور جو ایک بار ان کے دام شفقت میں گرفتار ہوگیا پھر وہ زندگی بھر اس سے باہر نہیں آسکا۔ مجھے حضرت مولانا سے شرف تعلق حاصل ہونے کے بعد زندگی کے کسی لمحہ میں اپنے بے سہارا ہونے کا احساس نہیں ہوا۔ کیا زمانہ طالب علمی اور کیا اس کے بعد کی زندگی۔ ایک حساس باپ کی طرح ہمیشہ حالات سے باخبر رہنا اور فکرمندی ودردمندی کے ساتھ مفید راہنمائیوں سے نوازتے رہنے کا جو سلسلہ تقریباً چالیس سال پہلے شروع ہوا تھا وہ زندگی کے آخر وقت تک برقرار رہا۔ میری دلجوئی اور میرے علاقہ کی ضرورت کی خاطر مدھوبنی میں ہفتوں قیام فرما کر دینی واصلاحی وعظ وارشاد کا سلسلہ جاری فرمایا اور اپنی مؤثر وپرکشش شخصیت سے پورے علاقے کو دینی رنگ میں رنگنے کا بے مثال کارنامہ انجام دیا۔ اور مولانا کی نوازشیں تھیں کہ دوران قیام انتظامی لائن سے کسی بار یا الجھن کا شکار ہونے نہیں دیا، بلکہ

یہ بتاتے ہوئے تو اب ندامت وفخر کے ملی جلی کیفیات سے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ بعض اوقات آمد و رفت اور دیگر اخراجات حضرت مولانا نے خود اپنی جیب سے ادا کئے۔ ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے۔ ان کی تحریک پر طلبہ کی جماعت کی جماعت ان سے استفادہ کے لئے جاتی رہی جس کے نتیجے میں مدھوبنی میں علماء وحفاظ اور دین داروں کی ایک بڑی ٹیم تیار ہوگئی۔

حضرت مولانا دنیا والوں کے لئے جو بھی رہے ہوں، کوئی بے مثال واعظ اور کامیاب مدرس کہے تو کوئی انشاء پرداز ادیب اور مطالعہ کا رسیا کہے، کوئی فنون کا ماہر اور زبردست محقق کہے تو کوئی شب زندہ دار اور شخصیت جامع سے یاد کرے۔ میرے لئے تو ان کی زندگی خدا کی عظیم نعمت تھی، ان کا وجود باعث تسلی تھا، ان کی گھنیری چھاؤں میں کبھی دھوپ کا احساس نہیں ہوا، ان کی بے مثال شفقتوں میں کبھی اپنے کو تنہا و بے سہارا نہیں سمجھا، ان کی زندگی میں یہ تسلی رہتی تھی درد کا درماں موجود ہے تو گھبرانے کی ضرورت کیا ہے، ان کے قدموں میں دو چار گھڑی بیٹھ کر دنیا جہان کا غم بھول جایا کرتے تھے۔ ان کے چلے جانے سے ایک بار پھر شدت سے اپنی یتیمی کا احساس ستا رہا ہے اور سایہ کا متلاشی دھوپ میں سرگرداں و پریشاں کھڑا ہے۔

حضرت مولانا کے صاحبزادگان بالخصوص عزیز مولوی محمد عرفات اعظمی سلمہ نے اپنے عظیم والد گرامی کے نقوش حیات کو سفینے میں منتقل کرنے کا ارادہ کیا ہے تو ہم اس موقع پر انہیں مبارکباد دیتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت تمام بھائیوں کو اپنے حفظ وامان میں رکھے اور اپنے والد جلیل کا سچا جانشیں بنائے۔ آمین

اس موقع پر حضرت مولانا کے تلامذہ ومتوسلین اگر حضرت کی پوری زندگی کی تگ ودو کا خلاصہ اور ان کے سب سے اہم پیغام کہ ’’اپنی زندگی کو اللہ کی مرضی کے آگے جھکا دو اور صرف اور صرف اسی ذات پر اپنی نظر رکھو‘‘ کو یاد رکھ کر اسے اپنی زندگیوں کو محض رضائے الٰہی کے حصول میں کھپاتے ہیں تو یہ حضرت کے لئے سچی عقیدت کا اظہار بھی ہوگا اور ان کی روح کے لئے باعث شادمانی بھی۔

❑❑❑

حیات اعجاز:

سوانحی نقوش

مولانا محمد عابد اعظمی صاحب
ابن حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب

نام: اعجاز احمد اعظمی بن قاضی شعیب کوثرؔ بن قاضی عبدالحق بن حافظ طاہر بن پُر دل

تاریخی نام: نعیم اختر

ولادت: ۲۸؍ربیع الثانی ۱۳۷۰ھ مطابق ۵؍فروری ۱۹۵۱ء بروز دوشنبہ بوقت تین بجے شب

والد کا نام: قاضی محمد شعیب کوثرؔ اعظمی (متوفی ۵؍جون ۲۰۰۸ء)

وطن: موضع بھیرہ پوسٹ ولید پور ضلع مئو۔ یوپی، ہندوستان

مکتب کی تعلیم:

۲۲؍ربیع الثانی ۱۳۷۶ھ مطابق ۲۶؍نومبر ۱۹۵۶ء بروز دوشنبہ آپ کی بسم اللہ کرائی گئی۔ باقاعدہ مکتب میں داخلہ ۱۲؍مئی ۱۹۵۸ء مطابق شوال ۱۳۷۷ھ میں ہوا۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن بھیرہ کے مدرسہ رحیمیہ میں حاصل کی۔ ۳۰؍جون ۱۹۶۴ء کو پرائمری درجہ پانچ کا امتحان دیا اور پرائمری درجات کی تعلیم مکمل کی۔

ابتدائی عربی وفارسی کی تعلیم:

فارسی اور عربی اول کی تعلیم وطن ہی میں مولانا عبدالستار صاحب اور ان کے صاحبزادے مولانا عزیز الرحمان صاحب مدظلہ سے حاصل کی۔

جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں:

اس کے بعد ۱۹۶۶ء مطابق شوال ۱۳۸۴ھ میں جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں

داخل ہوئے اور درجہ عربی دوم سے عربی پنجم تک چار سال یہاں تعلیم حاصل کی۔ یہاں کی تعلیم کا دورانیہ شوال ۱۳۸۴ھ تا شعبان ۱۳۸۸ھ مطابق ۱۹۶۶ء تا ۱۹۶۹ء رہا ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں:

شوال ۱۳۸۸ھ مطابق ۱۹۶۹ء میں دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے۔ امتحان داخلہ حضرت مولانا وحیدالزماں صاحب کیرانوی نے لیا، اور نمایاں نمبرات سے کامیابی حاصل کی۔ جدید طالب علم ہونے کے باوجود آپ کی غیر معمولی صلاحیت کی وجہ سے مولانا نے عربی تکلم وانشا کے درجہ ”صف ثانوی“ میں آپ کو داخل کیا۔

دیوبند میں چند ماہ گزرے تھے کہ ایک ہنگامے کی وجہ سے دارالعلوم چھوڑنا پڑا۔ اس کے بعد چند ہفتے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں زیر تعلیم رہے۔

مدرسہ حسینیہ چلہ امروہہ میں:

دورہ حدیث شریف کے لئے مدرسہ حسینیہ چلہ امروہہ تشریف لے گئے اور ۱۳۹۱ھ مطابق ۱۹۶۹ء میں رسمی فراغت حاصل کی۔

ادیب ماہر کا امتحان:

۱۳۹۰ھ مطابق ۱۹۶۹ء میں مدرسہ حسینیہ چلہ امروہہ کے زمانہ طالب علمی میں علی گڑھ سے آپ نے ادیب ماہر کا امتحان دیا اور پہلی پوزیشن سے کامیابی حاصل کی۔

تبلیغی جماعت میں چلہ:

فراغت کے بعد بنگال کے ضلع بردوان میں تبلیغی جماعت کے ساتھ ایک چلہ لگایا۔ جنوری ۱۹۷۱ء کے آخری دہائی میں چلہ پورا کرنے کے بعد اپنے وطن بھیرہ میں ۱۶؍مہینے تک رہے اسی دوران گھر کے کاموں کے ساتھ قرآن کریم حفظ کرنا شروع کیا اور ساتھ ساتھ گاؤں کے نوجوانوں کو قرآن شریف کا ترجمہ پڑھاتے رہے۔

حفظ قرآن کی تکمیل:

حفظ قرآن کریم کے لئے اوقات کی جو ترتیب بنائی تھی، وہ کچھ اس طرح تھی۔ رات کو دو بجے کے بعد اٹھ جاتے اور جتنا یاد کر چکے ہوتے اس کا کچھ حصہ تہجد میں پڑھتے، پھر ایک پاؤ یاد

کرتے اور فجر کی نماز پڑھ کر اسے پختہ کر کے اپنے استاذ حافظ احمد کریم صاحب کو ان کے گھر جا کر سناتے۔ اس کے بعد چار گھنٹے گھر کے کاموں میں مشغول رہتے، ظہر کی نماز کے بعد پھر قرآن کا دور کرتے اور دوسری کتابوں کا مطالعہ کرتے۔ عصر کی نماز کے بعد اپنے استاذ مولانا عبدالستار صاحب کی خدمت میں حاضری دیتے۔ مغرب کی نماز کے بعد گاؤں کے نوجوانوں کو ترجمہ قرآن پڑھاتے اور یاد کراتے۔ عشا کی نماز کے بعد فوراً سو جاتے۔ اس نظام الاوقات کے ساتھ چھ مہینے میں حفظ قرآن مکمل کیا۔

شادی خانہ آبادی:

مولانا کا نکاح اس وقت کے رواج کے مطابق دس سال کی عمر میں ہو گیا تھا، گاؤں میں ایک جگہ رشتہ طے ہوا اور مسجد میں نماز کے بعد دادا مرحوم نے نکاح پڑھا دیا۔ رخصتی ۱۳۹۱ھ مطابق ۱۹۷۱ء میں عمل میں آئی۔

تدریسی زندگی:

درس وتدریس کی ابتدا مدرسہ حسینیہ چلہ امروہہ کی عارضی مدرسی سے کیا۔ اس کے بعد اپنے اساتذہ کے حکم سے میسور تشریف لے گئے اور ربیع الآخر ۱۳۹۲ھ مطابق ۱۹۷۲ء سے شعبان ۱۳۹۲ھ مطابق ۱۹۷۲ء تک میسور شہر میں ایک مسجد میں امامت وخطابت اور وعظ وتقریر کا فریضہ انجام دیا۔ پھر جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب بنارس کے ذمہ داروں کے غیر معمولی اصرار پر وہاں کی مدرسی منظور کر لی اور شوال ۱۳۹۲ھ مطابق ۱۹۷۳ء سے شعبان ۱۳۹۳ھ مطابق ۱۹۷۳ء تک یہاں درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔

جامعہ اسلامیہ کے زمانہ قیام میں آپ کے قلم سے سب سے پہلی تصنیف ’’قربانی کیجئے قربانی دیجئے‘‘ کے نام سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب قلم برداشتہ ایک رات میں مکالمے کے انداز میں تحریر فرمائی اور عوام وخواص میں بے حد مقبول ہوئی۔

مدرسہ دینیہ غازی پور میں:

۱۳۹۳ھ مطابق ۱۹۷۳ء میں مدرسہ دینیہ غازی پور تدریس کے لئے تشریف لے گئے، وہاں آپ نے دو مرحلوں میں نو سال تدریس کی خدمات انجام دیں۔ پہلے مرحلے میں ۱۳۹۳ھ

مطابق ۱۹۷۳ء سے ۱۳۹۷ھ مطابق ۱۹۷۷ء تک اور دوسرے مرحلے میں ۱۴۰۱ھ مطابق ۱۹۸۱ء سے ۱۴۰۶ھ مطابق ۱۹۸۶ء تک وہاں قیام رہا۔

مدرسہ وصیۃ العلوم الٰہ آباد میں:

مدرسہ دینیہ کے زمانہ قیام میں خانقاہ وصی اللہی کے ذمہ داروں کے اصرار پر خانقاہ کے تحت چلنے والے مدرسہ ’’مدرسہ وصیۃ العلوم‘‘ الٰہ آباد تدریس کے لئے تشریف لے گئے۔ تدریس کے ساتھ ’’حیات مصلح الامت‘‘ کی تصنیف کا کام قیام کا ایک سبب تھا۔ اس کے ساتھ مدرسہ دینیہ کی تعلیمی نگرانی بھی آپ کے سپرد تھی۔ مدرسہ وصیۃ العلوم الٰہ آباد کی عارضی مدرسی ۱۳۹۷ھ مطابق ۱۹۷۷ء سے ۱۴۰۱ھ مطابق ۱۹۸۱ء تک چار سال رہی، پھر آپ باضابطہ مدرسہ دینیہ سے منسلک ہو گئے۔

مدرسہ ریاض العلوم گورینی میں:

۱۴۰۶ھ مطابق ۱۹۸۶ء میں مدرسہ دینیہ سے علیحدگی کے بعد مدرسہ ریاض العلوم گورینی جون پور تشریف لے گئے۔ یہاں ۱۴۱۰ھ مطابق ۱۹۹۰ء تک چار سال قیام رہا، پھر وہاں کچھ ایسے احوال پیش آئے کہ آپ نے گورینی کو خیر باد کہہ دیا، اور اپنے استاذ مولانا محمد مسلم صاحب بمہوری کے حکم پر مدرسہ شیخ الاسلام شیخو پور تشریف لے گئے۔

مدرسہ شیخ الاسلام شیخو پور میں:

شوال ۱۴۱۰ھ مطابق ۱۹۹۰ء میں شیخو پور تشریف لائے، یہاں آپ نے اپنی زندگی کے قیمتی ۲۴ رسال گزارے۔ جب آپ یہاں تشریف لائے تھے تو یہ مکتب سے زیادہ کچھ نہ تھا، علمی، تعلیمی اور تعمیری ہر لحاظ سے سناٹا تھا۔ مسجد بن کر کھڑی تھی، اس کے مشرق میں ایک لمبی چوڑی گڑھئی تھی، گڑھئی کے جنوبی حصے میں دو تین کھپریل کے کمرے تھے، مشرقی حصے میں چھ کمرے نیچے اور چھ کمرے اوپر کا ایک ڈھانچہ کھڑا تھا، شمال جانب میں ایک ادھورا سا کھپریل کا مطبخ تھا۔ تعلیم کے نام پر بیس پچیس طلبہ حفظ کے اور چار پانچ طلبہ عربی کے تھے۔ مکتب میں گاؤں کے بچے تعلیم کے وقت آتے اور چھٹی کے بعد چلے جاتے۔ یہی کل کائنات تھی۔ وسائل کی کمی اور بے سروسامانی تھی، پھر آپ کی محنت، جدوجہد اور لگن سے عربی درجات پنجم تک قائم ہوئے، تعلیم وتعلم کا خوشگوار

ماحول بنا، مدرسہ نے تعلیمی اور تعمیری لحاظ سے ترقی کی، دور دور تک اس کا شہرہ پہونچا، اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک معمولی مدرسہ سے ملک کا معروف ادارہ بن گیا۔ یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ نے ملک و بیرون ملک میں اس کے اعتبار و وقار میں اضافہ کیا۔ یہ خوشگوار انقلاب تمام تر حضرت مولانا کے مخلصانہ جدوجہد کا ثمرہ تھا، جو اس ادارہ کے گوشہ گوشہ چپہ چپہ سے عیاں ہے، اس کے لئے الگ سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن حالات کی ستم ظریفی اور قلب و نظر کی کم ظرفی دیکھئے کہ جس ادارہ کو ۲۴/سال تک اپنے خون جگر سے سینچا تھا اس میں ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے کہ مجبوراً آزردہ دلی کے ساتھ اسے چھوڑنا پڑا، اور فتنوں سے دامن بچا لینے ہی میں دین و دنیا کی عافیت محسوس کی۔

۱۴۳۴ھ مطابق ۲۰۱۳ء میں اس سے مکمل کنارہ کش ہوکر رمضان ۱۴۳۴ھ میں اپنے قائم کردہ ”مدرسہ سراج العلوم“ چھپرا ضلع مئو میں مستقل اقامت اختیار کر لی۔

مدرسہ سراج العلوم چھپرا ضلع مئو میں:

رمضان ۱۴۳۴ھ میں آپ یہاں تشریف لائے، اور اس مدرسہ کو ترقی دینے کا فیصلہ کیا، عربی جماعتوں کا قیام عمل میں آیا، تعلیم و تعلم کی باد بہاری چلنے لگی لیکن وقت نے مہلت نہ دی، محض چند مہینوں کے بعد حق جل مجدہ کی طرف سے بلاوا آ گیا اور آپ ۲۲/ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ مطابق ۲۸/ستمبر ۲۰۱۳ بروز اتوار، رات ۱۱/بج کر ۲۰ منٹ پر مالک حقیقی کے حضور پہونچ گئے۔ **رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ**

بیعت وسلوک:

حضرت مولانا کا تصوف وسلوک کی طرف رجحان ابتدائے شعور سے تھا۔ خود فرماتے ہیں کہ:

> ”میرا خیال ہے کہ جب سے شعور ہوا ہے، اپنے دل میں تصوف و احسان کا ذوق پاتا ہوں، میرا دل اہل اللہ اور بزرگان دین کی محبت سے کبھی خالی نہیں رہا۔ مجھ کو جہاں تک یاد ہے میرے دل کو روحانی دنیا میں سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ کی محبت ملی۔“

فراغت کے بعد تبلیغی جماعت کے دورہ سے جب واپس آئے اور حضرت مجدد الف

ثانی کے مکاتیب، امام غزالی کی ’’کیمیائے سعادت‘‘ اور سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی کی ’’فتوح الغیب‘‘ کا مطالعہ کیا تو طبیعت میں ایک نئی بے چینی پیدا ہوئی اور دل میں آگ لگی کہ کسی بزگ اور اللہ والے کے قدموں میں پامال ہونا چاہئے۔ چنانچہ سب سے پہلے اپنے علاقے کے جلیل القدر بزرگ حضرت مولانا حکیم منیرالدین صاحب امام وخطیب جامع مسجد مئو سے بیعت ہوئے، اس کے بعد حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب کے خلیفہ وجانشین حضرت مولانا قاری مبین احمد صاحب مدظلہ سے اصلاحی تعلق قائم کیا، پھر سندھ پاکستان کے مشہور بزرگ عالم، سلسلہ قادریہ کے نامور شیخ حضرت مولانا شاہ حماداللہ صاحب ہالیجوی کے خلیفہ اور شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے تلمیذ رشید عارف باللہ حضرت مولانا عبدالواحد صاحب کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے اور ان سے اجازت وخلافت حاصل کی۔

اپنے شیخ کے حکم پر آپ بھی سالکین راہ طریقت کی تربیت اور اصلاح وارشاد کے لئے بیعت کیا کرتے تھے۔ نہ جانے کتنے گم کردہ راہ آپ کی نظر کیمیا اثر سے جادۂ حق پر گامزن ہوئے اور اللہ اور اس کے رسول کی محبت کی حلاوت سے سرشار ہوئے۔ آپ کے مسترشدین کی ایک لمبی فہرست ہے جن میں دو نام نمایاں ہیں، جنہیں حضرت مولانا کی طرف سے اجازت وخلافت حاصل ہے۔ ایک صوبہ بہار کے مستند عالم ومفتی حضرت مولانا مفتی تبارک حسین صاحب قاسمی مدظلہ پورنیہ اور دوسرے حضرت مولانا قاری عبدالحسیب صاحب مدظلہ انجان شہید ضلع اعظم گڑھ ہیں۔ اب یہ دونوں حضرات، حضرت مولانا کے فیض روحانی کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔

پہلا سفر حج:

حضرت مولانا نے اپنی حیات مستعار میں نو مرتبہ حج کی سعادت حاصل کی۔ پہلا سفر حج ۱۴۰۹ھ مطابق ۱۹۸۹ء میں کیا۔ اس کی روداد آپ نے اپنے سفر نامہ حج ’’بطواف کعبہ رفتم‘‘ میں دلچسپ اور والہانہ انداز میں تحریر کی ہے۔ اس سفر میں آپ کے ساتھ آپ کے دیرینہ رفیق قاری نسیم الحق صاحب معروفی تھے۔

دوسرا سفر حج:

دوسرا حج ۱۴۱۱ھ مطابق ۱۹۹۱ء میں کیا۔ اس سفر میں راقم کے خسر حاجی عبداللہ صاحب

غازی پوری اور مولانا عبدالرب اعظمی صاحب ساتھ تھے۔

تیسرا حج:

تیسرا حج ۱۴۱۷ھ مطابق ۱۹۹۷ء میں کیا۔ اس سفر میں چھ افراد کا قافلہ ساتھ تھا۔ حضرت مولانا کے والد اور والدہ، چچا زاد بھائی حاجی بلال صاحب، حضرت مولانا کے استاذ مولانا عزیز الرحمان صاحب مدظلہ امام جامع مسجد بھیرہ اور مولانا ضیاء الحق صاحب خیرآبادی۔ اسی سال منی میں بھیانک آتش زدگی کا واقعہ پیش آیا تھا۔

چوتھا حج:

چوتھا حج ۱۴۲۳ھ مطابق ۲۰۰۳ء میں کیا، اس سفر میں ہماری والدہ، شیخوپور کے حاجی زبیر احمد اور ان کی والدہ اور حافظ عبدالجبار صاحب ساتھ تھے۔

پانچواں حج:

۱۴۲۶ھ مطابق جنوری ۲۰۰۶ء میں کیا۔ اس سفر میں حضرت مولانا کے ساتھ الحاج نوراللہ صاحب دربھنگوی تھے۔

چھٹا حج:

چھٹا حج ۱۴۲۷ھ مطابق دسمبر ۲۰۰۶ء میں کیا۔ ۲۰۰۶ء میں اتفاق سے حج کا دو موسم واقع ہوا، ایک ابتدا میں اور دوسرا اخیر میں۔ حضرت مولانا نے دونوں کی سعادت حاصل۔ دوسرے حج میں بڑے بھائی مولوی حافظ محمد عارف صاحب ساتھ تھے۔

ساتواں حج:

۱۴۲۸ھ مطابق ۲۰۰۷ء میں کیا۔ اس سفر میں دوسرے بڑے بھائی حافظ محمد عادل صاحب ساتھ تھے۔

آٹھواں حج:

آٹھواں حج ۱۴۲۹ھ مطابق ۲۰۰۸ء میں کیا۔ اس سفر میں احقر محمد عابد اعظمی، برادران عزیز مولانا محمد عامر اعظمی اور مولانا محمد راشد اعظمی سلمہما، مولانا ضیاء الحق صاحب خیرآبادی اور منشی عبدالسمیع صاحب بھیروی ساتھ تھے۔

نواں حج:

نواں حج ١٤٣٢ھ مطابق ٢٠١٢ء میں کیا۔ اس سفر میں برادران عزیز مولانا حافظ محمد راشد اور مولانا حافظ محمد عرفات سلمہما ساتھ تھے۔

تمام اسفار حج کی روداد مولانا کی کتاب بطواف کعبہ رفتم میں موجود ہے۔

سفر پاکستان:

حضرت مولانا نے پاکستان کا دو مرتبہ سفر کیا۔ سفر کا مقصد اپنے شیخ ومرشد عارف باللہ حضرت مولانا عبدالواحد صاحب بانی ومہتمم جامعہ حمادیہ کراچی کی زیارت وملاقات اور ان کی خدمت میں حاضری واستفادہ تھا۔ اس لئے کراچی کے علاوہ پاکستان کے دوسرے شہروں میں کم جانا ہوا۔

پہلا سفر ٦؍دسمبر ١٩٩٦ء میں ہوا۔ اس سفر میں اپنے شیخ کے شیخ حضرت مولانا حماداللہ صاحب ہالیجوی کے وطن ہالیجی شریف ان کی خانقاہ میں جانا ہوا، اور پھر مولانا حماداللہ صاحب ہالیجوی کے شیخ ومرشد مولانا تاج محمود امروٹی کے وطن امروٹ شریف بھی گئے۔ اس سفر میں مولانا نے حضرت مولانا حماداللہ صاحب ہالیجوی کی سوانح ''تذکرہ شیخ ہالیجوی'' تصنیف فرمائی۔ یہ کتاب پہلے جامعہ حمادیہ سے شائع ہوئی، بعد میں ہندوستان میں فرید بک ڈپو دہلی سے شائع ہوئی۔

تقریباً ایک مہینہ قیام کے بعد ٣؍جنوری ١٩٩٧ء کو واپسی ہوئی۔

دوسرا سفر ٣؍ستمبر ٢٠٠٧ء میں ہوا۔ اس سفر میں ہالیجی شریف اور پاکستان کے دیگر بڑے شہر لاہور وملتان بھی جانا ہوا۔ زیادہ وقت اپنے شیخ ومرشد کی خدمت میں جامعہ حمادیہ کراچی میں گزرا۔ اس سفر میں بھی تقریباً ایک مہینہ قیام رہا، اور ٢٩؍ستمبر ٢٠٠٧ء کو واپسی ہوئی۔

سفر بنگلہ دیش:

شوال ١٤١٨ھ مطابق فروری ١٩٩٨ء میں احباب کے ایک وفد کے ساتھ بنگلہ دیش کا سفر فرمایا اور ڈھاکہ کے عالمی تبلیغی اجتماع میں شرکت فرمائی۔ اس کے بعد بنگلہ دیش کے مختلف مدارس کا دورہ کیا۔ مدرسہ مرکز الفکر الاسلامی ڈھاکہ، دارالعلوم معین الاسلام ہاٹ ہزاری، مدرسہ ضمیریہ قاسم العلوم، مدرسہ اسلامیہ خبیری تشریف لے گئے۔ بنگلہ دیش کے ممتاز علما ومشائخ سے بھی

ملاقاتیں رہی۔

بنگلہ دیش میں پندرہ دن قیام رہا، اس سفر کی روداد مولانا نے البتہ اپنی ڈائری میں تاریخ وار تفصیل سے لکھی تھی۔ یہ روداد ''علوم ونکات'' جلد دوم میں سفر بنگلہ دیش کے عنوان سے شامل ہے

سفر عمرہ:

مولانا نے عمرہ کا تین سفر کیا۔ پہلا سفر یکم جمادی الثانی ١٤٢٩ھ مطابق ٦/جون ٢٠٠٨ء میں کیا۔ اس سفر میں والدہ ماجدہ اور بڑے بھائی حافظ محمد عادل صاحب ساتھ تھے۔ ١٦/جمادی الثانی ١٤٢٩ھ مطابق ٢٠/جون ٢٠٠٨ء کو واپسی ہوئی۔

دوسرا سفر ٢٦/شعبان ١٤٣١ھ مطابق ٧/اگست ٢٠١٠ء میں کیا۔ اس سفر میں بھی والدہ ماجدہ اور مولانا محمد راشد سلمہ ساتھ تھے۔ ١٨/رمضان ١٤٣١ھ مطابق ٢٦/اگست ٢٠١٠ھ کو واپسی ہوئی۔

تیسرا سفر ٢١/ربیع الثانی ١٤٣٢ھ مطابق ٢٦/مارچ ٢٠١١ھ میں کیا۔ اس میں بھی والدہ ماجدہ اور مولانا راشد سلمہ ساتھ تھے۔ ٦/جمادی الاول ١٤٣٢ھ مطابق ١١/اپریل ٢٠١١ء کو واپسی ہوئی۔

درس قرآن کا سلسلہ:

حضرت مولانا نے اللہ تعالی سے دعا کی تھی کہ تا زندگی قرآن کریم سے اشتغال اور اس کی خدمت کی توفیق عطا ہو۔ اللہ نے یہ دعا قبول کی اور تادم واپسیں کسی نہ کسی عنوان سے یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ سالہا سال تک رمضان المبارک میں اپنے گاؤں بھیرہ میں نماز تراویح کے بعد ایک بڑے مجمعے کے سامنے قرآن کریم کی تفسیر بیان کرتے رہے، یہ سلسلہ بغیر کسی انقطاع کے چلتا رہا تا آنکہ آپ نے رمضان میں گاؤں میں قیام کرنا ترک کر دیا اور شیخو پور میں کچھ عوارض کی وجہ سے قیام کو ترجیح دی۔ پھر ١٤٠١ھ مطابق ١٩٩٠ء سے اعظم گڑھ شہر کی جامع مسجد میں ہر اتوار کو بعد نماز مغرب درس قرآن کا سلسلہ شروع فرمایا، جو تا وقت وفات بغیر کسی تخلف کے مسلسل جاری رہا۔ آپ درس قرآن کا خصوصی اہتمام فرماتے تھے، اور اتوار کے دن کہیں دور کا سفر نہیں فرماتے تھے، جہاں کہیں بھی ہوتے، درس قرآن کے وقت حاضر ہو جاتے تھے۔ شہر کے لوگوں نے اس سے خوب

خوب استفادہ کیا، عوام ہوں یا تعلیم یافتہ طبقہ سب نے فائدہ اٹھایا، اور اس سے زندگیوں میں صالح انقلاب پیدا ہوا۔ دین سے برگشتہ نہ جانے کتنے لوگوں نے اس کی برکت سے اپنی زندگی کو دین سے جوڑا اور دینداری کے رنگ میں رنگ گئے۔

المآثر کی ادارت:

محدث کبیر ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمان الاعظمی متوفی ۱۴۱۲ھ کی وفات کے بعد ان کے علوم ومعارف کی اشاعت کے لئے ان کی یادگار میں سہ ماہی مجلّہ ''المآثر'' کا اجرا ہوا تو اس کی ادارت کے لئے نظر انتخاب آپ پر پڑی۔ چنانچہ آپ کی ادارتِ تحریر میں یہ مجلّہ ۱۴۱۳ھ مطابق ۱۹۹۲ء میں پوری شان وشوکت کے ساتھ منصۂ شہود پر آیا۔ اداریہ نویسی سے لے کر مضامین کی فراہمی، اس کی ترتیب وایڈیٹنگ کی ذمہ داری پوری تندہی کے ساتھ بحسن وخوبی آپ نے انجام دی اور علمی دنیا میں اس کی ایک شناخت بنائی۔ جب تک امراض وعوارض اور دیگر مصروفیات نے اپنی گرفت میں نہیں لیا، مسلسل اس کے لئے مضامین ومقالات اور اداریئے لکھتے رہے اور ادارت کی ذمہ داری تادم اخیر آپ ہی کے دوش پر رہی۔ اس درمیان آپ کے نوک قلم سے صدہا مضامین ومقالات، تبصرے، وفیات وجود میں آئے۔

ماہنامہ انوارالعلوم کی ادارت:

۱۴۱۶ھ مطابق ۱۹۹۶ء میں جامعہ عربیہ انوارالعلوم جہانا گنج سے ایک ماہنامہ ''انوار العلوم'' کے نام سے جاری ہوا۔ اس کی ادارت کی ذمہ داری بھی آپ کے سپرد ہوئی۔ یہ رسالہ عوام الناس کی دینی ضرورت کے تحت نکلنا شروع ہوا تھا، اس میں مختلف دینی موضوعات پر عام فہم مضامین ہوتے تھے، جس سے عوام وخواص سب مستفید ہوتے تھے۔ یہ رسالہ زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا اور تقریباً ڈیڑھ سال نکل کر بند ہوگیا۔

ماہنامہ ضیاء الاسلام کی ادارت:

ماہنامہ انوارالعلوم بند ہونے کے بعد احباب کے شدید تقاضے پر مدرسہ شیخ الاسلام شیخو پور سے ۱۴۲۰ھ مطابق ۲۰۰۰ء میں پہلے ''الاسلام'' کے نام سے پھر قانونی مجبوریوں کے وجہ سے ''ضیاء الاسلام'' کے نام سے ماہانہ رسالہ کا اجرا ہوا۔ اس رسالے کا غالب حصہ حضرت مولانا کے مضامین ومقالات پر مشتمل ہوتا تھا۔

جب تک دست وبازو میں قوت رہی، اور امراض وعوارض نے اپنے آہنی شکنجوں میں نہیں جکڑا تھا، مسلسل اس کے لئے مضامین لکھتے رہے۔ اخیر عمر میں جب کہ بیماریوں نے مکمل اپنے حصار میں لے لیا تو یہ رسالہ بھی اپنی زندگی کا وقت پورا کر کے بند ہو گیا۔

تصنیفات وتالیفات:

(۱) تسہیل الجلالین شرح اردو جلالین شریف (جلد اول)

(۲) حدیث دوستاں (دینی واصلاحی اور علمی وادبی مکاتیب کا مجموعہ)

(۳) کھوئے ہوؤں کی جستجو (مختلف شخصیات پر لکھے گئے مضامین کا مجموعہ)

(۴) حیاتِ مصلح الامت (حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب اعظمی کی مفصل سوانح)

(۵) مدارسِ اسلامیہ، مشورے اور گزارشیں (مدارس سے متعلق مضامین کا مجموعہ)

(۶) بطوافِ کعبہ رفتم .... (سفرنامۂ حج) حرمین شریفین کے سفر کی روداد

(۷) تہجد گزار بندے (تہجد کی اہمیت وفضیلت اور تہجد گزار بندوں کا تفصیلی تذکرہ)

(۸) علوم نکات (مجموعہ مضامین)

(۹) ذکرِ جامی (ترجمانِ مصلح الامتؒ مولانا عبدالرحمٰن جامی کے حالاتِ زندگی)

(۱۰) حضرت چاندشاہ صاحب اوران کا خانوادۂ تصوف (حضرت چاندشاہ صاحب ٹانڈوی اوران کے خلفاء کے حالات)

(۱۱) تذکرہ شیخ ہالیجوی۔ (سندھ کے معروف شیخ طریقت وعالم حضرت مولانا حماداللہ صاحب ہالیجوی کا مفصل تذکرہ)

(۱۲) حیات سراج الامت (حضرت مولانا سراج احمد صاحب امروہوی کی سوانح حیات)

(۱۳) نمونے کے انسان (بزرگان دین کے واقعات وحکایات کا مجموعہ)

(۱۴) مودودی صاحب اپنے افکار ونظریات کے آئینہ میں (مولانا بنوریؒ کی عربی کتاب الاستاذ المودودی کا ترجمہ

(۱۵) حکایت ہستی حصہ اول (خودنوشت سوانح، ابتداء حیات سے اختتام طالب علمی تک)

(۱۶) کثرتِ عبادت عزیمت یا بدعت؟

(۱۷) قتل ناحق قرآن وحدیث کی روشنی میں
(۱۸) تعویذات وعملیات کی حقیقت وشرعی حیثیت
(۱۹) شب برأت کی شرعی حیثیت
(۲۰) اخلاق العلماء (علماء کے لیے خاص چیز)
(۲۱) دینداری کے دو دشمن (حرص مال وحب جاہ پر ایک تحریر)
(۲۲) فتنوں کی طغیانی (ٹی وی پر ایک فکر انگیز تحریر)
(۲۳) اہل حق اور اہل باطل کی شناخت
(۲۴) مالی معاملات کی کمزوریاں اوان کی اصلاح
(۲۵) منصب تدریس اور حضرات مدرسین
(۲۶) حج وعمرہ کے بعض مسائل میں غلو اور اس کی اصلاح
(۲۷) برکات زمزم (ماء زمزم کی فضیلت واہمیت کا بیان)
(۲۸) تصوف ایک تعارف
(۲۹) خواب کی شرعی حیثیت
(۳۰) تکبر اور اس کا انجام
(۳۱) تذکرہ مولانا عبدالقیوم فتحپوری
(۳۲) تسہیل المیبذی
(۳۳) حدیث درددل (مجلّہ المآثر وماہنامہ ضیاء الاسلام کے اداریوں کا مجموعہ)
(۳۴) مسئلہ ایصال ثواب! ایک ذہنی طغیانی کا احتساب۔
(۳۵) **المد التعظیمی لاسم الجلالة**، اذان میں لفظ اللہ پر مد کرنے کی تحقیق
(۳۶) اذکار سلسلہ قادریہ
(۳۷) رمضان المبارک۔ نیکیوں کا موسم بہار
(۳۸) مروجہ جلسے! بے اعتدالیاں اور ان کی اصلاح

مرتب کردہ کتب:

(۱) تالیفات مصلح الامت جلد پنجم (مطبوعہ) جلد ششم (غیر مطبوعہ)

(۲) درد و درماں (حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب علیہ الرحمہ کے ان مضامین کا انتخاب اور ان کی ترتیب جو مصائب وغیرہ کے اسباب اور ان کے حل پر مشتمل ہے)

(۳) محبت الٰہی اور نفس (حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب علیہ الرحمہ کی چند مجالس کا مجموعہ، اور ان پر عناوین کی ترتیب)

(۴) احاطۂ دار العلوم میں بیتے ہوئے دن (حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی کے طویل سلسلۂ مضامین کی کتابی ترتیب)

(۵) مجالس مصلح الامت (۵؍جلدیں) حضرت مولانا نے اخیر عمر میں اس کو اپنے شاگرد مفتی عطاء اللہ صاحب سے اپنی نگرانی میں مرتب کروایا، اور اس کو قاری ولی اللہ صاحب مدظلہ نے اپنے ادارہ مکتبہ اشرفیہ بمبئی سے شائع کیا۔

اولاد و احفاد:

حضرت مولانا کی نسبی اولاد میں سات لڑکے اور تین لڑکیاں اور ان کی اولادیں ہیں۔

(۱) مولوی حافظ محمد عارف (۲) حافظ محمد عادل (۳) مولانا حافظ محمد عابد قاسمی (۴) مولانا محمد عامر قاسمی (۵) مولانا حافظ محمد راشد قاسمی (۶) مولانا حافظ محمد عرفات قاسمی (۷) محمد احمد (قاری صاحب)

(۱) عائشہ خاتون زوجہ مولانا مفتی اعجاز احمد قاسمی خیرآباد ضلع مئو (۲) میمونہ خاتون زوجہ مولانا قاری ابرار الحق قاسمی چھپرہ ضلع مئو (۳) رابعہ خاتون زوجہ مولانا فیض الحق قاسمی بھیرہ ولید پور ضلع مئو۔

۱۸؍نواسے نواسیاں اور ۱۲؍پوتے پوتیاں ہیں۔

وفات:

مولانا کی وفات ۲۲؍ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ مطابق ۲۸ ستمبر ۲۰۱۳ء بروز اتوار رات ۲۰۔۱۱ پر ہوئی۔ دن میں بالکل ٹھیک تھے، معمول کے مطابق سارے کام کئے، طلبہ کو سبق پڑھایا، عصر کے بعد اساتذہ کے ساتھ معمول کے مطابق چائے بھی پی، مغرب سے کچھ پہلے طبیعت بگڑی اور پھر بگڑتی چلی گئی، ڈاکٹر کو بلایا گیا، اس نے فوراً مئو ہاسپٹل لے جانے کا مشورہ دیا، مئو لے گئے،

ہاسپٹل میں بمشکل پانچ منٹ زندہ رہے۔ ڈاکٹروں نے ہاتھ لگایا تو روح پرواز کر چکی تھی۔ **انا للہ وانا الیہ راجعون**

جنازہ وتدفین:

وفات کی خبر اسی وقت جنگل کی آگ کی طرح ملک وبیرون ملک پھیل گئی، رات ہی میں خاصی تعداد میں لوگ چھپرہ پہونچ گئے۔ جنازہ کی نماز بعد نماز ظہر تین بجے رکھی گئی۔ احقر نے جنازہ کی نماز پڑھائی، علما، طلبہ، صلحا اور عوام کے ایک جم غفیر نے جنازہ میں شرکت کی، جن کی تعداد تقریباً تیس ہزار تھی۔ اعظم گڑھ، مئو، جون پور، غازی پور، بلیا، بنارس، چندولی اور یوپی کے دیگر اضلاع کے علاوہ بہار، دہلی، ممبئی اور دور دراز کے علاقوں سے لوگ آئے اور جنازہ میں حاضری کی سعادت حاصل کی۔

تدفین مدرسہ سراج العلوم سراج نگر چھپرہ ضلع مئو کی مسجد کے زیر سایہ مولانا کے مکان سے متصل مولانا کی مملوکہ زمین میں عمل میں آئی، اور علم وعرفان کا آفتاب وماہتاب منوں خاک کے نیچے ابدی نیند سوگیا۔ **رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ**

حضرت مولانا کے اساتذہ:

(۱) حاجی محمد شعیب کوثر صاحب (والد ماجد) قاعدہ بغدادی و پارہ عم اور اردو

(۲) حافظ عبدالغنی صاحب بھیرہ	قرآن شریف واردو
(۳) مولوی محمد یوسف صاحب بھیرہ	درجہ دوم سوم پرائمری
(۴) ماسٹر شفیع احمد صاحب بھیرہ	درجہ چہارم پنجم پرائمری
(۵) مولانا عبدالستار صاحب بھیرہ	فارسی وعربی اول
(۶) مولوی ممتاز احمد صاحب بھیرہ	گلستاں ومالابدمنہ
(۷) مولانا عزیز الرحمان صاحب بھیرہ	فارسی کے چند اسباق

(نوٹ) ان بزرگوں سے اپنے گاؤں بھیرہ میں تعلیم حاصل کی۔

(۸) مولانا عبدالکافی صاحب مبارکپوری	ہدایۃ النحو، نورالایضاح، شرح مأۃ عامل
(۹) مولانا عبدالمنان صاحب باسوپاری	کبری، مرقات، قدوری، نورالانوار، ہدایہ اول

(۱۰) مولانا جمیل احمد صاحب مبارکپوری	القراۃ الرشیدہ دوم سوم، کافیہ، شرح تہذیب، شرح وقایہ، مختصر المعانی
(۱۱) قاری حماد صاحب شیخوپور	تجوید
(۱۲) مولانا محمد مسلم صاحب بمہوری	علم الصیغہ، فصول اکبری، شرح جامی، ہدیہ سعیدیہ
(۱۳) مولانا محمد یحییٰ صاحب رسولپوری	نفحۃ الیمن
(۱۴) مولانا زین العابدین صاحب اعظمی	ترجمہ کلام پاک نصف اخیر، مقامات حریری، ہدایہ ثانی، سلم، ملا حسن
(۱۵) مولانا عبد الباری صاحب مبارکپوری	نور الانوار، ترجمہ کلام پاک چند اسباق
(۱۶) مولانا شمس الدین صاحب مبارکپوری	ترجمہ کلام پاک نصف اول
(۱۷) مولانا محمد عثمان ساحرؔ مبارکپوری	دیوان متنبیؔ
(۱۸) قاری محمد ادریس صاحب مبارکپوری	تجوید (حدر)
(۱۹) قاضی اطہر صاحب مبارکپوری	مقامات حریری (چند اسباق)
(۲۰) مولانا بشیر احمد صاحب مبارکپوری	شرح تہذیب (چند اسباق)

(نوٹ) مولانا عبد الکافی صاحب سے لے کر مولانا بشیر صاحب تک زمانہ قیام احیاء العلوم مبارک پور میں تعلیم حاصل کی۔ اور مؤخر الذکر تین بزرگ جامعہ کے مدرس اس وقت نہیں تھے۔

(۲۱) مولانا محمد سالم صاحب دیوبند	جلالین شریف
(۲۲) مولانا قمر الدین صاحب بڑہل گنج	میبذی
(۲۳) مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی	
(۲۴) منشی امتیاز احمد صاحب دیوبند	خطاطی (چند ماہ)
(۲۵) مولانا اختر حسین صاحب عرف میاں صاحب	ہدایہ آخرین

(نوٹ) مذکورۃ الصدر پانچوں بزرگوں سے دار العلوم دیوبند میں پڑھا۔

(۲۶) مولانا محمد اظہار صاحب بیناپارا	بدایۃ المجتہد (چند اسباق)
(۲۷) مولانا داؤد اکبر صاحب بمہور	ترجمہ کلام پاک (چند اسباق)

ماسٹر مسلم صاحب اعظم گڑھ	انگلش

(نوٹ) مذکورہ بالا تینوں بزرگوں سے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں پڑھا ہے۔ پندرہ دن حضرت مولانا نے وہاں تعلیم حاصل کی ہے۔

(۲۸) مولانا افضال الحق جوہر قاسمی	ترمذی شریف، بخاری شریف
(۲۹) مولانا عطاء اللہ صاحب دیوریاوی	مسلم شریف، ابن ماجہ
(۳۰) مولانا سید عبدالحی صاحب امروہوی	ابوداؤد شریف
(۳۱) مولانا عبدالمنان صاحب سیتامڑھی	شمائل ترمذی

(نوٹ) مذکورہ الصدر چاروں بزرگوں سے مدرسہ چلہ امروہہ میں تعلیم حاصل کی ہے۔

(۳۲) حافظ احمد کریم صاحب بھیرہ	حفظ قرآن (فراغت کے بعد بھیرہ میں ان کو قرآن یاد کر کے سنایا کرتے تھے)
(۲۴) مولوی فیضان اللہ صاحب مبارکپوری	دیوان غالب (مبارک پور میں ان سے دیوان غالب کے کچھ حصے پڑھے)

اساتذہ اور کتابوں کی یہ معلومات حضرت مولانا کی ڈائری سے ماخوذ ہے۔

* * *

یہ سچ ہے کہ معاش کا بحران انسان کو بے رحمی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار رہا ہے، ہر شخص پیٹ کا نعرہ لگا رہا ہے، معاشرہ حصولِ معاش کی چکی کے دو پاٹوں کے درمیان اس طرح پس رہا ہے کہ اس کو اپنے دین و ایمان کا ہوش ہی باقی نہ رہا۔ یہ مسئلہ اگر صرف ان تک محدود ہوتا جو خدا کی لامحدود قوت پر ایمان نہیں رکھتے تو چنداں قابل تعجب نہ ہوتا کہ ان کا دستور فطرت یہی ہے، لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ اس آتش سوزاں میں وہ لوگ بھی دھڑ ادھڑ اپنا خرمن ایمان و یقین پھینک پھینک کر جلا رہے ہیں جن کو خدا کی عظیم قوتوں پر بھروسہ کا دعویٰ ہے۔ (حدیث دوستاں)

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل

مفتی تبارک حسین قاسمی
خلیفہ ومجاز بیعت حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب

بندہ آثم ان سطور کا راقم اپنی رسمی طالب علمی کے دور سے اب تک اپنی حیات مستعار کی چالیس سے بھی زائد منزلیں طے کر چکا ہے مگر کبھی بھی کوئی اصلاحی مضمون یا علمی مقالہ یا کسی شخصیت کا تذکرہ وسوانح عمری نہیں لکھی اور نہ کبھی مضمون نگاری کی مشق وتمرین کی۔ تمام تر ناواقفیت اور ناتجربہ کاری کے باوجود ایک عظیم المرتبت، جامع کمالات وحامل ستودہ صفات کے کچھ مختصر حالات کو حبالہ تحریر میں لانے کے لئے کاروان قرطاس وقلم کو اذن سفر دیدیا ہے۔ دیکھئے اس انجان وادی کا راہی اپنی منزل تک پہونچنے میں کس حد تک کامیاب ہوتا ہے۔

میں نے یہ تذکرہ لکھنے کی ہمت محض اس لئے کی ہے کہ صاحب تذکرہ میرے استاذ، شیخ و مرشد اور میرے مربی ومحسن ہیں بلکہ کہنا چاہئے کہ سب کچھ انہیں کی طفیل ملا ہے۔ ان سے مجھے علم کی دولت ملی، ایمان کی حلاوت ولذت سے آشنائی ملی، زندگی کا صحیح رخ ملا، تو کیا محسن کے احسانات کا تذکرہ کرنا جذبۂ شکر کا تقاضا نہیں ہے؟ **من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ۔**

حضرت اقدس ان باتوفیق بندگان خدا میں سے تھے جنہیں قسام ازل نے ابتدائے تقدیر میں بے شمار کمالات، امتیازی خصوصیات اور گوناگوں صفات سے بہرہ مند فرمایا تھا۔ ان کی ذات میں ایسی خوبیاں جمع ہوگئی تھیں کہ وہ تنہا ایک انجمن کے مانند تھے۔

لیس علی اللہ بمستنکر ان یجمع العالم فی واحد

حضرت والا جہاں اور بہت سارے کمالات وخصوصیات سے سرفراز کئے گئے تھے وہیں

ان کو مردم سازی کی صلاحیت بطور خاص ودیعت کی گئی تھی۔ اور یہ صلاحیت انہیں اسلاف واکابر سے وراثت میں ملی تھی۔ حضرت مولانا نے ’’حیات سراج الامت‘‘ میں ایک مقام پر لکھا ہے کہ:

> ’’استاذ کے باکمال ہونے، نہ صرف باکمال ہونے بلکہ باکمال بنانے والا ہونے کی بین دلیل یہ ہے کہ اس کے شاگردوں اور تلامذہ میں اس کا ذوق خاص سرایت کر جائے۔ ہمارے علمائے دیوبند میں مردم سازی کی یہ صلاحیت خصوصیت کے ساتھ ہے، حضرت گنگوہی، حضرت نانوتوی، حضرت شیخ الہند اور حضرت تھانوی، علامہ انور شاہ کشمیری جیسے اکابر مردم سازی کے امام تھے، انہوں نے ایک گروہ کا گروہ اپنے اپنے رنگ میں تیار کر دیا تھا۔‘‘ (حیات سراج الامت: ص۳۳)

حضرت مولانا نے ہو بہو اپنے اسلاف کے طرز پر مردم سازی میں اپنی صلاحیت کو جھونک دیا تھا۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب نے حضرت مولانا کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ:

> ’’آج کل بہت سخت ضرورت ہے کہ دین کی خدمت کی جائے، آپ کو اللہ تعالیٰ نے بہت سی صلاحیتیں بخشی ہیں، پڑھانے کی، تقریر کرنے کی، لکھنے کی وغیرہ آپ اپنی سب صلاحیتیں دین کی خدمت کے لئے لگا دیجئے۔‘‘ (کھوئے ہوؤں کی جستجو: ص۳۴۷)

حضرت مولانا کا رنگ طبیعت کیا تھا، اسے خود ان کی زبانی سنئے:

> ’’میں بھی جب معلم کی جگہ بیٹھا اور طلبہ سادہ تختیاں لے کر میرے سامنے آئے تو مجھے بہت سوچنا پڑا۔ کتاب میں جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھا دینا آسان معلوم ہوا، مگر ان کا مزاج بنانا، ان کے قلوب اور اذہان کو علم کی اہمیت پر مرکوز کرنا ایک مشکل کام دکھائی دیا۔ میں صرف کتاب پڑھاؤں، یہ بات مجھے گوارا نہ ہوئی، مجھے ان کے مزاج وطبیعت اور قلوب واذہان کی ایک خاص نہج پر تشکیل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، تا کہ یہ ایسے عالم دین بنیں، جو اپنے دین، اپنے رسول اور اپنے اللہ کے وفادار ہوں۔ یہ دنیا کی عام فضا اور عام ہوا کے خلاف دین کو اور آخرت کو مقصد زندگی اور مطمح نظر بنائیں۔ اس کے لئے میں نے سبق کے اندر تھوڑے سے وقت کی گنجائش نکالی، سبق کی تکمیل کے بعد کچھ ایسی باتیں ضرور کرتا جس سے ان کے مزاج وطبیعت کی

> دینی تربیت ہو۔ جمعرات کے دن خصوصیت سے اس کا اہتمام کرتا، پھر وقتاً فوقتاً الگ سے وقت نکال کر اجتماعی طور پر تمام طلبا سے تربیتی خطاب کرتا، ان خطابات میں قرآن وحدیث، سیرت نبوی، حالات صحابہ، تذکرۂ علماء ومشائخ اور ذکر اہل اللہ وخاصان خدا سے میں کام لیتا، کہیں کہیں ان ریشمی ومخملی چادروں میں اپنے کسی کسی واقعہ سے ٹاٹ کا پیوند بھی لگا دیتا، اور محسوس کرتا کہ بچے ٹاٹ کے ان پیوندوں کا اثر زیادہ لیتے ہیں۔‘‘ (حکایت ہستی: ص۱۰)

یہ عمومی اجتماعی خطاب جمعہ کے دن فجر کے بعد ہوتا تھا، اس بیان کے سننے کا موقع ہفتہ میں ایک بار مل جاتا تھا اور اس خطاب کا نقد فائدہ یہ ہوتا کہ کاہل وسست اور کند ذہن طلبہ بھی اپنے اندر محنت کا جذبہ پاتے اور جو ذہین وفطین، محنتی ہوتے وہ برق رفتاری سے اپنے مقصد کی طرف گامزن ہوجاتے۔ بعض ساتھی ایسے بھی تھے جنہیں کتاب کا ایک حرف پلے نہیں پڑتا مگر رات گئے دیر تک کتاب کھولے رہتے۔ پڑھنے کا ایسا ماحول بنا ہوا تھا کہ کیسا ہی اچاٹ طبیعت کا طالب علم ہو اسے ماحول میں رنگنا ہی پڑتا تھا۔

جو طلبہ تعلیم کی تکمیل کے لئے دیوبند، سہارن پور اور دیگر بڑے مدرسے میں داخل ہوجاتے تو اب ان کے لئے زبانی تقریر نہیں ہوسکتی تو ان کی تربیت کے لئے بزم قرطاس وقلم آراستہ کرتے اور خطوط کے ذریعے غائب ازنظر طلبہ کے قلوب میں روح پھونکتے۔ خطاب بھی تربیت کی خاطر اور خطوط بھی تربیتی انداز میں۔ اس کا ایک اچھا خاصا مجموعہ ’’حدیث دوستاں‘‘ کے نام سے چھپ چکا ہے، پڑھئے اور دیکھئے کہ کس دل سوزی کے ساتھ اپنے طلبہ کو نصیحت فرماتے ہیں۔

درجہ عربی اول سے درجہ عربی پنجم تک مجھے مدرسہ دینیہ غازی پور میں حضرت کی زیر تربیت رہنے کی سعادت ملی ہے۔ اوپر کے درجات میں جلالین، ہدایہ، حسامی، البلاغة الواضحہ، میبذی وغیرہ کے اسباق حضرت سے متعلق تھے۔

ہدایہ کے سبق کا ایک واقعہ یاد آرہا ہے جس سے حضرت کے عشق رسول اور اصحاب رسول سے شیفتگی کا کچھ اندازہ ہوگا۔ ’’کتاب الحج‘‘ کا بیان چل رہا تھا، دوران سبق سلسلہ کلام میں یہ بات در آئی کہ رسول اکرم ﷺ کا مکی دور کلفت وصعوبت کا دور ہے، اہل مکہ کے جور وستم سہتے

رہے، پھر حکم ربانی پاکر مکہ سے مدینہ کے لئے روانہ ہوئے تو انتہائی بے سروسامانی اور کس مپرسی کے عالم میں، اپنے رفیق یار غار کو ساتھ لے کر چھپتے چھپاتے دیدۂ تر کے ساتھ نکلے۔ پھر ایک وقت آیا کہ اللہ تعالی نے اپنی قدرت قاہرہ سے غلبہ عطا فرمایا تو ایک لاکھ چوبیس ہزار کا جم غفیر آپ کے ہمرکاب تھا۔ ہجرت کے وقت کی بے بسی وکمزوری دیکھو اور آج کی شان وشوکت وزور آوری کا منظر ملاحظہ کرو۔ پھر آپ نے صحابہ کے بڑے مجمع کو خطاب فرمایا اور ایک ذمہ داری سونپی ''**الا فليبلغ الشاهد الغائب**''۔ صحابہ نے اطاعت گزاری کی بے نظیر مثال قائم کردی۔ نبی کے فرمان کو لے کر پورے عالم میں پھیل گئے اور ساری انسانیت کو نبی کا پیغام پہونچایا اور خوب پہونچایا۔

بس اس جملہ کا ادا کرنا تھا کہ دریائے دل میں تلاطم خیز طوفان جوش مارنے لگا، صبر وضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے اور حضرت کی آنکھیں بند سیلاب کی طرح بہہ پڑیں، سسکیاں اور ہچکیاں بندھ گئیں، ضبط واخفا کی ساری کوششیں ناکام ہوچکی تھیں، تب حضرت نے سبق روک دیا اور طلبہ کو اذن رخصت دیدی۔ پھر اس کے بعد خلوت میں اس عاشق رسول، شیدائی اصحاب رسول کے دل پر کیا کیا بیتا؟ سوائے علام الغیوب کے کون جان سکتا ہے؟ ہاں، اس کے بعد جس کا احساس ہر فرد کو ہو رہا تھا کہ چہرہ اداس، دل غمگین اور قلب کسی کی یاد میں کھویا کھویا سا لگتا تھا۔

لگے ہاتھ ایک دوسرے موقع کا بھی حال سن لیجئے۔ ہم طلبہ عربی پنجم کے سبق میں حاضر ہوئے، اللہ جانے کہ کون سی تقریب تھی کہ حضرت نے خلاف معمول فرمایا کہ آج تم میں سے کوئی نعت سنائے۔ ممکن ہے کہ عشق الہی کی آگ کی سوزش اور اس کی خلش آج تیز ہوگئی ہو تو اسے ذکر جمال مصطفیٰ کی ہلکی پھوار سے خنکی پہونچانا چاہتے ہوں۔ مولانا شرافت ابرار صاحب دیناج پوری اس وقت کے محنتی طالب علم اور آج کے بانی وناظم مدرسہ ابی حنیفہ نغمہ سنجی کے لئے کھڑے ہوئے اور ترنم ریز ہوئے، مگر بجائے نعت ومنقبت رسول پر مشتمل اشعار پڑھنے کے ایسی نظم پڑھی جو حمد باری عزاسمہ، قادر مطلق کی قدرت اور کاریگری اور خدا کی شان بے نیازی جیسے مضامین پر مشتمل تھی۔ نظم خوانی ہو رہی تھی، طلبہ کی جماعت ساکت وصامت اپنے سروں پر ردائے سکینت وطمانینت پھیلائے ہوئے نغمہ سرا کے سحر آفریں آواز پر ہمہ تن گوش بنی ہوئی تھی، اور یہ امر واقعی ہے کہ صوتی آہنگ میں بلا کی کشش اور جادو کی سی تاثیر تھی۔ یہ تو طلبہ کا حال تھا جو ہر طرح کے احوال وکیفیات

سے خالی تھے، مگر وہ جو اپنے سینے کی قندیل میں عشق مولی کی آگ سلگائے ہوئے ہے اور پہلے ہی سے اس کی سوزش اور جلن سے بیتاب ہے، قریب ہے کہ شعلۂ جوالہ عاشق کو خاکستر کر دے۔ ع

میں سوز عشق سے ہوں جاں بلب مجھے زندگی کی دعا نہ دے

مگر مولی کو رحم آ گیا اور قلب وجگر کی جلتی آگ کو سرد کرنے کے لئے آنکھوں کی راہ سے آنسوؤں کا سیلاب جاری کر دیا، جو دل کی جلتی کو ٹھنڈی کر دے اور راحت وسکون بخشے۔ آج پھر حکم ہوتا ہے کہ جاؤ۔ طلبہ درسگاہ سے باہر آ گئے۔ اس کے بعد محبوب ومحبّ کے درمیان کے راز ونیاز سے پردہ کی چادر کون ہٹا سکتا ہے؟ اور اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟ وہ جانے اور اس کا محبوب جانے۔

میان عاشق و معشوق رمزیست
کراماً کاتبین را ہم خبر نیست

البتہ کئی دنوں تک غالباً ہفتہ بھر مشاہدہ رہا کہ جب امامت کے لئے مصلے پر کھڑے ہوتے اور قرآن کی تلاوت جہر سے کرتے تو آواز بھرائی ہوئی صاف محسوس ہوتی۔

مدرسہ دینیہ غازی پور کی چند یادیں:

(۱) یہ عاجز ایک دیہات سے نکل کر غازی پور پہونچا تھا، بدویت، دیہاتی پن بلکہ صاف لفظوں میں کہا جائے تو گنوار پن کوٹ کوٹ بھرا ہوا تھا۔ بے تکلف زبان سے گالی نکلتی تھی، جہاں کسی نے چھیڑا یا ستایا، بے تکان زبان آلودۂ دشنام ہو جاتی۔ ایک دفعہ کسی نے کچھ کہہ دیا، بس عادت کے مطابق مغلظات بکنا شروع کر دیا، اس نے بھی اچھی طرح خبر لی، ہر گالی کا بدلہ پٹائی سے لیا۔ جب خوب پٹائی ہو گئی تو روتا ہوا حضرت کے حجرہ میں جا پہنچا اور اپنے مار کھانے کی شکایت کر دی۔ حضرت نے فرمایا کہ تمہیں کون مار سکتا ہے؟ تم تو گالی کے امام ہو۔ آگے فیصلہ کیا ہوا اب یاد نہیں، البتہ یہ اچھی طرح یاد ہے کہ میرے دل میں یہ بات جم گئی کہ حضرت کو غیب کی خبر ہو جاتی ہے۔ گالی سے متعلق میری عادت کی خبر حضرت کو کس طرح ہوئی؟ بس اس کے بعد میں کہیں بھی رہتا، اپنی زبان کو سنبھال کر استعمال کرتا۔ اور اس تصور سے کہ جو کچھ میں بول رہا ہوں اس کی خبر حضرت کو ہوتی ہے، پھر زبان کبھی آلودہ نہیں ہوئی بلکہ لغو اور لایعنی کلام سے بھی پرہیز کی توفیق مل گئی۔ اس

وقت کم عمری کی وجہ سے یہ نہیں سمجھ سکا کہ حضرت کا یہ پہلا تصرف ہے جس نے میرے زبان کو ہمیشہ کے لئے دشنام طرازی سے پاک کر دیا۔

(۲) عربی سوم کا سال تھا، عیدالاضحیٰ کی تعطیل ختم ہو کر مدرسہ کھل چکا تھا، لیکن طلبہ ابھی مدرسہ واپس نہیں لوٹے تھے۔ بندہ اپنی بعض مجبوری کی وجہ سے گھر نہیں گیا تھا، گرمی کا موسم تھا، حضرت صحن میں چارپائی پر لیٹے تھے اور میں پیر دبا رہا تھا۔ سوال ہوتا ہے اور عجیب وغریب سوال ہوتا ہے۔ تبارک! تم مجھے کیسا سمجھتے ہو؟ جو بات دل میں جمی ہوئی تھی، بے تکلف کہہ دیا ''متبع سنت'' سمجھتا ہوں۔ پھر حضرت گفتگو کرنے لگے، کہا کہ میں تم لوگوں سے بدن دبواتا ہوں، کپڑے دھلواتا ہوں، پٹائی کرتا ہوں، ڈانٹ ڈپٹ کرتا رہتا ہوں تو کیا یہ سب بھی سنت ہے؟ اس شبہہ کا میرے پاس جواب نہیں تھا، مجھے احساس ہونے لگا کہ شاید صحیح جواب نہیں دے سکا۔ پھر قدرے توقف کے بعد فرمایا:

''رسول اللہ ﷺ بشر تھے، انسانی ضروریات اور اس کے لوازمات سے بری نہیں تھے، صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک کے معمولات، احوال اور کیفیات سب محفوظ ہیں۔ اب جو شخص ہو بہو انہیں نقوش پر زندگی گزارے گا وہ پوری طرح سنت کا پیروکار ہوگا، جو اس میں کمی کرے گا وہ اسی قدر اتباع میں کوتاہ ہوگا۔ الحمد للہ! میرے چوبیس گھنٹے کے معمولات، اٹھنا، بیٹھنا، سونا، جاگنا، کھانا، پینا وغیرہ جملہ امور نبی کریم ﷺ کی ہدایات کے مطابق پورے ہوتے ہیں۔ یہی سنت کا اتباع ہے۔ میں بول اٹھا کہ حضرت! میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ آپ متبع سنت ہیں۔

ایک خواب اور اس کی تعبیر:

(۳) درجہ عربی چہارم میں مَیں نے ایک خواب دیکھا کہ ایک بڑا گڑھا ہے، قضائے حاجت کے لئے نیچے اترا ہوں، فارغ ہو کر اوپر آنا چاہتا ہوں، مگر جب نکلنے کے قریب ہوتا ہوں تو دھڑام سے نیچے گر جاتا ہوں۔ کئی دفعہ اسی طرح ہوا، تو میں نے کہا کہ بخدا میں بہت گنہ گار ہوں، ورنہ اس سے بڑا گڑھا پھلانگنا میرے لئے مشکل نہیں ہے۔ میرے ساتھ عبدالرشید نام کے ایک طالب علم ہیں جو عمر اور علم میں مجھ سے بڑے ہیں، وہ بڑی آسانی سے نکل کر کنارے کھڑے ہیں، اور مجھے نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چنانچہ میں اوپر کی جانب بڑھا اور عبدالرشید نے ہاتھ بڑھا کر میرا

ہاتھ تھاما اور گڑھے سے نکال لیا۔

اسی وقت حضرت سے یہ خواب بیان کیا تو فرمایا کہ ایسا لگتا ہے کہ راہ حق سے انحراف ہوگا اور عبدالرشید کی معیت سے اشارہ ملتا ہے کہ اس سے نجات مل جائے گی اور سیدھے راستے پر لوٹ آؤگے۔ بات آمد ورفت اور بھولی بسری ہوگئی۔

لیکن ایک زمانہ کے بعد خواب اور اس کی تعبیر عالم شہود میں اس طرح ظہور پذیر ہوئی کہ ۱۴۰۹ھ مطابق ۱۹۸۸ء میں دارالعلوم سے رسمی فراغت ہوئی اور درس وتدریس کا مشغلہ جاری ہوا۔ تدریس کے ابتدائی دور میں کچھ نامانوس مصنفین کی کتابیں مطالعہ میں آئیں جس سے ذہن ودماغ خاصا متاثر ہوا، اور میرے دل کی دنیا الٹ پلٹ کر رہ گئی۔ اسلاف واکابر کے بے غبار طریقے سے طبیعت ہٹ گئی، بالخصوص تصوف وسلوک کے اشغال واوراد پر سطحی اعتراضات واشکالات ہونے لگے۔ بات یہ تھی کہ حضرت مولانا سے اس وقت کوئی رابطہ نہیں تھا، غازی پور سے نکلنے کے بعد ایک دم مولانا سے دور ہوگیا تھا، اور میرا سفینہ حیات بغیر کسی ملاح کے دریائے طوفاں خیز میں ہچکولے کھا رہا تھا اور میں ہواؤں کے طوفان میں ادھر سے ادھر ہو رہا تھا۔ بارہ تیرہ سال کا طویل عرصہ گزر گیا اور میں بے راہ روی کا شکار رہا، پھر اللہ کا فضل شامل حال ہوا، اور شعبان ۱۴۲۲ھ مطابق جنوری ۲۰۰۲ء میں یہ مبارک خیال دل میں آیا کہ آزادانہ زندگی اچھی نہیں ہے، اسے پابند بنانا چاہئے اور کسی شیخ کامل کے حلقہ ارادت میں داخل ہوکر اپنی جبین عقیدت کو ٹیک دینا چاہئے۔

اپنی معلومات اور ذاتی رسائی کی حد تک حضرت الاستاذ سے بڑھ کر بہتر مربی کسی کو نہیں پاتا، طویل مدت کی دوری ومہجوری کے باوجود ان کی شفقت ومحبت دل سے بہت قریب محسوس ہوئی۔ چنانچہ رخت سفر باندھا اور نامعلوم منزل کی طرف چل دیا، نامعلوم اس لئے کہ حضرت کی فیضان گاہ کا پتہ معلوم نہیں تھا، بس اتنا علم تھا کہ اعظم گڑھ میں ہیں، اس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم تھا۔ لیکن اللہ تعالی کی رہنمائی ہوئی اور سستی پور پہونچ کر شیخوپور میں پڑھنے والے چند طلبہ ریلوے اسٹیشن پر مل گئے جو رمضان کی تعطیل میں دیوبند جانے کی تیاری کے لئے حضرت کی خدمت میں جارہے تھے، ان کا ہم سفر ہوگیا۔

استاذ محترم سے ملا، ملتے ہی دیرینہ تعلق کا کرشمہ ظاہر ہوا۔ تیرہ برس کے بعد بھولا بھٹکا

آدمی آیا تھا، اس درمیان خط وکتابت، سلام وپیام کچھ نہیں، لیکن مصافحہ کرتے ہی بول اٹھتے ہیں ''تبارک ہو''۔ بندہ نیازمندانہ اثبات میں سر ہلا دیا۔

ایک طویل فترت اور لمبے وقفے کے بعد تعلق کے دوسرے دور کا آغاز ہوا اور اسی سال رمضان ۱۴۲۲ھ میں ۲۷ویں شب کی مبارک ساعت میں دست حق پرست پر بیعت ہو کر سلسلہ قادریہ، اعجازیہ میں داخل ہوا۔

از برائے سجدہ کردن آستانے یافتم　　　سرزمین بود منظور آسمانے یافتم

بارہ برس تک حضرت والا کی صحبت کیمیائے سعادت میں لمحات زندگی بسر کرنے کی سعادت میسر آئی اور یہی بارہ برس میری زندگی کا حاصل ہے۔

ذوق ومزاج اور خصوصیات

اللہ والوں کے اوصاف وکمال کا تعلق زیادہ تر قلب اور باطن سے ہوتا ہے، ان کا احاطہ ظاہری آنکھیں اور سرسری علم کیوں کر کرسکتا ہے؟ نبوت کا معاملہ تو اعلان واظہار کا ہے ''**فاصدع بما تؤمر واعرض عن المشرکین**''۔ لیکن ولایت کی راہ اخفاو پوشیدگی کی ہے۔ اس لئے خاصان خدا اپنے احوال باطنی کو ہمیشہ راز میں رکھتے ہیں اور ان کا ادراک ایک امر دشوار ہوتا ہے، تاہم حضرت مولانا کی صحبت بابرکت میں بارہ برس رہ کر عقل کوتاہ اور فہم ناقص نے جو کچھ سمجھا اور قلب ودماغ نے جو کچھ محفوظ کیا اسے بے تکلف احاطہ تحریر میں لانے کی کوشش کر رہا ہوں۔

حضرت مولانا کا خصوصی کارنامہ تعلیم وتربیت:

اللہ تعالی نے امت کے حق میں رسول اللہ ﷺ کو جو ذمہ داری سونپی ہے اس کا بیان قرآن میں موجود ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهِ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلَالٍ مُبِيْنٍ

اللہ نے اہل ایمان پر احسان فرمایا کہ ان میں انہی کی جنس سے ایک رسول کو مبعوث فرمایا جو ان پر اللہ کی آیات کی تلاوت کرتا ہے اور انہیں پاکیزہ بناتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اور کوئی شبہہ نہیں کہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں تھے۔

اس آیت میں نبی کی تین ذمہ داریوں کا بیان ہے۔ تلاوت آیات، تزکیہ، تعلیم کتاب و حکمت۔ آپ ﷺ نے تینوں امور کو بدرجہ اتم اور بطریق احسن انجام دیا، چنانچہ آپ کی تلاوت اور تربیت و تعلیم سے دنیا کا سب سے پاکیزہ اور مقدس ترین گروہ تیار ہوا جنہیں اللہ نے بار بار سند مقبولیت سے نوازا، اور صحابیت کے معزز ترین مقام پر فائز کیا، جو نبوت کے بعد سب سے اعلی و اشرف مقام ہے۔

غرضیکہ آپ ﷺ کی بعثت کے دو اہم مقاصد ہیں، اور یہی دونوں آپ ﷺ کی سیرت طیبہ کے اہم پہلو ہیں۔ ایک تعلیم اور دوسرا تزکیہ۔ آپ نے خود اپنی بعثت کا مقصد بیان فرماتے ہیں'' **انما بعثت معلماً**'' (میں معلم بنا کر مبعوث ہوا ہوں) نیز فرماتے ہیں''**انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق**'' (میں تو صرف حسن خلق کی تکمیل کے لئے مبعوث کیا گیا ہوں) آیت کریمہ اور حدیث نبویہ سے یہ منقح ہو گیا کہ بعثت نبوی کے دو اہم مقاصد ہیں۔ تعلیم دین اور تزکیہ نفس۔

حضرت عیسی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ''جو شخص عالم ہو اور اس پر عمل کرتا ہو اور دوسروں کو بھی علم سکھاتا ہو، اسے آسمانوں کے اندر ''بڑے آدمی'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ہمارے حضرت مولانا ایک نبی کے فرمان کے مطابق سو فی صد اس لقب کے مصداق ہیں۔ آپ نے علم سیکھا، اس پر عمل کیا اور پوری زندگی بلکہ زندگی کے آخری لمحات تک سکھانے میں لگے رہے۔ بلاشبہ حضرت والا ان دونوں مقاصد نبویہ کے جامع تھے اور بیک وقت آپ نے دونوں کام کئے اور علی وجہ الکمال کئے۔ آپ کے باکمال تلامذہ جو کھیپ کے کھیپ تیار ہوئے اور ملک و بیرون ملک پہونچ کر خدمت دین حق میں لگے ہوئے ہیں، اس پر شاہد عدل ہیں۔ ان کی ظاہری و باطنی تربیت کر کے اللہ اور اس کے رسول کا وفادار اور دین کا خادم بنایا۔ چنانچہ حضرت مولانا کے شاگردوں کا ایک خاص مزاج اور انداز پایا جاتا ہے۔ تمام تر صلاحیتوں کے باوصف تواضع، انکساری، کسر نفسی اور خود کو کچھ نہ سمجھنا اور یکسوئی سے اپنے کام میں لگے رہنا، اور قلیل تنخواہوں پر قناعت کر کے خدمت دین پر جمے رہنا، دنیا اور حطام دنیا سے منہ موڑ کر آخرت کو اپنا مطمح نظر بنانا وغیرہ، یہ سب اوصاف حمیدہ حضرت کی تربیت کا ثمرہ و نتیجہ ہیں۔ کیوں کہ آپ خود ان تمام اوصاف حمیدہ وملکات فاضلہ

کے جامع تھے۔

اعمال قلبیہ پر خصوصی توجہ:

حضرت والا راہ سلوک کے زبردست سالک تھے، احسان وسلوک کے رموز واسرار اور اس کے مقاصد پر بڑی گہری نظر تھی۔ تصوف کی ضرورت اور اس کی حقیقت پر حضرت مولانا کے کئی مضامین ہیں، ان سب کا مجموعہ ''تصوف ایک تعارف'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے، جس میں انہوں نے عطر نکال کر رکھ دیا اور مغز و پوست کے درمیان فرق بیان کر کے خط امتیاز کھینچ دیا ہے۔ آپ بحر سلوک کے ماہر غواص تھے، ان کی نظر صرف موتیوں پر ہوتی، سیپی سے انہیں کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ مقاصد و سائل کے فرق کو خوب پرکھنا جانتے تھے، ظاہر سے زیادہ باطن پر نگاہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی نظر ان چند ظاہری سنتوں پر محدود نہ تھی جن پر لے دے کے بعض ظاہر پرست حلقوں میں بہت زور دیا جاتا ہے اور دیگر اہم سنن وفرائض سے تغافل واغماض برتا جاتا ہے۔ حضرت کے یہاں ظاہر کا درجہ ضرور تھا مگر باطن کا رتبہ اس پر مقدم تھا۔ باطن کے درست ہونے کے بعد ظاہر کے صالح ہونے میں دیر نہیں لگتی، باطنی اعمال میں توحید، توکل، اخلاص و محبت الٰہی، زہد، قناعت، حلم، صبر و شکر، تسلیم ورضا بالقضا، تواضع، فنائیت وغیرہ ہیں۔ اور ان سب کا مخزن انسان کا قلب ہے، قلب کی صلاح پورے جسد کی صلاح ہے اور اس کا فساد پورے جسم کا فساد ہے۔ قلب کی سلامتی پر آخرت کی نجات موقوف ہے۔ ''**یوم لا ینفع مال ولا بنون الا من اتی اللہ بقلب سلیم**'' اس دن مال واولاد نفع نہیں دیں گے، ہاں جو قلب سلیم لے کر آئے۔

مذکورہ بالا امور قلبی کا ذکر مشائخ کے یہاں ہوتا ہے، خانقاہیں ان کے تذکرے سے معمور ہیں۔ لیکن حضرت والا کا اعمال قلبیہ کا اہتمام اور باطنی سنتوں کا التزام ان کو علم وتحقیق کی اس وادی میں پہونچایا جہاں عوام تو عوام خواص کا بھی ذہن نہیں جاتا ہے۔ یعنی آپ کو ایک زمانے میں اس کی جستجو ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ کے قلب اطہر کا حال ہمہ وقت کیا ہوتا تھا؟ پھر جب کوئی نئی بات سامنے آتی تو اس وقت آپ کی قلبی کیفیت کیا ہوتی؟ حالات کے تغیر کے وقت آپ کے دل کا مرکز کیا ہوتا؟۔

ایک موقع پر یہ بندہ حاضر خدمت تھا، فرمایا کہ آپ ﷺ کے دوست بھی تھے جو اپنی جان

قربان کرتے تھے اور آپ کے جانی دشمن بھی تھے جو ایذا رسانی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ آپ ﷺ کو دوستوں کی جانب سے مسرت حاصل ہوتی تو آپ کے دل کی کیا کیفیت ہوتی؟ اور جب مخالفین کی جانب سے اذیت پہونچتی تو اس وقت آپ کے دل کا کیا حال ہوتا؟ اسی طرح خوشی وغم کے مواقع پر آپ کے دل کی کیفیت کیا ہوتی؟ مجھے اس ''سنت کیفی'' کی تلاش وجستجو میں سینکڑوں کتب سیر کی ورق گردانی کرنی پڑی مگر تشفی بخش معلومات حاصل نہیں ہوئی۔ مطالعہ کتب کے دوران حضرت مولانا یوسف صاحب کی کتاب ''حیات الصحابہ'' دستیاب ہوئی، اس میں سب سے زیادہ مواد ملا، اور صحابہ کے احوال سے رسول اللہ ﷺ کی قلبی کیفیات و باطنی جذبات کا کچھ اندازہ ہوا۔ کیوں کہ صحابہ جس طرح آپ کے ظاہر اعمال کے اتباع کرنے والے تھے اسی طرح آپ کے باطنی اعمال کے بھی پیروکار تھے۔

ہمہ وقت دربار الٰہی میں حاضری:

حضوری گر ہمی خواہی مشو غافل ازو حافظ
متی ما تلق من تھوی دع الدنیا واھملھا

قلب کی نگہ داشت رکھنا، ہمہ دم خدا کا دھیان دل میں بسائے رکھنا اور ہمہ وقت ذکر سے اپنے قلب کو معمور رکھنا حتی کہ ایک لمحہ کے لئے غفلت کا گزر نہ ہو ''احسان'' کہلاتا ہے، یہ صفتِ احسان نماز میں تو مطلوب ہے ہی، خارج نماز بھی بلکہ ہمہ دم مطلوب ہے، جسے حدیث جبریل میں دین کہا گیا ہے۔ بقول حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ''مقاصد شرعیہ میں بہ نسبت دوسرے احکام کے سب سے زیادہ دقیق اور گہرا ہے، یہ ایسا ہے جیسے بدن کے لئے روح اور لفظ کے لئے معانی۔'' یعنی احسان ایسی چیز ہے کہ علوم واعمال کی اس کے بغیر کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی۔ چنانچہ اعمال کے اعتبار سے فرمایا کہ اخلاص واحسان کے بغیر اعمال ایسا ہے جیسا کہ جسم ہو مگر روح نہ ہو۔ علوم کے اعتبار سے یوں تشبیہ دی کہ جیسے محض الفاظ ہوں اور ان کے معانی کچھ نہ ہوں۔ یعنی عمل بے روح ومردہ اور علم بے معنی ومہمل۔

سالک ذکر لسانی کی کثرت کرتا ہے پھر وہی کثرت ذکر لسانی، ذکر قلبی تک رسائی کا ذریعہ بن جاتا ہے حتی کہ ذاکر کے قلب میں ذکر سرایت کر جاتا ہے اور قلب ذکر کے ساتھ جاری

ہوجاتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ ترقی کرتے کرتے سراپا وجود ذاکر بن جاتا ہے بلکہ رواں رواں بال بال ذکر میں مستغرق ہوجاتا ہے۔ جو کوئی اس مقام ورتبہ کو پالیتا ہے اور حضوری حاصل ہوجاتی ہے تو تکثیر نوافل سے زیادہ دوام ذکر اور استحضار حق کا ہر وقت اہتمام رہتا ہے، یعنی اپنے باطن کو ایک لمحہ بھی حق تعالی سے غافل نہیں ہونے دیتا۔ اس نسبت کو ’’نسبت قلندریہ‘‘ کہا جاتا ہے۔

حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھول پوری، حضرت حکیم الامت تھانوی کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ:

> ’’رہ قلندر‘‘ ایک خاص اصطلاح ہے۔ ’’قلندریہ‘‘ ایک طبقہ اولیاء اللہ میں ہوتا ہے جو ایک خاص مذاق اور ایک مخصوص رنگ نسبت سے مشرف ہوتا ہے۔ جن اولیاء اللہ کو ہر وقت حق تعالی کے ساتھ ایک خاص کیفیت استحضاری نصیب ہوجاتی ہے اور ان کے سر پر ہر وقت نسبت کا گویا ایک پہاڑ رکھا ہوتا ہے، ایسے حضرات اگرچہ تکثیر نوافل اور تکثیر وظائف میں مشغول نظر نہیں آتے لیکن ان کے باطن پر کسی وقت غفلت اور ذہول نہیں طاری ہوتا۔ یہ حضرات تکثیر اوراد وظائف سے زیادہ اس امر کا اہتمام رکھتے ہیں کہ قلب ایک لمحہ کو بھی حق تعالی شانہ سے غافل نہ ہو۔ اسی مذاق کا نام ’’مذاق قلندری‘‘ ہے۔‘‘ (معرفت الہیہ: ص ۱۶۵)

ہمارے حضرت مولانا کو بھی نسبت قلندری حاصل تھی۔ ایک بار مجھے وسوسہ پیدا ہوا کہ میرے شیخ سنن مؤکدہ پر مکتفی ہوتے ہیں، نوافل کی کثرت تو الگ سرے سے نفل پڑھتے ہی نہیں۔ جب ایک دن مجلس میں ’’مذاق قلندری‘‘ کا تذکرہ آیا تو یہ عاجز جو حضرت کے اخلاق کریمانہ کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی بے باک بلکہ بسا اوقات بظاہر گستاخ سا ہوگیا تھا، کہہ دیا کہ یہ تو کاہل اور آرام طلب لوگوں کی عبادت ہوئی (اللہ مجھے معاف کرے) حضرت خاموش ہوگئے۔ قدرے توقف کے بعد فرمایا کہ ہمہ دم بارگاہ خداوندی میں حاضر رہنا بایں طور کہ ایک لمحہ بھی غفلت نہ ہو، آسان نہیں ہے، بڑا مشکل امر ہے، مگر اللہ نے اپنے بندے کے لئے اس کو سہل کر دیا تھا۔ اپنے ایک شاگرد کو خط میں لکھتے ہیں:

> ’’اسی بے ترتیبی میں زندگی ہچکولے کھارہی ہے، بس ایک چیز ہے جو مسلسل برقرار ہے، وہ ہے اللہ کے حضور عجز و نیاز، بندگی و انابت، اسی میں دل مطمئن رہتا ہے، نہ کتاب، نہ مطالعہ،

نہ تحریر نہ تصنیف، موقع ملتا ہے تو زبان سے نام لیتا ہوں ورنہ دل تو لگا ہی رہتا ہے، یہی لگا رہے تو سب ٹھیک ہے، مگر یہ کمبخت اونگھنے لگتا ہے، اور جب اونگھتا ہے تو اوٹ پٹانگ خواب بھی دیکھتا ہے، لیکن بہر حال

نہ غرض کسی سے نہ واسطہ، مجھے کام ہے اپنے کام سے
ترے ذکر سے، تری فکر سے، تری یاد سے، ترے نام سے

(حدیث دوستاں ص ۴۸۰)

حضرت والا کے اوپر حق تعالیٰ کا خاص فضل وکرم ہمہ وقت رہا ہے اور آپ نے جو اللہ سے عہد باندھا تھا کہ میں دنیا میں مشغول نہیں ہوں گا، میری دنیا دوسرے کے پاس رہے اور جب ضرورت ہو، میرے پاس آجائے، ۶۳؍ سالہ زندگی میں ہمیشہ اس کا تجربہ ہوتا رہا۔ بظاہر اسباب کی دنیا میں ہمیشہ سناٹا ہی رہا، بقدر ضرورت سے بھی کم رقم پاس میں ہوتی مگر جملہ امور وقت پر انجام پاتے رہتے۔ اس کے بے شمار واقعات اور مثالیں ہیں، صرف ایک مثال اوپر کی مناسبت سے پیش کر رہا ہوں۔

اللہ نے محض اپنے فضل سے حضرت کو متعدد بار حرمین شریفین کی زیارت نصیب فرمائی، غالباً نو بار، اور متعدد سفر میں صاحبزادگان بھی خدمت کے لئے سفر میں رہے، اور ایک دو سفر میں اماں جان بھی رہیں۔ حضرت کے سات لڑکے ہیں، سب کے سب صالح، نیک مزاج، متواضع، والدین کے فرماں بردار بلکہ ہر ایک کے خدمت گزار۔ والدین کی آنکھوں کے تارے، اپنے والد بزرگوار کی ہدایت کے پابند، بھائیوں میں ایسی الفت ومحبت جس کی مثال کم یاب، اور سب کے حج کا انتظام حضرت کی طرف سے ہوا۔ گویا ۱۴؍ حج کا انتظام آپ نے فرمایا۔ بہر حال ایک سفر حج کا قصہ آپ نے سنایا۔

”ایک سال سفر حج میں جہاں میرا قیام تھا اسی کمرہ میں ایک صاحب نسبت بزرگ (مجھے نام یاد نہیں رہا) مظفر نگر یوپی کے رہنے والے کا قیام تھا۔ ایک کمرہ میں ہونے کے باوجود باہمی تعارف اور گفت وشنید کی نوبت نہیں آئی، وجہ یہ تھی کہ حرم شریف کی حاضری کی نسبت سے ہم دونوں کا معمول مختلف تھا۔ وہ بزرگ عشا کی نماز کے لئے حرم شریف حاضر ہوتے تو دیر گئی رات

تک عبادت میں مشغول رہتے اور میں عشا کے بعد آکر سو جاتا۔ وہ جب حرم شریف سے لوٹتے تو مجھے سویا ہوا پاتے، اور جب میں اٹھتا تو ان کو آرام کرتے ہوئے پاتا۔ اس طرح بات چیت کی نوبت نہیں آتی۔ ایک دن آں موصوف قدرے تاخیر سے لوٹے اور میں ذرا معمول سے پہلے بیدار ہوگیا، آج ہم دونوں کی ملاقات بحالت بیداری کمرے میں ہوگئی۔ آں محترم نے سوال کیا کہ آپ نے ذکر قلبی بہت کیا ہے؟ میں نے اس سوال پر سکوت اختیار کیا مگر وہ صریح جواب چاہ رہے تھے، میں نے کہا ہاں، تھوڑا بہت کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ نہیں، معاملہ ایسا نہیں ہے، بلکہ آپ نے بہت کیا ہے، پھر انہوں نے اپنا مشاہدہ بیان کیا کہ میں حرم شریف سے لوٹتا ہوں تو آپ آرام فرما ہوتے ہیں، اور میں بیٹھ کر آپ کا ذکر سنتا ہوں، اور دیر تک جب تک مجھے نیند نہیں آجاتی، سنتا رہتا ہوں اور لذت یاب ہوتا ہوں۔''

نوم جو سراسر غفلت کی حالت ہے، ایک اللہ والے کی شہادت کے مطابق ذکر سے معمور ہے، جن کی نیند کا یہ حال ہے ان کی بیداری کا عالم کیا ہوگا؟۔ ع

قیاس کن زگلستان من بہار را

ذوق علم:

اللہ تعالیٰ کو حضرت اقدس سے کام لینا تھا تو ابتدا ہی سے اس کا انتظام بھی فرمایا۔ حضرت تھانوی کے آغاز عمر میں یہ موڑ آیا کہ اہل خاندان انگریزی تعلیم دلانا چاہ رہے تھے مگر تقدیر ازلی میں ''حکیم الامت'' ہونا منظور تھا، آخر تقدیر غالب آئی اور تدبیر فیل ہوگئی۔ حضرت شاہ وصی اللہ صاحب خلیفہ اجل حضرت حکیم الامت کے ساتھ یہی معاملہ ہوا کہ گھر والے انگریزی تعلیم دلانے پر ضد اور اصرار کر رہے تھے اور انگریزی تعلیم کے فوائد اور محاسن بیان کئے جاتے تھے مگر حضرت شاہ صاحب کو انگریزی کے نام سے وحشت تھی، تنہائی میں روتے اور اللہ سے مدد طلب کرتے۔ بالآخر اللہ نے اپنے بندے کی فریاد سن لی اور ''مصلح الامت'' بنا کر دنیا میں چمکایا۔

حضرت والا کے ساتھ بھی اسی طرح کا مرحلہ پیش آیا۔ ''حکایت ہستی'' سے اس کی تفصیل سنئے:

> ''امتحان میں کامیابی کے بعد ماسٹر صاحب نے میرے سامنے ہی والد صاحب سے

> کہا کہ یہ لڑکا بہت تیز ہے، اسے انگریزی تعلیم دلوایئے، آگے چل کر یہ بہت اچھا ثابت ہوگا، والد صاحب نے قبول کرلیا، اس وقت مکتب میں درجہ پانچ تک انگریزی کی کوئی کتاب نہیں پڑھائی جاتی تھی، جبکہ اسکول میں داخلہ کے لئے انگریزی شرط تھی۔ والد صاحب نے ماسٹر صاحب کے حسب ہدایت کوئی انگریزی ریڈر انگریزی لکھنے کی کاپی اور اس کا مخصوص قلم خرید کر مجھے دیدیا، اور میں اس ساز وسامان کو لے کر ماسٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوگیا وہ نہایت دلسوزی اور شفقت سے مجھے پڑھانے لگے، کئی دن پڑھتے گزر گئے تھے کہ ایک روز میں اپنے ایک ساتھی کے گھر پہونچا، وہ پچھلے سال پانچ پاس کرکے انگریزی اسکول میں پڑھنے لگا تھا۔ میں جب اس کے پاس پہونچا تو وہ برش سے ایک گائے کی تصویر بنارہا تھا۔ میں نے کہا کہ یہ کیا کررہے ہو؟ کہنے لگا کہ پکچر بنارہا ہوں، میں نے پوچھا کہ کیا یہ تصویر بنانی پڑتی ہے؟ اس نے کہا کہ اسکول میں تو یہ ضروری ہے، میں نے اس سے کہا کہ تصویر بنانی تو حرام ہے، ’’دوزخ کا کھٹکا‘‘ میں حدیث ہے کہ جو کوئی جاندار کی تصویر بنائے گا، اسے قیامت کے دن مجبور کیا جائے گا کہ اس میں روح ڈالے۔ حضو ﷺ نے تو اس سے منع کیا ہے۔ یہ دیکھ اور کہہ کر میں گھر آیا اور والد صاحب سے ساری صورت حال بتائی، اور میں نے انگزیزی پڑھنے سے صاف انکار کردیا، والد صاحب میری بہت دلداری کرتے تھے، انھوں نے خوشی ظاہر کی اور رات کو مغرب کے بعد حافظ احمد کریم صاحب مرحوم کے گھر جب سب لوگ جمع ہوئے، میں بھی وہاں حاضر تھا، والد صاحب نے مولانا عبدالستار صاحب سے ساری بات کہی، مولانا بہت خوش ہوئے، انھوں نے فرمایا کہ آمد نامہ اور فارسی کی پہلی دے کر اسے کل میرے گھر بھیج دو، میں اسے پڑھادوں گا۔ مجھے اس سے بہت خوشی ہوئی۔‘‘ (ص:۷۸)

اب حضرت مولانا فارسی اور عربی کی تعلیم کی راہ پر چل پڑے، پھر علوم وفنون کی کن کن وادیوں میں قدم رکھا، جب کہ قدرت نے حافظہ کی زبردست قوت بھی ودیعت فرمائی تھی اور پڑھنے کا شوق، جنون کی حد تک پہونچا ہوا تھا، تو اب ایسے جبال العلم کا اندازہ کون لگا سکتا ہے؟ پہاڑ کو تولنے کے لئے ویسا ہی ترازو اور باٹ کہاں سے لایا جائے؟ حضرت کی تقریر وتحریر سے جو علوم ومعارف سامنے آتے ہیں وہ ان خزانہ معلومات کا پاسنگ بھی نہیں ہیں۔ مخاطب کی ضرورت اور اس کی استعداد کے بقدر ایک خاص دائرہ میں بہت مختصر سا حصہ بیان فرمائے ہیں، ورنہ آپ کا

سینہ ایسے نوع بنوع علوم ومعارف کا گنجینہ تھا، جن سے نہ کبھی لب آشنائے تکلم ہوا اور نہ قلم کو اس کی کتابت کا موقع ملا۔ کیوں کہ مخاطب کے فہم سے بلند بات نہ کہتے تھے اور نہ لکھتے تھے، اس لئے کہ آپ کا بولنا اور لکھنا دونوں نفع رسانی کے لئے ہوتا تھا، نہ کہ اظہار علم کے لئے۔

حضرت والا کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ذہن ثاقب، فہم سلیم، طبیعت موزوں اور مزاج معتدل پائے تھے، اس لئے صحیح اور درست بات کہ تہہ تک آپ کا ذہن بڑی سرعت کے ساتھ پہونچ جاتا، ساتھ ہی ساتھ اعتدال کا دامن کبھی نہیں چھوٹتا۔

علم وفن کا کوئی سا موضوع ہو، سوال کیسا ہی مشکل اور پیچیدہ ہو، جواب کے لئے جب لب کھلتے تو معلومات کا دریا بہتا، سائل کی تشفی تو ہوتی ہی، حاضرین مجلس بھی نہال ہوجاتے۔ پھر اسی کے جلو میں جب سلسلہ کلام دراز ہوتا تو یہ سیل رواں رکنے کا نام نہیں لیتا۔ بات میں بات پیدا ہوتی چلی جاتی اور حاضرین مجلس اپنے گردوپیش سے بے خبر ہمہ تن گوش برآواز ہوتے اور یہ مواج دریا سامعین کو اپنے بہاؤ میں لئے جاتا، تاآنکہ اذان ہوجائے یا طلبہ سبق پڑھنے کے لئے آجائیں یا کوئی نو وارد محفل میں آکر کوئی اور موضوع چھیڑ دے۔

ذوق علم، پڑھنے کا شوق اور مطالعہ کی سرگزشت کی تفصیل کے لئے حضرت کی خودنوشت سوانح بنام ''حکایت ہستی'' پڑھئے، بڑی دلچسپ، سبق آموز کتاب ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ کے شعبہ ''دارالمطالعہ'' کے نگراں مولوی محمد حنیف صاحب کی ایک شہادت پر اس موضوع کو ختم کرتا ہوں، جن کے ساتھ حضرت والا کا پہلا سابقہ لڑائی سے شروع ہوا تھا اور انجام کار ان کی شفقت ومحبت تک جاپہونچا۔ وہی مولوی صاحب فرماتے ہیں:

> ''میں کتب خانے میں اس کام پر تیس سال سے ہوں، اس تیس سال کے عرصے میں کتب خانے کو استعمال کرنے والے تین طالب علم ملے، اور اتفاق ہے کہ تینوں اعظم گڑھ کے رہنے والے، بلکہ دو تو بھائی تھے۔ ایک امانت اللہ اور دوسرے نعمت اللہ اور تیسرے تم ہو۔''
>
> (حکایت ہستی: ص۱۹۲)

خلوت گزینی اور ذوق عبادت:

ارشاد نبوی ہے ''حُبِّب الیّ الخلا''۔ خلوت اور تنہائی مجھے محبوب کرادی گئی ہے۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کار نبوت سنبھالنے سے پہلے غار حرا میں گوشہ نشین رہتے، بہت سے اصحاب ورع وتقوی کا ماننا ہے کہ عزلت وگوشہ نشینی لوگوں سے میل جول سے بہتر ہے۔ حسن بصری فرماتے ہیں کہ ”تورات میں ہے کہ جب آدمی نے قناعت اختیار کرلی تو بے پرواہ ہوگیا، اور جب گوشہ نشینی اختیار کرلی تو سلامتی میں ہوگیا۔“ حضرت وہب بن الورد فرماتے ہیں کہ ”حکمت ودانائی کے دس حصے ہیں جن میں سے نو اجزا خاموشی میں ہیں، اور ایک جز تنہائی میں ہے۔“

حقیقت اس کی یہ ہے کہ اللہ کا ذکر اور اس کی کائنات میں غور وفکر کرنا اور حق تعالی کے اسرار ورموز سے آگاہ ہونا افضل ترین عبادت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے ”ایک گھڑی کا تفکر سال بھر کی عبادت سے بہتر ہے۔“ حضرت عیسی علیہ السلام سے کسی نے دریافت کیا کہ ”اے روح اللہ! کیا روئے زمین پر کوئی بشر آپ جیسا ہوگا؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں، وہ شخص جس کی تمام گفتگو اللہ کا ذکر اور خاموشی تفکر اور اس کی نظر عبرت آموز ہو، وہ مجھ جیسا ہے۔“ (اکسیر ہدایت: ۸۶۱)

بندے کی اعلی ترین حالت یہ ہے کہ ہمیشہ ذکر کے ذریعے حق تعالی کے ساتھ انس پیدا کرے اور فکر دائمی کے ساتھ حق تعالی کے جلال وجمال کی معرفت حاصل کرے، اور جب عالم آخرت میں پہونچے تو خدا کی محبت اس پر غالب ہو۔ انس ومحبت ذکر کے بدولت کامل ہوتی ہے، محبت ثمرۂ معرفت ہے اور معرفت ثمرۂ تفکر ہے، اور اس کا موقع خلوت میں میسر آتا ہے۔ لوگوں سے اختلاط کی صورت میں اس کا موقع مشکل سے ملتا ہے۔ جس بندے کو خلوت کا ذوق میسر آجائے تو سمجھنا چاہئے کہ یہ موہب الہی اور عطیہ خداوندی ہے۔

حضرت والا کو ابتدائے عمر سے خلوت وعبادت کا ذوق تھا۔ حکایت ہستی از اول تا آخر پڑھ جایئے، اس میں ملے گا، پڑھنے کا ذوق، مطالعہ کا شوق، علما وبزرگان دین کی قدر ومنزلت، وسعت بھر ان کی خدمت، کوئی بزرگ یا عالم دین گاؤں میں آجائیں تو کھانے پینے سے بے پرواہ ہوکر ان کے ساتھ لگے لپٹے رہنا، کھیل کود سے حد درجہ نفور، نہ صرف کھیل سے عدم مناسبت بلکہ دنیا اور دنیا کے تمام مشاغل سے وحشت۔

ایک تم سے کیا محبت ہوگئی
ساری دنیا سے نفرت ہوگئی

ایک جگہ لکھتے ہیں:

> میں ذکر کر رہا تھا کہ ان دنوں میری طبیعت دنیا اور مشاغل دنیا سے بالکل یکسو تھی، دنیا کے مشغلوں میں مَیں ضرور تھا، مگر بیزار بیزار سا! طبیعت اکھڑی اکھڑی سی! امورِ آخرت میں لگتا، تو جذب ہو کر رہ جاتا، امورِ دنیا کی طرف ضرورتاً توجہ کرتا، تو طبیعت کو وحشت ہوتی۔
>
> اسی لئے عام رہائشی مکان سے الگ تھلگ والد صاحب کے ایک غیر مسکون مکان کے ایک گوشے میں مَیں نے ٹاٹ سے گھیر کر ایک چھوٹا سا حجرہ بقدر نماز پڑھنے اور پاؤں پھیلانے کے بنا رکھا تھا، دن رات اس میں بند رہتا، صرف فرض نمازوں کے لئے مسجد جاتا، یا سبق سنانے کے لئے حافظ صاحب کے پاس جاتا۔“

اللہ تعالیٰ نے حضرت کے قلب کو اسلام کے لئے کھول دیا تھا۔ ارشاد ربانی ہے ”**فمن یرد اللہ ان یھدیہ یشرح صدرہ للاسلام**“۔ اللہ تعالیٰ جس کو ہدایت دینا چاہتے ہیں اس کے سینے کو اسلام کے لئے کھول دیتے ہیں۔ اور نور اسلام جب سینے میں داخل ہوتا ہے تو سینہ اس کی وجہ سے کھل جاتا ہے۔ ”**النور اذا دخل الصدر، انفسخ**“ آپ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ اس کی کوئی علامت ہے؟ جس سے اس کی شناخت ہو سکے۔ آپ نے فرمایا ”**نعم، التجافی عن دار الغرور، والانابۃ الی دار الخلود، والاستعداد للموت قبل نزولہ**“.

ہاں اس کی علامت یہ ہے، دنیا جو دھوکہ کی جگہ اس سے طبیعت کا ہٹ جانا اور آخرت جو ہمیشہ قیام کی جگہ ہے، طبیعت کا اس کی طرف رجوع ہو جانا اور موت کے آنے سے پہلے اس کی تیاری میں لگ جانا۔

حضرت والا کی تحریر سے ایک اقتباس پڑھئے:

> ”مدراس اتر کر چھوٹی لائن کی ٹرین پر میسور کے لئے بیٹھا۔ ایک سرسبز و شاداب علاقے میں، لطیف و خنک ہواؤں میں ٹرین دوڑ رہی تھی، طبیعت مچل رہی تھی، ایک وجد کی سی کیفیت چھائی جا رہی تھی، جی میں آ رہا تھا کہ کسی سنسان وادی میں اتر جاؤں اور کسی پہاڑی ندی یا چشمے کے کنارے ڈیرا ڈال دوں، پھر میں ہوں اور کائنات کی وسعت میں میرے پروردگار کی یاد ہو۔ میں بے چین تھا کہ کاش مجھے خلوت کی یہ یکسوئی حاصل ہوتی، اور مجھ میں اور میرے

پروردگار کی یاد میں ایک خوشگوار سناٹے کے علاوہ اور کوئی چیز حائل نہ ہوتی۔‘‘

یہاں تو حسرت کانٹا بن کر رہ گئی اور تمنا پوری نہ ہوسکی لیکن ایک دوسرے موقع پر وہ آرزو پوری ہوئی۔ قصہ تو طویل ہے مگر جب سارا اہتمام انہی بزرگ ہستی کے احوال وکوائف کے بیان کی خاطر کیا گیا ہے تو اصل مقصد میں بخل سے کیوں کام لیا جائے؟ حضرت کی اپنی تحریر میں وہ قصہ ملاحظہ ہو:

> شعبان (۱۳۹۱ھ) کا مہینہ تھا، مولانا افضال صاحب نصف شعبان کے بعد وطن میں فروکش تھے، میں ان کے یہاں حاضر ہوا، کتابوں کی الماری میں کتابیں دیکھنے لگا، اور دو کتابوں کا انتخاب کیا۔ ایک امام غزالی کی کتاب ’’کیمیائے سعادت‘‘ کا ترجمہ ’’اکسیر ہدایت‘‘ دوسرے سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ کی ’’فتوح الغیب‘‘ کی فارسی شرح جو حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے قلم سے ہے، اس کا قلمی نسخہ جو بہت عمدہ اور روشن خط میں لکھا ہوا تھا۔ یہ دونوں کتابیں میں مانگ کر لے آیا، اور ان کے مطالعہ میں غرق ہوگیا۔ چند دنوں میں دونوں کتابیں پڑھ لیں، پھر دونوں نے مجھے اس طرح اپنی گرفت میں لے لیا کہ قرآن کریم کی تلاوت کے بعد انھیں دونوں کتابوں میں محو رہتا۔ اسی میں رمضان کا مبارک مہینہ آگیا، اور ان دونوں کے اثر نے دنیا کے رہے سہے نقوش بھی دل سے مٹادئے۔ اخیر عشرہ میں اعتکاف کا منصوبہ بنایا، لیکن کس مسجد میں اعتکاف کروں؟ اس سوال پر کئی دن الجھا رہا، جس مسجد میں مَیں پنج وقتہ نمازیں پڑھا کرتا تھا، اس میں تنہائی نصیب نہ ہوتی، کیونکہ اس وقت وہ عبادت گزاروں سے ہمہ وقت معمور رہتی تھی، اور میرا دل تنہائی چاہتا تھا۔ گاؤں کے پچھّم محلّہ میں ٹونس ندی کے کنارے، آبادی سے قدرے ہٹ کر ایک چھوٹی سی مسجد تھی جسے گھریلو زبان میں ’’اونچکی مسجد‘‘ یعنی اونچی مسجد کہا جاتا تھا، اس وقت اس میں آبادی سے قدرے فاصلے پر ہونے کی وجہ سے گنے چنے مصلی آتے تھے، اور صرف نماز کے اوقات میں آتے تھے، باقی ہمہ وقت وہ سنسان رہتی تھی۔ ندی کے کنارے سناٹے میں ہونے کی وجہ سے کچھ غیر مرئی روایتیں بھی اس کی طرف منسوب تھیں، اس میں کسی کو اعتکاف کی ہمت نہ ہوتی تھی، میں نے اپنے اعتکاف کے لئے اسی کو منتخب کیا۔ میرے خاص لوگوں نے منع بھی کیا، مگر میں مصر رہا، مجھے اصرار تھا کہ تنہائی اس مسجد کے علاوہ اور کہیں نہ ملے گی،

اس لئے میں بہرحال وہیں اعتکاف کروں گا۔

اس اعتکاف کی تنہائی میں زیادہ وقت تو تلاوت میں گزرتا، باقی وقت اکسیر ہدایت اور شرح فتوح الغیب کے پڑھنے میں بسر ہوتا۔ رات کو عموماً ڈیڑھ دو بجے اٹھ جاتا، چونکہ یہ مسجد آبادی کی چہل پہل سے الگ تھلگ تھی، اس لئے میں رات کو اٹھتا، تو ایک ڈراؤنا سناٹا محسوس ہوتا، مگر مجھ پر کسی اور ہی حال کا غلبہ تھا، اٹھتا، مسجد کے باہر ضروریات سے فارغ ہوتا اور وضو کر کے تہجد کی نماز میں محو تلاوت ہو جاتا، ایک اللہ ہوتا، ایک اس کا غلام ہوتا، باقی سب کچھ معدوم وفنا ہوتا!''

توکل وتفویض:

مقربین بارگاہ الست کو اس دنیا میں جن باطنی دولتوں سے نوازا جاتا ہے، ان میں ایک عظیم دولت توکل ہے۔ توکل ترک اسباب کا نام نہیں ہے بلکہ توکل درحقیقت اسباب کی تاثیر سے قطع نظر کر کے انجام کار خدا کے سپرد کرنے کا نام ہے۔ یعنی آدمی اسباب ووسائل کا استعمال کرے لیکن اس پر سے نظر اعتماد اٹھا کر قلب کا تعلق اور ربط محض حق تعالی سے باندھے۔ پھر اسباب و وسائل کے بعد جو بھی نتیجہ وثمرہ برآمد ہو، اسے خدا کے حوالے کر دے اور اپنے لئے کوئی خاص حالت تجویز نہ کرے۔ یہ تفویض ہے، اور قضائے الٰہی پر اعتراض نہ کرنا، نہ دل سے نہ زبان سے۔ رضا بالقضا کہلاتا ہے۔

توکل توحید کے لوازم میں سے ہے۔ توحید میں راسخ انسان ہی کامل متوکل ہوگا اور ان دونوں کے حصول کے بعد ایمان کامل اور پختہ ہوگا۔ پھر ایسا شخص حالات سے ہراساں نہیں ہوگا چاہے وہ کتنے ہی بگڑے ہوئے کیوں نہ ہوں۔

حضرت والا کو توحید وتوکل ابتدائے عمر سے حاصل تھا، بسا اوقات ظاہری اسباب و وسائل کا کہیں دور دراز تک کوئی نام ونشان نہیں ہوتا مگر اعتماد وتوکل بہرصورت قائم رہتا۔ اس عاجز نے متعدد بار حضرت کو فرماتے سنا ہے کہ ''جب میں توکل سے متعلق آیات واحادیث پڑھتا ہوں تو میری رگ پھڑکنے لگتی ہے، کیوں کہ وہ صرف میری معلومات نہیں ہوتی بلکہ مشاہدات وتجربات ہو چکے ہوتے ہیں کہ اب اگر ذرا بھی دل میں شبہہ وتردد کو جگہ دوں تو میں کافر ٹھہرایا جاؤں۔''

توکل کے باب میں حضرت مولانا کو علم الیقین سے حق الیقین کا درجہ حاصل ہوگیا تھا، اسباب ووسائل کی حیثیت گردراہ سے زیادہ نہیں تھی، اسی حیثیت سے انہیں برتتے اور استعمال فرماتے اور اپنے متعلقین کی تربیت بھی اسی انداز پر فرماتے۔ اس کے لئے تفویض وتوکل کے مضامین بار بار بیان فرماتے، اور گاہے بگاہے اپنا کوئی تجربہ بھی بیان فرماتے تاکہ مخاطب کو بھی کامل توکل کا سبق ملے۔

حضرت نے ایک بار اپنا واقعہ سنایا کہ ’’مجھے ایک بیمار دوست کی عیادت کے لئے جانا تھا، جیب میں ایک پیسہ نہیں، گاڑی ریزرو کرکے عیادت کے لئے گیا، بعد عیادت واپسی ہوئی تو راستہ میں سوچنے لگا کہ قیام گاہ پر پہونچ کر گاڑی والے کو کرایہ دینا ہوگا، دل ہی دل میں بارگاہ خداوندی میں اپنی حاجت پیش کرکے مطمئن ہوگیا۔ راستہ میں چند احباب سے ملاقات ہوئی، وہ لوگ بھی عیادت کے لئے ہی جارہے تھے، سرراہ دعا وسلام کے بعد جب ایک دوسرے سے جدا ہونے لگے تو ایک صاحب نے پوچھ لیا کہ وہاں سے گاڑی کا کرایہ ملا تھا؟ میں نے کہا کہ عیادت کے لئے گیا تھا تو کیوں کرایہ ملے گا؟ پھر انہوں نے پانچ سو روپئے ہدیہ پیش کیا کہ مدرسہ پہونچ کر کرایہ دیدیں۔ اللہ نے منزل پر پہونچنے سے پہلے ہی انتظام فرمادیا۔‘‘

اس قسم کے بےشمار واقعات ہیں کہ ذات عالی پر اعتماد کرکے قدم بڑھادیا اور بروقت غیبی مدد شامل حال ہوگئی۔ حضرت نے تحدیث نعمت کے طور پر غیبی عنایات کے واقعات قلم بند کرنے کا ارادہ فرمایا تھا، کچھ حصہ لکھا بھی گیا تھا، پھر طبیعت رک گئی۔ شاید خدا کو منظور نہ تھا اور جتنا حصہ لکھا گیا تھا وہ بھی ضائع ہوگیا۔

توکل کا تعلق صرف کھانے پینے اور روزی کمانے تک محدود نہیں ہے جیسا کہ عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ آدمی رزق کے معاملے میں خدا پر بھروسہ کرلے، بس وہ متوکل ہوگیا۔ توکل کا یہ ایک شعبہ ہے، ورنہ توکل تو یہ ہے کہ آدمی ہر معاملہ میں خدا پر بھروسہ رکھے، خواہ اس کا تعلق رزق سے ہو، یا صحت ومرض سے، یا تعلیم وتربیت کے ثمرات ونتائج سے ہو، یا علم وعمل، تقوی وطہارت اور فہم وفراست سے ہو۔ ہر جگہ آدمی کی نظر خدا پر جمی رہے۔ عموماً ان مقامات پر آدمی کی نظر خدا سے ہٹ کر اپنی محنت وکوشش پر ہوتی ہے۔ حضرت والا کی نظر بڑی باریک بیں اور دماغ دقیقہ سنج تھا،

اس لئے توکل کے وسیع تر مفہوم سے کبھی ذہول نہیں ہوتا۔

راقم الحروف کا ایک تجربہ:

سالک جب راہ سلوک میں قدم رکھتا ہے تو نفس وشیطان راہ مارنے کی نامسعود کوشش کرتے ہیں اور طرح طرح سے رخنہ انداز ہوتے ہیں، بعض مرحلہ بڑا کٹھن اور دشوار بھی پیش آتا ہے مگر شیخ ومرشد کامل ہو تو بآسانی گزار دیتا ہے۔ بندہ کے اوپر بھی ایک مشکل مقام آیا، بیعت ہونے کے ایک سال بعد اپنے شیخ ومرشد پر وسواس وشبہات ہونے لگے۔ ہر چند اپنی وسعت بھر ان وساوس وخطرات کو دفع کرتا مگر قلب پر گزرنے والے خطرات ووساوس سے نجات نہیں پاتا۔ ایک اعتراض کا جواب دیتا تو فوراً دوسرا اعتراض پیدا ہو جاتا۔ اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہا (ہاں اس کا خیال وسوسہ کے طور پر بھی نہیں آتا کہ اس در کو چھوڑ دوں بلکہ اس باب میں کامل اعتماد تھا کہ مجھے فائدہ یہیں سے ملے گا) گناہوں سے توبہ کرتا، استغفار کرتا، گریہ وزاری کرتا، نگاہ خوردہ گیر ہوگئی تھی کہ ہر حرکت وعمل پر اعتراض ہی ذہن میں ابھرتا تھا۔ میں تھک کر ہار گیا، حضرت سے بار بار اپنے ناگفتہ بہ حال کا تذکرہ کر کے دعا وتصرف وتوجہ خاص کی درخواست کرتا مگر حضرت کا جواب ہر بار یہی ہوتا کہ ”مشیت الٰہی کے بغیر کوئی تصرف، کوئی توجہ کارگر نہیں“۔ ایک رمضان اسی حالت میں گزر گیا، اگلے رمضان میں حضرت شیخ ومرشد کی خدمت میں پہونچا تو پھر وہی سلسلہ شروع ہوگیا۔ میں اپنے کو محروم القسمت سمجھتا، منافق گمان کرتا وغیرہ، حضرت سے توجہ خاص کرنے اور تصرف باطنی سے اس نامبارک حالت کو ختم کرنے کی درخواست کرتا مگر حضرت کا وہی ایک جواب ہوتا۔ ایک مرتبہ اپنی حالت زار لکھ کر خدمت اقدس میں پیش کیا، حضرت نے جو جواب مرحمت فرمایا اس کے تصور سے آج بھی کانپ اٹھتا ہوں۔ فرمایا کہ:

> ”اگر پوری قوت سے دل میں یہ خیال جمے کہ مجھ سے تمہارا کام نہ چلے گا تو مجھے چھوڑ دو، جہاں یہ مقصود ملے، چلے جاؤ، میری طرف سے خوشی سے اجازت ہے، مجھے کوئی رنج وتکدر نہ ہوگا۔“

بس اس تحریر کا پڑھنا تھا کہ سارے اعتراضات اور خدشات دور ہوگئے اور طبیعت ٹھہر گئی۔ اس واقعہ میں حضرت کا توکل اور پھر تصرف دونوں عیاں ہے۔

زہد واستغناء:

رسول اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے "**اول صلاح ھذہ الامة الیقین والزھد و اول فسادھا البخل وطول الامل**"۔

اس امت کی پہلی نیکی اور بہتری یقین اور زہد ہے اور اس کا پہلا بگاڑ بخل اور طول امل ہے۔

زہد کی حقیقت کسی رغبت کی چیز کو چھوڑ کر اس سے بہتر کی طرف مائل ہونا ہے۔ آخرت کی دائمی وابدی نعمتوں کے حصول کی خاطر دنیائے فانی سے منہ موڑ لینا، یہی زہد کہلاتا ہے۔ امام غزالی نے اس کی حقیقت کو اس طرح سمجھایا ہے:

''ایک شخص کے پاس گرمی کے موسم میں برف موجود ہے، اس کو اس بات کی حرص ہے کہ جب پیاس لگے گی تو برف سے پانی ٹھنڈا کر کے پئے گا، اتنے میں ایک دوسرا شخص اس کو قیمت دے کر لینا چاہتا ہے، پیسوں کی وجہ سے اس کی اس حرص میں کمی آ گئی جواب تک برف کے ساتھ تھی، اس کے بجائے پیسوں کی محبت دل میں پیدا ہوگئی اور وہ دل میں کہنے لگا کہ آج میں گرم پانی ہی پی لوں گا اور صبر کروں گا، کیوں کہ پیسے مجھے مدتوں تک کام آئیں گے، اور برف کا کیا وہ تو پگھل جاتی۔ پس مناسب یہ ہے کہ برف کے عوض پیسے لے لو۔''

غور کرو کہ یہ بے رغبتی جو پیسوں کے مقابلہ میں اس کی طبیعت میں برف سے پیدا ہوئی، اس کو زہد کہتے ہے۔ عارف کا حال بھی آخرت کے مقابلہ میں دنیا کے ساتھ ایسا ہی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ دنیا فانی ہے اور آخرت دائمی ہے، تو اب فانی کی جگہ باقی کی محبت کو قلب وجگر میں بسا لیتا ہے اور دنیا اس کی نظر میں ایسی حقیر ہوجاتی ہے جیسے بیش قیمت جواہر کے مقابلے میں پھٹے پرانے چیتھڑے، اور دنیا کی ساری لذتیں اور یہاں کی آسائشیں بلکہ ہفت اقلیم کی بادشاہت اس کی نگاہ میں ہیچ ہوجاتی ہے، اور دنیا سے اعراض واغماض اس کی حیات مستعار کا سب سے جلی اور نمایاں عنوان ہوتا ہے۔

حضرت والا زہد واستغنا کے اعلی مقام پر فائز تھے، آپ کا ابتدائی زمانہ بڑی عسرت کا رہا ہے، حادثہ دیوبند کے بعد اضطراب اور بے چینی جب دوبارہ سرزمین دیوبند لے گئی تو کئی کئی وقت

فاقہ میں گزر جاتا۔ زیادہ تنگ ہوئے تو اپنے ایک بے تکلف ساتھی سے قرض لے لیا اور شکم سیر ہو کر کھائے۔ قرض کی رقم ختم ہوگئی تو پھر فاقہ مستی شروع ہوگئی۔ آخر میں ایک گھڑی تھی وہ بھی بیچ دی، لیکن تنگ دستی و فاقہ مستی کے باوجود حضرت کا استغنا اور بے نیازی انہیں کی زبانی سنئے:

> ’’میری فاقہ مستی کا سلسلہ گھڑی بیچنے کے بعد موقوف ہوگیا، مسجد کے موذن حافظ سمیر الدین نے محلّہ کے ایک بااثر اور مخیّر بزرگ عبدالوہاب خان سے شاید میرے متعلق ذکر کیا انھوں نے کہا کہ میرے چھوٹے بیٹے عبدالرؤف کو قرآن پڑھا دیا کریں اور کھانا میرے گھر کھالیا کریں۔ سمیر الدین نے اس بات کی اطلاع مجھے کی، میں نے کہا میں ضرورت مند تو ہوں مگر کسی کے گھر جا کر ٹیوشن پڑھانا علم کی غیرت کے خلاف ہے، اور گھر جا کر اس کے معاوضے میں کھانا کھانا میری غیرت کے خلاف ہے۔ اس لئے مجھے یہ معاملہ منظور نہیں ہے، سمیر الدین نے اصرار کیا کہ کوئی قابل قبول صورت بتاؤ، میں معذرت کرتا رہا مگر سمیر الدین نے کسی طرح میری معذرت قبول نہیں کی، میں نے کہا بچہ یہیں مسجد میں آئے میں پڑھا دیا کروں گا اور کھانے سے معذرت ہی قبول کیجئے، انھوں نے کہا کھانا اس کا معاوضہ نہیں ہے، اگر ان کے گھر سے کوئی لا دیا کرے تو آپ قبول کرلیں گے۔ یہ بطور ضیافت کے ہوگا، ان کے اصرار پر میں نے اسے قبول کرلیا، بچہ پڑھنے آنے لگا اور کھانا کبھی وہی لاتا، کبھی کسی اور سے بھجوا دیتے۔‘‘ (حکایت ہستی: ۲۴۰)

خیر یہ تو دور طالب علمی کا قصہ تھا، جہاں عام طور سے سادگی رہتی ہے۔ اب مدرس ہونے کے بعد کا حال دیکھئے کہ اللہ کا بندہ زندگی کیسے بسر کرتا ہے:

> ’’میں لکھ چکا ہوں کہ مدرسہ دینیہ میں میری تنخواہ اس وقت ۱۷۵/روپئے تھی، اس کے ساتھ کھانا بھی تنخواہ میں شامل تھا، جب میں اپنے بچوں کو لے گیا تو مدرسہ کے مطبخ سے میرے کھانے کا انتظام موقوف ہوگیا، تو مہتمم صاحب نے یہ آسانی کردی کہ شروع ماہ میں ایک مہینہ کا غلہ، آٹا، چاول اور دال دیدیتے، اس کے ساتھ سبزی ترکاری اور جلاون کے پیسے بھی متعین کرنے چاہے، میں نے پیسوں کے لئے تو معذرت کی، البتہ میرے حصے کا غلہ مل جاتا اس سے مجھے بہت سہولت ہوتی۔ وہ ہوتا تو صرف میرے حصہ کا مگر اللہ تعالیٰ اس میں برکت دیتے اور تقریباً ہم دونوں کے لئے پورے مہینے کفایت کرتا۔ گوشت، تیل، سبزی اور لکڑی خریدنی پڑتی،

مگر آسانی سے کام چل جاتا، ہاں یہ ہے کہ کھانے اور کپڑے میں آخری حد تک سادگی رہتی، بسا اوقات ایسا ہوتا کہ نہ تیل ہوتا نہ سبزی، صرف دال روٹی اور چاول ہوتا، اور ہم دونوں اللہ کا شکر ادا کر کے کھا لیتے۔ اس صورت حال میں اس وقت ذرا دقت محسوس ہوتی جب کوئی مہمان آجاتا۔ اس وقت تک نہ میری کوئی شہرت تھی اور نہ کوئی خاص وقعت! اس لئے مہمانوں کی آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی، پس سکون کے ساتھ وقت گزرتا اور زندگی بسر ہوتی رہتی۔ ‘‘

یہ کھانے کی سادگی کی ایک جھلک تھی، اب پوشاک اور پہننے کا بھی حال دیکھئے۔

حضرت والا کے مخلص، ہمدرد، غمخوار، رفیق و ہم نشیں حضرت مولانا حافظ قاری شبیر احمد صاحب دربھنگوی مدظلہ العالی، جب میرٹھ میں پڑھا رہے تھے تو ملاقات کے لئے غازی پور تشریف لائے۔ اس کے بعد کا واقعہ حضرت کے الفاظ میں پڑھئے:

’’جن دنوں قاری صاحب غازی پور تشریف لائے تھے، سردی کا موسم تھا، اس وقت میں موسم کے تغیرات سے قدرے بے نیاز تھا، نہ گرمی کا زیادہ احساس تھا نہ سردی کا! سردی سے تو اس حد تک بے نیازی تھی کہ میرا جسم اس وقت ہر قسم کے گرم کپڑے سے نا آشنا تھا، نہ سوئٹر پہنتا تھا نہ گرم رومال رکھتا تھا، اور نہ کبھی موزے پہنے تھے۔ دیوبند میں سردی شدید پڑتی ہے، حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی علیہ الرحمہ نے مجھے صرف کرتے بنیائن میں شدید سردی میں دیکھا تو پوچھنے لگے کہ آپ اور آپ کے اطراف کے طلبہ بہت غریب ہوتے ہیں کیا؟ میں نے عرض کیا نہیں، خاصے خوشحال ہوتے ہیں، فرمایا میں دیکھتا ہوں کہ نہ سوئٹر پہنتے ہیں نہ جرسی، میں نے عرض کیا کرتے کے نیچے پہنتے ہیں، فرمایا اور آپ؟ میں نے عرض کیا مجھے ضرورت نہیں ہے۔

پھر فراغت کے بعد جب دلی میں دفتر جمعیۃ علماء میں مقیم تھا، تو ضرورت محسوس ہوئی کہ سوئٹر یا جرسی خریدی جائے۔ میرے محترم دوست مولانا عبد الوحید حیدرآبادی نے ایک پوری آستین کا سوئٹر خریدوا دیا، جسے میں تبلیغی سفر میں پہنتا رہا۔ جب گھر واپس آیا تو مسجد میں ایک غریب آدمی کو دیکھا کہ سردی سے کانپ رہا ہے، تو میں نے وہ سوئٹر اسے دیدیا، پھر میں آزاد تھا، البتہ ایک سوتی رومال رکھنے کا عادی تھا، جو ہر موسم میں میرے کندھے پر رہا کرتا تھا، جاڑوں میں اسے کانوں پر لپیٹ لیتا تھا۔ سردیوں میں کرتے بنیائن پر ایک ہلکی سی سوتی چادر

> ہوا کرتی تھی، بس تمام جاڑا اسی میں بسر ہوتا تھا۔ اس وقت تک میں نے موزہ کبھی نہیں پہنا تھا۔ قاری صاحب تشریف لائے اور مجھے اس حال میں دیکھا تو انھوں نے گرم کپڑوں کی تاکید بلیغ کی، مگر مجھے کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی اور اس وقت میری مالی حیثیت بھی ایسی نہ تھی کہ گرم کپڑوں کا انتظام کرتا، غریبانہ زندگی بسر ہوتی رہی۔‘‘

دنیا میں بنی آدم کو تین چیزوں کی حاجت ہوتی ہے، کھانا جو اس کو قوت پہونچائے، کپڑا جو اس کو گرمی و سردی سے محفوظ رکھے اور مکان جس میں وہ بود باش کر سکے۔ کھانے کی سادگی اور کپڑے کی بے سروسامانی کو آپ نے ملاحظہ کر لیا۔ اب مسکن و مکان کا حال سنئے کہ سرے سے مکان بنایا ہی نہیں۔ جن دنوں حضرت مولانا پر ترک دنیا کا غلبہ تھا، اس وقت کا حال خود بیان فرماتے ہیں کہ:

> دنیا اور حیات دنیا کی کسی متاع سے کوئی دلچسپی نہ تھی، مجھے نہ مال کا تصور آتا نہ گھر مکان کی کوئی فکر ہوتی، نہ دنیا کے کسی مستقبل کی طرف نگاہ اٹھتی، دلچسپی کا تمامتر محور نماز، عبادت، تلاوت اور آخرت کا تصور تھا۔ روزہ رکھتا، تو مسلسل رکھے جاتا، اس وقت کے غلبۂ رجحان نے مستقبل سے بے پرواہو کر کئی معاملات طے کر ڈالے۔ میں نے بارگاہِ الٰہی میں خاموش زبان سے یہ عہد کر لیا تھا کہ میں دنیا میں مکان کی تعمیر سے ہمیشہ کنارہ کش رہوں گا، اینٹ پر اینٹ رکھنے کا عمل نہ کروں گا۔‘‘

خاکسار نے ایک دفعہ عرض کیا کہ حضرت! مکان بنوا لیجئے، تو فرمایا کہ میرا مکان تو بنا ہوا ہے، اور یہ کہتے ہوئے نگاہ آسمان کی طرف اٹھی اور ہلکا سا اشارہ انگلی کا بھی ہوا۔ قدرے سکوت کے بعد فرمانے لگے کہ ’’ساری دنیا سے منہ موڑا ہے، ساری دنیا کو چھوڑا ہے، اس کی خاطر، اب بھی نہیں دیں گے۔‘‘ اتنا کہنا تھا کہ آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور دوسرے کام میں مصروف ہو گئے۔

استغنا و بے نیازی کے بعد سخاوت و فیاضی اور داد و دہش کا ایک سلسلہ دراز قائم تھا۔ کتنے متعلقین و متوسلین ایسے تھے جن کا ماہانہ وظیفہ مقرر تھا۔ ان سب کا ذکر کیا، خود خاکسار کو اس خوان کرم سے اتنا ملا ہے کہ ان سب مواقع کو بیان کیا جائے تو اس کے لئے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہو۔

حضرت والا کے کن کن اوصاف عالیہ کا ذکر اس مقالہ میں کیا جائے، اس کے لئے ایک مستقل تالیف کی ضرورت ہے۔ مخلوق کے ساتھ شفقت ومحبت خاص کر اپنے تلامذہ و متعلقین کے ساتھ ایسا انداز کہ ہر شخص گمان کرے کہ حضرت مجھے زیادہ چاہتے ہیں، اور یہ انداز ہو بہو سنت نبوی کا نمونہ ہے۔ اصلاح امت کی دھن اور اس کے لئے اسفار، علماء عصر کی نگاہ میں محبوبیت پھر مقبولیت عامہ ایسی کہ:

چلا ہی جارہا ہے گرتا پڑتا اس کی محفل تک
جہاں سے جس نے جس حالت میں اس دلبر کی بو پائی

دعاؤں کا خاص اہتمام اور اپنے احباب کو اس کی تلقین وغیرہ عناوین پر تفصیل سے لکھ کر ان پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے، مگر یہ مقالہ خاصا طویل ہو گیا ہے، اس لئے اب اتنے ہی پر اپنی بے ہنگم تحریر کو ختم کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ حضرت اقدس کو اعلیٰ علیین میں خوش وخرم رکھے۔ آمین

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

* * *

ایمان کے بعد معصیت مصیبت کو جلد لاتی ہے، جو بالکل نہیں مانتے انھیں دخولِ نار تک مہلت ہے، اس لئے ان کے یہاں کسی قدر چین ہے، لیکن ایک مومن جس کو حق تعالیٰ دخولِ نار سے بچاتے ہیں، وہ فوراً سزا کی زد میں آجاتا ہے، گنہگاروں کے گناہ اس سے مٹتے ہیں، صالحین کے درجات بلند ہوتے ہیں، آخرت کی پکڑ سے حفاظت ہوتی ہے، ہے تو بڑا فائدہ! مگر مصائب کی تاب ہمارے اندر کہاں؟ حق تعالیٰ حفاظت فرمائیں۔

(حدیث دوستاں)

فضل وکمال کی ایک جامع شخصیت
حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب

مولانا فضل حق صاحب عارفؔ خیرآبادی

الحمد لله و كفى وسلام على عباده الذين اصطفى. اما بعد

غیر منقسم اعظم گڑھ کی سرزمین ہمیشہ سے علما، صلحا، اتقیا، خطبا اور محدثین کی سرزمین رہی ہے۔ شاید اسی لئے اقبال سہیلؔ اعظمی ترنگ میں آکر کہہ گئے۔ ع

''جو ذرہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیر اعظم ہوتا ہے''

اس شہر کا قیام راجہ اعظم خان کے ہاتھوں ۱۶۶۵ء میں عمل میں آیا، اور اس شہر کو ضلع کی حیثیت ۱۸۳۲ء میں انگریزی دور اقتدار میں ملی۔ اعظم گڑھ اور اس کے اطراف واکناف کے مواضعات وقصبات کی مردم خیز خاک بہت پہلے ہی سے شیراز ہند جونپور کے عہد شباب میں علوم و فنون کے لعل وگہر اگل رہی تھی۔

یہاں ایسی قدآور اور علمی شخصیات پیدا ہوتی رہی ہیں جنہوں نے صرف اعظم گڑھ کو ہی نہیں بلکہ ہندوپاک کے پورے خطے اور علاقے پر اپنی علمی اور عملی خدمات کے ایسے تابندہ نقوش چھوڑے ہیں جو پایندہ اور انمٹ ہیں، اور آنے والی نسلوں کے لئے سنگ میل کا کام کرتی ہیں اور کرتی رہیں گی۔ (ان شاء اللہ) انہیں بافیض شخصیات میں حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب کی بلند قامت شخصیت تھی، جنہیں محبوبیت ومقبولیت کا وہ اعلی مقام حاصل ہوا جو کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔

حضرت مولانا جیسے صاحب فضل وکمال کے بارے میں محض اس لئے لکھنے کی ہمت کر رہا ہوں کہ میں نے مولانا کو بچپن ہی سے دیکھا اور قریب سے دیکھا، برتا اور خوب برتا، جانچا اور پرکھا اور بساط بھر جانچا پرکھا، پھر کہنا پڑا۔ ع

”گل چیں تو زتنگئ داماں گلہ دارد“

مولانا کے ساتھ میری رفاقت:

مولانا کے ساتھ بچپن ہی میں میرے رفیقانہ تعلقات یوں ہوئے کہ مولانا کی دو پھوپھیاں میرے پڑوس میں بیاہی تھیں، مولانا ان کے یہاں آتے جاتے رہتے تھے، اور ہم لوگ ساتھ کھیلتے تھے، اس طرح مولانا سے میری دوستی ہوگئی۔ پھر گلستاں پڑھنے کے زمانے میں ایک بہت ہی دلچسپ واقعہ پیش آیا کہ میرے سالانہ امتحان کے دن مولانا خیرآباد پہونچ آئے، اور صبح مدرسہ منبع العلوم بھی پہونچ گئے۔ میری گلستاں وغیرہ کا امتحان حضرت الاستاذ جناب مولانا مفتی حبیب الرحمان صاحب خیرآبادی (حال صدر مفتی دارالعلوم دیوبند) لے رہے تھے۔ مولانا اعجاز میرے پیچھے بیٹھ گئے۔ حضرت مفتی صاحب نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ کیا پڑھتے ہو؟ کیا نام ہے؟ مولانا اعجاز صاحب نے مختصراً عرض کیا کہ بھیرہ کا ہوں، اعجاز احمد نام ہے، گلستاں وغیرہ پڑھ رہا ہوں۔ حضرت مفتی صاحب نے فرمایا کہ ”دور بیٹھو، ورنہ کوئی معجزہ دکھادو گے۔“

اس جملے پر مولانا سے زمانہ طالب علمی میں مَیں کبھی کبھی ازراہ مذاق کہہ دیتا تھا کہ ”اعجاز تم تو ”صاحب معجزہ“ ہو۔

خیر بات آئی گئی ہوگئی، مولانا کی خیرآباد آمد ورفت برابر جاری رہی اور ہم دونوں کی رفاقت میں استواری آتی گئی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ میرا اور مولانا کا تعلیمی سال ہمیشہ ایک رہا، مدرسے دور رہے۔ مولانا بھیرہ سے احیاء العلوم مبارک پور پھر دیوبند، پھر پھرتے پھراتے امروہہ سے رسمی فراغت ..... اور میں تیلی کا بیل، منبع العلوم خیرآباد، پھر دارالعلوم مئو سے فراغت (میرے دیوبند جانے میں الوہ کی شدید علالت حائل ہے) میں اس کو یہی کہتا ہوں۔

ماو مجنوں ہم سبق بودیم در دیوان عشق
او بصحرا رفت ما در کوچہا رسوا شدیم

الحمدللہ! بعد مکانی کے باوجود ہمارے رفیقانہ تعلقات میں کوئی کمی نہیں آئی، البتہ اب گاہے ماہے یا سال بسال۔ یہ البتہ میری کمزوری رہی ہی ہے کہ مکاتبت کی نوبت نہیں آسکی۔

فراغت کے بعد مولانا میسور گئے، پھر غازی پور پھر الٰہ آباد، بعدہ غازی پور کی طرف مراجعت، پھر مولانا عزیزالحسن صدیقی صاحب کی ”نظرعنایات“ نے مولانا کو ریاض العلوم گورینی جیسے مرکزی ادارے میں پہونچا دیا، اور میں یہ کہتے ہی رہ گیا۔

بیا جاناں تماشا کن کہ در انبوہ جانبازاں
بصد سامان رسوائی سر بازار می رقصم

گورینی سے مدرسہ شیخوپور پہونچنے کے بعد تو مولانا علم وہدایت کے مہر عالم تاب بن کر علمی دنیا کے افق پر جلوہ افروز ہوگئے، اور ہمارے دوستانہ روابط مرشد ومسترشد تک جا پہونچے۔

مولانا کی شخصیت کی تشکیل کے باطنی اور خارجی عوامل:

مولانا ایسے صاحب کمال کیسے بنے؟ جب اس کے عوامل واسباب کو ہم تلاش کرتے ہیں تو دو قسم کے عوامل پر ہماری نگاہِ جستجو مرتکز رہ جاتی ہے۔

(۱) مولانا کی سیرت سازی میں اللہ جل شانہ کی محبت، فکر آخرت اور اتباع سنت کے ذوق وشوق کی پوری کارفرمائی نظر آتی ہے۔

(۲) متدین معاصر علما، صلحا اور فقہا سے تعلق وروابط پھر مشائخ وصوفیہ سے محبت و گرویدگی نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔

مولانا کی آپ بیتی ”حکایت ہستی“ پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا کو بچپنے ہی سے بچوں کے عمومی کھیل کود سے دلچسپی تو کیا ایک طرح کا گریز تھا، بس گھر میں گھسے رہنا، کوئی کتاب ہاتھ میں آگئی تو اسے پڑھنا ورنہ پڑھی ہوئی کتابوں کی بار بار ورق گردانی کرکے قند مکرر کا مزہ لوٹنا۔

سرو مینا ہے سبو ہے غنچہ ہے اور ساغر گل ہے
ساقیا! بادہ کشی کا ہے مزہ گلشن میں آج

مطالعہ وکتب بینی، بڑے بوڑھوں اور شرفا کے ساتھ ہم نشینی، علما وصلحا کی آمد پر عقیدت واحترام کے جذبات کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضری وغیرہ وہ خارجی اسباب ہیں جنھوں نے مولانا کو مولانا بنا کر مرجعیت ومحبوبیت اور مقبولیت کا وہ مقام عطا کیا کہ بعد وفات، جب کہ وفات ایک کوردہ اور دور افتادہ مقام میں ہوئی، مگر جنازہ میں شرکت کی سعادت سے بہرہ مند ہونے کے

لئے خلق خدا ٹوٹ ٹوٹ پڑی اور آمدرفت کی تمام تر دشواریوں کے باوجود ایک بڑے مجمعے نے جنازے میں شرکت کی۔ غفر الله له مغفرة تامة (آمین)

تصوف کی طرف مولانا کا میلان:

مولانا کی طبیعت میں صالحیت کا غالب عنصر اللہ نے اپنی رحمت سے فطرتاً ودیعت فرمادیا تھا، اس لئے تعلیم سے رسمی فراغت کے بعد جلد ہی عارف باللہ حضرت مولانا منیرالدین صاحب امام جمعہ شاہی مسجد کٹرہ مئو کے دست حق پرست پر بیعت ہوکر سلوک کی راہیں طے کرنے لگے۔ نفس (امارہ بالسوء) کو نفسانی آلودگیوں اور آلائشوں سے پاک ومنزہ کرکے نسبت مع اللہ کے حصول میں دلجمعی کے ساتھ لگ گئے۔ زندگی کے مختلف ادوار میں تزکیۂ نفس کے لئے یکے بعد دیگرے تین شیوخ طریقت کے دامن تربیت سے وابستہ ہوئے، آخری شیخ حضرت مولانا عبدالواحد صاحب غازی پوری ثم کراچوی سے سلسلہ راشدیہ، قادریہ میں بیعت ہوئے۔

مجاہدہ اور ریاضت وعبادت کی برکت سے جب نفس روحانیت اور تجلیات سے معمور ومنور ہوگیا تو پیرومرشد نے خلافتِ بیعت کی دولت سے سرفراز فرما کر خرقہ خلافت عطا فرمایا اور مُجاز بیعت کردیا۔

شیخ کی نظر کیمیا اثر اور ان کی تعلیم وتلقین پر استمرار کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا کی زندگی سے ذمائم یعنی چغل خوری، کذب بیانی، حسد، کینہ، بغض وعناد، حرص اور ریاء وکبر وغیرہ رذائل کافور ہوگئے۔

اور ایک بڑی اور نہایت بری خصلت جو آج کل عموماً اچھے اچھوں کی مجالس کی زینت بنی ہوئی ہے، اس کا تو مولانا کی زندگی میں کوئی وجود ہی نظر نہیں آتا۔ وہ ہے ''غیبت''۔ مولانا نوراللہ مرقدہ کی پوری زندگی اس ذمیمہ سے کلیۃً پاک اور مبرا نظر آتی ہے۔ نہ تو خود کسی کی غیبت کرتے نہ ہی اس کا سننا پسند کرتے۔ اگر کبھی کسی بے تکلف نے اس موضوع کو چھیڑ دیا تو مولانا نہایت ہی ناپسندیدگی کا اظہار کرکے فوراً اس پر قدغن لگاتے، چاہے سامنے والا کتنا ہی جزبز کیوں نہ ہو، مولانا مطلقاً اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔

اسی کے ساتھ جو چیز نایاب تو نہیں کمیاب ضرور ہے، اس کی مولانا کے یہاں بہت افراط

اور بہتات نظر آتی ہے۔ وہ ہے ’’تواضع، انکساری اور فروتنی‘‘۔ یہ وہ گرانمایہ سرمایہ ہے جو مولانا کے یہاں بافراط نظر آتا ہے، ہر کہ ومہ، ہر چھوٹا بڑا مولانا کی خدمت میں پہونچ کر یہی محسوس کرتا کہ مولانا کو مجھ سے بڑی محبت ہے، مولانا میرے ساتھ بڑے اکرام سے پیش آئے، میں تو مولانا کی محبت آمیز باتوں سے پانی پانی ہوا جاتا تھا، وغیرہ وغیرہ۔

علوم ومعارف:

مجاہدہ وریاضت کے ذریعے جب مولانا کا قلب، ’’قلبِ صافی‘‘ بن گیا اور خصائل حمیدہ کا خوگر وعادی بن گیا تو اللہ رب العزت کی بارگاہ فیضان رساں سے علوم ومعارف کی موسلا دھار بارش شروع ہوگئی اور اسلامی علوم وفنون پر کتنی دسترس اور قدرت حاصل ہوئی وہ آپ کے نوع بنوع کے مضامین، مختلف موضوعات پر آپ کی تالیفات وتصانیف شاہد عدل ہیں۔ ع

’’ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے‘‘

یہ الگ بات ہے کہ:

باراں کہ درلطافت طبعش خلاف نیست　　درباغ لالہ روید درشورہ بوم وخس

صالح اور نیک طینت طبیعتیں آپ کے باران فیض سے خوب خوب فیضیاب وسیراب ہوتیں۔ **فللہ الحمد والشکر. بیدہ ملکوت کل شئی**

مولانا کی نجی مجلسیں ہوں یا پند ونصائح کی محفلیں، جب زبان حق بیان کھلتی تو وہ علمی جواہر پارے بکھرتے کہ آنکھیں خیرہ اور ششدر ہو جاتیں۔ اہل شعور کہہ اٹھتے:

علوم دین پر اللہ اکبر، اتنی قدرت ہے
زباں میں کوثر وتسنیم کی شامل حلاوت ہے

مولانا ایک قلم کار زرنگار:

زباں میں کوثر وتسنیم کی شامل حلاوت کی بات آگئی تو مولانا کے خامۂ زرنگار، ترجمان سحر بیان کا کچھ تذکرہ مناسب حال ہوگا۔

جس طرح ذہانت وفراست اور تعلیم وتعلم میں مولانا کی ایک انفرادی شان تھی، اسی طرح آپ قرطاس وقلم کے جوہر آبدار اور خامۂ زرنگار کے مالک تھے۔ مولانا جس موضوع پر قلم

اٹھاتے ، آیات قرآنی اور احادیث رسول ﷺ کے ذریعے اس موضوع میں جان ڈال دیتے ۔ اصولیات کے ساتھ تطبیق کے لئے فروعات کا بھی ذکر فرماتے ۔ زبان سادہ مگر پرکشش ، دلآویزی اور اثر آفرینی کی چاشنی سے بھرپور ، مشکل سے مشکل مضمون کو سہل ترین انداز میں پیش کرنے کا سلیقہ ہی نہیں ، ملکہ حاصل تھا ۔ شیریں بیانی اور دل نشینی کے انداز بیان نے آپ کو معاصرین میں ایک ممتاز اور نمایاں مقام پر فائز کردیا تھا ۔ جی چاہتا ہے کہ اس موقعے کے لئے ایک دلچسپ واقعہ نقل کردوں ۔

مولانا کی خطابت ''از دل خیزد بر دل ریزد'' کا نمونہ ہوا کرتی تھی ۔ ایک بار حیدرآباد میں ایک عظیم الشان جلسۂ سیرت کا انعقاد ہوا ، حضرت مولانا بھی بحیثیت مقرر تشریف لے گئے ، مولانا کی تقریر سے پہلے خطابت کے شہرت یافتہ ، بڑے طلیق اللسان اور فصیح البیان ایک ایسے مقرر کی تقریر ہوئی جن کی خطابت کا طوطی بولتا تھا ۔ اب باری حضرت مولانا کی تھی ، مولانا کرسی پر تشریف فرما ہوئے اور بہت ہی پرمغز ، علمی جواہر پاروں کو بکھیرنا شروع کیا مگر بڑے ہی سلیس ، عام فہم اور دل میں اتر جانے ، بلکہ گھر کر جانے والا انداز ! مجمع عش عش کر اٹھا ، اور اہل علم میں تو کانا پھونسی شروع ہوگئی کہ مولانا اعجاز احمد صاحب کی تقریر کے بعد فلاں صاحب تو ایک دم پٹ گئے ۔

واقعی بات تو یہی ہے کہ مولانا وعظ کے لئے جب کرسی نشین ہوتے تو سامعین کے جذبات کا اندازہ کرکے وعظ فرماتے ، اور ''کلموا الناس بقدر عقولهم'' کا صحیح مصداق بن جاتے ۔ مطالعہ کی کثرت ، معلومات کی وسعت کا دریا ہر مجمع میں جاری نہیں فرماتے ، یہ الگ بات ہے کہ آپ کی شیریں بیانی اور سلاست لسانی کے ساتھ ہی مومنانہ اور صالحانہ انداز بیان سامعین کے دلوں کو موہ لیتا ۔ مولانا اپنے وعظ میں جب آیات قرآنی اور احادیث رسول ﷺ پڑھ کر تفسیر فرماتے تو زبان وبیان اور اردو زبان کے ذوق آشنا کہہ اٹھتے ۔ ع

''بلبل چہک رہا ہے ریاض رسول کا''

مولانا کا انداز بیان دل نشیں ہونے کے ساتھ ہی سکینت آفریں ہوتا اور سامعین واقعی باتمکین بن جاتے ، پورے مجمع میں شاید ہی کوئی ایسا ہوتا جو سمع خراشی محسوس کرتا ۔ اور مولانا کا وعظ جب اپنے اختتامیہ پر پہونچتا تو سامعین چہرے مہرے ، زبان حال سے گویا ہوجاتے ۔ ع

''روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد''

اب تو ہم سبھی کو حسرت ویاس سے یہی کہنا پڑ رہا ہے کہ۔ ع

''ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے''

سچ ہے:

''تمہارے جگر کا کوئی دوسرا نہیں ملتا''

اور اگر ہیں تو بہت کمیاب ہیں۔

مولانا کی فقہی بصیرت:

جس طرح دیگر اسلامی علوم وفنون، تفسیر اور حدیث ومتعلقات حدیث پر مولانا کو درک حاصل تھا، اسی طرح فقہیات پر بھی مولانا کو غیر معمولی بصیرت اور مہارت حاصل تھی۔ چنانچہ فقہیات پر لکھے آپ کے مضامین کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علوم فقہیہ میں بھی آپ کی ذہانت، بصیرت، فراست اور علم وآگہی کے خزانوں سے آپ کا دامن علم بھرا ہوا تھا۔ اس موضوع پر آپ نے اپنی خداداد صلاحیت سے بھرپور کام لیا حتی کی فقہ اکیڈمی کے بعض فیصلوں کا خالص علمی اور ناقابل تردید دلائل سے تعاقب کر کے یہ ثابت کر دیا کہ یہ فیصلہ اسلامی تعلیمات کی روح کے سراسر منافی ہے۔ اس کی مثال میں بیمہ کے جواز اور طلاق سکران سے متعلق مضامین آپ کی دقیقہ رسی کے مبرہن ثبوت ہیں۔

احکام شرعیہ کے سلسلے میں کسی بھی قسم کی کوئی مداہنت اور مروجہ خوشنما رواداری آپ کا مزاج ہی نہیں تھا۔ جو افکار ونظریات اسلامی روح سے متصادم نظر آتے، مولانا بلا خوف لومة لائم ان پر بے باکانہ نقد فرماتے، چاہے ان پر ''جدید دور کے تقاضے، وقت کی مجبوری اور مصلحت بنی وغیرہ وغیرہ'' کی کتنی ہی ملمع سازی کی جاتی۔

بینکنگ کا مالیاتی نظام، لڑکیوں کی اقامتی درسگاہیں، انشورنس وغیرہ وہ چیزیں ہیں جو اسلامی مزاج سے قطعاً ہم آہنگ نہیں، پھر ان کے جواز کے لئے مصلحتوں کے انبار لگائے جاتے ہیں مگر یہ تمام چیزیں صحیح علمی اور ٹھوس دلائل کے بعد تار عنکبوت سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ اس لئے کبھی بھی مولانا نے اس قسم کے نظریات اور افکار سے سمجھوتا نہیں کیا، چلانے والے چلاتے ہی

رہ گئے۔

کاش شیخ وبرہمن باہم یہ سمجھوتہ کریں پرفضا جس سے فضا ہو، وہ فضا پیدا کریں

مگرحتی المقدور حسب موقع وضرورت مولانا اپنے خامہ حقیقت نگار سے ”اثمھما اکبر“ کو واشگاف انداز میں واضح کرتے رہے۔

مثال کے طور پر سہ ماہی رسالہ ”الماثر“ شمارہ فروری تا مارچ ۲۰۰۰ء کا ایک اقتباس قارئین کے لئے قندمکرر کے طور پر پیش کیا جاتا ہے:

> ”............. یہ سب نئے زمانے کی پیداوار ہیں، ان کے فوائد کم اور نقصان زیادہ ہیں، ہر طرح کے لوگ ان سیمیناروں میں اکٹھا کر لئے جاتے ہیں، ایسے لوگ جن پر مصالح زمانہ کا غلبہ ہوتا ہے، وہ دلائل سے تعرض کرنے کے بجائے جذبات ومصالح کی رعایت ضروری سمجھتے ہیں، کچھ ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں، جو دلائل کی خبر رکھتے ہیں، مگر یہ کھچڑی جیسا مجمع کس حد تک صحیح نتیجے تک پہونچتا ہے، یہ قطعاً مشکوک ہے، اور اس پر طرہ یہ کہ سوالنامہ اس طرح مرتب کیا جاتا ہے کہ اس میں مفروضہ مصائب ومشکلات کو اہتمام سے ذکر کر کے جواب دینے والوں کے لئے ایک راہ متعین کردی جاتی ہے، اس کے بعد اگر دلائل اس کے خلاف بھی ہوں، بہت سی مصلحتیں اس کے منافی بھی ہوں تب بھی جواب دینے والا ادھر متوجہ نہیں ہوتا، یا اس کی الٹی سیدھی تاویلیں کرتا ہے۔“

اسی طرح ایسے مسائل بھی سامنے آئے کہ ان میں علما وفقہا کی رایوں سے مختلف مولانا کا رجحان ہوتا اور اکابرین سے اس سلسلے میں کوئی واضح رائے متعین نہ ہوتی تو مولانا تفرد اختیار کرنے اور الگ سے اپنی کوئی رائے قائم کرنے سے یکسر گریز فرماتے، تاکہ امت میں تشتت وافتراق کا دروازہ نہ کھلنے پائے۔

مولانا نوراللہ مرقدہ کی فقہی بصیرت پر گہرائی اور گیرائی کے ثبوت کے لئے ایک تحریر نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مولانا کے ایک شاگرد تھے، مفتی نسیم احمد صاحب (اللہ کو پیارے ہوچکے ہیں، اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور درجات بلند فرمائے۔ آمین) مدرسہ دینیہ میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد

دارلعلوم دیوبند میں درس نظامیہ کی تکمیل کی، پھر افتاء وتدریب فی الافتا کی بھی وہیں تکمیل کی۔ مفتی صاحب مرحوم کا ایک خط پھر اس کا جواب بھی قارئین ملاحظہ فرمالیں تو مولانا کی فقہی بصیرت کے بارے میں کہنا پڑے گا کہ مولانا فقیہ النفس تھے۔

مولانا کا جواب ذرا طویل ہے مگر اہل علم کی خصوصی تواضع کی غرض سے مولانا کا پورا جواب نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

> ”ام الزوجہ اور بنت الزوجہ کی حرمت، حرمت مصاہرت کے ذیل میں آتی ہے، حرمت مصاہرت میں دو حکمتیں......والعلم عنداللہ......محسوس ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ جس کو تم اصول فقہ اور فقہ میں پڑھ چکے ہو کہ ولد کے واسطے سے مرد وعورت ایک دوسرے کے جز ہو جاتے ہیں، اور پھر یہ جزئیت متعدی ہوکر دونوں کے اصول وفروع کو بھی اپنے دائرہ میں سمیٹ لیتی ہے، اور اپنے اجزاء سے نکاح ظاہر ہے کہ ناجائز ہے۔
>
> دوسری حکمت یہ ہے کہ اگر یہ حرمت ثابت نہ ہوتو معاشرہ تباہ ہوکر رہ جائے گا، تفصیل اس کی یہ ہے کہ نکاح کے بعد ظاہر ہے کہ دو خاندانوں میں نہایت قریبی تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں، قرابت داری کی وجہ سے آپس کا اختلاط ناگزیر ہے، ایسی صورت میں اگر ام الزوجہ وبنتہا کے سامنے حرمت کی دیوار کھڑی نہ کردی جائے تو شوہر کو بیوی کی ماں یا اس کی بیٹی کی طرف بھی رغبت ہوسکتی ہے، اور اس رغبت کے نتیجے میں نیا تعلق قائم کرنے کے لئے پرانے تعلق کو توڑنے اور ختم کرنے کی کوشش ہوگی، اور یہ بات خوب معلوم ہے کہ جنسی بنیادوں پر جو محبت قائم ہوتی ہے وہ ہرنا کردنی کو کردنی بنادیتی ہے۔ پھر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ماں بیٹی کے درمیان سخت عداوت اور کشمکش پیدا ہوتی، اور قتل وخون کی نوبت پہونچ جاتی، اور قطع رحمی کا بازار گرم ہوجاتا، جس کو مٹانے کے لئے شریعت کا نزول ہوا ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہٗ تحریر فرماتے ہیں کہ:
>
> **ومنها المصاهرة فإنه لو جرت السنة بين الناس أن يكون للأم رغبة فى زوج بنتها وللرجال فى حلائل الابناء وبنات نسائهم لأفضىٰ إلى السعى فى فک ذٰلک الربط أوقتل من يشح به ، وان أنت تسمعت إلىٰ قصص قدماء**

الفارسين واستقرأت حال أهل زمانک من الذين لم يقيدوا بهٰذه السنة الراشدة وجدت اموراً عظاماً ومهالک ومظالم لاتحصىٰ . (حجۃ اللہ البالغۃ ج:۲، ص:۱۳۲)

عبارت کا حاصل وہی ہے جو میں نے اوپر لکھا، مجوسیوں اور اہل جاہلیت میں یہ قید حرمت نہ تھی، تو کتنے فساد اور کتنی خونریزیاں اسی بنیاد پر ہوئیں؟ حرمت کی دیوار قائم کر دینے کے بعد ان رشتوں کی جانب کوئی حرص وہوس کی نگاہ کرتا ہی نہیں، بلکہ ایک ایسا احترام اور تقدس طبائع میں جاگزیں ہو گیا کہ رشتۂ زوجیت کے تصور سے بھی طبع سلیم اباء کرتی ہے۔

اب مزید غور کرو! پہلی حکمت یعنی انشاء جزئیت کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں رشتے محض عقد نکاح کی بنیاد پر حرام نہ ہوں کیونکہ جزئیت کا ثبوت ولد پر موقوف ہے، اور ولد کا قریبی سبب وطی ہے، نہ کہ عقد نکاح! اس لئے چاہئے کہ جب دخول ہو تب حرمت ثابت ہو، لیکن دوسری حرمت کا اقتضاء یہ ہے کہ محض عقد نکاح سے حرمت قائم ہو جانی چاہئے، کیونکہ قرابت تو محض عقد نکاح سے ثابت ہو گئی۔ اب وہ تمام امور حرام ہونے چاہئیں جن سے قطع رحمی لازم آئے۔

پھر غور کرو! اصل وجہِ حرمت تو جزئیت کا ثبوت ہے، اور دوسری وجہ تو قطع رحمی سے بچانے کی غرض سے ہے، اس لئے اس کو فرع اور تابع کہو تو بجا ہے۔ اب پہلی وجہ کا تقاضا یہ ہے کہ حرمت مصاہرت کے لئے بہر صورت وجودِ وطی کو بنیاد قرار دیا جائے، لیکن دوسری حکمت کی رعایت بھی ضروری ہے، اس لئے اب تقسیم کار یوں مناسب ہے کہ جہاں قطع رحمی اور تحاسد کا احتمال شدید ہو، وہاں حرمت کے ثبوت کے لئے وجودِ وطی کا انتظار نہ کیا جائے، بلکہ محض عقد نکاح کی بنیاد پر جلد تر بندش قائم کر دی جائے، اور جہاں قطع رحمی کے احتمال میں اس درجہ شدت نہ ہو، وہاں وجود وطی کے بعد حرمت مانی جائے، اور جہاں اس قطع رحمی کے احتمال میں مزید کمی ہو وہاں معاملہ کچھ اور سہل کر دیا جائے۔

اس اصول کو سمجھ لینے کے بعد ایک بار پھر تامل کرو کہ بیوی کے ہوتے ہوئے اگر اس کی ماں کی جانب رغبت کی گنجائش ہو تو بیوی اس کو کسی طور پر گوارا نہیں کرے گی۔ عام عادت یہی ہے کہ اس باب میں بیٹی کو سخت غیرت آئے گی، اور شر وفساد اور قطع رحمی اپنے آخری نقطہ پر پہونچ

کر رہے گی، اس کے برخلاف اگر بیوی کی بیٹی کی طرف رغبت ہو تو عام طبیعت یہی ہے کہ ماں اپنی اولاد کے لئے بہت امکان ہے کہ بخوشی قربانی دینے کے لئے آمادہ ہو جائے۔ وہ یہ خیال کر سکتی ہے کہ اولاد کی زندگی بن جائے، میرا کیا ہے، اب کتنے دنوں جینا ہے۔ چنانچہ ماؤں کا اپنی اولاد کے لئے ہر قسم کی قربانی دینا ایک عام مشاہدہ ہے۔ پہلی صورت میں قطع رحمی شدید ہے۔ اس لئے جزئیت کے سبب قریب یعنی وطی پر حرمت کو موقوف نہ رکھا گیا، بلکہ سبب بعید یعنی عقد نکاح کو حرمت کے لئے کافی سمجھا گیا، اور دوسری صورت میں یہ احتمال ہے کہ قطع رحمی کا وجود ہی نہ ہو، بلکہ برضاء و رغبت اپنی بیٹی کے لئے یہ قربانی دے ڈالے، اس لئے اس کی حرمت اس وقت تک موقوف رکھی گئی جب تک جزئیت کا سبب قریب یعنی وطی نہ پائی جائے۔ **والعلم عند اللّٰہ**

یہ وجہ میں نے خود سے اختراع نہیں کی ہے، صاحب بدائع الصنائع نے لکھی ہے۔ بدائع کی عبارت بھی دیکھ لو، جلد: ٢، ص: ٢٥٨۔

اور جہاں قطع رحمی کا احتمال اس سے بھی کم ہے، وہاں صرف **جمع بین المرأتین** کو حرام کیا گیا ہے، علیٰحدہ علیٰحدہ ہر ایک سے نکاح جائز قرار دیا گیا ہے، مثلاً دو بہنوں کا مسئلہ۔ امید کہ اتنی تفصیل کافی ہوگی۔'' (حدیث دوستاں۔ ص ٦٢٤)

مولانا کی علمی زندگی کا سب سے نمایاں پہلو فقہ پر عمیق اور بالغ نظری کے ساتھ دور رس اور ہمہ گیر نظر، نظر آتی ہے۔ آپ کی علمی بصیرت اور مقام کا اندازہ کرنے کے لئے فقہ کے مختلف موضوعات پر لکھے ہوئے مضامین ہیں جو خصوصیت کے ساتھ سہ ماہی مجلّہ ''المآثر'' کے بیشتر شماروں میں داد تحقیق حاصل کر چکے ہیں، اور ان پر صاحبان علم و تحقیق نے بھی پورے وثوق کے ساتھ اعتماد کر کے درجہ استناد کا مقام عطا کیا ہے۔ آپ کے ان مضامین کے پڑھنے کے بعد اگر آپ کو ''فقیہ النفس'' کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ چنانچہ اس بات کا ثبوت بھی موجود ہے کہ کسی مسئلہ میں عام علمائے تحقیق کی تحقیقات کچھ تھیں، اور مولانا کی تحقیق کچھ اور! مگر جب بالغ نظری کے ساتھ دقیقہ رسی سے کام لیا گیا تو مولانا کی رائے کو ہی ترجیح حاصل ہوئی۔ مثلاً ''جمعہ فی القریٰ'' کی ایک معرکۂ آرا بحث ہے، مولانا کے سب سے اہم اور محسن و مشفق استاذ حضرت مولانا افضال الحق صاحب

جوؔہر قاسمی اعظمی تھے۔ اس موضوع پر سہ ماہی مجلّہ ’’بحث ونظر‘‘ میں دونوں حضرات کے علمی مباحثے یا تبادلۂ خیال ہوئے، جس میں مولانا کی رائے ہی کو ترجیح حاصل رہی۔ مسائل فقہیہ کی تحقیقات مولانا کی زندگی کی بہت ہی اہم، نمایاں اور ممتاز خصوصیت ہے۔

بہت سے ایسے مسائل بھی ہیں جنہیں مباحات کا درجہ حاصل ہے، لیکن ان میں کھلی چھوٹ دیدی جائے تو معاملے کو معصیت تک پہونچنے کے اندیشے ہیں، ایسے مسائل میں سدراہ کے طور پر مولانا نے قدغن لگائی اور اس کی اجازت سے احتیاط کی راہ اختیار فرمائی۔

ان خصوصیات کے حامل ایک انسان کے بارے میں یہ کہتے ہوئے ذرا بھی تأمل نہیں ہوتا کہ:

آفاقہا گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

اب مولانا کے باقیات صالحات میں مولانا کی تالیفات وتصنیفات اور بہت سے رسالوں اور کتابوں میں بکھرے مضامین ہیں جو ہمارے لئے منارۂ نور ہیں، اگر ہم اس نور سے مستنیر ہوئے تو ہماری زندگی بھی فلاح وصلاح سے ہم آغوش ہوگی، ورنہ ’’پدرم سلطان بود‘‘ کی حیثیت ہوائی قلعہ یا نقش برآب سے کم نہیں۔

اردو زبان ادب پر مولانا کی نظر ودسترس:

ہماری مادری زبان اردو پر بھی مولانا کو کامل دسترس حاصل تھی۔ قید تحریر میں آنے والے جملے، دوران تقریر ادا ہونے والے الفاظ میں ایسی دلآویزی، دلکشی اور دل نشینی ہوتی کہ لکھنوی ٹکسال میں ڈھلے ہوئے سکۂ رائج الوقت معلوم ہوتے۔ خامۂ زرنگار جب صفحۂ قرطاس کو مزین کرنے پر آتا تو لب ولہجہ کی شائستگی، زبان وبیان کی برجستگی اپنی تمام تر شگفتگی کے ساتھ ’’از دل خیزد بر دل ریزد‘‘ کا بہترین اور نظر افروز جلوہ رونما ہوجاتا۔ اردو زبان وادب کے ذخیرہ پر آپ کی عمیق اور گہری نظر تھی۔ موقع اور حالات کی مناسبت سے الفاظ ایسے برمحل استعمال فرماتے کہ اگر تناسخ کا عقیدہ ہمارے مذہب میں صحیح ہوتا تو بلا تکلف کہا جاسکتا تھا کہ ابوالکلام کی روحِ اردو آپ کی زبان خوش بیان میں حلول کرگئی ہے۔

جس طرح آپ نے علوم اسلامیہ کو بڑی جانکاہی، دلسوزی اور جانفشانی سے حاصل کیا تھا، ویسے ہی اردو زبان وادب کو بھی بڑی محنت اور کنج کاوی کے ساتھ حافظے کے خزانے میں محفوظ رکھ کر حسب ضرورت اور موقعے کی مناسبت سے اردو زبان کا گلزار کھلا دیتے۔

مولانا مستقیم احسن اعظمی مولانا آزاد کی اردو زبان کے بارے میں اپنے ایک گراں قدر مضمون میں رقم طراز ہیں کہ ’’مولانا آزاد کی بلندانانیت قطب مینار سے زیادہ قدآور، تاج محل سے زیادہ دل کش اور لال قلعہ سے زیادہ پرشکوہ ہے‘‘۔

حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب نوراللہ مرقدہ کی تحریروں اور تقریروں میں بھی مذکورہ اوصاف بھرے پڑے نظر آتے ہیں، اور یہ ذائقہ، ذوق صحیح رکھنے والے محسوس کرپاتے ہیں

طلبہ کی تعلیم وتربیت اور سالکین وواصلین کا تزکیہ:

دین متین کی اشاعت وتبلیغ کا ایک مؤثر ترین طریقہ اہل تعلق سے مکاتبت ہے، موجودہ دور کی ایجاد ’’موبائل‘‘ نے اس فن کا ستیاناس کرکے رکھ دیا ہے۔ افسوس ہوتا ہے ان تشنگان علوم پر کہ اب اپنی بہت سی علمی ضروریات خطوط نویسی کے بجائے موبائل میں گفت وشنید تک محدود رکھ کر مطمئن ہوجاتے ہیں کہ چلو ہماری ضرورت پوری ہوگئی، جبکہ عمومی موبائل میں گفت وشنید محفوظ بھی نہیں رہتی۔ یہی کام اگر تحریر کے ذریعے لیا جاتا تو ایک ریکارڈ محفوظ رہتا، اور کل کی زندگی میں وہ ریکارڈ کارآمد بن سکتا۔

مذکورہ چندسطریں دل کا ایک درد تھا جو پیش کردیا گیا کہ:

’’شاید کہ کسی دل میں اتر جائے میری بات‘‘

اصل لکھنا یہ ہے کہ مولانا نوراللہ مرقدہ نے اس فن کے ذریعہ بھی اپنے تلامذہ اور منتسبین کی اصلاح وتربیت اور تزکیہ نفس کا کام بڑی تندہی کے ساتھ انجام دیا، جبکہ اس ذریعہ کو اختیار کرنے میں بظاہر قیمتی اوقات کی بربادی نظر آتی ہے، مگر اس بربادی کے پس پردہ تعمیر کا قصر عظیم پوشیدہ ہے۔

غور کرنے سے ایک اور بات سمجھ میں آتی ہے کہ مکاتبت کے ذریعہ جس طرح مکتوب نگار کی سیرت، طبیعت اور مزاج کی عکاسی ہوتی ہے، اسی طرح مکتوب الیہ کی طبیعت میں اگر اثر

پذیری کی صلاحیت موجود ہوتی ہے تو اس کی زندگی میں چار چاند لگ جاتے ہیں اور مکتوب موجود ہونے کی صورت میں بار بار استفادے اور استفاضے کے مواقع بھی ملتے رہتے ہیں۔

حضرت مولانا نے اس فن کے ذریعے کتنے اصلاح طلب لوگوں کا تزکیہ سرانجام دیا، اس کے گواہ مولانا کے لکھے ہوئے وہ خطوط ہیں جو ’’حدیث دوستاں‘‘ کی شکل میں اپنی بھرپور تابانی دکھا رہے ہیں۔ آپ کے خطوط بڑے اور بزرگوں کے نام بھی ہیں، اور دوستوں اور ہمسروں کے نام بھی۔ تلامذہ اور عزیزان خوش اطوار کی اصلاح و تربیت کے بھی، خالص علمی مباحث کے آئینہ دار تو ہیں ہی، ان خطوط میں ابطال باطل اور احقاق حق کی پوری پوری جلوہ سامانی بھی موجود ہے۔

راہ سلوک کے مستفیضین:

جس طرح مولانا نے تعلیم و تربیت کے ذریعے طلبہ علوم دینیہ کی اصلاح فرمائی، اسی طرح راہ سلوک و احسان کے رہروان اصلاح طلب پر خصوصی توجہ سے کام لیا۔ کسی بھی مسترشد میں کسی ایسی خرابی کا اندازہ فرمالیتے جو دنیا و آخرت کے خسران کا باعث بن سکتی تو اس کی اصلاح پر پوری حکمت علمی کے ساتھ التفات فرماتے۔ ایسا بارہا مشاہدہ ہوا کہ عمومی مجلس ہے، اس میں کوئی مولانا کا مسترشد بھی ہے، اور بات کچھ اس انداز سے مولانا کی زبان فیض ترجمان سے نکلنا شروع ہوئی کہ وہ مسترشد تعجب میں پڑ گیا کہ یہ میرے دل کا چھپا ہوا چور تھا، جس کا اظہار میں نے کبھی کسی سے نہیں کیا تھا، آخر مولانا کیسے جان گئے کہ اس کی اصلاح کی باتیں کرنے لگے۔ ممکن ہے کہ کوئی عقیدت منداس کو کشف و کرامت سے تعبیر کرے، اور ہو بھی سکتی ہے مگر سچی بات یہ ہے کہ جب مرشد اور مسترشد دونوں کے اندر اخلاص اور للّٰہیت کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ جو علیم بذات الصدور ہے، مرشد کی زبان پر اصلاح و تربیت کے لئے وہی بات جاری فرمادیتے ہیں، جس کی بروقت ضرورت ہوتی ہے، یا یہ کہئے کہ شیخ کی مومنانہ فراست تاڑ جاتی ہے اور موقع و محل کی مناسبت سے وہ بات شیخ کہہ جاتے ہیں جو مسترشد کے تزکیہ کے لئے مفید اور سودمند ہوتی ہے۔ آخر اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ زبان و قلب پر مضامین و معارف کا ورود اور سب کچھ تو خداوند قدوس ہی کے قبضہ و اختیار میں ہے۔ **سبحان الذی بیدہ ملکوت کل شی**

جس آدمی کے دل میں دین و شریعت کی محبت و عظمت ہوگی، جس کے دل و دماغ پر

اتباع سنت کا جذبہ کارفرما ہوگا، وہ خود بھی اپنا ایک ایک قدم سنت کے مطابق اٹھانے میں پوری سعی وکوشش کرے گا اور اپنے اہل تعلق کو بھی اسی راہ پر گامزن کرنے کی فکر میں غلطاں وپیچاں رہے گا۔ آخر اللہ کے رسول ﷺ کی بہت سی صفات میں تزکیہ نفس خود آپ کی بعثت کا ایک عظیم مقصد قرار دیا گیا ہے، یہ وصف جمیل، مشتاق رسول ﷺ اور خاصان خدا کے اندر کیوں کر جلوہ گر نہیں ہوگا۔

اسی لئے اللہ جل شانہ نے بڑی صراحت اور وضاحت کے ساتھ حکم دیا ہے کہ:

”یا ایھا الذین آمنوا اتقوا الله وکونو مع الصادقین“.

اہل اللہ کی مجالست، صحبت اور ہم نشینی کبریت احمر سے کم نہیں۔

عوارض جسمانی:

حضرت مولانا نوراللہ مرقدہ عرصے سے مختلف جسمانی عوارض سے دوچار رہا کرتے تھے مزاج پرسی اور دعا خواہی کی غرض سے برابر فون پر رابطہ ہوتا ہی رہتا تھا، ایک ڈیڑھ ماہ گزرتے گزرتے حاضر خدمت ہونا اپنا لازمہ بن گیا تھا۔ ایک بار جبکہ مولانا ممبئی میں زیر علاج تھے، مزاج پرسی کے لئے فون کیا تو فرمایا کہ ایک عقیدت مند نے از راہ محبت اعصابی قوت کے لئے کل ایک معجون عنایت فرمایا، رات میں ایک خوراک کھایا اور صبح تک پورے جسم میں بڑے بڑے آبلے پڑ گئے، سوزش اور جلن بہت ہے، طبیعت بڑی اضطرابی کیفیت سے دوچار ہے، خاص طور سے دعا کریں۔ معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ اس معجون میں ”کچلا“ ملا ہوا تھا، میں نے عرض کیا کہ کچلا کو صحیح طریقے پر مدبر نہیں کیا گیا تھا جس کا یہ نتیجہ نکلا، مولانا نے فرمایا کہ میرا بھی یہی خیال ہے۔

ابھی اس بیماری سے کلیۃً شفایابی نہیں ہوئی تھی کہ مولانا شیخوپور آگئے اور میں عیادت کے لئے حاضر ہوا۔ اس بیچ میں جب بھی خیریت معلوم کرنے کے لئے فون کرتا تو فرماتے کہ ٹھیک ہوں، بس خصوصی دعا کریں۔ خیر شیخوپور آنے پر میں حاضر خدمت ہوا، اس وقت مولانا غسل خانے میں تھے، فراغت کے بعد صرف لنگی پہنے ہوئے کمرے میں برآمد ہوئے تو میں دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ پورے جسم پر ٹوٹے ہوئے آبلوں کے غیر مندمل زخم اب بھی موجود ہیں، مولانا نے مسکرا کر جلدی سے بنیان اور کرتا پہن لیا۔ ان شکستہ اور ٹوٹے ہوئے آبلوں کو دیکھ کر میں نے اپنے دکھ کا اظہار کیا تو فرمانے لگے ”مولوی صاحب! یہ سب تو ہوتا ہی رہتا ہے، یہ بھی اللہ کی ایک نعمت ہی

ہے، چاہے شکل زحمت کی ہے، اسی بہانے کم از کم رب کریم ورحیم کی یاد تو آتی رہتی ہے۔‘‘ پھر پوری بشاشت کے ساتھ مختلف موضوعات پر محوِ گفتگو ہوئے، گویا انہیں کوئی آزار ہی نہیں! یہ اور اس قسم کے بہت سے واقعات مولانا کی ذات سے وابستہ ہیں، جن کا احاطہ مقصود نہیں، بس رضا بالقضا کا ایک نمونہ قارئین کی خدمت میں پیش کر دیا ہے۔

اللهم اغفره رحمة تامة واسعة وادخله فی رحمتک الخاص

* * *

حقیقت یہ ہے کہ کٹھن اوقات اور شدید حالات کی یہ بھٹی ایسی ہے کہ اس میں جہاں ایک طرف گناہوں اور معصیتوں کے انبار جل کر راکھ سیاہ ہو جاتے ہیں، وہیں گریہ وزاری، تضرع وفریاد اور نالۂ وفغاں کی وہ دولت بے بہا بھی حاصل ہو جاتی ہے جو اللہ کو بے حد محبوب ہے، اور اس سے مقبولیت کے بے انتہا درجات سے آدمی سرفراز ہو جاتا ہے، لیکن کیا کیجئے کہ یہ عظیم دولت راحت وآرام اور مسرت وخوشی کے ایام میں میسر نہیں آتی، اس لئے بلاؤں کا نزول وہجوم ہوتا ہے، کہ انسان اس سے محروم نہ رہ جائے ایک صحابی سے حضور ﷺ نے خود ارشاد فرمایا جنھوں نے عرض کیا تھا کہ یا رسول اللہ! مجھے آپ سے محبت ہے کہ: میاں! پھر تو مصائب کے لئے تیار ہو جاؤ، کیونکہ جو شخص مجھ سے محبت رکھے گا اس کی جانب مصائب کا سیلاب اس طرح آئے گا جیسے نشیبی زمین میں پانی کی تیز رَو! نیز احادیث وآثار سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مومن مقبول کی دعاؤں کی قبولیت میں اس لئے تاخیر ہوتی ہے کہ اللہ عزوجل کو اس کا رونا اور آنسو بہانا بہت محبوب ہے۔ آنکھ جب اللہ کی محبت اور خوف سے آنسو بہانے سے بخل کرتی ہے تو دوسرے حالات پیدا کر کے آنسوؤں کا بند کھولتے ہیں، پھر انھیں اپنے فضل وکرم سے اشک محبت اور گریۂ خوف کے عوض قبول کر لیتے ہیں۔ اللہ اللہ کیسی مہربانی ہے۔ (حدیث دوستاں)

عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

مولانا ولی اللہ مجید صاحب قاسمی
استاذ: جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڈھ

> ’’یہ تو حقیقت ہے کہ انسان دنیا میں مسافرانہ وارد ہوا ہے، اس کا سفر برابر طے ہو رہا ہے، ہر روز ایک انسانی قافلہ شب و روز کی راہ قطع کرتا ہوا عدم کی منزل میں گم ہو جاتا ہے، تاہم ہر روز ایک نیا قافلہ اس دنیا میں وارد ہو کر جانے والوں کی جگہ پُر کر لیتا ہے، لیکن انھیں جانے والوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا جانا دنیا کو بہت محسوس ہوتا ہے، وہ رحمت و برکت کا سرچشمہ ہوتے ہیں۔ ان کے سائے میں ایک عالم کا عالم راحت پاتا ہے، ان کے وجود سے دلوں میں روشنی محسوس ہوتی ہے، ان کی صحبت میں سکون و اطمینان کی چادر سی تنی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یہ لوگ جب چلے جاتے ہیں تو بے شمار انسان بے سایہ اور بے سہارا لگنے لگتے ہیں، پھر دنیا کے ستائے ہوئے لوگ، مصیبت کے مارے ہوئے لوگ، علم و عمل کے پیاسے لوگ، گزر جانے والوں کا بدل تلاش کرتے ہیں اور نہیں پاتے، تو انھیں دہری مصیبت کا احساس ہونے لگتا ہے۔‘‘ (حدیثِ دردِ دل، ص: ۴۳)

ان سطور کا لکھنے والا خود اس کے ایک ایک لفظ کا مصداق تھا۔ اور آج اسے ’’تھا‘‘ لکھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے، نگاہوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے، دنیا ویران سی لگتی ہے، آہ! وہ صبح کس درجہ درد انگیز اور جاں گداز تھی جب یہ اطلاع ملی کہ حضرت والا اس دنیا میں نہیں رہے اور ہمیں داغ مفارقت دے گئے، اور ہم اس شجر سایہ دار سے محروم ہو گئے، اور طوفان حوادث میں ضوفشاں رہنے والی شمع اور زندگی کی شب تاریک کی قندیل رہبانی ہمیشہ کے لئے بجھ گئی۔

آہ! میں اپنے درد وکرب کا اظہار کروں تو کس سے کروں؟ اپنی مصیبت اور دکھ کو بیان کروں تو کس سے کروں؟ کیا الفاظ مجھ پر بیتے ہوئے کی ترجمانی کر سکتے ہیں؟ کیا آنسوؤں کی جھڑی کچھ بتلا سکتی ہے؟۔

ادا کیونکر کریں چند آنسو دل کا افسانہ
بہت دشوار ہے جتنا سمجھنا اتنا سمجھانا

وہ مصیبت کی دھوپ میں تپنے والوں کے لئے راحت ورافت کی ایک گھنیری چھاؤں تھا وہ علم وعمل کے پیاسوں کے لئے آب حیات تھا، پریشان حالوں کو اس کے یہاں سکون وطمانیت کی دولت ملتی تھی، دردر کے ٹھکرائے ہوؤں کو عزت نفس اور اپنی پہچان ملتی تھی، ذرہ نوازی میں وہ اپنی مثال آپ تھا، وہ بے کسوں کا سہارا اور دردمندوں کا مداوا تھا، وہ محقق تھا، مصنف تھا، مفسر تھا اور عبادت وریاضت میں اپنے وقت کا جنید وشبلی!

محقق، مجتہد، عالم، محدث، حافظ وقاری
بایں اوصاف شہرت سے بری اظہار سے عاری

ان سب کے باوجود اس کا دروازہ ہر ایک کے لئے ہمہ وقت کھلا ہوا، نہ کوئی پہرا، نہ ہٹو بچو کی صدا۔ موبائل کبھی بند نہیں، حضر وسفر میں ہر جگہ آن، اور اپنے شاگردوں اور متعلقین کے فون ہمہ وقت بشاشت کے ساتھ رسیو کرتے، کبھی کوئی ناراضگی نہیں کہ بے وقت کیوں پریشان کیا۔

زخم پر زخم:

میرے مربی اور سرپرست مولانا افضال الحق جوہؔر قاسمی کی وفات کا زخم ابھی تازہ تھا کہ اس پر دوبارہ چوٹ لگی اور دل اس صدمہ جانکاہ کو برداشت نہ کر سکا اور خونِ دل پانی بن کر آنکھوں سے بہنے لگا۔ ابھی کچھ دنوں پہلے کی بات ہے کہ حضرت والا سے ملاقات ہوئی تھی، جوہؔر قاسمی کی بات چل پڑی، کہنے لگے کہ تم مولانا پر کچھ لکھو، تاکہ ان کے نام پر ''سراج الاسلام'' کا نمبر نکل سکے، لیکن کسے معلوم تھا کہ وہ ہستی جس کی پوری زندگی ''کھوئے ہوؤں کی جستجو'' میں گزری، وہ خود اس طرح ہم سے اچانک کھو جائے گی۔ کتنے لوگ جنھیں دنیا والے بھلا چکے تھے اور تاریخ کے اوراق ان کے ذکر سے خالی تھے، حضرت والا نے اپنے اچھوتے انداز اور نرالے اسلوب کے ذریعہ انہیں

نئی زندگی عطا کردی۔ اپنے ایک شاگرد مفتی نسیم احمد دربھنگوی کی وفات پر انہوں نے جو کچھ لکھا اسے پڑھنے کے بعد میرے دل میں حسرت پیدا ہوئی کہ ان کی جگہ میری موت ہوتی اور حضور والا میرے متعلق اس طرح سے کچھ سپرد قرطاس فرماتے۔

مسحور کن شخصیت:

ان حروف کا لکھنے والا ریاض العلوم گورینی جونپور یوپی میں عربی دوم کا طالب علم تھا، ایک روز دیکھا کہ بڑے مولانا کے ساتھ مدرسہ کے صحن میں ایک صاحب ٹہل رہے ہیں، بھاری بھرکم جسم، پررعب چہرہ، سر پر پگڑی جس سے ان کی شخصیت میں ایک عجیب نکھار اور کشش پیدا ہوگئی اور ہر شخص انہیں دیکھنے پر مجبور۔ ساتھیوں میں چرچا ہوا کہ آئندہ سال یہاں استاد کی حیثیت سے تشریف لا رہے ہیں اور اس وقت ہماری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا، اور ہم اپنی خوش قسمتی پر نازاں و فرحاں تھے، جب آئندہ سال اصول الشاشی کا سبق ان سے متعلق ہوا۔ پڑھانے کا انداز، تخاطب کا اسلوب، شخصیت سے زیادہ دلچسپ، ہر دن ان کی شخصیت کے حیران کن پہلو سامنے آتے اور محبت وگرویدگی میں اضافہ ہوتا۔ درس کے اس نرالے اور ذہن و دماغ میں پیوست ہونے والے انداز کا تجربہ پہلی بار ہوا تھا۔ ان کے آنے سے ثقافتی پروگرام کے تن مردہ میں زندگی دوڑنے لگی، طلبہ جوق درجوق تقریر وتحریر میں حصہ لینے لگے اور علم وعمل کی باد بہاری چلنے لگی۔

افراد سازی اور مردم گری:

کہا جاتا ہے کہ اگر ایک سال کا منصوبہ ہو تو کاشت کرو اور دس سالہ پلاننگ ہے تو درخت لگاؤ اور سو سالہ پروگرام ہو تو مردم سازی کرو۔ حضرت والا یہی مشکل ترین کام کیا کرتے تھے، اس لئے کہ ہیرے تراشنا آسان ہے لیکن انسان کی تراش وخراش سب سے مشکل کام ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میرا محبوب مشغلہ تم لوگوں کی تربیت ہے، چلتی پھرتی کتابوں کی تالیف ہے، کاغذ کا سیاہ کرنا مجھے بہت زیادہ پسند نہیں۔ اپنے متعلق وہ خود لکھتے ہیں:

> ”میں طبعاً معلم و مدرس ہوں، مطالعہ کتب میرا شوق ہے، طلبہ کو پڑھانا میرا ذوق ہے، اطاعت و سپردگی میری طبیعت، ذکر الٰہی میری غذا ہے، فکر آخرت میری سوچ ہے طبیعت اسی رنگ میں ڈھلی ہوئی ہے، اس دائرے میں قرطاس وقلم کا کوئی خانہ نہیں ہے۔“ (حدیث درد

دل/۱۳)

نیز فرماتے ہیں:

> ’’عزیزان من! میری امیدوں کا سہارا آج کے نوجوان طلبہ ہی ہیں لیکن جگر کٹ کر ٹکڑے ہوجاتا ہے جب ان کا رخ دین مصطفیٰ سے پھرا ہوا دیکھتا ہوں۔ امید ہے کہ تم لوگ میرے درد کو سمجھوگے۔‘‘ (حدیث دوستاں/۲۴۴)

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں منقول ہے کہ آپ کے پاس آنے والا ہر شخص یہ محسوس کرتا تھا کہ آنحضور ﷺ کو مجھ سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ آنے والے سے مسکرا کر ملتے تھے، مجلس میں ان کے لئے جگہ نکالتے تھے، اور اس کے پسندیدہ نام سے پکارتے تھے۔ حضرت والا مکمل طور پر اس اسوۂ نبوی پر عامل تھے، اور اقبال کے ان اشعار کا مصداق تھے:

اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل — اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دل نواز
نرم دم گفتگو گرم دم جستجو — رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

انداز تربیت:

حضرت والا کی تربیت کا انداز بڑا نرالا تھا، اختلاف وانتشار سے خود دور رہتے اور اپنے متعلقین کو بھی اس سے دور رہنے کی تلقین کرتے۔ لڑائی اور جھگڑے سے سخت نفور تھے، اور کسی بھی طرح ان چکروں میں پڑنا گوارا نہیں کرتے۔ ان کے تعلق سے بعض لوگوں کے طرز عمل پر میں نے تنقید کردی تھی جس میں نوبت بحث وتکرار تک پہونچ گئی تھی۔ حضرت والا کو اس کی اطلاع ملی۔ اس پس منظر میں یہ خط پہونچا، پڑھئے اور دیکھئے:

> ’’بہت عرصہ کے بعد تمہارا خط ملا، خوشی ہوئی، اللہ تعالی مقصود میں کامیابی عطا فرمائے۔ تم نے خواہ مخواہ ...... سے بحث وتکرار کی...... مدرسے کے ارباب انتظام تو اپنی خوش اخلاقی کے باعث خود ہی اپنی قبر کھود رہے ہیں، تم لوگوں کو چاہئے کہ ان سے کف لسان کرو، کچھ فائدہ نہیں۔ بہر حال وہ جانے اور اس کا کام، تم اپنے مدعا کی طلب وجستجو میں سرگرم رہو، مقصود حصول علم ہے جس میں رسوخ ہو، باقی کون کس کا دشمن ہے؟ کس کو کس سے عناد ہے؟ یہ زائد از کار بحثیں ہیں، انہیں چھوڑ دو۔ اگر حق تعالی نے علم وکمال عطا فرمایا ہے تو جو آج آمادہ بدشمنی ہیں وہ کل خوشامد

> کریں گے۔ بس ایک انہماک سا انہماک ہو، ایک دھن سی دھن ہو، کتاب ہو اور تم ہو، علم ہو اور اس کی لگن ہو، ...... میری خوشی اس میں نہیں کہ تم لوگ میری موافقت میں کسی کی مخالفت کرو، میری ساری مسرت اس میں ہے کہ تم لوگ ایسے بن جاؤ کہ اللہ اور رسول خوش ہو جائیں۔ اس کے علاوہ سب ہیچ در ہیچ ہے، اپنی تراش وخراش میں لگے رہو، ہر وقت اپنے اوپر تنقیدی نگاہ رکھو اور جو قابل اصلاح بات محسوس ہو ہمت کر کے اس کی اصلاح کر ڈالو، بن جاؤ اور سنور جاؤ، کل کو بارگاہ خداوندی میں پیشی ہے، وہ قبول کرلیں، ان کی پسند میں آ جاؤ بس پوری زندگی سوارت ہے۔'' (۹؍ذوقعدہ ۱۴۲۰ھ)

دارالعلوم دیوبند میں تعلیم کے دوران ایک طالب علم کی کسی دوکان دار سے لڑائی ہوگئی، اس کے ساتھیوں نے عشاء بعد اس دوکان پر ہلہ بول دیا۔ میرے لئے یہ بہت حیرتناک اور تعجب خیز بات تھی۔ خط کے ذریعے آپ کو اس کی اطلاع دی، اور جواب میں آپ نے لکھا:

> ''طالب علموں کا نہ ختم ہونے والا سیلاب جو دوکان پر ٹوٹ پڑا تھا، اس میں تم تو شامل نہیں تھے۔ دیکھو ایسی جگہ تمہارا وجود نہ پایا جائے تو بہتر ہے، یہ فتنے اندھے بہرے ہوتے ہیں، ان میں حق ناحق کی کوئی شناخت نہیں ہوتی، صرف بے جا عصبیت کام کرتی ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ اپنا دامن ان فتنوں میں آلودہ نہ ہونے دیا جائے۔ تمہارا کام علم حاصل کرنا ہے، اسے حاصل کرو اور ہڑبونگ سے خود کو بچائے رکھو، حتی کہ اس کا تذکرہ بھی زبان وقلم سے نہ کرو، ورنہ یہ فتنے خواہ مخواہ بھی چمٹ جاتے ہیں۔'' (۱۵؍ربیع الاول ۱۴۱۲ھ)

دیوبند کی تعلیم کا آخری سال ہے اور ذہن اس خیال میں الجھا ہوا ہے کہ فراغت کے بعد روزی کا کیا ذریعہ ہوگا؟ اپنی الجھن آپ کی خدمت میں پیش کی اور اطمینان بخش جواب ملا:

کارساز ما بفکر کار ما فکر در کار ما آزار ما

> ''تم نے یہ کیا گرانی مول لی؟ کیا مستقبل تمہارے اختیار میں ہے کہ اس میں غلطاں و پیچاں رہتے ہو؟ عقل کی بات یہ ہے کہ جو چیز ہمارے تصرف میں نہیں ہے، اس کی طرف التفات نہ کیا جائے۔ آج جس وقت میں تم ہو آج سے پہلے یہ مستقبل تھا، حق تعالی اس کو حال بنا کر تمہارے سامنے لایا اور بخیر وعافیت لایا، ایسے ہی آج تم جسے اپنے وہم سے مستقبل سمجھ رہے

ہو، اعتماد رکھو کہ اسے بھی اللہ تعالی بخیریت حال بنا کر تمہارے سامنے لائیں گے۔ یہ خدا کے ساتھ بدگمانی کا شاخسانہ ہے کہ تم اندیشہ کر رہے کہ کل کیا ہوگا؟ عزیزم! دونوں طرف کے کل کی بات چھوڑ دو، جو جا چکا وہ تمہارے ہاتھ سے نکل چکا، اور جو نہیں آیا وہ بھی اختیار سے باہر ہے۔ صرف حال تمہارے حصے میں ہے، اس میں حق تعالی کی بندگی، طاعت ومناجات، اور جدوجہد کرو۔ باقی سب خدا کے حوالے کردو، زندگی پرسکون رہے گی، موت خوشگوار آئے گی۔ سنتے ہو!

ماضی و مستقبل ست پردہ خدا

اس چکر میں پڑو گے تو خدا سے غافل ہو جاؤ گے، اور خدا کو نظر میں رکھو گے تو ماضی و مستقبل نظروں سے اوجھل ہو جائیں گے۔ پھر نہ ماضی کا غم رہے گا اور نہ مستقبل کا اندیشہ۔ وہ جو پڑھا ہے: ”ان الذین قالو ربنا الله“ اس میں اسی حقیقت کو اللہ تعالی نے ظاہر فرمایا ہے، مستقبل کی الجھن میں حال کو برباد نہ کرو، حال جتنا طاقت ور اور صاف ستھرا ہوگا مستقبل اتنا ہی روشن اور بارونق آئے گا۔ سمجھتے ہو!

الجھن اسے ہو جو خدا نہ رکھتا ہو، جو اپنے آپ کا خود ہی سہارا ہو۔ مومن تو اپنا یقین خدا پر رکھتا ہے، اسے اگر کسی الجھن کا سامنا ہوتا ہے تو اسے خدا کے حوالے کر کے اپنے کام میں لگ جاتا ہے۔

میں دل وجان سے تمہارے لئے دعا گو ہوں کہ حق تعالی ان بکھیڑوں سے نجات دے کر اپنی طاعت وبندگی کی حلاوت نصیب کرے اور حیات طیبہ عطا کریں۔“ (۸؍صفر ۱۴۱۲ء)

خردنوازی اور حوصلہ افزائی:

آپ نے یہ طویل خط پڑھا، جس کی ایک ایک سطر اللہ پر کامل اعتماد اور اطمینان کی دلیل ہے، جس کے ایک ایک لفظ سے اخلاص اور محبت کی خوشبو پھوٹ رہی ہے۔ یہ ایک طالب علم کے دو سطری خط کا جواب ہے جس سے حضرت والا کے انداز تربیت، امت کی اصلاح کے لئے غیر معمولی تڑپ اور لگن اور دلسوزی اور ذرہ نوازی کو معلوم کیا جا سکتا ہے۔

وہ اسی طرز پر اپنے شاگردوں اور متعلقین کی تربیت فرماتے اور حوصلہ افزائی کرتے۔ خرد نوازی میں میرے سامنے ان کے علاوہ کوئی اور مثال نہیں ہے۔ دار العلوم دیوبند میں داخلے کے

بعد کا یہ خط ملاحظہ فرمایئے:

’’........کا تمہارا خط ملا، بحمد للہ داخلہ مل گیا، اسے سعادت سمجھو، اور ذرا مستقل مزاجی کے ساتھ تعلیم میں محنت کرو۔ حق تعالی نے تمہیں ذہانت وذکاوت کی دولت بخشی ہے، اس کو ضائع مت کر دینا، بلکہ اچھی طرح سے کام میں لانا، ان شاء اللہ علم نافع حاصل ہوگا۔

ایک خوشی کی خبر یہ ہے کہ میرے حج کی منظوری آچکی ہے، ان شاء اللہ ۲۴ / جون کو بمبئی کے لئے روانگی ہوگی۔ وہیں سے ۳ / جولائی کو پرواز ہے۔ حق تعالی سے دعا کرو کہ عزت وآبرو کے ساتھ دربار میں حاضری کی سعادت میسر ہو جائے۔ وہاں پہونچ کر ان شاء اللہ تمہارے لئے دعا کروں گا۔ عزیزم صباح الدین اور شاہنواز کو سلام ودعا کہو۔‘‘ (۲۹ / شوال ۱۴۰۹ھ)

کسے فرصت ہے کہ وہ طالب علموں کے خط کا جواب لکھتا؟ اور وہ بھی فوراً! میں نے ایسے بہت سے اساتذہ دیکھے ہیں جو اپنی علمی مصروفیت کا بہانہ بنا کر نہ تو خط کا جواب دیتے ہیں اور نہ فون اٹھاتے ہیں لیکن حضرت والا اپنی تمام مصروفیتوں کے باوجود خط کا جواب ضرور دیتے تھے اور وہ بھی فوراً، بلکہ اپنے کسی متعلق کے بارے میں دوسرے ذریعہ سے بھی کوئی بات معلوم ہو جاتی تو پہل کرتے ہوئے اس کو فون کرتے، تسلی دیتے، اور حوصلہ بڑھاتے۔ چنانچہ والد کی وفات کے بعد انہوں نے تعزیتی خط میں لکھا:

’’والد محترم کے انتقال کی خبر سے دل بہت متاثر ہوا، اللہ تعالی انہیں غریق رحمت فرمائیں ان کی نیکی، ان کی شرافت، اور ان کا تقوی تو میں جانتا ہوں، یوں حضرت شاہ صاحب (مولانا وصی اللہ) نور اللہ مرقدہ کی صحبت میں اخلاص کے ساتھ جو رہا، اس کی نورانیت نمایاں رہتی ہے۔ یہ سیدھے سادھے بےنفس وبےریا لوگ جنہیں نہ کبھی جاہ ومنصب کا خیال آیا اور نہ کسی مقام ومرتبہ کا، یہ محض اللہ کے لئے اللہ کی بندگی کرتے ہیں، ان کا کل مطمح نظر رضائے خداوندی کا حصول تھا۔ ان لوگوں نے جس قدر حضرت اقدس کا فیض اٹھایا ہے بہت سے اہل علم بھی اتنا فیض نہ پاسکے۔

مجھے ان سے بہت محبت تھی، وہ بھی جب ملے یہی احساس ہوا کہ ان سے بہت پرانی ملاقات ہے۔ اللہ تعالی ان کی مغفرت فرمائیں۔ اب یہ نیکی وتقوی بیٹوں میں منتقل ہونا

چاہئے۔" (۲۵/ربیع الآخر ۱۴۱۷ھ)

حضرت والا کے جو خطوط میرے پاس محفوظ ہیں ان میں یہ آخری خط ہے، اور اس کے کچھ ہی مہینوں کے بعد میں حیدرآباد سے جامعۃ الفلاح بلریا گنج آ گیا، جو شیخو پور سے چار کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے اور اس طرح سے قربت بڑھ گئی فاصلے سمٹ گئے۔ خط لکھنے کی ضرورت نہیں رہی، ہر ہفتہ سنیچر کو خدمت اقدس میں حاضری کا شرف حاصل کرتا، ان کے دیدار سے بصیرت کو روشنی ملتی، دکھوں اور پریشانیوں کا علاج ملتا، علمی مسائل اور الجھنوں کا حل ملتا اور درس قرآن میں شرکت سے بہت سے خدشات و وساوس دور ہوتے۔

وہ مجھے مضمون لکھنے کے لئے اکساتے، میرے مضامین کو شائع کرتے، کسی پرچے میں کوئی مضمون دیکھتے تو شاباشی دیتے، اور کبھی محبت بھرے انداز میں اس پر نقد بھی فرماتے۔ ماہنامہ "ضیاء الاسلام" میں نفل نمازوں سے متعلق میرا مضمون سلسلہ وار شائع ہو رہا تھا، ایک دن کہنے لگے کہ بمبئی میں لوگ تمہارے مضمون کو تمہارے ہم وطن قاری ولی اللہ صاحب (امام مسجد نور ڈونگری ممبئی) کا مضمون سمجھ رہے ہیں اور ان کے پاس جا جا کر ان کی تعریف کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے اس چھوٹے اور کھوٹے کو قاری صاحب جیسے بزرگ اور قد آور عالم دین سے کیا نسبت؟۔

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل نسیم صبح تیری مہربانی ہے

اور اب ہمارے حصے میں سوزش، پیاس اور بے اطمینانی کے سوا کچھ نہیں، اور شاید آنسوؤں کی بارش ہی ہمیں اس کیفیت سے نکال سکتی ہے:

کوئی نہیں جو یار کی لادے خبر مجھے
اے سیل اشک تو ہی بہا دے ادھر مجھے

دنیا سے بے نیازی:

حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ میری دعا صرف یہ ہوتی ہے کہ "اے اللہ! دنیا سے صرف مجھے اتنا عطا کر کہ میری ضرورت پوری ہو جائے"۔ میں روپیوں کو سینت کر رکھنا نہیں چاہتا۔ اللہ تعالی نے ان کی دعا قبول کر لی تھی، اور روپیوں کی وجہ سے کبھی ان کا کوئی کام نہیں رکا، بوقت ضرورت کہیں نہ کہیں سے ضرور اس کا انتظام ہو جاتا، اور انہوں نے اس کے لئے کبھی اصحاب

ثروت کی ناز برداری نہیں کی اور نہ شہرت کے لئے سیاسی لوگوں کے ساتھ تصویر کھنچانے کا شوق ہوا، مجھے بہت سے ایسے لوگوں سے ملنے اور قریب رہنے کا موقع ملا ہے جن کی بزرگی کے بہت چرچے ہیں لیکن اس کے پاس جا کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ میں اہل علم کے بالمقابل مالداروں کی زیادہ وقعت ہے۔ دولت مندوں سے وہ بہت پرتپاک انداز میں ملتے ہیں اور اہل علم کے ساتھ ان کا رویہ بڑا روکھا سوکھا ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف حضرت والا کے ساتھ بارہا کا تجربہ ہے کہ انہوں نے میری جو عزت افزائی کی اور مجھے جس توجہ اور عنایت کا مستحق سمجھا، میرے ساتھ آنے والے صاحب ثروت کے ساتھ اس طرح سے پیش نہیں آئے۔

خاکی و نوری نہاد بندہ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

بارہا دنیا نے ان کے قدم چومنے کی کوشش کی مگر ان کے قلندرانہ انداز اور مومنانہ کردار میں سرمو فرق نہیں آیا، اور سکوں کی جھنکار کی وجہ سے ان کے پائے استقامت میں کبھی کوئی لرزش نہیں ہوئی، اور زہد اور دنیا سے بے نیازی کی روش کو انہوں نے ہر حال میں باقی رکھا۔

حق پسندی اور حق گوئی:

آئین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی　　اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

ان کی تمام امیدیں اللہ تعالی سے وابستہ تھیں، مخلوق سے بے غرض و بے لوث تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے جسے وہ حق سمجھتے تھے، اس کا برملا اظہار کرتے تھے، اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ کوئی اس سے خوش ہوگا اور تعریف کرے گا، یا ناراض ہوگا اور دشمنی پر آمادہ ہو جائے گا۔ وہ اس صفت میں اپنے استاذ جوہر قاسمی کے پرتو تھے، جوہر قاسمی اپنے متعلق خود لکھتے ہیں:

> ''......اس لئے کہ ہم دارالعلوم سے نکلے تو بے لاگ قلم، بے باک زبان اور بے پناہ جدو جہد کا شوق لے کر نکلے......ہم نے ہر بات سمجھنے کی کوشش کی اور ہر غلط بات کی تردید کی ضرورت پر کمربستہ رہے اور بحمد للہ اپنی کوئی پرواہ نہیں کی۔'' (ترجمان دارالعلوم دہلی، جون تا اگست ۲۰۰۲ء)

اور یہ ایک ایسی صفت ہے جو بہت سے مدارس کے ذمہ داروں کی نگاہ میں ناقابل معافی جرم ہے، اور اس جرم کی پاداش میں یہ دونوں حضرات ان کی آنکھوں میں کانٹا بن کر چبھتے رہے۔

وہ دینی جماعتوں اور اداروں میں جو کمیاں دیکھتے اور کوتاہیاں دیکھتے تقریر اور تحریر کے ذریعے برملا اس کا اظہار کرتے۔ بہت سے لوگ بعض جماعتوں کے تعلق سے نجی محفلوں اور مخصوص لوگوں میں تنقید و تبصرہ کرتے ہیں اور ان کی غلطیوں کو بیان کرتے ہیں، لیکن چونکہ اس جماعت سے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد وابستہ ہے اور ان میں اصحاب ثروت بھی ہیں، اس لئے بہت سے علماء برسرعام اس کی غلط روش پر ٹوکنے اور انگلی اٹھانے کی جرأت نہیں کرتے۔ بالکل ’’اتخشون الناس‘‘ (کیا تم لوگوں سے ڈرتے ہو؟) کا منظر سامنے ہوتا ہے۔ حضرت والا اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتے تھے، جس کی وجہ سے ان کو بہت سے نقصانات سے دوچار ہونا پڑا۔ اعظم گڑھ میں ان کے مقبول عام درس قرآن میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی گئی، لیکن وہ جسے حق سمجھتے تھے اس کے لئے وہ کبھی سمجھوتے، سودے بازی اور مصالحت کے لئے آمادہ نہیں ہوئے۔

علمی وفکری وسعت و گہرائی:

حضرت والا سلف کی اتباع میں متصلب تھے، وہ علماء دیوبند کے طریقہ کو اعتدال پر مبنی سمجھتے تھے اور فقہ حنفی پر عامل تھے، لیکن بعض مسائل میں دلیل کے اختلاف کو جائز سمجھتے تھے اور اسے تقلید کے خلاف نہیں جانتے تھے۔ اور جزئیات کے اختلاف کو اصول کا اختلاف نہیں مانتے تھے۔ چنانچہ وہ دیہات میں جمعہ کے قائل تھے اور اس موضوع پر ان کا ایک مضمون ’’بحث ونظر‘‘ میں شائع ہو چکا ہے، جس سے ان کے نقطہ نظر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

نیز وہ ائمہ حنفیہ اور ان کے بعد کے لوگوں میں فرق کے قائل تھے۔ امام ابوحنیفہ اور صاحبین کی تقلید ضروری خیال کرتے تھے لیکن مرغینانی اور شامی کی تقلید ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ غیر مقلدوں کو فقہ حنفی پر اعتراض کا موقع انہیں بعد کے لوگوں کی وجہ سے ملتا ہے۔ بطور مثال کہا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ بٹالوی صاحب نے شیخ الہند کو مناظرہ کی دعوت دی، شیخ الہند نے فرمایا کہ میں ائمہ حنفیہ کی تقلید کرتا ہوں اس لئے ان کی طرف سے دفاع کی ذمہ داری لیتا ہوں، اگر ان پر کوئی اعتراض ہو تو پیش کرو، میں مناظرہ کے لئے تیار ہوں۔ رہے بعد کے لوگ تو میں نہ ان کی تقلید کرتا ہوں اور نہ ان کے قول وفعل کے دفاع کا ذمہ دار ہوں۔ یہ سن کر بٹالوی صاحب نے مناظرہ سے انکار کر دیا۔

ہدایہ کے شارح علامہ ابن ہمام اس بات کے قائل ہیں کہ سنت و فرض کے درمیان ’’**اللھم انت السلام ومنک السلام تبارکت یا ذاالجلال والاکرام**‘‘ کے بقدر فصل ہونا چاہئے۔ وہ حضرت عائشہ سے منقول اس روایت سے استدلال کرتے ہیں کہ ’’سلام کے بعد اللہ کے رسول ﷺ صرف مذکورہ دعا کے بقدر بیٹھا کرتے تھے‘‘۔ اور بعض صحیح روایتوں میں طویل ترین دعا بھی ثابت ہے، نیز ہر فرض نماز کے بعد ’’سبحان اللہ، الحمدللہ، اللہ اکبر‘‘ سو مرتبہ پڑھنا منقول ہے، نیز ’’آیۃ الکرسی‘‘ اور ’’معوذتین‘‘ پڑھنے کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ اس کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ یہ تمام چیزیں سنت کے بعد پڑھی جائیں گی۔ عام طور سے مسجدوں میں اسی کے مطابق عمل ہے، اور صرف فجر اور عصر کی تسبیحات پڑھی جاتیں ہیں، بلکہ عوام کو تو یہ بھی نہیں معلوم ہے کہ تسبیحات اور مذکورہ دعاؤں کو پنج وقتہ نمازوں میں پڑھنا چاہئے۔

علامہ ابن ہمام کی رائے ظاہر حدیث کے برخلاف ہے، اس لئے بہت سے مشائخ حنفیہ اس کے برعکس رائے رکھتے ہیں، لیکن ان کی رائے شہرت نہ پاسکی اور عوام میں اس کی پذیرائی نہیں ہوئی، اس لئے لوگوں کو یہ اچنبھا لگتا ہے۔ ایک مرتبہ میں نے حضرت والا سے اس کا تذکرہ کیا اور اپنا رُجحان بیان کیا، تو کہنے لگے کہ میں بھی ابن ہمام کی رائے کا قائل نہیں ہوں۔ ایک مرتبہ میں گورینی میں مغرب بعد بیٹھا ہوا تسبیحات پڑھ رہا تھا، ایک قاری صاحب نے مجھے ٹوک دیا کہ اٹھئے سنت میں تاخیر ہو رہی ہے۔ اس وقت تو میں خاموش رہا لیکن بعد میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کر دی جس سے وہ مطمئن ہو گئے۔

حل اشکالات:

زمانۂ طالب علمی سے لے کر حضرت والا کی زندگی کے آخری مرحلے تک میرا یہ معمول رہا کہ جب بھی مجھے کوئی علمی اشکال پیش آتا، ان کی طرف رجوع کرتا اور ادھر سے کافی و شافی اور اطمینان بخش جواب ملتا۔ اس سلسلے کے چند واقعات ملاحظہ ہوں:

(۱) عربی سوم میں پڑھنے کے دوران ایک ساتھی کے ذریعہ ’’نور کی تفسیر‘‘ نامی کتاب دیکھنے کو ملی، جس میں نبی ﷺ کے بشر ہونے کا انکار تھا، اور مثالوں کے ذریعہ ’’نور‘‘ ہونے کو ثابت کیا گیا تھا۔ کتاب کو پڑھ کر بڑی وحشت اور الجھن ہوئی، سیدھے حضرت والا کے پاس پہونچا، اپنے

خدشات ذکر کئے۔ جواب ملا کہ یہ سب مثالیں ہیں، مثال وضاحت کیلئے ہوتی ہے، اس سے کسی چیز کو ثابت نہیں کیا جاسکتا ہے، ثبوت کیلئے دلیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ جاؤ! کتاب دوبارہ پڑھو اور دیکھو کتاب وسنت سے کوئی دلیل ہے۔ حسب ارشاد کتاب دوبارہ پڑھی اور کوئی دلیل نہ مل سکی۔

(۲) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' پر منعقد ایک سیمینار میں شرکت کا موقع ملا۔ ایک صاحب نے کتاب پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ حضرت حسنؓ ان کے خواب میں آئے اور ایک قلم دیا اور فرمایا کہ یہ میرے نانا کا قلم ہے۔ وہ صاحب کہنے لگے کہ نانا تو امی تھے، ان کے پاس قلم کہاں سے آگیا؟ متعدد لوگوں نے اس اعتراض پر واہ واہ کی، اور یٰسین مظہر صدیقی جیسے لوگوں نے بھی خاموشی میں عافیت محسوس کی، اور کسی طرف سے اس کا کوئی جواب نہیں آیا۔ سفر سے واپسی میں حضرت والا سے اس واقعہ کا ذکر کیا، کہنے لگے عجیب بات ہے کتنا گھٹیا اعتراض ہے۔ کیا خواب میں حقیقت دکھائی جاتی ہے؟ اگر حقیقت دکھائی جائے تو پھر تعبیر کا کیا مطلب ہے؟ حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ گیارہ ستارے اور چاند، سورج ان کو سجدہ کررہے ہیں، تو کیا یہی حقیقی چاند سورج مراد ہیں؟ ان کے وقت میں مصر کے بادشاہ نے خواب دیکھا کہ سات دبلی پتلی گائیں، موٹی تازی گایوں کو کھا گئیں۔ کوئی ان کی طرح اعتراض کرنے لگے کہ گائیں کب سے گوشت خور ہوگئیں؟ تو عقل پر ماتم کے سوا اور کیا کیا جائے گا؟۔

(۳) ایک کتاب میں امام اعظمؒ کی کثرت عبادت کا انکار کیا گیا تھا، اور ۴۰/سال تک عشا کے وضو سے فجر پڑھنے کو مستبعد قرار دیا گیا تھا اور کہا گیا تھا کہ وہ ۴۰/سال تک حقوق زوجیت کب ادا کرتے تھے؟ اس سلسلے میں آپ کے پاس خط لکھا، جواب فوراً ملا:

> ''تمہارا خط ملا، کثرت عبادت والا مضمون بالکل پہلے شمارہ میں شائع ہورہا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کی کثرت عبادت کا انکار ہی اس مضمون کا محرک بنا، امام صاحب کے متعلق تفصیلی بات پہلے ہی آچکی ہے، لیکن اس میں شاید حقوق زوجیت کی ادائیگی سے تعرض نہیں کیا گیا، کیونکہ کثرت عبادت اور حقوق زوجیت کی ادائیگی میں کوئی منافات نہیں (اور اس کیلئے رات ضروری نہیں) یہ تو بالکل سامنے کی بات ہے۔ اس میں اشکال نہیں ہونا چاہئے۔''

(۴) بعض صحابۂ کرام، تابعین عظام اور ائمہ دین کے متعلق صحیح ذرائع سے یہ منقول ہے کہ وہ ایک رات میں یا اس سے بھی کم وقت میں قرآن مجید مکمل پڑھ لیا کرتے تھے، اور صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق مذکور ہے کہ انھوں نے ایک رات میں اپنی تمام بیویوں سے صحبت کی، جو سو کے قریب تھیں۔ کچھ لوگ منٹوں اور گھنٹوں کا حساب لگا کر ان واقعات کا انکار کر دیتے ہیں کہ یہ ممکن نہیں، اتنے کم وقت میں یہ ہو ہی نہیں سکتا۔

حضرت والا سے اس کے متعلق عرض کیا تو فرمایا کہ لوگ مادی چیزوں میں برکت کے واقعات سے مانوس ہیں کہ ایک لوٹے پانی سے سو دو سو لوگ وضو کریں تب بھی لوٹا بھرا کا بھرا رہے۔ ایک کٹورے دودھ کو دس لوگ شکم سیر ہو کر پییں اور کٹورا خالی نہ ہو، اس لئے کہ اس طرح کے واقعات بکثرت ہوتے ہیں، اور عام طور پر لوگ انھیں معجزہ یا کرامت کے خانے میں رکھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اور مذکورہ واقعات وقت میں برکت کی مثالیں ہیں، اور اس سلسلہ میں سب سے اہم اور نادر واقعہ معراج کا ہے، اور مشرکین نے انکار وقت کے حساب سے ہی کیا تھا، کہ بیت مقدس کے سفر میں مہینوں لگ جاتے ہیں، ایک رات میں کیسے یہ ممکن ہے؟ اس لئے جو لوگ اس طرح کے واقعات کا انکار کرتے ہیں، وہ وقت کی برکت کی حقیقت سے ناواقف ہیں۔

ایک پراگندہ حال، منتشر خیال اور شکستہ حال کی طرف سے چند صفحات اس لئے سیاہ کر دیئے گئے تا کہ ان کے نام لیواؤں کی جو فہرست مرتب ہو، اس میں میرا نام بھی شامل ہو سکے، اور ان کی برکت سے میرے نامۂ اعمال کی سیاہی ختم ہو جائے ورنہ ''اعجازِ احمدی'' کے تعارف کے لئے۔ ع

سفینہ چاہئے اس بحرِ بےکراں کے لئے

حقیقت یہ ہے کہ مطالعہ ومعلومات کا جو بحر ناپیدا کنار ان کے سینے میں موجزن تھا ان کا بہت کم حصہ سفینے میں منتقل ہو سکا۔ وہ اصلاً شخصیت سازی کا کام کیا کرتے تھے، اور اس وصف کے اندر میرے علم میں کوئی ان کا شریک وسہیم نہ تھا۔ اور وہ ایک عہد اور تاریخ ساز شخصیت کے مالک تھے۔ اللہ تعالیٰ حضرت والا کو جنت الفردوس اور ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ **آمین یا رب العالمین**

❑❑❑

حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب
چند تاثرات

اہلیہ محترمہ جناب الحاج نسیم احمد صاحب/ مدینہ منورہ

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر نبی آخر الزماں محمد ﷺ تک دنیا کو بغیر مرسلین وانبیاء اور آسمانی ہدایت وکتب کے نہیں چھوڑا۔ محمد ﷺ پر نبوت کے خاتمے کے بعد خیر کا ایک ایسا تکوینی نظام قیامت تک کے لئے جاری کر دیا جو ہر شر سے نبرد آزما ہوتا رہے گا۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، تابعین، تبع تابعین، علماء عظام، ائمہ کرام، محدثین وفقہاء، اس امت کو ہدایت پر رکھنے کا ذریعہ بنتے رہے۔ یہ قدرت کا جاری کردہ ایسا تکوینی نظام ہے کہ عقل اس پر قابو نہیں پاسکتی۔ اللہ تعالیٰ ایسے نفوس قدسیہ انسانی تربیت کے لئے امت میں پیدا کر دیتے ہیں جن کی روشنی اور ہدایت میں بھٹکتی ہوئی یا گم کردہ راہ امت کا ایک انبوہِ کثیر جادۂ مستقیم پر دوبارہ رواں ہو جاتا ہے۔ دنیا تیزی سے اپنے انجام کی طرف دوڑ رہی ہے، شر کا غلبہ بڑھ رہا ہے، قحط الرجال کے بارے میں پڑھا کرتے تھے، اب دیکھ رہے ہیں۔ علماء جو علمِ نبوت کے وارث ہیں وہی خیر کے منبع ہیں، اللہ تعالیٰ سے دلی دعا ہے کہ خیر کے ان منبعوں میں برکت دے، قوت دے، اضافہ کرے۔ آمین ثم آمین

علم نبوت کا وارث بننا یا مخلوق کو ہدایت کی طرف راغب کرنا آسان کام نہیں، پتّہ پانی کرنے والا یہ کام اولوالعزم طبیعتیں ہی کر سکتی ہیں، جن کی اپنی ذات اور زندگیاں اول تا آخر سراسر آزمائشوں میں گذرتی ہیں۔ آزمائشوں اور تکالیف کے ذریعے ان قدسی نفوس کی تربیت کی جاتی

ہے۔ یہ مبارک ہستیاں وہ ہیں جن کا انتخاب اوپر آسمانوں میں پہلے ہی ہو چکا ہوتا ہے۔ اللّٰہُ یَجۡتَبِیۡۤ اِلَیۡهِ مَنۡ یَّشَآءُ وَیَهۡدِیۡۤ اِلَیۡهِ مَنۡ یُّنِیۡبُ ۔ (شوریٰ: ۱۳) [اللہ جس کو چاہتا ہے چن کر اپنی طرف کھینچ لیتا ہے، اور جو کوئی اس سے لَو لگاتا اسے اپنے پاس پہونچا دیتا ہے۔] یا وَاجۡتَبَیۡنٰهُمۡ وَهَدَیۡنٰهُمۡ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ۔ (الانعام: ۸۷) [ہم نے ان کو منتخب کر کے راہ راست تک پہونچا دیا۔]

بھائی اعجاز صاحب بھی قدرت کے منتخب کردہ عالم، داعیِ حق اور بزرگ تھے، مجتبیٰ اور مہتدین میں سے ایک۔ خیر کا، بھلائی کا، علم کا ایک ایسا سوتا، ایک ایسا چشمہ جو اپنے وقت پر پھوٹا، جاری ہوا، اور ایک وسیع رقبہ کو بحکم الٰہی سیراب کر گیا۔

بھائی اعجاز صاحب کی زندگی اور ان کی ذات کے بارے میں خود ان کی تحریروں سے ذہن میں جو کردار ابھرتا ہے وہ ایک حقیقی وارثِ علم نبوت کا ہے۔ ان کی زندگی میں آزمائشیں شروع سے ہی رہیں۔ والدہ کی شفقت سے دو ڈھائی سال کی عمر میں محروم ہو گئے تھے، جسمانی عوارض بھی کسی نہ کسی شکل میں لگے رہتے تھے۔ ایک شوق، ایک دُھن، ایک لگن، ایک ولولہ، ایک جنون جس سے ان کی ذات میں امنگ تھی، ولولہ تھا۔ وہ علم کا شوق اور جنون تھا جس نے ہر درد، ہر آزمائش کو آسان کر دیا تھا۔ دیوبند سے ان کے اخراج کا سانحہ معمولی نہیں تھا، یہ ان کی آئندہ زندگی کی تبدیلیٔ رخ کا ایسا آغاز تھا جو خود ان کے فہم و گمان سے بھی بالا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ دیوبند سے فارغ التحصیل ہو کر وہ ایک اعلیٰ درجے کے استاد اور مدرس بن کر کسی بڑی سے بڑی درس گاہ کی رونق ہوتے، لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیّت اس سے بڑے کام کے لئے ان کو منتخب کر چکی تھی، ان کا دل شکستہ اور ٹوٹا ہوا ضرور تھا لیکن اس کی شکستگی نے ان میں خاص قسم کا گداز، شفقت، محبت، فراست، قربِ الٰہی اور معرفت خداوندی کی دولت بے بہا عطا کر دی تھی۔ وہ دل شکستہ ضرور تھے، راندۂ درس گاہ ضرور تھے، لیکن اس گھاؤ نے انھیں جادۂ حق سے، اللہ کے در سے اور رسول کی سنت سے قرب عطا کیا۔ دنیا کی بے ثباتی، اس کا فریب اور بے کیفی ان پر منکشف ہوئی۔ غم و اضمحلال سے ہدایت کی روشنی پھوٹی، نت نئے تجربے ہوئے، نئی راہیں کھلیں، آئندہ زندگی گزارنے کا راستہ اور متعین ہوتا چلا گیا، لیکن دارالعلوم دیوبند اور علماء دیوبند کی جو محبت اور عقیدت ان کے رگ و پے میں بسی ہوئی

تھی اس میں ذرّہ برابر فرق نہ آیا۔ اسی محبت اور عقیدت نے بھائی سے اِن بزرگوں اور ادارے کے بارے میں ایسی تحریریں رقم کرائیں کہ خود اہل دار العلوم دیوبند کو شاید کچھ چیزوں کا علم بھائی کی تحریروں سے ہوا ہو۔ دار العلوم دیوبند کی محبت، اہمیت ان کے قلب میں تھی، اسی لئے معتوب ہونے کے باوجود طلباء کو تیار کر کر کے وہاں بھیجتے رہے۔

مزاج میں نرمی تھی، سادگی تھی، معمولی سی محبت کی بھی بے حد قدر کرتے تھے، اور اس محبت کا احساس کرتے تھے اور جواب میں اس سے بڑھ کر محبت اور شفقت کا معاملہ فرماتے تھے۔ دل آئینے کے مانند شفاف تھا، ہر بغض اور کینے سے پاک۔

امتِ مسلمہ جادۂ مستقیم سے جس طرح ہٹتی جارہی ہے وہ اسی ہدایت کے راستے کے مسافر اور جویا تھے۔ انھیں مسلمانوں کے ماضی سے بہت لگاؤ تھا، علماء کرام اور اولیاء اللہ ان کی اوّلین محبت اور رہبر تھے۔ ان کا ذکر کرنے میں، سننے میں اور ان کے حالات کی جستجو میں وہ انتھک محنت اور کوشش کرتے تھے۔ اس کا اظہار یوں تو ان کی ہر تحریر سے ہوتا ہے، لیکن اس موضوع پر ’’تصوف ایک تعارف‘‘ خاص الخاص کتاب ہے، یا ’’کھوئے ہوؤں کی جستجو‘‘۔ الہ دین کے قصے میں کبھی پڑھا تھا کہ کس طرح اس کے جادوئی پرانے چراغ کو ایک جادوگر نیا چراغ دے کر حاصل کر لیتا ہے، بعینہٖ بھائی اعجاز جو اوتوا العلم (جنھیں علم دیا گیا) اور خود ایک چراغ تھے، انھوں نے پرانے چراغوں کا کھوج لگایا، ڈھونڈا، نکالا، صاف کیا اور سب کے سامنے پیش کیا، کہ ہدایت کا راستہ انھیں چراغوں کی روشنی میں طے ہوسکتا ہے اور ہوگا۔

بھائی کی زندگی پر نظر ڈالئے اور احسن القصص کے پیغمبر حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی دیکھئے، کافی مماثلت ملے گی۔ جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی ہر جگہ، ہر حال میں اللہ ہی کے ذکر، اسی کی فکر، اسی کی تبلیغ سے منور اور معمور رہی، اور ہر آزمائش ان کے رتبے کو بڑھاتی رہی، صدق و احسان، صبر و تقویٰ بڑھتا گیا، ٹھیک اسی طرح بھائی کا معاملہ رہا۔ اور جس طرح آخر میں برادرانِ یوسف بول اٹھے تھے کہ ’’لَقَدْ اٰثَرَکَ اللّٰہُ عَلَیْنَا‘‘ اسی طرح اس وقت کے تمام طلباء میں بھائی کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ ’’لَقَدْ اٰثَرَہُ اللّٰہُ عَلَیْھِم‘‘ کا رتبۂ بلند ان کو ملا۔ راندۂ درس گاہ محبوبِ خلائق بن گئے، یہ اعزاز، یہ رتبہ اسی کے سر سجتا ہے جو ’’من یتق ویصبر‘‘ کا

مصداق ہو، جو محسن و صادق ہو، جو اپنی ذات اللہ کے آگے مٹا چکا ہو، جس کا مرنا جینا سب اسی ذات وحدہ لاشریک کے لئے ہو۔ (اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ) جو ’’ اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہِ ‘‘ کا مصداق ہو۔

بھائی نے ۱۰؍سال کی عمر میں آنحضرت ﷺ کی خواب میں زیارت کی اور دیکھا کہ آنحضرت ﷺ کاغذ پر کچھ لکھ رہے ہیں۔ یہ خواب یوں شرمندۂ تعبیر ہوا کہ بھائی نے جب کاغذ قلم تھاما اور اس سے جو دردِ دل اور خونِ جگر ٹپکا تو پتہ نہیں وہ خون کتنے لوگوں کی زندگی کا سبب بنا! ان کے دردِ دل نے کتنوں کے دلوں کو سکون بخشا۔ اسے مبالغہ نہ سمجھیں، ذرا اس سے پوچھئے جو تقریباً ۳۵؍سال سے مختلف جان لیوا یا ایمان لیوا امراض میں مبتلا ہو، جس کا ہر لمحہ سسک سسک کر گذرا ہو، جو معالجین کی خاصی تعداد آزما چکا ہو اور اسے اللہ کے حکم سے بھائی کے دَر سے شفاء یک بیک نصیب ہو جائے۔

جس نے بھی کلام اقبال پڑھا ہو، اسے اندازہ ہوگا کہ اقبال کی شاعری کا محور وہ مردِ مومن ہے جس کی خودی بلند ہو، جو بحیثیت مسلمان ہونے کے اپنے منصب سے واقف ہو، وہ مردِ مومن جو اسلام کو مطلوب ہے اور جسے وہ ’’ شاہین ‘‘ کا لقب دیتے ہیں۔ بھائی کی بہت ساری خوبیاں وہی ہیں جو اقبال ایک مردِ مومن کے اندر دیکھنا چاہتے تھے۔ ’’ نگاہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُرسوز ‘‘ یا پھر

نہ پوچھا ان خرقہ پوشوں کو ارادت ہو تو دیکھ ان کو ید بیضاء لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

بھائی کی شخصیت اور ان کے کردار کی غماز ان کی تحریریں ہیں۔ ان کی تحریر پر ’’ مسجد قرطبہ ‘‘ کے اقبال کے یہ اشعار صادق آتے ہیں۔ ؎

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز اس کے دلوں کی تپش اس کی شبوں کا گداز
اس کا مقام بلند، اس کا خیال عظیم اس کا سرور، اس کا شوق، اس کا نیاز، اس کا ناز
ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ غالب و کار آفریں، کار کُشا، کارساز
نوری نہاد، بندۂ مولا صفات ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دلنواز

نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز
نقطۂ پرکار حق مرد خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز
نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

نبیٔ کریم ﷺ کے وصال سے لے کر آج تک جتنے بزرگ، اولیاء، علماء عالمِ فانی سے عالم بقا کی طرف لوٹے، یہ وقت، جدائی کا یہ مرحلہ بڑا صبر آزما رہا ہے، ہمیشہ سے صحابۂ کرام سے لے کر آج تک ہر عالم، ہر بزرگ، ہر ولی سے اس کے حلقے میں کچھ شدید محبت کرنے والے ہوتے ہیں، کچھ درمیانی اور کچھ معمولی۔ شدید محبت کرنے والے کی محبت کو عشق کہا جاتا ہے۔ ”وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ“ بھائی اعجاز صاحب کے تلامذہ، ابناء، رفقاء، دوست احباب میں سے کتنے ہوں گے جو ان سے شدید محبت کرتے ہوں گے، ان سب کی نذر اقبال کے یہ اشعار ہیں، ان اشعار سے شاید کچھ اشک شوئی ہو سکے۔

ہے ابد کے نسخۂ دیرینہ کی تمہید عشق
عقل انسانی ہے فانی زندۂ جاوید عشق
عشق کے خورشید سے شامِ اجل شرمندہ ہے
عشق سوزِ زندگی ہے تاابد پائندہ ہے
رخصت محبوب کا مقصد فنا ہوتا اگر
جوشِ الفت بھی دلِ عاشق سے کر جاتا سفر
عشق کچھ محبوب کے مرجانے سے مرجاتا نہیں
روح میں غم بن کے رہتا ہے مگر جاتا نہیں
پستیٔ عالم میں ملنے کو جدا ہوتے ہیں ہم
عارضی فرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم
مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں
عقل جس دم دہر کی آفات میں محصور ہو
یا جوانی کی اندھیری رات میں محصور ہو
دامنِ دل بن گیا ہو رزم گاہِ خیر و شر
راہ کی ظلمت سے ہو مشکل سوئے منزل سفر
خضر ہمت ہو گیا ہو آرزو سے گوشہ گیر
فکر جب عاجز ہو اور خاموش آوازِ ضمیر
وادیٔ ہستی میں کوئی ہم سفر تک بھی نہ ہو
جادہ دکھلانے کو جگنو کا شرر تک بھی نہ ہو
مرنے والوں کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں

(بانگِ درا، فلسفۂ غم)

آخری مصرعے کے تارے سے ذہن میں سورہ الطارق آ رہی ہے۔ وَالسَّمَآءِ

وَالطَّارِقِ وَمَا اَدْرَاکَ مَا الطَّارِقِ النَّجْمُ الثَّاقِبُ آسمان اور رات کے وقت آنے والی کی قسم اور تم کو کیا معلوم کہ رات کو وقت آنے والا کیا ہے؟ وہ تارا ہے چمکنے والا۔

بھائی نے ''حکایتِ ہستی'' میں تحریر کیا ہے کہ وہ اس شب میں پیدا ہوئے جو اوّل سے آخر تاریک ہوتی ہے، چاند اس رات نکلتا ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بھائی کو نجم ثاقب بنا کر بھیجا تھا۔ چاند اگر مواقیت کے لئے ہوتا ہے تو ستاروں کے لئے ارشاد ہے ''**وبالنجم هم يهتدون**'' اور ستاروں سے وہ راستہ پاتے ہیں (سبحان اللہ) بھائی بھی اندھیری رات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتارے ہوئے ستارہ تھے، جس نے نہ صرف آسمان کو حسن بخشا بلکہ کتنے لوگوں نے اس تارے سے ہدایت حاصل کی۔ اس تارے سے اس کے چھپنے سے محض دو برس قبل میرا رابطہ ہوا، یہ رابطہ تین چار خطوط، چند ٹیلی فون کالز یا پھر ان کی کتابوں کے مطالعے تک رہا، نہ کبھی ملاقات ہوئی نہ دیکھا۔

یہ چند فی البدیہہ تاثرات تھے، جو قلم سے ٹپک پڑے، اس خاص نمبر میں آپ بھائی کے بارے میں وہ تفصیلات پڑھئے جن کی طرف میں نے اس مختصر تحریر میں اشارے کئے ہیں۔

بھائی اعجاز　　**فقد فاز**　　**انشاء اللہ تعالیٰ**

* * *

بے شک اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: **إن الله لايضيع أجر المحسنين** ۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ حق تعالیٰ دنیا میں بھی اجر دیتے ہیں، کیا روزی کا ملنا، اہل محبت کا میسر آنا، نماز روزہ کی توفیق ہوتے رہنا، ان کا نام زبان سے لیتے رہنا، یہ کچھ کم انعامات ہیں۔ اور یہ بھی تو ہے کہ اگر بھلائیوں کا کچھ اجر مل جاتا ہے تو برائیوں کی بھی کچھ کچھ سزا مل جاتی ہے، اسی سے توازن برقرار رہتا ہے، اگر کچھ تکلیف ہوتی ہے تو یہ اثر ہے ان گناہوں کا جن میں کچھ کو تو ہمارا حافظہ یاد رکھتا ہے، اور بہت کچھ اس زود فراموش کو فراموش ہو جاتا ہے۔

(حدیث دوستاں)

حضرت الاستاذ مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی علیہ الرحمہ
میں نے انھیں کیسا پایا؟

مولانا ضیاء الحق صاحب خیر آبادی
مدرسہ تحفیظ القرآن، مبارکپور

آج حضرت الاستاذ مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی علیہ الرحمہ کے سانحۂ وفات کے ایک عرصہ بعد بھی جب ان پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں تو آنکھوں پر اشکوں کا پردہ پڑا جا رہا ہے۔ استاذ مرحوم کی خوبیوں اور کمالات پر جب نظر جاتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس عہد اور زمانے کے آدمی نہیں تھے، بلکہ قرون اولیٰ کی کوئی شخصیت اس دور میں جلوہ گر ہوگئی ہو۔ خدا کی ذات پہ بے پناہ توکل واعتماد، سنت رسول سے والہانہ شیفتگی ووابستگی، دین وملت کے تئیں حد درجہ وفاداری وجاں سپاری، اپنے متعلقین کے لئے سراپا ہمدردی وغمخواری، سنت وشریعت کا پیغام عام کرنے کا بے پناہ جذبہ، اس کے لئے اپنی تمامتر امکانی صلاحیتوں کو صرف کر دینا۔ یہ ان کی زندگی کے وہ جلی عنوانات ہیں جن سے ان کا پورا عرصۂ حیات روشن وتابناک ہے، میں اس مضمون میں کوشش کروں گا کہ جن خوبیوں اور کمالات کا میں نے مشاہدہ کیا ہے اسے قارئین کے سامنے لاؤں۔ **واللہ الموفق وھو المعین**

ربط پروانے کا شمع روشن سے:

حضرت الاستاذ سے میری واقفیت کب سے ہے؟ خود مجھے اس کا پتہ نہیں ہے، اس لئے کہ جب سے شعور کی آنکھیں کھلی ہیں ناواقفیت کا کہیں پتہ نہیں چلتا، والد مرحوم الحاج عبدالرحمٰن

صاحب **تغمدالله بغفرانه واسکنه فی فسیح جناته** کے حضرت مولانا سے بڑے مخلصانہ تعلقات تھے، حضرت مولانا کی تصریح کے مطابق والد صاحب سے تعلقات کی ابتداء ۱۹۷۸ء میں ہوئی، اس وقت میری عمر تین سال تھی، اس لئے ابتداء شعور ہی سے مولانا کو دیکھ رہا ہوں، والد صاحب کو آپ سے جو محبت اور تعلق خاطر تھا اس کا فطری اثر ہم لوگوں پر بھی پڑا کہ وہی عظمت و محبت ہمارے اندر بھی منتقل ہوئی۔ بچپن کی لاشعوری کے دور میں اس کا احساس وادراک کہاں کہ مولانا کن خوبیوں اور کمالات کے حامل ہیں، ہم لوگ صرف یہ جانتے تھے کہ بہت بڑے عالم اور خطیب ہیں۔ جب کسی عالم کا ذکر ہوتا تو پہلے مولانا ہی کا تصور ذہن میں آتا۔ اللہ نے علم وعمل کے ساتھ ایسی صورت اور وجاہت بھی عطا فرمائی تھی اسے دیکھ کر ہر کوئی متاثر ہوتا تھا، جب کبھی مولانا تشریف لاتے تو ہم لوگ دوڑتے ہوئے گھر میں جاتے اور والد صاحب کو مطلع کرتے کہ ''مولانا'' آئے ہیں، اس وقت والد صاحب کی خوشی دیدنی ہوتی تھی۔ ہمارے گھر اب تک مطلق ''مولانا'' سے آپ ہی کی ذات مراد ہوتی ہے۔ اس وقت آپ مدرسہ دینیہ غازی پور میں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے، اور ماہ دو ماہ پر اپنے وطن بھیرہ تشریف لاتے تو ہمارے یہاں بھی آتے، والد صاحب بھی گاہے بگاہے غازی پور ملاقات کے لئے حاضر ہوتے۔ جب مولانا کی آمد ہوتی تو گھر کے دوسرے افراد اور گاؤں کے اہل علم جمع ہوجاتے اور مختلف دینی وعلمی موضوعات پر گفتگو ہوتی۔ مجھے ابتدا ہی سے مولانا سے بڑی عقیدت اور محبت تھی اس لئے میں بڑے شوق سے آپ کی مجلس میں بیٹھتا اور غور سے آپ کی باتیں سنتا، کچھ باتیں سمجھ میں آتیں، اور بیشتر میری فہم سے بالاتر ہوتیں۔ اس وقت کی ایک بات اب تک یاد ہے، مجھے غصہ بہت آتا تھا، والد صاحب مجھے سمجھاتے رہتے تھے، ایک مرتبہ مولانا تشریف لائے تو والد صاحب نے میرے غصہ کا ذکر آپ سے بھی کر دیا، آپ نے بڑی شفقت کے ساتھ مجھ سے اس موضوع پر بات کی، اور فرمایا کہ جانتے ہو غصہ کس کی وجہ سے آتا ہے؟ میں خاموش رہا تو بتایا کہ غصہ شیطان کی وجہ سے آتا ہے، اور سب سے زیادہ ناپسندیدہ شیطان ہی ہے، اس لئے اس سے حد درجہ بچنا چاہئے۔

کاروانِ حیات رفتہ رفتہ آگے بڑھتا رہا، میں مدرسہ میں داخل ہوا، پڑھنے لکھنے کی کچھ شد بد ہوئی، مجھے مطالعہ کا بہت شوق تھا، اپنی استعداد کے مطابق ہر قسم کی کتابیں پڑھتا، مطالعہ کا یہ

ذوق دن بدن پروان چڑھتا رہا، مولانا اس کے متعلق سوال کرتے، رہنمائی فرماتے اور حوصلہ افزائی کرتے۔ پرائمری درجات سے نکل کر جب درجۂ حفظ میں داخل ہوا، اس وقت آپ نے ایک نصیحت کی، جسے حفظ کے ہر طالب علم کو یاد رکھنا چاہئے۔ فرمایا کہ دیکھو یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اس کی عظمت اور تقدس ہمیشہ پیش نظر رہے اور جب پڑھنے بیٹھو تو اس سے پہلے نبی اکرم ﷺ پر درود بھیجو اور ان کے واسطہ سے سہولت اور آسانی کی دعا کرو، اس سے برکت بھی ہوگی اور ان شاء اللہ سہولت بھی ہوگی۔ حسب توفیق اس پر عمل کیا، اور ڈیڑھ سال کی مدت میں حفظ قرآن کی تکمیل بفضلہٖ تعالیٰ ہوگئی۔ اپنی دیرینہ شفقت کی بنا پر مولانا نے پہلی محراب خود سنی، اور دعائیں دیں، اس کے بعد تین چار سال تک مسلسل آپ کو تراویح میں قرآن سنایا۔ مولانا کے یہاں تعلیم کے ساتھ تربیت کا اہتمام بہت تھا، وہ صرف قرآن سننے پر اکتفا نہ کرتے تھے، بلکہ اس کا بہت اہتمام کرتے تھے کہ تراویح بالکل سنت کے مطابق ہو، ورنہ حفاظ کا حال عموماً یہ ہوتا ہے کہ وہ تکبیر تحریمہ کے بعد نہ ثنا پڑھتے ہیں نہ اعوذ باللہ بسم اللہ سیدھے سورہ فاتحہ شروع کر دیتے ہیں، اور ایک ہی سانس میں پوری سورہ فاتحہ پڑھ دیتے ہیں، جیسے ٹرین چھوٹ رہی ہو، پہلے ہی دن اس پر تنبیہ کردی کہ بالکل اطمینان سے قرآن پڑھو اور نماز کے تمام ارکان پورے اطمینان اور سکون سے ادا کرو۔ ایک روز میں نے بھی ایک ہی سانس میں پوری سورہ فاتحہ پڑھ دی تو سلام پھیرتے ہی تنبیہ کی۔ ایک روز فرمایا کہ آیت لا پر رکوع نہ کیا کرو، یعنی جس آیت پر گول دائرے کے اوپر لا لکھا ہو، وہاں اکثر بات پوری نہیں ہوتی ہے، نماز تو ہوجائے گی لیکن یہ بہتر نہیں ہے۔ اس تربیت کا اثر یہ ہوا کہ اب تک اطمینان وسکون کی وہی کیفیت تراویح میں باقی رہتی ہے، اللہ ان کے درجات کو یوماً فیوماً بڑھائے ایک ایک رخ پر ان کی نگاہ رہتی تھی۔

حفظ قرآن کے بعد جب فارسی پڑھنے کا وقت آیا تو اس وقت آپ نے کچھ نصیحتیں کیں، اور خاص طور سے یہ بات فرمائی کہ جس قدر تم اپنے حفظ کے استاذ محترم جناب قاری وسیم احمد صاحب کا ادب کرتے ہو، اتنا ہی تمام اساتذہ کا ادب کروگے تب جاکر علم آئے گا، ورنہ بے ادبی یا قلت ادب کی نحوست یہ ہوتی ہے کہ یا تو علم سے محرومی ہوجاتی ہے یا علم تو حاصل ہوجاتا ہے لیکن اس کا فیض کسی کو نہیں پہونچتا۔.....اور یہ واقعہ ہے کہ ہم لوگ قاری صاحب کا جو ادب کرتے تھے

اس کو بیان نہیں کیا جاسکتا.....بہر حال اس طریقے سے مولانا میری ذہنی تربیت فرماتے رہے۔ فارسی پڑھنے کے سال (۱۹۹۳ء) میں نے بہار وجھارکھنڈ کا ایک سفر اپنے چند دوستوں کے ساتھ کیا اس سفر کا مقصد مشہور شاعر وادیب ڈاکٹر کلیم عاجز صاحب سے ملاقات کرنا تھا، اس کی روداد لکھ کر مولانا کی خدمت میں پیش کی۔ مولانا نے اسے ملاحظہ فرما کر جگہ جگہ اس میں اصلاح کی اور کافی حوصلہ افزائی فرمائی۔ اسی سال سالانہ امتحان کے بعد میری درخواست پر کلکتہ کے سفر میں مجھے دیوان حافظ کا کچھ حصہ پڑھایا، یہ مولانا سے باقاعدہ شاگردی کی ابتدا تھی۔ ان اسباق کی کاپی اب تک موجود ہے۔ مولانا جو ترجمہ کراتے اور تشریح کرتے اس کو بعد میں میں لکھ لیا کرتا تھا، سبق بیحد دلچسپ ہوتا، مولانا دوران تشریح لطائف واشعار اور برمحل واقعات اور مثالوں کے ذریعہ اسے دل میں اتار دیتے۔ اس سے پہلے مولانا کی تقریروں اور خطبات کے سننے کا بارہا اتفاق ہوا تھا، اور اندازہ تھا کہ مولانا واقعات وامثال کے بادشاہ ہیں، لیکن درس میں اس سے کہیں عمدہ اور دلنشیں انداز واسلوب تھا۔ عربی اول کا سال اپنے وطن کے مدرسہ منبع العلوم میں گزرا۔ اس کے بعد عربی دوم کے سال بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر میری طبیعت خیرآباد سے بالکل اچاٹ ہوگئی اور یہ فیصلہ کرلیا کہ اب وطن سے نکل کر تعلیم حاصل کرنی ہے، رحلت اور سفر کے بغیر علم میں رسوخ اور پختگی ممکن نہیں۔ اب نگاہ مولانا کے علاوہ کسی اور پر ٹھہرتی ہی نہ تھی، میں نے ایک تفصیلی خط لکھ کر اس سلسلہ میں مشورہ چاہا، مولانا نے جواب دیا کہ تم میرے یہاں چلے آؤ، میں تمہیں مدرسہ کے نظام سے علیٰحدہ ذاتی طور پڑھاؤں گا، چنانچہ میں شیخوپور آ گیا۔

یہاں آنے کے بعد پہلی کتاب حضرت مولانا سے جو پڑھی، وہ فن صرف کی مشہور کتاب علم الصیغہ تھی، اسی کے ساتھ ساتھ ادب میں القرأۃ الرشیدہ بھی پڑھتا تھا، صرف میں قواعد یاد کرانے کے بعد اطمینان بخش حد تک مولانا اس کا اجرا کراتے تھے، اور وقتاً فوقتاً تعلیلات وغیرہ پوچھتے رہتے تھے۔ القرأۃ الرشیدہ میں انشاء عربی کی بھی مشق کراتے تھے۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ سبق کو ذہن نشین کر کے اپنے انداز واسلوب میں عربی لکھو، پھر کتاب سے ملا کر دیکھو کتنا صحیح اور کتنا غلط ہے، تجربہ سے معلوم ہوا کہ محنتی اور شوقین طلبہ کے لئے عربی انشاء وتمرین کے سلسلے میں یہ طرز بہت مفید ہے۔ اسی دوران عبدالرحمٰن پاشا کی مشہور زمانہ کتاب ’’**صور من حياة الصحابه** ‘‘

کے بھی کچھ حصے پڑھے، کامل کیلانی کا عربی ادب کا سیٹ بھی اسی وقت پڑھا۔ درس زمانۂ قدیم کے طرز پر جاری رہتا، جماعت اور گھنٹیوں سے بے نیاز! میں مطالعہ کر کے حسب استعداد سبق کو حل کر کے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتا، عبارت پڑھتا، ترجمہ کرتا، مولانا مطلب کی تقریر کرتے، نہایت اختصار کے ساتھ۔ اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تو مزید وضاحت کے ساتھ سمجھاتے۔ انسان عملی نمونوں سے جتنا متاثر ہوتا ہے اور کسب فیض کرتا ہے محض کتابوں سے اس کا عشر عشیر بھی نہیں حاصل کر سکتا ہے، مجھ پر اللہ تعالیٰ کا بے حد فضل واحسان تھا کہ اس نے مولانا جیسے صاحب ذوق عالم باعمل کی خدمت میں نہ صرف پہونچا دیا بلکہ ان کی شفقت وتوجہ بھی حاصل کرادی۔ میں اگر پوری زندگی اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کروں تب بھی اس کا حق ادا نہ ہوگا۔

درس وتدریس:

حضرت مولانا کی شخصیت تو جامع الجہات تھی، وہ بیک وقت بہترین معلم ومربی، سحر نگار انشاپرداز وادیب، بے مثال مقرر وخطیب اور بحر معرفت کے شناور تھے، لیکن جو چیز ان کی شناخت اور پہچان تھی وہ درس وتدریس ہی تھی، اسی نے ان کو شہرت دوام عطا کی۔

تدریس کی ابتداء تو طالب علمی کے زمانے سے ہوگئی تھی جب عربی چہارم میں تھے، جیسا کہ حکایت ہستی میں لکھتے ہیں:

> ’’مجھے پڑھنے کے ساتھ پڑھانے کا بھی ذوق تھا، پچھلے سال بعض طلبہ کو بے ضابطہ طور پر کچھ کتابیں پڑھایا کرتا تھا مگر اس میں باقاعدگی نہ تھی، عربی چہارم کے ایک طالب علم نے ندوے کی منثورات کے کچھ اسباق پڑھے تھے، بعض طلبہ نے ہدایۃ النحو کے کچھ اسباق پڑھے، بعض چھوٹے طلبہ نے ابتدائی فارسی وعربی کی کتابیں پڑھیں اس سال تعلیم شروع ہونے کے بعد مجھ سے بڑی عمر کے ایک طالب علم میرے پاس آئے اور کہا کہ مولانا زین العابدین صاحب نے فرمایا ہے کہ مقامات حریری اور ترجمہ کلام پاک آپ سے میں پڑھ لیا کروں۔‘‘

> ’’پڑھنے کے ساتھ پڑھانے کا ذوق، درس کے ساتھ تدریس کا شوق مجھے شروع ہی سے تھا، مکتب میں جب پڑھتا تھا تو خودرَو پودوں پر مشق تدریس کیا کرتا تھا، عربی مدرسہ میں داخل ہوا تو جلد ہی اپنے سے چھوٹے طلبہ کو پڑھانا شروع کر دیا تھا، یہ سلسلہ طالب علمی کے آخر تک چلتا رہا،

فراغت کے بعد گاؤں میں حفاظ قرآن کو ترجمۂ قرآن پاک پڑھانے کی طرح ڈالی، چھٹی کے دنوں میں عربی کے طلبہ کو پڑھاتا رہا، پھر میسور جانے سے پہلے امروہہ میں دو ماہ تک عربی کی کتابیں زیر درس رہیں، میسور میں عربی کے ایک پروفیسر صاحب کو پڑھانے کا مشغلہ رہا، مگر تدریس کی مشغولیت اصطلاح کے مطابق باقاعدگی کے ساتھ نہ تھی، جیسا موقع ہوا پڑھانے کا کام ہوتا رہا۔''

تدریس کے سلسلے میں خود مولانا مرحوم کا نظریہ کیا تھا؟

'' طالب علمی کے زمانے میں کتابیں میں نے سمجھ کر پڑھی تھیں، اور ہر کتاب کا ایک مدرس کی طرح تکرار بھی کرایا تھا، اس لئے تدریس میں اور اس کے لئے مطالعہ میں مجھے بہت زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔ زیر درس ہر ایک کتاب کا سرسری مطالعہ کافی ہوتا۔ تفہیم مطالب کے لئے آسان سے آسان طرز اختیار کرتا، طلبہ بآسانی سمجھ لیتے، اس طرح پڑھاتا کہ انھیں تحصیل کا شوق پیدا ہو جاتا، گھنٹے میں جو وقت درس و تفہیم کے بعد بچ جاتا اس میں پچھلے علماء و بزرگوں کا تذکرہ کرتا، ان کی محنتوں کی داستانیں سناتا، ترغیب و تشویق کے مضامین بیان کرتا، اس سے طلبہ کو بہت دلچسپی ہوتی، تذکروں اور سوانح کا مطالعہ چونکہ وسیع تھا، بالخصوص علماء دیوبند کے حالات و واقعات سے بکثرت واقفیت تھی، ان کے تذکرے زیادہ تر ہوتے۔''

میں نے ہدایۃ النحو سے لے کر جلالین شریف تک دو کتابوں کے علاوہ تمام کتابیں حضرت مولانا سے پڑھی ہیں، واقعی اس قدر تفہیم پر قدرت تھی کہ کبھی کوئی مسئلہ مشکل معلوم نہیں ہوا، اور جب سبق سے اٹھتے تو اپنے اندر علم و عمل کا ایک نیا ولولہ اور عزم لے کر اٹھتے۔ کسی شاگرد کے حق میں اس کے استاذ سے بڑھ کر کسی اور کی شہادت معتبر نہیں ہو سکتی، مفتی مجد القدوس صاحب اپنے تعزیتی مکتوب میں لکھتے ہیں:

''میں نے ان کے استاذ محترم حضرت مولانا زین العابدین معروفیؒ سے ایک مرتبہ دریافت کیا تھا کہ مولوی اعجاز احمد بھی آپ کے شاگرد ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا ہاں مولوی اعجاز نے مجھ سے فلاں فلاں کتابیں پڑھی تھیں مگر وہ جب تکرار کراتے تھے تو ان کا تکرار سن کر میں عش عش کرتا، ان کی تعبیر و تفہیم مجھ سے اچھی ہوتی تھی وہ شروع سے اچھا بولنے اور لکھنے پر خوب

قدرت رکھتے تھے۔ ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء۔ "(اور ہم لوگوں نے شیخوپور میں خود حضرت مولانا زین العابدین صاحب کی زبان سے یہ بات سنی تھی۔ ضیاء)

میں نے جماعتی نظام سے ہٹ کر تمام کتابیں پڑھی ہیں اس لئے بغیر مطالعہ کے پڑھنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ علم الصیغہ میں صیغوں کی مشق و تعلیلات پر کافی زور تھا، اگر کوئی مشکل بحث آجاتی تو پڑھانے کے بعد فرماتے کہ اسے لکھ کر دکھاؤ، پھر اس کی تصحیح فرماتے، اور کبھی کبھی خود ہی املا کرا دیتے۔ مجھے اخیر تک اس کا احساس نہ ہو سکا کہ مولانا کو کس فن سے مناسبت زیادہ ہے؟ اس لئے کہ سب پر یکساں دسترس اور قدرت تھی۔ منطق و فلسفہ جیسے خشک و از کار رفتہ مضامین کو پڑھاتے تو اسے اپنی شگفتہ بیانی سے گل و گلزار بنا دیتے۔ عام انداز یہ تھا کہ پہلے عبارت پڑھواتے اور پورے سبق کی ایک ہی بار تقریر کرتے، چونکہ تفہیم پر بے پناہ قدرت تھی اس لئے پورا سبق اسی وقت ذہن نشیں ہو جاتا، پھر طالب علم ترجمہ کرتا، ترجمے کے ساتھ ساتھ دوبارہ مطلب بیان کرتے، اس سے سبق اور اچھی طرح یاد ہو جاتا۔ لیکن اس طرح پڑھانا ہر استاذ کے بس کی بات بھی نہیں ہے۔ جب تک پڑھانے والا تمام مباحث پر حاوی نہ ہو اس طرح پڑھانا بہت مشکل ہے۔ اکثر مشکل مباحث کو لکھوا دیا کرتے تھے، جیسے علم الصیغہ میں باب تمفعل میں ''فا کلمہ سے پہلے الحاق'' والی بحث۔ کافیہ میں عدل کی بحث، اصول الشاشی میں استعارے کی بحث۔ نور الانوار میں امر کی بحث، شرح وقایہ میں طہر متخلل کی بحث اور حسامی میں قیاس کے بعض مباحث۔ یہ سب میری کاپیوں میں محفوظ ہیں۔

مولانا کو شعر گوئی کا تو ذوق نہیں تھا، ایک غزل، ایک مرثیہ ایک فارسی زبان کی حمد دستیاب ہے۔ سخن فہمی بہت اعلیٰ درجے کی تھی، شعر کی اس قدر عمدہ تشریح کرتے تھے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے محبوب دوست مولانا قاری شبیر احمد صاحب مدظلہ کے علاوہ کسی اور کو اشعار کی اس قدر عمدہ تشریح کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ عربی پنجم کے سال حسامی کے سبق میں عموماً گھنٹے کے اختتام سے بیس منٹ پہلے سبق سے فارغ ہو جاتے اور تختہ سیاہ (بلیک بورڈ) پر علامہ اقبال کا کوئی قطعہ لکھواتے اور کہتے کہ اس کا مطلب لکھو، اس طرح ہم لوگوں کے اندر شعر فہمی کا ذوق پیدا کرتے ورنہ عام طور سے مولویوں کے بارے میں یہ لطیفہ مشہور ہے کہ

شعر من بمدرسہ کہ برد   یعنی میرا شعر مدرسہ میں کون لے گیا؟

ایک مرتبہ فرمایا کہ سب لوگ اقبال کے اس قطعہ کا مطلب لکھ کر دکھائیں۔

خداوندا! خدائی دردِ سر ہے   خدائی اہتمامِ خشک وتر ہے
ولیکن بندگی استغفر اللہ   یہ دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے

اس کا مطلب لکھ کر سبھی ساتھیوں نے دکھایا، میں نے جو کچھ لکھا تھا حضرت مولانا کی تصحیح کے ساتھ اب بھی میری ڈائری میں موجود ہے، اس پر مجھے انعام بھی دیا تھا۔ تحریری ذوق پیدا کرنے کیلئے مجھ سے کبھی کبھی مقالات بھی لکھواتے، جس میں زبان وبیان کی باریکیوں پر مطلع فرماتے۔ عربی پنجم کے سال میں نے چار مقالے لکھے، دو تو جامعۃ الفلاح کے طلباء کی تنظیم کی طرف سے منعقدہ انعامی مقابلے کے لئے، دونوں میں یہ مقالے انعام اول کے مستحق قرار دئے گئے، بعد میں ماہنامہ انوار العلوم جہانا گنج میں یہ سب شائع ہوئے۔

اندازِ تربیت اور وصف مردم سازی:

تعمیر شخصیت، مردم گری اور رجال سازی انتہائی دشوار گزار امر ہے، اس دور میں یہ وصف نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ مردم سازی کی صفت جوٴاب خال خال لوگوں میں ہی ہوتی ہے، فیاض ازل کی طرف مولانا کو اس کا وافر حصہ ملا تھا۔ آپ طلباء کے اندر علمی ذوق پیدا کرنے کے ساتھ ان کی بہترین تربیت اور دین وشریعت کے مزاج کے مطابق ان کی ذہن سازی وکردار سازی کی طرف خصوصی توجہ فرماتے تھے۔ خود میں نے جو کچھ اس سلسلے میں محسوس کیا اسے ”حدیث دردِ دل“ کے پیش لفظ میں لکھا:

> ”میں نے دیکھا کہ تعلیم کے ساتھ تربیتی پہلو پر بھی مولانا کی نظر بہت زیادہ رہتی تھی، اس انداز سے تربیت فرماتے کہ اللہ ورسول اور شعائر دین کی محبت وعظمت قلب ودماغ میں راسخ ہو جائے، کبھی کبھی اسباق میں کسی مناسبت سے رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرام اور بزرگان دین کا ذکر خیر نکل آتا تو اس وقت آپ کی محویت قابل دید ہوتی، پوری گھنٹی تذکیر وموعظت میں تمام ہو جاتی اس وقت آپ فرماتے کہ میں تم لوگوں کو دین پڑھا رہوں، چنانچہ شوق علم کے ساتھ عملی پہلو بھی اطمینان بخش تھا، دوسروں کے متعلق تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن مجھے اس سے بے حد نفع پہونچا،

> ان کے فیض صحبت سے مزاج میں دینداری، عبادات پر استقامت، اللہ کی ذات پر یقین وتوکل کی کیفیت، اخلاق حسنہ کا حصول، گرچہ ناتمام ہی سہی! یک گونہ حاصل ہوگیا، مولانا کے عمل کو دیکھ کر دنیا کی بے حقیقتی ایک بدیہی چیز بن گئی، ان کے نزدیک دنیا کی کوئی وقعت نہیں تھی، چنانچہ بڑے سے بڑا دنیاوی نقصان ہوجائے یا کوئی کام حسب منشاء نہ ہوسکا تو اس کا کوئی اثر طبیعت پر نہیں دیکھا، فرماتے کہ اللہ کی مرضی یہی تھی، اور دنیا اتنی اہم شے نہیں ہے کہ اس کے لئے دل دماغ کو اتنا مشغول کردیا جائے کہ انسان اسی کا ہوکر رہ جائے، اس اندازِ تربیت کی وجہ سے تعلیم کا عملی پہلو کبھی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوا۔‘‘

اس سے کسی قدر اندازہ ہوجاتا ہے کہ حضرت مولانا کے سامنے ایک پروگرام اور ایک مشن ہے کہ وہ اپنے تلامذہ و متعلقین کے اندر خالص اسلاف کے رنگ میں دین کی خدمت کا ایک جذبہ اور ولولہ پیدا کریں اور انھیں بزرگان دین کے نقش قدم پر قائم رکھیں۔ اس کے لئے وہ نبوی اصول کو سامنے رکھ کر ذہن سازی و کردار سازی کے لئے زبان و قلم دونوں کا استعمال کرتے رہے۔ اسی غیر معمولی محنت کا نتیجہ ہے کہ آپ کے تلامذہ کی اکثریت تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد تعلیم و تعلم اور خدمت دین میں لگی ہوئی ہے۔ مولانا کے اس وصف کا اعتراف ان کے محسن استاذ حضرت مولانا افضال الحق صاحب جوہر قاسمیؒ نے بھی کیا ہے۔ وہ ’’احاطہ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن‘‘ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں: ’’مولانا اعجاز صاحب تعلیم وتربیت کے آدمی ہیں، میں نے اس کے نمونے غازی پوری، گورینی اور اب شیخوپور میں دیکھ رہا ہوں۔‘‘ ایک جہاں دیدہ استاذ کی شہادت بڑی چیز ہے۔

آپ نے اپنی عمر عزیز کے تریسٹھ سالوں میں سے ۴۲؍ سال اسی تعلیم وتربیت میں صرف کئے، آپ جہاں بھی گئے طالبان علوم دینیہ کی نگاہوں کا مرکز بنے رہے۔ آپ کی شخصیت میں کچھ ایسی مقناطیسی کشش تھی کہ آپ کے اردگرد اچھے اور باصلاحیت طلبہ کا ہالہ سا بن جاتا، حتی کہ دو دہائیوں سے شیخوپور جیسے گم نام قریہ کے ایک ویران سے مدرسہ میں جب علم وفن کا چراغ روشن کیا تو کچھ ہی عرصہ میں اس کی کرنوں نے شمع علم کے پروانوں کو ملک کے کونے کونے سے شیخوپور میں جمع کردیا اور یہ بے نام قریہ علوم قرآن وحدیث کے پُرشور زمزموں سے گونج اٹھا۔

مولانا کے شاگردوں اور مستفیدین کا ایک بڑا حلقہ موجود ہے جو ان کے نام کا شیدائی اور ان کے علم و ہنر اور بے مثال تعلیم و تربیت کا سب سے بڑا گواہ ہے۔ اگر میں یہ کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کے بعد شاید ہی کوئی شخصیت ہوگی جس کے شاگردوں پر اس کا اتنا اثر ہو جتنا کہ حضرت مولانا کے شاگردوں پر ان کی سحر انگیز شخصیت کا اثر تھا۔

تربیت کے باب میں مولانا کے مجموعۂ مکاتیب حدیث دوستاں کا مطالعہ کرنا چاہئے، اس سے ان کی ہمدردی، دلسوزی اور جذبۂ خیر خواہی کا صحیح اندازہ ہوگا۔ اس کے چند ایک اقتباسات پیش خدمت ہیں:

> ''ہر انسان کا عموماً اور ہر مسلمان کا خصوصاً فرضِ اولین ہے کہ وہ اپنے مالک و معبود اور خالق و مربی کی رضا اور خوشنودی کے لئے کوشاں رہے، عشاق اپنے محبوب کے لئے جان کی بازی لگا دینا آسان سمجھتے ہیں، خدا کی رضا کے لئے اگر جان کی بازی لگائی جائے تو عین مناسب ہے کہ ہر مسلمان نے کلمۂ توحید پڑھ کر خدا سے عہد وفا باندھا ہے کہ خدایا! ہم آپ کی اطاعت کریں گے، اور طالب علم نے تو مدرسہ میں داخل ہو کر اور وراثت نبوی کو حاصل کرنے کی نیت کر کے اس عہد و پیمان کی تجدید کی ہے، اسے تو ہر وقت اپنا یہ عہد و پیمان مستحضر رکھنا چاہئے، اس کی کوتاہی عجب نہیں کہ نا قابل معافی جرم بن جائے، ہر وقت دیکھ بھال رکھنی ضروری ہے۔ ہمارے مورثِ اعلیٰ سید الموجودات سرور کائنات فخر بنی آدم سیدنا و مولانا حضرت محمد رسول اللہ **فداہ ابی وامی وروحی وقلبی علیہ الف الف تحیۃ وصلوۃ** ہیں، آپ ہمارے روحانی باپ ہیں، جن کا ترکہ حاصل کرنا ہے، پھر
>
> باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر از بر ہو
> پھر پسر قابل میراثِ پدر کیونکر ہو
>
> اگر ان سے ہماری نسبت اور ہمارا رشتہ منقطع ہو گیا تو یقیناً ہم ترکہ پانے سے محروم رہیں گے۔ دیکھو وارث اور مورث کے دین میں تباین ہو، یا وارث نے مورث کو قتل کر دیا ہو تو وہ اپنے حق سے محروم کر دیا جاتا ہے، بس یوں ہی سمجھ لو کہ حضرت رسول مقبول ﷺ کا دین اور طریقہ تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت و خوشنودی کا حصول ہے، اگر ہم نے اپنا مذہب نافرمانی بنا لیا یا کم از کم فرمانبرداری کی لگن سے ہم خالی ہو گئے تو طریقہ بدل گیا، یا اگر ہم نے آپ کی سنتوں اور طریقوں کو ترک کرنا

اپنا دستور بنالیا یا کم از کم ان کا اہتمام باقی نہیں رکھا تو ہم ....معاذ اللہ سو بار اللہ کی پناہ! **أعاذنا الله منه وسائر المسلمين** ....آپ کی لائی ہوئی شریعت کے قاتل ثابت ہوں گے، سوچو کیسی محرومی کی بات ہے، کیا اس کے بعد بھی آپ کا ترکہ ہمیں ملے گا۔

دیکھو یہ سطریں لکھتے ہوئے میرا دل کانپ گیا، بے اختیار آنکھیں ڈبڈبا گئیں، کیا ہم نے اپنے آپ کو اس سطح پر اتار لیا ہے، جہاں ہم کو اس طرح خطاب کیا جائے؟ اللہ سے توفیق مانگو، استعاذہ کرو، **اللّٰهم نسألك علماً نافعاً ورزقاً طيباً وعملاً متقبلاً ونعوذبك من علمٍ لا ينفع وقلبٍ لايخشع ومن دعوةٍ لا يستجاب لها** (اے اللہ! ہم آپ سے سوال کرتے ہیں علم نافع کا، رزق پاکیزہ کا، عمل مقبول کا اور ہم آپ کی پناہ میں آتے ہیں ایسے علم سے جو نافع نہ ہو، ایسے قلب سے جو خشوع سے خالی ہو، اور ایسی دعا سے جو قبولیت سے محروم ہو)
(حدیث دوستاں: ص ۳۰۷)

’’آج دنیا کمانے اور اس کی فکر وطلب میں مرنے کھپنے والوں کی کمی نہیں ہے، انسان بہائم کی طرح اپنے رزق کی جستجو میں حیران وسرگشتہ ہے، رزق ملتا ہے بقدر مقسوم ہی! لیکن کتنی مشقت، کتنی ذلت اور کتنی مصیبت اس کے جلو میں چلتی ہے، آدمی رزق کا غلام ہوکر رہ گیا ہے، کہاں ہیں وہ شاہبازانِ بلند پرواز! جن کی نگاہیں زمین کی پستیوں کے بجائے آسمان کی بلندیوں میں اپنا نشیمن تلاش کرتی ہیں، کہاں ہیں وہ مردانِ جانباز! جو دین حق کی سربلندی کے لئے اپنی جاہ وعزت، اپنے مال ومنال اور اپنے جسم وجان کو قربان کردینا اتنا ہی پُرکیف اور پُرلطف سمجھتے ہیں جتنا دوسرے لوگ تن پروری اور عیش کوشی کو! حق تعالیٰ نے ہمیں دین کامل اور نعمت تام سے نوازا ہے، ہماری قسمت میں سب سے عظیم وبزرگ نبی روزی فرمایا ہے، ہمارے قلب وزبان کو اپنے محفوظ ومنزل کلام سے حلاوت بخشی ہے! حق تو یہ تھا کہ ان احسانات پر ہم، جو کچھ ہمیں ملا ہے سب قربان کردیتے۔

خدا کا بہت شکر ہے کہ تمہارے لئے کام کی راہیں کھل رہی ہیں، مالیات کا حساب ضرور رکھو، مگر خود کو سنبھال کر، مدرسہ کے مال کو امانت سمجھو، کسی ضرورت میں خواہ وہ کتنی ہی اہم اور فوری ہو، مدرسہ کی رقم بطور قرض بھی ہرگز نہ لو، اپنی بڑی سے بڑی ضرورت روک دو، مگر مدرسہ کی رقم

> سے اسے پورا نہ کرو، ممکن ہے آزمائش کے ایسے مرحلے آجائیں، لیکن اگر تم نے اجتناب کلی سے کام لیا تو ایک دو مرتبہ کے بعد ایسا دروازہ کھلے گا کہ تم خود حیران ہو جاؤ گے، یہی اس زہر کا تریاق ہے۔ امانت و دیانت کے ثمرات دنیا و آخرت میں اس کثرت سے دیکھو گے کہ تم خود دوسروں کے لئے نمونہ بن جاؤ گے، لیکن بعض مواقع پر اس باب میں سخت آزمائش ہو سکتی ہے، دیکھو قدم جادۂ مستقیم سے نہ ہٹے۔''

ایک جگہ لکھتے ہیں:

> اپنے اعمال کے سلسلے میں مضبوط رہو۔ نماز باجماعت سب سے اولین فریضہ ہے۔ تلاوت ہمیشہ کرتے رہو، بعد نمازِ فجر سورۂ یٰسین، بعد نمازِ مغرب سورہ واقعہ اور بعد نمازِ عشاء سورہ ملک اور سورہ الم سجدہ اور ہو سکے تو سورہ دخان بھی، نیز جمعہ کے دن سورہ کہف پڑھنے کا معمول رکھو، اس میں بے انتہا فوائد ہیں۔ اور کوئی بہت زیادہ وقت صرف نہیں ہوتا۔ دعاء استخارہ تم لوگوں نے یاد کی تھی، اس کو بھی ایک بار کسی نماز کے بعد باستحضارِ قلب پڑھ لیا کرو۔
>
> آخری بات سنو! پڑھنے میں یہ نیت و ارادہ ہرگز نہ رکھو کہ ذریعہ معاش کا ایک دھندا ہے، بلکہ قصد صرف یہ رکھو کہ علم دین حاصل کر کے اس کے مقتضیات پر عامل ہوں گے اور اس طرح اپنے رب کو راضی کریں گے۔ رزق و معاش کے کفیل حضرت حق ہیں۔ ڈھلمل یقین مولویوں کی طرح اس چکر میں ہرگز نہ پڑنا۔ یہ خط اپنے سب ساتھیوں کو سنا دینا، اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق بخشے۔''

یہ ذاتی نوعیت کے خطوط کے اقتباسات ہیں، جو آج سے چالیس سال پہلے لکھے گئے ہیں، اس سے آپ کی طبیعت کے رنگ کا پتہ چلتا ہے۔ یہی حال زندگی کے آخری لمحات تک باقی رہا۔

صاحب طرز انشا پرداز و ادیب:

تحریر و انشاء پردازی میں حضرت مولانا کا جو بلند مقام و مرتبہ ہے، اس کے لئے دلائل و براہین کی ضرورت نہیں، آپ کی چھوٹی بڑی تقریباً تیس پینتیس کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، ان سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان کتابوں میں کچھ ایسی بھی ہیں جن میں آپ کو خالص علمی اور

دینی مسائل کی بحثیں نظر آئیں گی۔ آپ کی کتابوں میں کئی سوانحی حالات، سفرنامے اور خودنوشت آپ بیتی پر مشتمل نظر آئیں گی، جن میں آپ کو متعلقہ شخصیت کی جیتی جاگتی تصویریں نگاہوں کے سامنے چلتی پھرتی نظر آئیں گی۔ جب کہ دیگر کتب ورسائل میں عصر حاضر کے مسائل اور اسلام کی روشنی میں ان پر آپ کی فاضلانہ رائیں بڑے اعتدال وتوازن اور سلیقہ ووقار کے ساتھ آراستہ و پیراستہ نظر آئیں گی۔ آپ کی تمام کتابوں میں مضامین کے تنوع کے ساتھ زبان وبیان کی خوبی پورے شباب کے ساتھ موج زن رہتی ہے۔ آپ کے خطوط کے مجموعہ میں یہ ساری فنی اور علمی خوبیاں پورے طور پر موجود ہیں جن میں ٹھیٹھ علمی موضوعات بھی ہیں، ایک معلم ومربی کی سنجیدہ و ناصحانہ گفتگو بھی، پدری شفقت کا مظہر دلآویز انداز بھی پوری طرح موجود ہے اور یارانہ تخاطب کا بے باکانہ طرز تخاطب بھی پوری طرح جلوہ گر ہے۔ غرض پورا مجموعۂ مکاتیب خطوط نویسی کے ادب میں ایک قابل قدر اضافہ کہیے۔

اگر یہ جسارت نہ ہو تو مجھے کہنے دیا جائے کہ علماء دیوبند میں مولانا مناظر احسن گیلانی علیہ الرحمہ کے بعد ایسا صاحب قلم شاید ہی کوئی ہوا ہو۔ مولانا کے اسلوب بیان اور طرز تحریر کے بارے میں عرب وعجم کے مسلم ادیب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمہ کی شہادت سنئے، جس کے بعد مزید کچھ کہنے کی حاجت نہیں، وہ ’’حیات مصلح الامت‘‘ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> ’’مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی کی تالیف کی ہوئی کتاب ’’حیاتِ مصلح الامت‘‘ کا کتابت شدہ مسودہ طباعت کے لئے تیار ہے، میں نے جستہ جستہ اس پر نظر ڈالی اور اس کے بعض حصے سنے، کتاب جدید اسلوب اور مذاق کے مطابق لکھی گئی ہے، اور اس میں جہاں تک مجھے اندازہ ہوا وہ خصوصیات موجود ہیں جن کی طرف میں نے اشارہ کیا۔ میرا مصنف سے اس کتاب کے ذریعہ پہلی مرتبہ تعارف ہوا، وہ مدرسۂ دینیہ غازی پور کے مدرس ہیں، جن کا اصلاً اشتغال درس وتدریس سے ہوگا، لیکن ان میں تصنیفی سلیقہ، تحریر میں ایسی شگفتگی اور سلاست، کتاب میں ایسی حسن ترتیب اور مضامین کا حسن انتخاب ہے جو کہنہ مشق مصنفوں اور اہل قلم میں پایا جاتا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت وقت کی ایک اہم دینی واصلاحی خدمت اور بزرگوں کی سوانح عمریوں میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔‘‘ (حیات مصلح الامت، ص:١٦)

خدمتِ دین کا جذبۂ بے پناہ:

خدمت دین کے سلسلے میں حضرت مولانا کا مزاج کیا تھا، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے جو انھوں نے اپنی اہلیہ سے کہی تھی:

> ’’میں نہ دنیا کمانے کے کام کا ہوں، نہ دنیا کا کوئی کام کروں گا، اللہ کی عبادت، رسول کی اطاعت اور دین اسلام کی خدمت جس قدر مجھ سے بن پڑے گی کرتا رہوں گا۔ معلوم نہیں تمہارے اخراجات وضروریات کو میں نباہ سکوں یا نہ نباہ سکوں؟ دین کی خدمت میں کبھی سفر، کبھی گھر، کبھی تنگی کبھی فراخی، سب سے سابقہ پڑے گا، اگر اس تنگی ترشی کے ساتھ بخوشی گزارا کرنا منظور ہو، تو ٹھیک ہے، اور اگر نہیں، تو میں ابھی زندگی میں تبدیلی لانے سے پہلے آزاد کردوں؟‘‘
>
> (حکایت ہستی: ص ۲۹۶)

چنانچہ آپ کی پوری زندگی اسی مشن کی آبیاری میں گزری کہ کس طرح اللہ اور رسول کا کلمہ بلند ہو، کیسے دین کو سرفرازی وسربلندی حاصل ہو؟ فراغت کے بعد کا زمانہ، بیس بائیس کی عمر، یہ دور اور یہ عہد آرزوں اور امنگوں کا عہد شباب ہوتا ہے، عموماً لوگ اس عمر میں تعمیر مستقبل کے تانے بانے میں الجھے رہتے ہیں، بہتر سے بہتر دنیاوی جگہوں کے حصول میں سرگرداں رہتے ہیں، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس عمر میں بھی مولانا کی طبیعت ومزاج کا رخ اپنے ابنائے زمانہ سے بالکل الگ تھا۔ آپ کو اپنے شاگردوں کے ذریعہ معلوم ہوا کہ دمکا دیوگھر کے علاقے میں جہل وضلالت اور کفر وشرک کی گرم بازاری ہے، بدعات وخرافات کا بہت زور ہے، ہندوانہ تہذیب اس طور پر مسلط ہے کہ نام تک مسلمانوں جیسے نہیں ہیں۔ وہاں کے تفصیلی حالات کے لئے حکایت ہستی کا مطالعہ کریں۔ ان شاگردوں نے گزارش کی کہ اگر آپ تشریف لے چلیں تو امید ہے کہ آپ سے دین کا کام ہوگا۔

مولانا نے اس دعوت پر لبیک کہا اور تشریف لے گئے، اور متواتر کئی سال تک جاتے رہے اور پورا رمضان وہیں گزارتے اور عید کے بعد واپسی ہوتی ہے۔ اس علاقے کے بارے میں مولانا نے جو کچھ لکھا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ دینی ودنیوی دونوں اعتبار سے یہ نہایت پسماندہ علاقہ تھا، بنیادی ضروریات کے لئے کئی کئی کیلومیٹر جانا پڑتا تھا، مولانا جب وہاں جاتے تو اپنی روز

مرہ کی ضروریات کی چیزیں لے کر جاتے، جیسے لالٹین، مچھر دانی، پیڑھا اور لوٹا وغیرہ، دینی پسماندگی کا حال خود ان کی زبانی سنئے:

> ''دینی پسماندگی جسے موضوع بنا کر میری حاضری ہوئی تھی، اس کا حال ناگفتہ بہ تھا۔ میں اس وقت وہاں پہونچا تھا جب ایک دینی اصلاح کی ایک کوشش ہو چکی تھی، وہ کوشش تین چار سال قبل ہوئی تھی، ورنہ اس سے پہلے کا جو حال وہاں کے لوگوں سے معلوم ہوا وہ کسی طرح دینی و اسلامی نہ تھا۔ جہالت تھی، کفر وشرک کی گرم بازاری تھی، توہمات کا دور دورہ تھا، مسجد ضرور تھی مگر اس لئے نہیں کہ اس میں نماز پڑھی جائے بلکہ اس لئے کہ اگر بارش نہ ہو، سوکھا پڑ رہا ہو تو سارے علاقے سے چندہ کر کے ایک بکری محرابِ امام میں ذبح کی جائے اور اس کا خون پکے فرش پر صحن تک بہایا جائے، پھر اس کی بوٹی بوٹی کر کے گاؤں کے ہر ہر فرد کو تقسیم کی جائے۔ یہ ان دیہاتیوں کے وہم کی کرشمہ سازی تھی کہ اس طرح بارش ہوگی، قحط کی وبا دور ہوگی، نماز کا ذکر تو نہ تھا، البتہ تعزیہ کی پرستش اہتمام سے تھی، مسجد کے سامنے چوک بنا ہوا تھا، گاؤں کے باہر پتھر کی ایک چٹان زمین پر جمائی ہوئی تھی، کاشتکار جب کھیتی کے عمل کا آغاز کرتا تو اس پر دودھ کا چڑھاوا بطور نذر کے پیش کرتا، کہ اس سے فصل اچھی ہوگی اور نقصان سے محفوظ رہے گی، شادی بیاہ کی تاریخیں ہندو پنڈتوں سے رکھوائی جاتیں، دلہنوں کو گھر میں لانے کے وقت کی تعیین ان سے کرائی جاتی، غرض زندگی کے ہر عمل پر شرک وکفر اور ہندوانہ تہذیب کی چھاپ تھی، اور یہ چھاپ اتنی عام تھی کہ مسلمان مردوں اور عورتوں کے نام تک ہندوانہ تھے، ان میں لفظ میاں لگا کر انھیں مسلمان بنا لیا جاتا تھا، مثلاً جگدیش میاں، ڈوما میاں، لیدھو میاں، چھاتو میاں وغیرہ۔''

ان حالات میں مولانا نے پوری دلچسپی اور دلجمعی کے ساتھ کام شروع کیا، جہاں کی صورتحال دینی اعتبار سے ایسی ناگفتہ بہ تھی، مولانا کی بے لوث محنت کی برکت سے اب وہاں کئی مدرسے اور درجنوں علماء وحفاظ ہیں۔ مولانا فرماتے تھے کہ اس علاقے میں غربت وفلاکت حد سے زیادہ تھی، جب میں وہاں جاتا تو ظاہر ہے کہ وہاں کے لوگوں سے کسی دُنیوی منفعت کا تو تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا، میرے بعض بزرگ مجھ سے کہتے تھے کہ تم وہاں کیوں جاتے ہو وہاں تمہیں کیا ملتا ہے؟ میں ان سے کیا کہتا کہ میں کس نیت، ارادے اور عزم کو لے کر وہاں جاتا ہوں، اس ماحول

میں جہاں افریقہ، لندن، بمبئی، مدراس، گجرات، بنگلور اور حیدر آباد اعتکاف کرنے کا رواج ہو، یہ بات یقیناً حیرت کا باعث تھی کہ ایک شخص ان علاقوں کو چھوڑ کر دمکا جیسے کوردہ علاقے میں کیوں جاتا ہے، لیکن مولانا نے وہاں کمال جفاکشی اور مجاہدے کے ساتھ کئی رمضان گزارے جس کے نتیجے میں یہ خوشگوار تبدیلی آئی۔

مدرسہ کی تعطیل کے زمانے میں مولانا کا یہ معمول تھا کہ تبلیغِ دین کی خاطر دور دراز علاقوں میں جاتے اور ہفتہ عشرہ قیام فرماتے۔ اس عرصہ میں دعوتی واصلاحی پروگرام ہوتے رہتے، ایک روز میں تین تین چار چار جگہوں پر پروگرام ہوتے، بارہا مجھے بھی ساتھ جانے کا اتفاق ہوا، اس طرح کے پروگرام کے بڑے خوشگوار اثرات مرتب ہوتے۔

قرآن کریم سے غیر معمولی تعلق:

قرآن کریم سے تعلق اور شیفتگی اللہ سے محبت وتعلق کا مظہر ہے۔ میں نے آپ کو دیکھا کہ قرآن کریم کی تلاوت، اس کے معانی میں غور وتدبر، اس کا عوامی درس، اس کے ترجمہ وتفسیر کی تدریس، ان سب کے ساتھ آپ کو غیر معمولی شغف تھا۔ اپنے تعلق بالقرآن کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ’’شعبان ۱۳۹۰ء میں مدرسہ کی رسمی طالب علمی سے اس خاکسار کی فراغت ہوئی، فراغت کے بعد ڈیڑھ دو سال گھر رہنے کا اتفاق ہوا۔ قرآن کریم کی تلاوت، حفظ اور تدبر معانی سے قدرے مناسبت زمانۂ طالب علمی ہی سے تھی، گھر پر رہ کر حفظ قرآن کی تکمیل کی سعادت نصیب ہوئی، اس کے لئے بکثرت تلاوت کی توفیق ہوئی، تو قرآن سے محبت اور تعلق میں رسوخ پیدا ہوا۔ ایک روز اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ تازندگی قرآن کریم سے اشتغال اور اس کی خدمت کی توفیق عطا ہو، پھر راہ آسان ہوئی، چند ذی استعداد حفاظ کو ہلکے پھلکے قواعد کے ساتھ ترجمۂ قرآن پڑھانے کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ خدمت سال بھر اپنے وطن اور گاؤں میں چلتی رہی، پھر تدریس کے سلسلے میں باقاعدہ مدرسوں میں آ گیا۔ اللہ کا نہایت فضل وکرم شامل حال رہا کہ کسی نہ کسی عنوان سے قرآن کی خدمت نصیب ہوتی رہی، زیادہ تر تفسیر کی ابتدائی اور مختصر کتاب ’’جلالین شریف‘‘ زیر درس رہی۔ اس کے علاوہ مساجد میں بیان تفسیر اور اس کی روشنی میں تذکیر و

> موعظت کا ایک تسلسل قائم رہا، سالہا سال تک رمضان شریف میں اپنے گاؤں میں بعد نماز تراویح ایک بڑے مجمع کے سامنے قرآن کریم کا ترجمہ اوراس کے مضامین کا بیان ہوتا رہا۔ پھر ۱۴۱۰ھ (۱۹۹۰ء) سے اعظم گڈھ شہر کی جامع مسجد میں ہراتوار کو تفسیر وتذکیر کا سلسلہ شروع ہوا، تو اب تک بغیر کسی انقطاع کے جاری ہے...... خدا کرے یہ سلسلہ قائم رہے...... مجھے قلبی خوشی ہے کہ میری وہ دعا جو اللہ تعالیٰ کے حضور چالیس سال قبل بارگاہِ الٰہی میں پیش کی گئی تھی، بحمد اللہ اس کی قبولیت کے آثار محسوس ہورہے ہیں۔‘‘

قرآن کریم سے غیر معمولی شغف ہی کا نتیجہ تھا کہ فراغت کے بعد صرف چار ماہ میں قرآن حفظ کرلیا، مجھ سے کئی بار فرمایا کہ صبح تہجد کے بعد یاد کرنا شروع کرتا اور روز ایک پاؤ یاد کرلیتا، انیسویں اور اکیسویں پارے کے بارے میں بتایا کہ اسے ایک دن میں یاد کرلیا تھا، اور کبھی کبھی کسی مصروفیت کی وجہ سے ناغہ بھی ہوجاتا تھا۔ اس طرح چار ماہ میں قرآن حفظ کرلیا۔ اور سالہا سال تک تراویح میں قرآن سنانے کا سلسلہ جاری رہا۔

اللہ کی ذات پر توکل اور دعاؤں کا اہتمام:

اللہ کی ذات پر بے پناہ توکل تھا، اس لئے میں نے بیس سالہ معیت میں کبھی کسی معاملہ میں پریشان اور بدحواس ہوتے نہیں دیکھا، سخت سے سخت حالات آتے لیکن اطمینان وسکون کی وہی کیفیت طاری رہتی ہے۔ بڑے سے بڑے حادثے پر زبان پر صبر وشکر کے کلمات جاری رہتے۔ آپ کے اطمینان ویقین کی کیفیت یہ تھی کہ دوسرے پریشان حال آپ کی خدمت میں پہونچ کر مطمئن اور پرسکون ہوجاتے ہیں۔ نماز اور دعاؤں کا بہت اہتمام تھا، پریشان حال لوگوں کی ایک بھیڑ لگی رہتی تھی، آپ ان کو مختلف اوراد اور دعاؤں کی تلقین کیا کرتے تھے۔ ایک روز مدرسہ کے کسی پروگرام میں طلبہ واساتذہ کو خطاب کررہے تھے تو دوران خطاب ایک دعا کے بارے میں فرمایا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ یہ دعا میرے تمام طلبہ اور متعلقین کو یاد ہو اور سب اس کو اللہ کے حضور پیش کیا کریں، وہ دعا یہ تھی:

أَللّٰهُمَّ أَلِّفْ بَيْنَ قُلُوْبِنَا وَأَصْلِحْ ذَاتَ بَيْنِنَا وَاهْدِنَا سُبُلَ السَّلَامِ وَنَجِّنَا مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّوْرِ وَجَنِّبْنَا الْفَوَاحِشَ مَاظَهَرَ مِنْهَا وَمَابَطَنَ وَبَارِكْ لَنَا فِيْ أَسْمَاعِنَا

وَأَبْصَارِنَا وَقُلُوبِنَا وَأَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّکَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ وَاجْعَلْنَا شَاكِرِيْنَ لِنِعْمَتِکَ مُثْنِيْنَ بِهَا قَابِلِيْهَا وَأَتِمَّهَا عَلَيْنَا۔

اے اللہ! ہمارے دلوں کو جوڑ دے، اور ہمارے باہمی تعلقات کو سنوار دے اور ہمیں سلامتی کے راستوں پر لے چل، اور ہمیں تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آ، اور ہمیں ظاہری و باطنی بے حیائیوں سے بچا، اور ہمارے کانوں، اور ہماری آنکھوں، اور ہمارے دلوں، ہماری بیبیوں اور ہماری اولاد میں بھرپور خیر و بھلائی مقدر فرما اور ہمیں معاف فرما، بے شک تو ہی توبہ کو قبول کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے، اور ہمیں اپنی نعمتوں کا شکرگزار، ان کا ثنا خواں اور انھیں قبول کرنے والا بنا اور ان کو ہمارے لئے مکمل فرما۔

اور اس دعا کو بھی پڑھنے کی بہت تاکید فرماتے تھے، اس پر تو ”ایک اہم دعا“ کے عنوان سے ایک مستقل مضمون بھی لکھا تھا جو ”حدیث دردِ دل“ میں شائع ہو چکا ہے۔

اَللّٰهُمَّ اقْسِمْ لَنَا مِنْ خَشْيَتِکَ مَا تَحُوْلُ بِهٖ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مَعَاصِيْکَ وَمِنْ طَاعَتِکَ مَا تُبَلِّغُنَا بِهٖ جَنَّتَکَ وَمِنَ الْيَقِيْنِ مَا تُهَوِّنُ بِهٖ عَلَيْنَا مُصِيْبَاتِ الدُّنْيَا وَمَتِّعْنَا بِأَسْمَاعِنَا وَأَبْصَارِنَا وَقُوَّتِنَا مَا أَحْيَيْتَنَا وَاجْعَلْهُ الْوَارِثَ مِنَّا وَاجْعَلْ ثَارَنَا عَلٰى مَنْ ظَلَمَنَا وَانْصُرْنَا عَلٰى مَنْ عَادَانَا وَلَا تَجْعَلْ مُصِيْبَتَنَا فِيْ دِيْنِنَا وَلَا تَجْعَلِ الدُّنْيَا أَكْبَرَ هَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا وَلَا تُسَلِّطْ عَلَيْنَا مَنْ لَّا يَرْحَمُنَا۔

اے اللہ! ہمیں اپنا اتنا خوف نصیب فرمائیے، جس کی وجہ سے آپ ہمارے درمیان اور گناہوں کے درمیان حائل ہو جائیں، اور اپنی وہ طاعت نصیب فرمائیے، جس کی وجہ سے آپ ہمیں اپنی جنت میں پہونچا دیجئے، اور اتنا یقین بخشئے جس کی وجہ سے آپ دنیا کی مصیبتیں ہمارے اوپر سہل فرما دیجئے، اور ہم کو ہماری سماعت، ہماری بینائی اور ہماری طاقت سے اس وقت تک استفادہ کا موقع دیجئے، جب تک آپ ہم کو زندہ رکھیں، اور اس کے خیر کو ہمارے بعد باقی رکھئے، اور جو ہم پر ظلم کرے اس سے ہمارا انتقام لیجئے، اور دنیا کو ہمارا مقصود اعظم نہ بنائیے، نہ ہمارے علم کا منتہا بنائیے، اور ہم پر کسی ایسے شخص کو مسلط نہ فرمائیے جو ہم پر رحم نہ کرے۔

لوگ حج کے لئے جاتے اور دعا کے بارے سوال کرتے کہ وہاں کون سی دعا خاص طور

سے کی جائے تو اس دعا کو بتاتے تھے:

أَللّٰهُمَّ آتِ نَفْسِىْ تَقْوَاهَا وَزَكِّهَا أَنْتَ خَيْرُ مَنْ زَكّٰهَا أَنْتَ وَلِيُّهَا وَمَوْلَاهَا

اے اللہ! میرے نفس کو تقویٰ عنایت فرمائیے، اور اس کو پاکیزہ بنادیجئے۔ آپ بہترین پاکیزہ بنانے والے ہیں۔ آپ اس کے مالک و مولیٰ ہیں۔

مختلف مواقع پر اس طرح کی بہت ساری دعائیں لوگوں کو تلقین کرتے، جس سے لوگوں کو نفع ہوتا۔ ایک سال تو اعتکاف میں تراویح کے بعد بیان میں پورے عشرے میں صرف دعاؤں پر بیان فرمایا، اس بیان میں جن دعاؤں کا ذکر فرمایا اسے میں نے محفوظ کرلیا اور وہ اب بھی میرے پاس ہے۔ حدیث دوستاں میں بھی مختلف مواقع کی بہت سی دعائیں مل جائیں گی۔ کبھی کبھی اجتماعی دعا کراتے تھے، اس وقت جو کیفیت ہوتی تھی اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا، چند مواقع تو ایسے ہیں کہ انھیں میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ ایک مرتبہ تراویح میں ختم قرآن کے موقع پر ستائیسویں شب کو، اور ایک بار میدان عرفات میں وقوف عرفہ کے بعد، اس وقت تو ایسا لگ رہا تھا جیسے دل سینے سے نکل کر باہر چلا آئے گا۔ اس کی تفصیل میں نے ”بطواف کعبہ رفتم .....“ کے جدید ایڈیشن میں لکھ دی ہے۔

اتباعِ سنت:

نبی اکرم ﷺ کی ذات بابرکات سے جو والہانہ لگاؤ اور فداکارانہ شیفتگی تھی وہ کسی اہل تعلق سے مخفی نہیں ہے۔ اس پر مستقل ایک مضمون میں نے مفتی عطاء اللہ صاحب سے لکھوایا ہے جو اس نمبر میں شائع ہورہا ہے، اس سے اس کیفیت کا اندازہ ہوگا۔ اسی محبت کا اثر تھا کہ آپ کی پوری زندگی اتباع سنت میں ڈھلی ہوئی تھی، حتی المقدور اس کی کوشش کرتے کہ کوئی کام سنت کے خلاف نہ ہو۔ میں نے کئی بار آپ کی زبان سے سنا کہ: ”میں نے سیرت نبوی کا تین سال تک مطالعہ محض اتباع سنت کی نیت سے کیا ہے۔“ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آپ کے اندر اتباع سنت کا کیسا جذبہ فروزاں رہا ہوگا۔

جب تک قوت وصحت رہی خود ہی امامت فرماتے تھے، اور مسنون قرأت کا بہت لحاظ رکھتے تھے، ہمیشہ سورہ فاتحہ میں ہر آیت پر وقف فرماتے، اور پوری سورہ کی قرأت کرتے یا مسلسل

کسی ایک جگہ سے قرآن پڑھتے، ایسا کبھی نہیں ہوتا تھا کہ کچھ حصہ کہیں سے پڑھ دیا اور کچھ حصہ کہیں سے، جیسا کہ آج کل ائمہ کی عام روش ہے، اس کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ جمعہ کے دن صبح کو پابندی سے سورہ سجدہ اور سورہ دہر پڑھتے تھے، التزام مالا یلزم سے بچنے کے لئے دو چار ماہ میں کسی کسی ہفتے میں ترک بھی کر دیتے تھے۔ اس کا اس قدر اہتمام فرماتے کہ ایک بار تو سفر میں ٹرین میں اتنی گنجائش مل گئی کہ دو آدمیوں کی جماعت ہو جائے تو جمعہ کا دن ہونے کی وجہ سے فجر میں حسب معمول سورہ سجدہ اور سورہ دہر پڑھی۔ میں نے کئی سال تک تراویح میں قرآن سنایا ہے، وتر کی امامت آپ خود فرماتے تھے، پورے ماہ میں دو چار دن کے علاوہ ہر روز مسنون قرأت کے مطابق پہلی رکعت میں **سبح اسم ربک الاعلیٰ** دوسری میں **قل یاایھاالکافرون** اور تیسری میں **قل ھو اللہ احد** پڑھتے تھے۔

سفر میں بھی بارہا ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا مختصر اسفار تو بہت ہوئے۔ چار سفر تو بہت طویل تھے، دو سفر پاکستان کے اور دو سفر حج کے۔ سفر میں انسان کے اخلاق کا پتہ چلتا ہے، جب شب و روز کا ساتھ ہوتا ہے۔ میں نے آپ کو سفر کی حالت میں تو اور اعلیٰ اخلاق کا حامل پایا، سفر میں اپنے رفقاء کی بہت رعایت فرماتے، اور بہت بے تکلف رہتے۔ مجھ سے کہتے کہ استاذی شاگردی کے تکلفات کو حضر کے لئے چھوڑ دو، ورنہ بہت دقت ہوگی۔

سفر میں بھی رخصت کے بجائے عزیمت پر عمل فرماتے، تہجد کی پابندی ہمیشہ دیکھی چاہے سفر ہو یا حضر، بیماری ہو یا صحت، ہر حال میں اس کی پابندی کرتے۔ اور طویل رکعتیں پڑھا کرتے تھے، اسی وقت وتر بھی پڑھتے تھے۔ اس کے بعد تلاوت اور اوراد وظائف میں مشغول ہو جاتے اور مشغولیت فجر تک رہتی۔

تعویذات:

مولانا تعویذات بھی لکھتے تھے، لیکن اس میں ان کے کچھ شرائط و قیود تھے۔ ایک تو یہ کہ عورتیں ان کے پاس نہیں آسکتی تھیں، تعویذ لکھنے کے لئے کہیں نہیں جاتے تھے، اور کبھی تعویذ لکھنے پر کوئی اجرت نہیں لی، محض اس کو خدمت کے طور پر انجام دیا۔ ان کا طریقہ عام عاملین سے بالکل الگ تھلگ تھا۔ وہ کہتے تھے کہ میں تو اس لئے تعویذ لکھ دیا کرتا ہوں کہ اگر نہ لکھوں تو لوگ نہ جانے

کہاں کہاں جا کر اپنے دین وایمان کو ضائع کریں گے۔ آپ نے کس طرح تعویذ نگاری شروع کی اور اس سلسلے میں ان کے کیا خیالات ونظریات تھے؟ اس کے بارے میں انھوں نے قدرے تفصیل سے اپنی آپ بیتی میں لکھ دیا ہے کہ وہ نہ عامل ہیں اور نہ انھیں اس فن کا علم ہے اور نہ مناسبت ہے، بلکہ وقت پر جو چیز ذہن میں آئی اسے لکھ کر دے دیا، اور اللہ نے اس میں شفا دیدی۔

تعویذات کے بارے میں آپ کا نظریہ کیا تھا، اس کی وضاحت اس خط سے خوب اچھی طرح ہوتی ہے جو انھوں نے اپنے ایک شاگرد کو لکھا تھا:

> ”تمہارا خط ملا، تم نے عملیات کے بارے میں دریافت کیا، کہ انھیں تم عمل میں لانا چاہتے ہو تو سنو! کہ یہ بات ایک ایسے شخص کے لئے جو عالم دین ہو، خدا اور رسول پر ایمان رکھتا ہو، اللہ پر بھروسہ رکھتا ہو، ہرگز زیبا نہیں ہے، عملیات ایک فتنہ ہے، اس میں پڑ کر آدمی بسا اوقات اپنے ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، کتابوں میں جو کچھ اس پر سبز باغ نظر آتے ہیں، جب کرنے لگو گے تو معلوم ہوگا کہ محض سَراب ہیں، اور ان تک پہونچنے کے لئے نہ جانے اپنا کتنا قیمتی سرمایہ برباد کرنا ہوگا، ہرگز اس کے درپے نہ ہو، عملیات نہ کرو، اعمال حسنہ پر کاربند رہو۔
>
> عملیات کا حاصل یہ ہے کہ آدمی خدا کی کائنات کو اپنی مٹھی میں لے کر اپنی مرضی کے تابع بنانا چاہتا ہے، یہ خدا کی جناب میں گستاخی ہے، انسان کا بڑا کمال یہ ہے کہ وہ خود خدا کی مرضی کا تابع بن جائے، پھر اگر ان کو منظور ہوگا تو دنیا کی بہت سی چیزوں کو اس کے تابع بنائیں گے۔
>
> عملیات کا عامل نہ کوئی نبی اور رسول ہوا، اور نہ سلف صالحین! یہودیوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام پر الزام رکھا تھا کہ وہ عامل تھے، ساحر تھے، تو اللہ تعالیٰ نے اس کی تردید کی، اور فرمایا **وما کفر سلیمٰن**، (سلیمان نے کفر نہیں کیا)۔
>
> ہاروت وماروت کے بارے میں راجح قول یہی ہے کہ وہ فرشتے تھے، ان پر بھی سحر کا علم اتارا گیا تھا، مگر وہ سحر سفلی نہ تھا۔ آج کل کی اصطلاح کے مطابق ”رحمانی عمل“ تھا، مگر تاثیر کے اعتبار سے وہ بھی عجائبات کا مظہر تھا، اسی لئے اسے بھی سحر کہہ دیا جاتا ہے، یہ علم درحقیقت سفلی سحر کو ختم کرنے اور اس کے علاج کے لئے نازل کیا گیا تھا، تاہم اس میں بھی خطرات واندیشے اسی طرح کے تھے جیسے سحر میں ہوا کرتے تھے، اسی لئے جب کوئی شخص اس فن کو حاصل کرنا چاہتا تو وہ

> یہ کہہ کر منع کرتے تھے کہ إنما نحن فتنة فلا تكفر، یہ عمل بذاتِ خود کفر نہیں ہے، لیکن نتیجۃً یہ بسا اوقات کفر تک جا پہونچتا ہے
>
> ایک بزرگ سے ایک نوجوان نے دست غیب کا عمل معلوم کرنا چاہا، تو انھوں نے دیر تک اسے سمجھایا، اور آخر میں ایک بہت بلیغ بات ارشاد فرمائی، فرمایا:
>
> ’’بیٹا! کامل بنو، عامل نہ بنو، عامل وہ ہے، جو خدا کو اپنی منشا کے مطابق چلانا چاہتا ہے، اور کامل وہ ہے، جو خود خدا کی مرضی کے مطابق چلنا چاہتا ہے۔‘‘
>
> تسخیر قلوب اللہ کی شان ہے، واعلموا أن الله يحول بين المرء وقلبه، تم کو کیا ضرورت ہے، اس شان خداوندی میں شرکت کرنے کی۔ اس خیال کو دل سے نکال دو، عملیات میں نہ پڑو، اللہ کے ذکر میں لگو، اس کی رضا جوئی کے ڈھب نکالو، یہی اصل کام ہے، باقی سب فضول۔ تم کو زیادہ اشتیاق معلوم ہوتا ہے، اس لئے اس پر مفصل گفتگو کر دی، اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائیں۔ والسلام‘‘

اس سلسلے میں آپ کا رسالہ ’’تعویذات وعملیات کی شرعی حیثیت‘‘ بھی ایک معتدل اور متوازن تحریر ہے۔ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے اس کا مطالعہ بہت مفید ہوگا۔

فتنوں اور نزاع سے اجتناب:

حضرت مولانا اپنے متعلقین کو اس کی بہت تاکید فرماتے تھے کہ وہ فتنے اور نزاع کی جگہوں سے بچیں۔ فرماتے تھے فتنے کے زمانے میں سب سے پہلے قلوب تباہ ہوتے ہیں، جس کا نتیجہ طاعات سے محرومی کی صورت میں نکلتا ہے۔ اپنے ایک شاگرد کو آج سے ۴۱؍سال قبل ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ’’آج کل فتنے جنگل کی آگ کی طرح پھیلتے ہیں، فتنوں کی طرف جہاں کسی نے نگاہ اُٹھائی، وہ گیا۔ ان فتنوں میں جانے کی ضرورت نہیں ہوتی، فتنے خود لپک لپک کر لگتے ہیں، اس لئے خوب مضبوط رہ کر محفوظ رہنے کی کوشش کرو، جو لوگ فتنے میں پڑے ہوئے ہیں ان سے بالکل نہ ملو، نہ ان کی گفتگو میں حصہ لو۔ زبان کو لگام دے لو، کان بند کر لو، نہ بولو اور نہ سنو، اور اللہ

> کی پناہ میں آجاؤ۔ اللّٰھم إنی أعوذ بک من الفتن ماظہر منہا و مابطن ، رسول اکرم ﷺ کی وصیت ہے کہ فتنوں میں بیٹھنے والا کھڑے رہنے والے سے بہتر ہے، اور لیٹ جانے والا اس سے بہتر ہے، بعض اوقات طبیعت کے جوش کا تقاضا ہوتا ہے کہ فلاں تحریک ہمارے اور طلبہ اور فلاں فلاں کے مفاد میں ہے، اس میں حصہ لینا مناسب ہے، یہ بات بہت مضر ہے، خبردار! یکسوئی سے بڑھ کر دولت نہیں، میں تم لوگوں کو آج کل کے فتنوں سے بہت ڈرا چکا ہوں، اور ڈراتا رہتا ہوں، اس کو خوب اچھی طرح گرہ میں باندھ لو اور سب ساتھیوں کو بھی میری یہ بات پہنچادو۔''

آپ فرماتے تھے کہ دل ودماغ کو تشویش اور افکار سے ممکنہ حد تک محفوظ رکھنا چاہئے، اس کا خاص اہتمام کرنا چاہئے، تاکہ جب فرصت ملے تو انسان یکسوئی سے اللہ کا ذکر کر سکے۔ جب انسان فتنوں اور نزاع میں گھرا رہے گا تو فرصت ملنے کے بعد بھی دل ودماغ اس لائق نہیں رہتے کہ وہ اللہ کا نام لے سکے۔ آپ نے کئی مدارس میں تدریسی خدمات انجام دیں، جب آپ نے محسوس کیا کہ فتنوں اور نزاع میں پڑے بغیر رہنا ممکن نہیں ہے تو آپ نے خاموشی سے وہ جگہ چھوڑ دی، حالانکہ اگر آپ وہاں سے نہ نکلتے تو بزور نکالنا ناممکن تھا۔ اس کا مشاہدہ ہم لوگوں نے شیخوپور میں بچشم خود کیا، بہت سے متعلقین نے اصرار کیا کہ آپ یہاں رہئے، کوئی طاقت آپ کو یہاں سے نہیں نکال سکتی۔ آپ کا جواب بس یہی تھا مجھے فتنوں اور نزاع میں نہیں پڑنا ہے، اور خاموشی سے وہ جگہ چھوڑ دی۔ یہی وجہ تھی کہ آپ نے اتنی مختصر مدت میں بغیر کسی انجمن اور ادارے کی مدد کے اپنے محدود وسائل کے ساتھ اتنا سارا کام کرلیا۔

شفقت اور خورد نوازی:

میں نے دیکھا کہ مولانا اپنے ہر ملنے والے سے پوری خندہ پیشانی اور توجہ کے ساتھ ملتے تھے، ایک خاص بات جو میں نے محسوس کہ وہ یہ کہ ایسے لوگ جن کی معاشرے میں کوئی حیثیت نہیں سمجھی جاتی تھی، جنھیں بالکل ناقابل التفات سمجھا جاتا تھا مولانا کے یہاں ان کی بڑی اہمیت تھی، ان پر بھی پوری توجہ فرماتے، اہتمام کے ساتھ ان کی باتیں سنتے، ان کے مسائل کو حل کرتے، ان کو تسلی دیتے۔ مولانا کے متعلقین میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی، جن کی آپ ہر طرح سے مدد

فرماتے تھے۔ ایک خط میں اپنے ایک شاگرد کو لکھتے ہیں:

> ’’میں چھوٹا آدمی ہوں۔ اسے تواضع پر محمول نہ کرنا، میں واقعی بہت چھوٹا ہوں............ میری چھوٹائی ہی کا اثر ہے کہ میرے پاس ان لوگوں کا مجمع رہتا ہے جن کو عرف عام میں چھوٹا سمجھا جاتا ہے، مثلاً یہ کہ میرے پاس اہل بہار کافی تعداد میں رہتے ہیں اور میں ان کی بڑی عزت کرتا ہوں، اور کسی کو اجازت نہیں دیتا کہ انھیں حقارت کی نگاہ سے دیکھے، تو کیا اس خیال و نظریہ اور عمل میں تم میرا ساتھ خوش دلی سے دے سکتے ہو، اگر دے سکتے ہو تو بہت خوب! اور اگر انقباض کے ساتھ رہوگے تو ضرر ہے۔‘‘

ہم لوگ دیکھتے تھے کہ بعض لوگ آتے ہیں بالکل پراگندہ حال و پراگندہ بال، اور مولانا مسجد سے نکل رہے ہیں تو ان کا ہاتھ پکڑے بات کرتے ہوئے کمرے تک آتے ہیں، اپنے ساتھ دسترخوان پر بیٹھا کر کھانا کھلا رہے ہیں، توجہ و شفقت کے ساتھ باتیں کر رہے ہیں اور واپسی میں کچھ ہدیہ بھی پیش کر رہے ہیں۔ اس طرح کے صاحب احتیاج لوگ بکثرت آتے تھے، اور مولانا اپنی حیثیت کے اعتبار ان کی مدد کرتے تھے۔ جبکہ اب تو عمومی احوال یہ ہیں کہ اگر کوئی مالدار شخص مدرسہ میں آجائے تو پورا مدرسہ حرکت میں آجاتا ہے اور اس طرح کے لوگ نہ جانے کتنے آتے جاتے رہتے ہیں لیکن کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ مولانا کے پاس ہر طرح کے لوگ آتے تھے، ایک سے ایک ذہانت و ذکاوت کے پتلے بھی، اور ایک سے ایک غباوت و سفاہت کے نمونے بھی، لیکن کمال کی بات یہ تھی کہ سب ان سے یکساں طور پر مطمئن رہتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ مولانا ہر ایک سے اس کی حیثیت کے مطابق باتیں کرتے اور اس کے احوال کے اعتبار سے نصیحت فرماتے۔

❑❑❑

ہماری عادتِ فراموشی اور غفلت میں انہماک کہیں اس درجہ تک ہم کو پہونچا نہ دے **نعوذ باللہ من شرور أنفسنا**، یہ درد سب سے بڑھ کر ہے، مدرسے قائم ہیں، وعظ ہو رہے ہیں، کتابیں لکھی پڑھی جارہی ہیں، مسجدوں میں کتابیں سننے اور سنانے کا اہتمام ہے، لیکن مرض ہے کہ زوروں پر ہے، دوا وہاں نہیں پہونچ رہی ہے جہاں مرض ہے، اس لئے علاج نہیں ہو رہا ہے، **فإلی اللہ المشتکیٰ**۔

بلند پایہ محقق ومصنف، عظیم مصلح وداعی، پیکر علم وعمل
حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب

مفتی شرف الدین عظیم قاسمی اعظمی شیخوپور اعظم گڑھ
امام خطیب جامع انوار شیواجی نگر گوونڈی ممبئی

یہ دنیا ایک سرائے فانی ہے، کیوں کہ اس میں نشو نما پانے والی زندگی محض محدود وقفہ اور مختصر مہلت کے لئے ہے جو ہر ایک کی نگاہوں کے سامنے دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو جاتی ہے۔ زندگی کے اس مختصر سفر میں یہ دنیا راستے کا درخت ہے۔ فرمان نبوی ہے ”**مالی وللدنیا وما انا والدنیا الا کراکب استظل تحت شجرة ثم راح وترکھا** (ترمذی) اس عارضی دنیا سے مجھے کیا سروکار؟ میرا اور دنیا کا رشتہ تو ایسا ہے جیسے کوئی راہگیر کسی درخت کے سائے میں تھوڑی دیر بیٹھ گیا پھر اسے چھوڑ کر اپنی منزل کی راہ لی۔ نظام عالم میں انسانی آمد ورفت کا یہ تسلسل اس قدر مشاہدے میں ہے کہ زندگی کے ہنگامے میں موت کے سناٹے کا تسلط کوئی حیرت انگیز اور تعجب خیز امر نہیں رہا۔

لیکن موت وحیات کے اس کارگہ عالم میں کچھ ایسی عظیم المرتبت ہستیاں بھی ہوتی ہیں جو اپنے زریں اور تاریخی کارناموں کی وجہ سے ”ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ماست“ کی واضح ترین علامت اور انمٹ نقوش بن کر اس صفحہ ہستی پر بسنے والے انسانوں کے قلوب کے لئے ناقابل فراموش بن جاتی ہیں۔ جن کی وفات پر نہ صرف اہل تعلق رنجور ہوتے ہیں بلکہ اجنبی قلوب بھی دلفگار اور ان کی آنکھیں اشک بار ہو جاتی ہیں، اور ارادت مندوں کے لئے ان کی ہر نقل وحرکت

خوبصورت یاد اور راہ حیات کی تاریکیوں میں روشنی عطا کرنے والا قیمتی اثاثہ بن جاتی ہیں۔ ان ہی خوش نصیب اور سعادت مند ہستیوں میں سے ایک عظیم ہستی، پیکر علم وعمل، جامع کمالات، اکابر و مشائخ کے پرتو، عارف باللہ حضرت الاستاذ مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب رحمۃ اللہ علیہ واسعۃ کی بھی تھی، جن کی وفات حسرت آیات کے عظیم ودلفگار سانحہ کی وجہ سے ہر حلقے میں رنج والم اور سوگ و اضطراب کی لہر دوڑ گئی ہے۔ درسگاہیں ماتم کناں ہیں کہ علم وفن کا بحر بیکراں رخصت ہوگیا، علمی اداروں اور تنظیموں میں ہنگامہ ہے کہ علوم نبوی کی ایک شمع روشن خاموش ہوگئی، ارادت مندوں اور عقیدت مندوں میں شور بپا کہ ہم ایک بے مثال مصلح ومربی کی رحلت کی وجہ سے یتیم ہوگئے، علمی و فکری فضاؤں پر سناٹا چھا گیا، خانقاہوں میں صف ماتم بچھ گئی، تاریکیوں میں مزید اضافہ ہوگیا، مصنفین واہل قلم سوگوار کہ علمی، فکری، ادبی، تاریخی اور اصلاحی عناوین کے اوراق پر نہایت تیز گامی سے چلنے والے ایک قلم کی حرکت رک گئی، اہل تعلق اشک بار کہ ان کی قیمتی متاع حیات کو موت کے بے رحم پنجوں نے چھین لیا جو علم وادب، حرکت وعمل، جہد مسلسل، ایثار وقربانی کی ایک طویل تاریخ رکھتی تھی۔

ویران میکدہ ہے خم وساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

علم وفن کا نیر تاباں:

مبدأ فیاض نے استاذنا المعظم کو ان تمام خوبیوں اور صلاحیتوں سے نوازا تھا جو خاک ارض کو کیمیا اور ذرے کو آفتاب کی صورت میں جلوہ گر ہونے میں مرکزی کردار ادا کرتی ہیں۔ آپ کی ذات علم وعمل، فضل وکمال، صلاح وتقوی اور اخلاص وللّٰہیت کی مظہر جمیل تھی۔ آپ نے ام المدارس دارالعلوم دیوبند کی نہج پر قائم گاؤں کے اک چھوٹے سے مکتب اور پھر درس نظامی کے خطوط پر چلنے والے ادارے میں عام تشنگان علم کی طرح اپنے علم کی پیاس بجھائی مگر ذہانت و ذکاوت، فہم وفراست کی خداداد صلاحیتوں اور حصول علم ومعرفت کی سچی تڑپ اور جذبہ صادق کی بدولت راہ علم وفن کے ہر گام پر کامیابیوں اور کامرانیوں کی تمام منزلوں کو عبور کرتے گئے اور پھر امتیازی شان کے ساتھ افق علم پر اس طرح نیر تاباں کی طرح جگمگائے کہ ہم عصروں کی نگاہیں آپ

کی علمی وعملی معراج کی تابانیوں کو دیکھ کر خیرہ وششدر رہ گئیں۔ اخذ واکتساب کی اللہ تعالی نے آپ کو وہ استعداد عطا کی تھی کہ علوم اسلامی کے جس صنف کی طرف آپ کی توجہ ہوتی، وہ مکمل آپ کی دسترس میں آجاتی۔ ایسا لگتا کہ آپ خاص طور پر اسی فن کے شناور اور اسی بحر بیکراں کے غواص ہیں، حالانکہ حقیقتِ واقعہ یہ ہے کہ علوم اسلامی کے تقریباً تمام فنون پر آپ کو قابل رشک حد تک تبحر اور قدرت حاصل تھی۔ بلاشبہ حضرت الاستاذ بیک وقت باکمال اور فیض رساں مدرس بھی تھے اور عبقری معلم اور مدبر و مربی بھی، فقہ وحدیث کے شناور بھی تھے اور تاریخ وسوانح کی وادی تحقیق کے فکر انگیز اور اثر انگیز نثر نگار بھی، دلوں کی دنیا میں محبت رسول کا دریا موجزن کرنے والے سحر انگیز داعی و خطیب بھی تھے، اور بھٹکے ہوئے آہو کو سوئے حرم لانے والی، اور شہر کے ہنگاموں کی خوگر طبیعتوں کو وسعت صحرا سے ہم کنار کرنے والی گراں بہا علمی، دعوتی، ادبی تحریروں کے حوالے سے ایک عظیم مصنف بھی۔ حاصل یہ کہ آپ ایسے ہمہ جہت، ہمہ وصف اور ہمہ گیر عالم تھے جو طویل مدتوں میں روئے زمین پر جلوہ گر ہوتے ہیں، اور اپنی انفرادیت کے لازوال نقوش اس صفحہ گیتی پر قائم کر کے رخصت ہو جاتے ہیں، تاکہ آنے والی نسلیں ان نقوش کو مشعل راہ قرار دے کر اس کی روشنی میں زندگی کے سفر کی صحیح سمت متعین کر کے شادکام اور سرخ رو ہوں۔

مدت کے بعد ہوتے ہیں پیدا کہیں یہ لوگ
مٹتے نہیں ہیں دہر سے جن کے نشاں کبھی

فیض رساں مدرس و معلم:

برصغیر میں رائج درس نظامی کے تمام فنون پر حضرت الاستاذ کو یکساں عبور حاصل تھا، اخذ و اکتساب کی بے پناہ استعداد کے ساتھ ساتھ علم وفن کے انتقال وترسیل کی صلاحیت بھی قدرت نے وافر مقدار میں عطا کی تھی، جس کی وجہ سے رسمی فراغت کے بعد جہاں بھی آپ نے تدریسی فرائض انجام دیئے طالبان علوم کے ذہنوں پر ممتاز لیاقت کے دیرپا اثرات اور علم ومعرفت کے لازوال نقوش ثبت کر دیئے۔ آپ کے درس کی یہ خصوصیت تھی کہ لفظی تعقیدات اور پیچیدہ تعبیرات سے بالکل پاک، سادہ اور آسان زبان میں اس طرح ہوتا کہ ذہین وفطین طلبہ کے علاوہ ادنی فہم اور کمزور ذہن کے طلبہ بھی پیچیدہ عبارات کے مفاہیم ومطالب کو آسانی سے ہضم کر لیتے، فن کی

مناسبت سے معتدل اور پر مغز کلام کرتے، نہ بہت اختصار کہ مطالب چیستاں بن جائیں اور نہ اس قدر طوالت اور دراز بیانی کہ الفاظ وتعبیرات کی فضاؤں میں اصل مضمون ذہنوں سے محو ہو جائے۔ علم وفن کی ترسیل وتشریح کی نادر وساحرانہ صلاحیت کا نتیجہ تھا کہ پروانہ علم، مجلس علمی کی پہلی ہی منزل میں اس روشن فانوس پر نثار ہو جاتے اور عقیدت والفت کا نہ مٹنے والا گہرا نقش ہمیشہ کے لئے ان کے دلوں پر قائم ہو جاتا۔

حضرت الاستاذ کے درس کی ایک نمایاں خصوصیت جوان کے ہم عصروں میں انہیں ممتاز مقام عطا کرتی ہے، یہ ہے کہ وہ کتاب علم کے ساتھ ساتھ کتاب زندگی کے دستور وآداب اور اسرار و رموز سے بھی شاگردوں کو آشنا کرتے رہتے تھے۔ عام اداروں کی طرح ان کا درس محض فنون کی موشگافیوں کے انکشاف کا رسمی کلاس روم نہیں تھا بلکہ اصلاح وارشاد اور سیرت وکردار سازی کی ایسی درس گاہ تھی جس میں سلف کے نہج کے مطابق ذہن ودل کو اسلامی روح سے ہم آہنگ کیا جاتا تھا۔ تعلیم کے ساتھ کردار سازی ہی اسلاف کا طرۂ امتیاز تھا کہ طالبان علوم اسلامیہ کے قلوب، علمی سرمایہ کے ساتھ روحانیت، عبودیت اور اخلاص وتقوی کے گرانمایہ خزانوں سے معمور ہو جایا کرتے تھے۔ حضرت الاستاذ کی تدریسی مجلس انہیں اسلاف کی مجلس علمی کا واقعۃً آئینہ تھی۔ آپ کے حلقہ درس کا فیض یافتہ زندگی کے اصول وضوابط، اس کے عظیم مقاصد کا آشنائے راز اور یقین محکم، عمل پیہم اور خالق حقیقی اور اس کے محبوب رحمۃ للعالمین ﷺ کی والہانہ محبت کی نعمت سے سرشار رہتا تھا۔

رجال ساز و بے نظیر مربی:

دینی ادارے درحقیقت ایک ایسی درس گاہ ہیں جہاں مردم گری وانسانیت سازی کا عظیم کارنامہ، تربیت واصلاح کے ذریعے انجام دیا جاتا ہے، کیوں کہ اسلامی علوم کے حصول کا عظیم تر مقصد ہی یہی ہے کہ انسان اپنی اور اپنے خالق کی حقیقت کو پہچان لے۔ اس مقصد سے انحراف کی صورت میں علم بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس لئے کہ علم برائے تحقیق ومعلوماتِ محض کی اسلام کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے، محض علم وذہانت کی بنیاد پر، بیدار مغز مرد مومن کی رہنمائی کے بغیر راہ عمل پر سفر کرنے والے اکثر وبیشتر افراد الحاد وتشکیک کی ایسی پرخار وادی میں پہونچ جاتے ہیں جہاں ان کی عقل وفہم اور فکر ونظر زخم زخم اور ایمان وعقیدہ کے صاف وشفاف دامن تار تار ہو جاتے

ہیں۔ اس نتیجہ خیز تجربہ ومشاہدہ نیز وسعت علم ومطالعہ اور وادئ احسان وتزکیہ کی سیاحت کی بنا پر حضرت الاستاذ کی توجہ طلبہ کی تربیت واصلاح کی طرف زیادہ مرکوز رہتی تھی، وہ ہر فرد کو عموماً اور طالبان علوم کو خصوصاً اسلامی رنگ میں دیکھنا چاہتے تھے، اور اس کے لئے حتی الامکان فکری وعملی اعتبار سے ساری کوششیں صرف کر دیتے تھے۔

مادہ پرستی کے اس ایمان کش دور میں عصری دانش گاہوں کے علاوہ دینی مدارس میں بھی تربیت کے نام پر خودساختہ قوانین کا جو تسلط ہے اور اس کے نتیجے میں قانون کے خوف کے سائے میں بادل ناخواستہ کندھے کا بوجھ سمجھتے ہوئے مفوضہ فرائض کو طلبہ اسلامی ادا کرتے ہیں، اس حکمت علمی اور طریقۂ کار کے حضرت الاستاذ قطعاً قائل نہیں تھے بلکہ آپ کے یہاں قانونی سختیوں کی حکمرانی اور بے جا تضریب وتادیب کی شدت کا کوئی تصور نہیں تھا، وہ شفقت ومحبت میں ڈوبی ہوئی علم خیز اور حکمت ریز، نرم وشیریں گفتاری، ذہن ودل کو اسلامی روح ومزاج میں ڈھالنے والے اکابر واسلاف کے عقل کشا اور بصیرت افروز حکایات وواقعات کے ذریعہ عمل اور ترکِ عمل کے سود وزیاں کے حقائق کو اس طرح آشکارا کرتے کہ حاضر طلبہ کے دلوں میں امتثالِ اوامر اور ترکِ منکرات کے جذبات کا دریا موجزن ہو جایا کرتا، اور پھر وہ زندگی کے تمام گوشوں میں سنت نبوی پر کاربند ہونے کے خوگر ہو جایا کرتے۔

ایک شفیق باپ کی طرح لامحدود محبتوں سے لبریز دردمندانہ پند ونصائح کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ آپ کے زمانۂ قیادت میں جہاں ایک طرف اساتذہ صلہ وستائش کی پرواہ کئے بغیر انتہائی اخلاص کے ساتھ تدریسی فرائض میں مشغول رہتے تو دوسری طرف عام طلبہ اخلاق وکردار، عادات واطوار اور اعمال وافعال میں حقیقی طالبان اسلامی کی سچی تصویر تھے۔ یہی وجہ تھی کہ متعینہ اوقات درس کے علاوہ دیگر اوقات مطالعہ میں ان کی نگرانی عام اداروں کی طرح نہیں کی جاتی تھی کہ طلبہ کے اپنے مقاصد کے حصول میں انہماک کی وجہ سے اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ کیوں کہ محبت و شفقت کے سائے میں پروان چڑھنے والا وجود خود محبوب کی تمام حرکات وسکنات کو اپنی ذات کے اندر جذب کرنے میں فخر وسعادت محسوس کرتا ہے، اور یہ بات بلا تأمل کہی جاسکتی ہے کہ حضرت الاستاذ کے قلب میں اپنے تمام ارادت مندوں، شاگردوں کے متعلق جو تڑپ اور ان کی تعمیر حیات

کی فکر تھی، الفت ورحم دلی کا جو جذبہ تھا اور اس کے ساتھ ملت کی زبوں حالی کا جو درد وقلق تھا، اس زر پرست عہد میں انسانیت کی ان عظیم صفات کی حامل شخصیت تلاشِ بسیار کے باوجود بھی شاید نہ مل سکے۔

آئے عشاق ، گئے وعدہ فردا لے کر
اب انہیں ڈھونڈھ چراغ رخ زیبا لے کر

قلب میں سوز اور روح میں احساس کی شدت کا یہ عالم تھا کہ متعارفین ومتوسلین، خصوصاً طالبان علوم دینیہ کے پریشان کن اور آزمائشی لمحات میں حضرت کی رقیق القلبی اور سوز دروں اکثر چشم اشک بار کی صورت میں ظاہر ہو جایا کرتا۔ مادہ پرستی کی خودغرض فضاؤں میں استاذ کا خلوص، مربی ومرشد کے بے پناہ الفت اور ایک باپ کی بے لوث محبت کے عناصر زریں سے آراستہ آپ کی ذاتِ مجمع الکمالات یقیناً صحرا و بیاباں کی تاریکیوں میں قندیل رہبانی سے کم نہیں تھی، جس کی نظیر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ ع

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہوں جسے

صورت وسیرت:

حضرت الاستاذ کا سراپا علم وعمل کی ظاہری وباطنی خوبیوں سے معمور تھا، حرارت ایمانی و حب نبوی کی کرنیں چہرے پر کھیلتی رہتی تھیں۔ آپ کا چہرہ روشن، پیشانی کشادہ، آنکھوں میں ذکاوت علم اور فراست ایمانی کا نور، قد دراز اور جسم متوازن اور بھرا ہوا تھا۔ چہرے بشرے پر عظمت وجلال اور ہیبت ووجاہت نمایاں تھی۔ عام انسان آپ سے ہم کلام ہونے کی جرأت وہمت نہیں کر پاتا مگر مجلس میں تھوڑی دیر کی حاضری میں یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہتا تھا کہ آپ کی بارعب شخصیت کے داخلی عناصر الفت ومحبت، ہمدردی وغمگساری، اخوت ورحم دلی کی انمول صفات عالیہ سے لبریز ہے۔ سنگ دلی، سخت گیری، قساوت وبیدردی سے ان کا قلب ناآشنا ہے، اس لئے کہ حضرت الاستاذ خوش مزاج، خوش فکر، کشادہ قلب اور فیاض نفس تھے، وہ الفت وہمدری کا پیکر مجسم تھے۔ اپنی نرم خوئی، نرم مزاجی، نرم گفتاری اور شیریں کلامی سے لوگوں کے دلوں میں گھر کر جاتے تھے، نتیجتاً آپ سے وابستگی کو متعارفین روح کی بالیدگی اور قلب ونظر کے سرور ونشاط کا سامان خیال

کرتے تھے۔

مذکورہ اعلی انسانی اقدار کے باعث آپ کی تربیتی واصلاحی کوششیں زندگی کے ہرمحاذ پر ثمرآوراور نتیجہ خیز ثابت ہوئیں، اس لئے کہ مردم گری ورجال سازی محض کاغذی علم کی بنیاد پر ممکن نہیں۔ علم کے ہمالیائی منزل پر جلوہ فگن ہونے کے باوجود استاذ گرامی ہمیشہ طالب علم ہی رہے، علم سے جنون کی حدتک انہیں عشق تھا۔ آپ کی قیام گاہ جوطلبہ کی درس گاہ بھی تھی، اس میں چاروں طرف الماریوں میں مختلف علوم وفنون پر مشتمل ظاہری وباطنی حسن سے آراستہ شاہکاراور نادر و نایاب عربی واردو کتابوں کا ذخیرہ آپ کے اعلی علمی، ادبی، تحقیقی مزاج کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

عبادت وریاضت میں انہماک:

علمی، تربیتی اور معاشرتی ہمہ گیر مشغولیات کے باوصف حضرت الاستاذ عبادت و ریاضت اور عبودیت وفنائیت کے اس مقام پر تھے جہاں ہروقت عشق الٰہی کا غلبہ اوراس کی یاد، اس کے ذکر کی مستی وشوریدگی چھائی رہتی ہے۔ عبدیت کے اس فطری ذوق کو آپ کے شیخ ومربی حضرت مولانا عبدالواحد صاحب کی نظر کیمیا اثر نے دوآتشہ کردیا جس کا اثر یہ تھا کہ سنت نبوی علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کی روشنی میں تمام نوافل واذکار آپ کی تشنگی دور کرنے کا سامان بن گئے۔

ہے غرض کسی سے نہ واسطہ مجھے کام ہے اپنے کام سے
ترے ذکر سے تری فکر سے تری یاد سے ترے نام سے

شب بیداری اور لذت سحرگاہی سے آپ کا قلب اس قدر مانوس وآشنا تھا کہ سن شعور سے لےکر زندگی کے آخری ایام تک سحرخیزی کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا ہمیشہ آپ کی زبان معبود حقیقی کی یاداوراس کے ذکر سے تر رہتی تھی، اور کیوں نہ ہوتی؟ زندگی کے ہرگام پر توفیق الٰہی و عنایات الٰہی آپ کے ہمراہ رہی ہے، جس کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ راہ حیات کے ہرنشیب وفراز میں آپ نے اصل رشتہ وسچی وابستگی خدائے قادر ووہاب سے ہی قائم رکھی۔ حالات کی استواری ہو یا ناہمواری، کسی مقام پر بھی توکل علی اللہ اور مخلوق سے استغنائیت وبے نیازی کی عظیم صفت سے بے اعتنائی برت کر اپنی ذات کو مجروح نہیں ہونے دیا، اوراس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مذکورہ اوصاف کو اپنی ذات میں جذب کرنے کے بعد ہی انسان خدا کی نصرت وعنایت کا حقیقت میں

مستحق ہوتا ہے، اس لئے کہ یہ چیزیں ایمانی صلابت اور عقیدے کی غیر متزلزل مضبوطی کے بعد وجود میں آتی ہیں۔ مادیت کے اس دور میں اکثر خواص کا دامن ان صفات سے خالی ہے تو عوام کا ذکر ہی کیا کہ ان کی زندگی کی تمام گردشیں اسباب ہی کے گرد گھومتی ہیں۔

صبر وتحمل کا کوہ گراں:

استاذ گرامی کی ممتاز صفات میں سے ایک اہم صفت گردش لیل ونہار کے صبر آزما اور حوصلہ شکن مراحل میں صبر وشکیبائی اور حلم وبرباری بھی تھی۔ زندگی کے اس سفر میں کیسی کیسی خاردار وادیاں آئیں، مخالفین کی جانب سے طنز وتعریض کی چٹانیں سدراہ ہوئیں، ناگہانی امراض کے مختلف جانکاہ طوفان آئے، لخت ہائے جگر کے فراق وجدائی کے اچانک ایمان شکن سانحات رونما ہوئے مگر صبر ورضا کے اس مسافر کے پائے ثبات میں کسی مقام پر بھی لغزش پیدا نہیں ہوئی۔ اپنے مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں یہ حقیر راقم مکمل اعتماد اور وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ سنگین سے سنگین تر خونچکاں حالات میں جب انسان مایوسیوں کی خوفناک تاریکیوں میں ڈوب کر حواس کھو بیٹھتا ہے حضرت الاستاذ ان جاں گسل لمحات میں بھی جس طرح صبر وضبط اور تحمل وبردباری سے کام لیتے تھے، تقدیر پر کامل ایمان کے نتیجے میں جس طرح حوادثات پر راضی برضا رہتے تھے، یہ انہیں کا حصہ تھا۔ عام آدمی یہ سمجھ ہی نہیں سکتا تھا کہ آپ کی ذات کے نہاں خانے میں رنج والم کے کس قدر جگر خراش طوفان چھپے ہوئے ہیں۔ متعدد مواقع پر ہم نے دیکھا ہے کہ بارہا مخالفین کے ضرر رساں اور اذیت رساں اعمال وکردار سامنے آئے مگر اس حلم وبردباری اور صبر ورضا کے پیکر جمیل نے نہ صرف یہ کہ خاموشی اختیار کر کے اعلی ظرفی کا ثبوت دیا بلکہ خلوت وجلوت کی کسی محفل میں بھی حرف شکوہ زبان پر آنے نہیں دیا کہ خالق کے علاوہ مخلوق کے سامنے رازہائے دل شکستہ کے انکشاف کو وہ کسی بھی حالت میں سودمند نہیں سمجھتے تھے، اور یہی وہ وصف ہے جس نے آپ کی ذات کو عارفین کی صف میں کھڑا کیا ہے۔

کسی نے زہر غم دیا تو مسکرا کے پی گئے
تڑپ میں بھی سکون تھا خلش بھی سازگار تھی

حسین یادوں کے اجالے:

انسان کی عظمت و بزرگی اور اس کے قد کی بلندی کا راز یہ ہے کہ جس طرح وہ اپنے بزرگوں کے تقدس اور ادب واحترام کے پاس ولحاظ کو سعادت وخوش بختی تصور کرتا ہے، اسی طرح اپنے چھوٹوں پر شفقت ومحبت، رحم دلی ومہربانی کی فرحت بخش چادر ڈال کر ان کی تعمیر وترقی کے لئے ہمہ وقت کوشاں رہتا ہے۔ حضرت الاستاذ کی تمام مجلسوں میں انسانیت کی یہ صفت نمایاں طور پر محسوس ہوتی تھی، وہ اپنے ہم جنسوں اور شاگردوں سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے۔ ایک عام طالب علم جس نے کبھی بھی ان کے سامنے براہ راست زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا، اس کے ساتھ بھی آپ کا رویہ انتہائی کریمانہ ہوتا تھا، اس کے کیف آگیں لمحات پر اظہار مسرت کے ساتھ نامساعد حالات پر دل گرفتہ اور بے قرار ہو جاتے، نیز یکساں طور پر تمام طلبہ کے تابناک مستقبل کے لئے ہمیشہ فکرمند اور بے تاب نظر آتے۔

راقم آثم درس نظامی کی متعدد کتابوں کے ذریعے براہ راست حضرت سے خوشہ چینی کے باوجود آپ کی بارعب شخصیت اور کچھ فطری تکلف وحجاب کے باعث خدمت اقدس میں خال خال ہی حاضری کی سعادت حاصل کر پاتا تھا اور یہ کیفیت فضیلت کی رسمی فراغت کے بعد بھی قائم رہی، تاہم جب بھی آپ کی زیارت سے مشرف ہوتا، انتہائی شفقت آمیز اور انسیت ریز کلمات کے ذریعے اس طرح احوال دریافت کرتے کہ لفظ لفظ سے اپنائیت کی جاں نواز خوشبو پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی۔ آج سے تین سال قبل ناچیز بمبئی میں سخت امراض متعددہ کا شکار ہو گیا تھا، وطن آنے کے بعد جب حصول نیاز کے لئے حاضر خدمت ہوا تو انتہائی دل سوزی کے ساتھ دیر تک بیماری کے اسباب وعلاج کی دریافت اور دلجوئی فرماتے رہے، حالانکہ اس وقت آپ کے گھر میں صاحبزادۂ محترم مولانا محمد عابد صاحب قاسمی کے دو اور مولانا محمد راشد صاحب قاسمی کے ایک بچے کی یکے بعد دیگرے کمسنی کے عالم میں اموات کے جانکاہ حادثے کی وجہ سے خود سخت اذیت اور صدمے سے نڈھال تھے۔ ایک ادنی شاگرد کے ساتھ جو ان کی علمی وروحانی مجلسوں سے اکثر محروم رہا، اپنائیت و الفت کے اس کریمانہ سلوک سے، میکدۂ عرفان ومحبت کے میخوار پر آپ کی نوازشات وعنایات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

راہ حیات کی آخری منزل میں جب جاں سوز امراض اور مخالفین کے جگر سوز کردار و عمل سے آپ رنجور و دل شکستہ تھے، اس وقت بھی بمبئ کی عارضی قیام گاہ پر ملاقات کے دوران صبر و رضا کے اس پیکر مجسم کو داخلی و خارجی تکالیف سے بے پرواہ دعوتی و اصلاحی سرگرمیوں میں ہماری آنکھوں نے متحرک دیکھا۔ آپ کی جاوداں و پیہم رواں زندگی کے سنہرے واقعات اور خوبصورت یادیں جو دل کے نہاں خانے میں پوشیدہ ہیں اسے کس طرح قید تحریر میں لایا جائے۔

یاد سے تیری دلِ درد آشنا معمور ہے
جیسے کعبے میں دعاؤں سے فضا معمور ہے

اقلیم قلم کا فصیح و بلیغ اور بے باک تاجدار:

اردو زبان و ادب کے حوالے سے حضرت الاستاذ ان مسلم ادبا فصحا اور محققین کے زمرے میں شامل ہیں جن کی تحریریں فصاحت و بلاغت، لطافت و جاذبیت، دلکشی و رعنائی کے لحاظ سے امتیازی شناخت رکھتی ہیں۔ آپ کا صاف ستھرا اعلی ادبی مذاق، فکر کی گہرائی، تخیل کی بلند پروازی، قلب کا سوز دروں وہ عطیہ الٰہی ہے جو ہر شخص کو حاصل نہیں ہوتا۔ آپ کی تحریروں میں مؤرخ کی دیدہ وری، محدث کی عرق ریزی، فقیہ کی بصیرت مندی، سوانح نگار کی سلیقہ مندی اور نثر نگار کی سحر انگیزی سطر سطر سے نمایاں ہے۔ آپ نے خداداد لیاقت و صلاحیت، مطالعہ کی وسعت، علم کی گہرائی و گیرائی کے ساتھ ساتھ خیال کی ندرت و انفرادیت، جملوں کی فصاحت، الفاظ کی بلاغت، جاں نواز متنوع پیرایہ بیان، اسلوب کی طرح داری، طرز ادا کی جادو بیانی، خوبصورت تشبیہات اور عمدہ استعارات سے مرصع تحریروں کے ذریعے عصری درس گاہوں کے علم برداران زبان و ادب کے اس خیال اور نظریہ کو یکسر غلط ثابت کر دیا کہ دینی اداروں کے پروردہ علما تحریر و قلم کے میدان میں زبان و ادب کے اصول و ضوابط اور اس کے اسرار و رموز سے یکسر نا آشنا ہوتے ہیں، اور یہ کہ ان کی تحریریں خشک بے مزہ اور دل کشی و جاذبیت سے تہی مایہ ہوتی ہے۔

استاذ عالی مقام کے گہر بار قلم سے ضخیم علمی، تحقیقی اور سوانحی تصنیفات کے علاوہ مختلف اسلامی و ادبی موضوعات پر سینکڑوں مقالات و مضامین منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے اور برصغیر کے معیاری رسالوں کی زینت بنے۔ وہ دعوتی و اصلاحی موضوع کو قرطاس و قلم کے سپرد کرتے یا تاریخ

وسوانح نگاری کرتے، تحقیقی وتنقیدی تحریریں لکھتے یا تذکرہ نویسی کرتے، ہر جگہ ہر مقام پر زبان کی لطافت، شگفتگی وبرجستگی، سلاست وروانی کی لہریں دوڑتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ آپ کی نگارشات کا یہ امتیاز ہے کہ جہاں دقیقہ رسی وژرف نگاہی کے عناصر سے مزین وآراستہ ہیں، وہیں آپ کی ذہانت وذکاوت، علم وعمل کی جامعیت، عشق نبوی کی تڑپ، ماضی کے دھندلکوں سے حال ومستقبل کی نتیجہ خیز معرفت کے حصول کی حیرت انگیز صلاحیت، پردۂ باطل کو چاک کرنے کی غیر معمولی مہارت، لفظ لفظ میں آفتاب نیم روز کی طرح واضح اور روشن ہیں۔

آپ تاریخ، تفسیر، فلسفہ، تراجم، سفرنامہ، اور تذکرہ وسوانح کے علاوہ ایمانیات وعبادات اخلاقیات ومعاملات، روحانیت ومعاشرت کے متنوع موضوعات پر علمی وتحقیقی کتابیں تصنیف کرکے اسلامی کتب خانوں کو مالا مال کیا ہے۔

قرآنی علوم کے بحر ناپیدا کنار کے شناور:

اہل اللہ کی زندگیوں کا نہایت اہم اور روشن پہلو ہے کہ محبوب حقیقی، خالق کائنات کا کلام ان کے درد کا درماں اور روح کی تسکین کا اہم سامان ہوتا ہے۔ حضرت الاستاذ کی زندگی قرآن سے شغف اور اس کو حرز جان بنالینے کے حوالے سے اسلاف کا آئینہ تھی کہ انہوں نے قرآن کی تلاوت کو زخم کا مرہم اور اس کے معانی ومفاہیم کی لامحدود گہرائیوں میں غواصی کرکے معرفت الہیہ کے حصول کو اپنا محبوب مشغلہ بنالیا تھا۔ آپ کی علمی ودعوتی سرگرمیوں میں یہ مقصد بڑی اہمیت کا حامل تھا کہ کلام الٰہی کے علوم ومعارف سے عوام الناس کو روشناس کرایا جائے۔ چنانچہ اس عزم اور تڑپ کو عملی شکل آپ نے اسی وقت دیدی تھی جب تدریسی وتربیتی زندگی میں قدم رکھا تھا۔ شیخوپور آنے کے بعد شہر اعظم گڑھ کی مرکزی جامع مسجد میں تو باضابطہ ہر اتوار کو بعد نماز مغرب تقریباً ۲۳؍سال کے طویل عرصے تک درس قرآن کے ذریعے لوگوں کی دینی وعلمی پیاس بجھائی، اور ہوا وہوس کی تاریکیوں میں بھٹکنے والے بے شمار افراد کو سنت نبوی کی شاہراہ پر گامزن کیا۔

آپ کی مجلس تفسیر کی یہ خصوصیت تھی کہ عوام وعلما کے علاوہ شہر کے ڈاکٹروں اور عصری درس گاہ شبلی کالج کے آزاد فکر لکچرروں اور پروفیسروں کی بڑی تعداد موجود رہتی تھی، اور نہایت دلچسپی اور شوق کے ساتھ حالات حاضرہ کے تناظر میں فکر اسلاف کی ترجمانی کرنے والی علمی وتحقیقی تقریر

کے ذریعے علم ومعرفت کی دولت سے سرفراز ہوتی تھی۔

علوم قرآنی میں گہری بصیرت، اس کے ادبی، لسانی، معاشرتی اور قانونی اسرار ورموز سے حضرت الاستاذ کی بے مثال واقفیت اور لطیف پیرائے، باثر اسلوب میں دلوں کے اندر علوم کو جذب کرنے کی صلاحیت کے لحاظ سے تفسیری میدان میں آپ کی ذات نمایاں مقام رکھتی ہے۔ اسلامی نظام واحکام کے تئیں شکوک وشبہات کی خاردار وادیوں میں رہنے والے عصری درس گاہوں کے پروردہ اذہان کو دین کے تمام شعبوں میں مطمئن اور قائل کر کے ان کے اندر عمل کا جذبہ پیدا کر دینا آسان کام نہیں ہے لیکن زمانے نے دیکھا کہ علم وعمل، اخلاص اور سوز دروں کے ذریعے آپ نے عامۃ الناس کے علاوہ روشن خیال افراد کے قلوب کو اس طرح اسلام کی حقانیت و روحانیت سے روشناس کرایا کہ وہ اسلامی سانچے میں مکمل طور پر ڈھل گئے اور ہمیشہ کے لئے آپ کے دست گرفتہ ہو گئے۔

تدریس کے ذریعے تفسیری خدمات کے علاوہ اپنی خوبصورت وشگفتہ تحریری صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے آپ نے سورہ فاتحہ سے سورہ مائدہ تک درس نظامی کی مقبول ترین تفسیر ’’جلالین‘‘ کی روشنی میں قرآن کی علم وحکمت سے معمور تشریح بھی کی ہے۔ اردو زبان میں کم از کم سات سو صفحات پر محیط یہ شرح مسمی ’’تسہیل الجلالین‘‘ حل عبارت، حسن ترتیب، لسانی ترکیب، ادبی تحقیق، اسباب نزول، تفسیری نکات اور آسان وعمدہ پیرایہ بیان کے لحاظ سے جامعیت و معنویت کی شاہکار ہے۔

ترفع وخود پسندی کی راہوں میں روشنی کا سفر:

انسانی نفسیات کے متضاد اوصاف کا ایک تاریک پہلو یہ ہے کہ اخلاق وعمل اور حسن کردار کے تعمیری عناصر سے اپنی زندگی کو آراستہ کئے بغیر معاشرے میں عظمت ورفعت کی امتیازی شناخت کے حصول کا ہمہ وقت خواہاں رہتا ہے، اور اس آرزو کی تکمیل کے لئے ہوائے نفس کے زیر اثر انسان، اہل فضل وکمال کی رفعتوں کو یا تو تسلیم نہیں کرتا اور اگر کرتا ہے تو اس کے اعتراف میں جذبہ خود رائی اور احساس برتری مانع ہو جاتا ہے۔ پس علم وکمال کے درخشاں آفتاب پر کردار کشی اور طعنہ زنی کی خاک ڈال کر اس کی روشنی کو قید کرنے کی سعی نامسعود جہاں ظرف وطبیعت کی تنگی کا

نتیجہ ہے، وہیں شہرتوں کی فضاؤں میں یکتائی کا جذبہ بھی کارفرما رہتا ہے کہ چراغ نمائش کی شعاؤں کا وجود آفتاب کی پردہ پوشی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

نہ جانے کتنے چراغوں کو مل گئی شہرت
ایک آفتاب کے بے وقت ڈوب جانے سے

حضرت الاستاذ نے علمی زندگی میں جب قدم رکھا اور جامعہ اسلامیہ بنارس، مدرسہ دینیہ غازی پور، وصیۃ العلوم الہ آباد کے اداروں میں تعلیمی، تدریسی، تحریری، تبلیغی سرگرمیوں کی راہ میں حوصلہ افزا و ہمت شکن مراحل سے گزرتے ہوئے جامعہ ریاض العلوم گورینی جونپور میں مسند تدریس پر فائز ہوئے تو آپ کی خداداد لیاقت وصلاحیت، روح کو اسیر کر لینے والے انداز تدریس، طبیعت کی پاکیزگی اور نرم خوئی نے طلبہ کے دلوں میں اس طرح الفت وعقیدت کا نقش قائم کیا کہ جامعہ کے بیشتر طلبہ حسن اخلاق وکردار کی وجہ سے آپ کے گرویدہ ہو گئے۔ اور یہ بات مسلم ہے کہ بعض بیمار ذہنیت کے حاملین جو محض حرف علم سے آشنائی کے ذریعہ ہفت آسمان کی سرحدوں کو عبور کرنے کی تمنائے ناکام رکھتے ہیں، جبکہ تزکیہ واحسان کی راہوں اور اس کی منزلوں سے ان کے قلوب ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں گزرے۔ خصوصاً تنگ ظرف ارباب انتظام ہمیشہ ماتحتوں کی عظمت سے خائف رہتے ہیں، جس کی وجہ سے عمل پیہم اور اخلاص وفا کے نتیجے میں ظاہر ہونے والی نفع بخش کرنیں خود مینارۂ نور کے لئے اذیت رساں بن جاتی ہے۔

مذکورہ ادارہ میں حضرت الاستاذ کی مقبولیت اور روشنی طبع ان کے لئے راہ کا کانٹا بن گئی اور حالات کی نامساعدت سے مجبور ہو کر اس ادارہ کو خیرباد کہا اور اپنے محبوب استاذ حضرت مولانا مسلم صاحب بانی جامعہ حسینیہ جونپور کی ایماء پر شیخو پور اعظم گڑھ کا قصد کیا۔

گذرے چمن کی ہر خوش و ناخوش فضا سے ہم
لیکن کبھی ہٹے نہ حدود وفا سے ہم

مدرسہ شیخ الاسلام شیخو پور میں ہمہ گیر سرگرمیاں:

ریاض العلوم کے بعد علم وادب اور فضل وکمال میں انفرادی شان رکھنے والی یہ عظیم ہستی شہر اعظم گڑھ کے شمالی دیہات میں واقع غیر معروف اور نامانوس بستی شیخو پور کے ایک مکتب میں

صرف خدائے قادر و وہاب کے بھروسے پر اس حال میں فروکش ہوئی کہ نہ یہاں علمی و ادبی فضا تھی، نہ مادی وسائل کی فراوانی، طبیعت میں سکون ونشاط کی غذا فراہم کرنے والی علما و صالحین کی علمی مجلسیں تھیں نہ ہی علمی و روحانی مزاج کی تسکین کا کتابی سرمائے کے حوالے سے کوئی سامان تھا۔ تاہم دل کے نہاں خانے میں حب نبوی ﷺ کی آگ پوری آب و تاب کے ساتھ روشن تھی، امت مسلمہ کو دین کی راہ پر لانے کی ایک فکر، تڑپ اور دھن تھی، علم دین کی حفاظت و صیانت کا سچا جذبہ قلب صافی میں فروزاں تھا، جس نے تمام تر بے سامانیوں کے باوجود تاریخ کی گمشدہ سرنگوں میں قائم ایک چھوٹے سے مکتب میں آپ کو ایسی یکسوئی اور قوت عطا کی کہ آپ نے اس مقام کو علم و عمل کی تمام سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا۔ پھر زمانے نے دیکھا کہ کوہ ہمالیہ جیسی ایمانی صلابت، جہد مسلسل، عمل پیہم اور فرسان بالنہار اور رہبان باللیل کے نتیجے میں اس چھوٹے سے مکتب نے علمی و ادبی، اصلاحی ترقی کے وہ منازل طے کئے اور تعلیم و تربیت کے لحاظ سے دنیائے علم میں وہ مقام حاصل کیا جس کی نظیر سے ماضی قریب کے تاریخی اوراق خالی ہیں۔ آپ نے حیرت انگیز صلاحیتوں کو اخلاص وتقوی کے سیال مادے میں تحلیل کر کے اس طرح استعمال کیا کہ چند سال کے قلیل عرصے میں اس مکتب کا شمار ملک کے اعلی اور قابل اعتماد اداروں کی صف میں ہونے لگا۔ کم و بیش پچیس سال کے اس دورانئے میں کتنے طالبان علوم نے اس چشمہ فیض سے اپنی پیاس بجھائی، کتنے افراد نے اصلاح و تربیت کے نتیجے میں روحانیت کی دنیا میں قدم رکھا، اصلاح و ارشاد کے فکر انگیز خطبات و مواعظ کے ذریعے کتنے قلوب میں انقلاب برپا ہوئے، کتنے جرائم پیشہ افراد کی دشت ظلمت میں بھٹکتی ہوئی زندگیوں نے اپنے زاویے بدلے، تحریری نگارشات نے مغرب زدہ غلط افکار و خیالات کے کتنے پرفریب پردے چاک کئے، اس کا اندزہ کیسے اور کیوں کر لگایا جا سکتا ہے؟۔

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لئے

محبوبیت و مقبولیت کی ایک جھلک:

انسان جب رب کریم کی عطا کردہ تمام صلاحیتوں کو اس کے دین کی آبیاری میں صرف کر دیتا ہے اور زندگی کی تمام خواہشات و تمناؤں کو صیانت دین پر نثار کر کے فنائیت کے نہاں

خانوں میں گم ہوجاتا ہے تو زمین کی مخلوقات کے علاوہ آسمان کے فرشتوں میں بھی اس کی محبوبیت کے ترانے جاری ہوجاتے ہیں، بالآخر حسن عمل اور اخلاص وللّٰہیت کی شعائیں عام انسانوں کے قلوب کو اس طرح مسخر کرلیتی ہیں کہ وہ وارفتگی کے عالم میں عقیدت مند ہوجاتے ہیں۔ استاذ محترم کو رب کائنات نے اسی مذکورہ مقام پر فائز کیا تھا۔ لوگ آپ سے ٹوٹ کر محبت کرنے پر اس لئے مجبور ہوتے تھے کہ آپ کے ہر رویے میں محبوبیت کی صفات وافر مقدار میں موجود تھی۔ خواص کے علاوہ عام لوگوں میں آپ کا کس قدر احترام تھا کتنی محبت وعقیدت تھی اس کا اندازہ تدفین کے موقع پر جمع ہونے والے انسانی سمندر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اعظم گڑھ کی سرزمین پر انسانی سروں کا اتنا بڑا مجمع آسمان کی نگاہوں نے نہیں دیکھا۔

آپ نے خاکی پسماندگان کے علاوہ ملک وبیرون ملک میں رہنے والے لوگوں کے دلوں میں ایسی ناقابل فراموش یادیں چھوڑی ہیں جسے زمانے کے انقلابات بھی مٹا نہیں سکتے۔

جان منجملہ خاصان میخانہ تجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

رب کریم! تو اپنے اس محبوب بندے کو بے پایاں رحمتوں ونوازشات سے سرفراز فرما، جنت الفردوس میں انبیا وشہدا وصالحین کی معیت عطا فرما اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی ہم لوگوں کو توفیق ارزانی نصیب فرما، ان کے مشن کی تکمیل کا ہمیں عزم بالجزم اور ہمت عطا فرما۔ آمین

سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے
آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے

❑❑❑

> محبت خدا کے پاس سے چلی ہے، بڑی پاکیزہ، بڑی دل آویز، بڑی روشن، پھر یہ خاص خاص دلوں کو اپنا نشیمن بناتی ہے، پھر وہاں سے نکل نکل کر بارش کی طرح برستی ہے، اور سب اپنی اپنی استعداد اور اپنے اپنے ظرف کے بقدر فیضیاب ہوتے ہیں، آپ فراموش ہوجائیں، کیسے یقین دلاؤں کہ یہ ممکن نہیں ہے، عشق ومحبت کا سرمایہ دار مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے، دلوں میں زندہ رہتا ہے، یادوں میں زندہ رہتا ہے۔ (حدیث دوستاں)

وہ مرددرویش......

مفتی روح اللہ قاسمی صاحب
استاذ: مدرسہ فلاح المسلمین گواپوکھر مدھوبنی

حضرت مولانا اعجاز اعظمی کے نام ساتھ اب ''رحمۃ اللہ علیہ'' کا لاحقہ لگاتے ہوئے ذہن ودماغ پر سناٹا چھاجاتا ہے۔ ایسا شفیق ومہربان استاذ جواپنے ہر طالب علم سے اتنا ہی پیار کرتا تھا جتنا کہ اپنی اولاد سے۔ جن کے سامنے بیٹھ کر پرکیف سکون محسوس ہوتا تھا، جن کی باتوں سے غموں کے بادل چھٹ جایا کرتے تھے۔ جن کی عنایتوں سے زیربار ہوکر بعض طلبہ ''استاذ محترم'' اور ''حضرت'' جیسے الفاظ کوکوتاہ قامت سمجھ کر بے انتہا الطاف وعنایات کا حامل لفظ ''ابا'' سے حضرت مولانا کا ذکر کیا کرتے تھے۔ جن کی تسلیوں سے اللہ عزوجل پر اعتماد ویقین بڑھا کرتا تھا۔ اور ایمان وعشق کی شمع میں گرمی کی تمازت محسوس ہوتی تھی۔ کسی تھکے ماندے مسافر کو گھنیری چھاؤں اور فرحت بخش ہواؤں میں جیسی نیند آسکتی، اس سے کہیں بڑھ کر ان کی شفقتوں کے زیر سایہ چین نصیب ہوتا تھا، اور ہر پریشانی میں یہ تسلی رہتی تھی درد کی دوا موجود ہے، گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ آہ! وہ عظیم استاذ دنیا سے کوچ کر گیا اور ہم جیسے ہزاروں طالبان علوم کو یتیم کر گیا.... نہیں.... بلکہ سچ جانئے تو ملت اسلامیہ یتیم ہوگئی۔ کیوں کہ اسلاف کی روایات کا محافظ، اکابر کا سچا جانشین، اسلامی اقدار سے سرمو انحراف نہ کرنے والا، علوم اسلامی کا عارف وشناور، گرمئ نفس سے قلوب میں ایمانی شمع کی لوکو تیز کردینے والا، اور سیدھے لفظوں میں اللہ کے لئے جینے اور اللہ ہی کے لئے مرنے والا، ملت کا وہ عظیم سپوت سپرد خاک ہوگیا، جو پوری زندگی اور حیات مستعار کی آخری سانس تک دین وملت کے لئے اپنے کو مجاہدہ وجانفشانی کی چکیوں میں پیستا رہا۔ جن کا دن مخلوق خدا کی اصلاح اور طالبان

علوم کی خدمت میں گذرتا تو رات رب ذوالجلال کے سامنے عجز و نیاز اور گریہ وزاری میں، جو دنیا کا بظاہر گھاٹے کا سودا کر گیا مگر اپنی آخرت کا کامیات ترین تاجر رہا۔ آج وہ ہزاروں دلوں کو روتا بلکتا چھوڑ کر خود آرام کی نیند سو گیا۔ **فرحمه الله تعالى رحمة يغنيه بهاعن رحمة من سواه**

حضرت مولانا نے پوری زندگی مدرسہ کی چہار دیواری میں گزار دی اور زمانہ کے کروفر اور اس کی آلودگیوں سے اپنا دامن بچائے رکھا۔ حضرت کی صلاحیتوں کا سب سے قیمتی جوہر طلبہ میں تعلیمی لیاقت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ دینی تربیت اور اپنے اسباق میں اذعان کی کیفیت پیدا کرنا تھا جو عام طور سے مدارس اسلامیہ سے اب عنقا ہوتی جا رہی ہے۔ وہ طلبہ کو ان کا صحیح مقام یاد دلانے اور دلوں میں اس راہ کی عظمت کا احساس پیدا کرنے کی پوری کوشش کرتے تھے، اور جب یہ ساز چھڑ جاتا تو رکنے کا نام ہی نہ لیتا، کبھی وراثت نبوی کی عظمت کا احساس، کبھی اللہ کی طرف سے پے در پے ہونے والی نوازشیں اور مہربانیاں، تو کبھی آخرت میں جواب دہی کی فکر اور اللہ کے دربار میں حاضری کا منظر۔ ان چیزوں کو ایسے پردرد اور بھرپور انداز میں ذہن و دماغ میں اتارتے کہ دنیا اور حطام دنیا کی حقیقت واقعی مکھی اور مچھر کے پروں سے زیادہ حقیر معلوم ہونے لگتی، پھر غضب یہ کہ اس سلسلے میں اکابر کے واقعات اس تسلسل اور ایسی سرمستی و وارفتگی سے بیان فرماتے کہ ماحول پر بے خودی طاری ہو جاتی اور جب تک وقت کی تنگ دامانی کا گھنٹہ ''بس بس'' کی صدا نہ لگانے لگتا یہ سلسلہ رکنے کا نام نہیں لیتا۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے:

قطرہ جب ہزار مرتبہ ٹپکے گا تو پتھر پر اپنا اثر چھوڑ جائے گا۔ تربیت کو مدرسے کا جز لاینفک اور طالب علم کی زندگی کا اہم عنصر سمجھنے کے بعد اس سے بے اعتنائی برتی جانے والی عمومی فضا میں، اس کے لئے اتنا بلکہ اس سے کہیں زیادہ جتن کرنا جتنا کہ کسی طالب علم میں اعلی علمی لیاقت پیدا کرنے کے لئے کی جاتی ہے، ایک مربی کا اہم فریضہ بن جاتا ہے۔ حضرت مولانا نے مدرسے کا اسے نصب العین بنا کر اس پر اس سے زیادہ محنتیں کی ہیں جتنے کی ضرورت تھی اور اس سلسلے میں استاذ محترم کی کوششیں گھٹا ٹوپ تاریکی میں ایک دیا جلانے اور اپنے پرانے چراغ پر اصرار کرنے کے مترادف تھا، جس کے قدرداں تو برائے نام لیکن ناقدروں کی بھیڑ مل جائے گی۔ ایسے میں یہ

توقع رکھنا کہ یہ بیج مسموم فضا میں بارآور ہو جائے گا، یقیناً حوصلہ شکن امید تھی، مگر ”آہ“ و ”واہ“ سے بے پرواہ ہو کر حضرت مولانا نے محنت کی اور یہ پودا ثمر بار ہو کر رہا۔ اور یہی وصف اکابر کی نگاہوں میں حضرت مولانا کے لئے وجہ امتیاز بنا اور اسی کا ثمرہ ہے کہ آج حضرت کے شاگردوں اور مستفیدین کی اکثریت نان جویں پر قناعت کر کے خدمت دین سے جڑی ہوئی ہے اور مولانا کے لئے صدقہ جاریہ بنی ہوئی ہے۔

ریشم میں ٹاٹ کا پیوند اگر غیر مناسب بھی ہو تو اسے گوارہ کر لیجئے کہ جب آخری مرتبہ یہ راقم شیخوپور کی فضا سے نکل کر وطن کے لئے عازم سفر ہوا، بس میں سوار تھا کہ گانے کی آواز آنے لگی، یقین جانئے اس وقت میرے دل کی جو کیفیت تھی وہ میرے لئے متاع عزیز اور زندگی کا ایک یادگار لمحہ بن گئی۔ بس تو فراٹے بھرتی ہوئی مجھے مادر علمی کی علمی وروحانی فضاؤں سے دور لے جا رہی تھی لیکن میرے حافظے میں بیتے ہوئے لمحات کے مناظر گردش کر رہے تھے۔ ہائے خدایا! دنیا میں یہ کیا ہو رہا ہے؟ حضرت مولانا کی صحبت چھوٹنے کے بعد وہ فضا پھر میسر ہو پائے گی؟ جو قلب وجگر کی روحانی تسکین کا باعث بنی ہوئی تھی۔ جہاں بوقت دعا، دل ودماغ یقین کی کیفیت سے سرشار ہوتا تھا کہ میرا خدا میری فریاد سن کر رہے گا۔

دو دن کو اے جوانی! دیدے ادھار بچپن

مطالعہ کا جنون:

کتابوں کا مطالعہ، اسے الٹ پھیر کرتے رہنا، اس کے لئے پوری رات آنکھوں میں گزار دینا آپ کا وہ محبوب مشغلہ تھا جس کے سامنے ہر شوق پھیکا، ہر دلچسپی بے کار اور ہر کام ناقابل توجہ تھا۔ ہم طلبہ کو تعلیم پر ابھارتے ہوئے اکابر کی علمی جانفشانیوں کی تذکرے کے ساتھ جب خود آپ کے سب سے محبوب مشغلے کا ذکر چھڑ جاتا تو پھر مولانا ہوتے اور ہم طلبہ، بقیہ کسی اور کے وجود کا احساس ختم ہو جاتا، اور جب مجلس ختم ہوتی تو زندگی میں نئی توانائی کا بھرپور احساس جاگتا، پھر پورے جوش وجذبے کے ساتھ کتابوں سے دوستی باندھ لی جاتی۔ دن بیتے ہوئے آخر کتنے دن ہوئے ہی ہیں کہ باتیں لوح حافظہ سے محو ہو جائیں کہ ہم لوگوں نے ہدایہ کے بعض مشکل ترین مسائل کو عصر کے بعد کی تفریحوں میں پانی بنایا تھا بلکہ مطالعہ وتکرار کے دھن میں یہ تفریح بھی

فراموش ہوجاتی تھی۔

مولانا نے اپنی خودنوشت سوانح ''حکایت ہستی'' میں زندگی کے اس سب سے عزیز مشغلہ کو بڑے چاؤ اور مزے لے لے کر بیان فرمایا ہے۔ انہیں ''اگر شوق تھا تو پڑھنے اور مطالعہ کرنے کا تھا، اس شوق کے سامنے ہر شوق ماند تھا، ہر دلچسپی فنا تھی۔ کتاب ہاتھ آجاتی یا کوئی نوشتہ مل جاتا تو ہر شوق فراموش ہوجاتا''۔ (ص: ۱۳۰) اور یہ بات کوئی علم کی منزلیں طے کرلینے کے بعد کی نہیں ہے بلکہ ابتدائے عمر سے ہی جب کہ بچہ علم کے مفہوم سے نا آشنا ہوتا ہے، آپ کی طبیعت اس کی طرف مائل تھی۔ جب عربی کے ابتدائی درجات میں تھے ''اس وقت بچپن جوانی سے ہم آغوش تھا، طبیعت افسردگی اور پژمردگی کے مفہوم سے نا آشنا تھی، نہ کبھی تکان کا احساس ہوتا نہ اکتاہٹ ہوتی، بس ایک دھن تھی کہ پڑھتے چلے جاؤ۔ ہر قسم کی کتابیں پڑھتا اردو تو اپنی مادری زبان تھی، فارسی کی شدبد بھی برائے نام تھی، عربی کی تحصیل کا زمانہ تھا، تینوں زبانوں کا مطالعہ جاری رہتا، اردو زیادہ، عربی دوسرے نمبر پر اور کسی قدر فارسی''۔ (ص ۱۵۳) اور اس شوق میں اس قدر بے خود تھے کہ حاصل مطالعہ لکھنا بھی بار تھا۔ چنانچہ ''والد صاحب ہمیشہ تاکید کرتے کہ حاصل مطالعہ لکھ لیا کرو، علوم کا ذخیرہ ہاتھ میں رہے گا لیکن میں سوچا کرتا تھا کہ جتنی دیر میں ایک صفحہ لکھوں گا، نہ جانے کتنے صفحات پڑھ لوں گا۔'' (ص ۱۵۱)

رہنے دو ساغر و مینا مرے آگے:

مطالعہ کا جنون آپ پر دور طالب علمی کے ساتھ ختم نہیں ہوگیا بلکہ زندگی کے میدان میں آنے کے بعد جوں جوں اس کی ضرورت بڑھتی گئی، آپ کا یہ علمی سفر اسی تیز رفتاری کے ساتھ جاری رہا، اور جب ذمہ داریوں اور اسفار کی کثرت کے ساتھ امراض نے آپ کو اپنا آشیانہ بنالیا تب بھی ذکر الٰہی کے بعد اگر کوئی چیز آپ کی قلبی تسکین کا باعث تھی تو یہی مطالعہ تھی۔ آپ ہی کے الفاظ میں ''اب بھی اگر کوئی دھن ہے تو یہی کہ کوئی اچھی کتاب مل جائے، فراغت ہو، اور میں ہوں، نہ جانے اس کا کیا فائدہ؟ مگر اپنی مہمل طبیعت کو دیکھتا ہوں، تو سودوزیاں کی سودے بازی سے اسے کوئی مناسبت نہیں، مطالعہ اور علم مقصود ہے، اور وہ خود فائدہ ہے، بھولنا انسان کی فطرت ہے، دس باتیں پڑھے گا، تو ایک یاد رہے گی۔ سفر آگے کو جاری ہے، پیچھے مڑ کر کون دیکھے کہ کون کون سی منزلیں

گزریں۔"(ص:۱۵۱)

افسوس کہ اب "وہی سو گئے داستاں کہتے کہتے" ورنہ خود ان کی زبان اعجاز سے ان کے سب سے محبوب مشغلہ کی داستان سننے کا لطف ہی کچھ اور ہوتا۔

گل افشانی گفتار:

مطالعہ کے جنون نے اگر چہ حاصل مطالعہ لکھنے کا موقع نہیں دیا لیکن وعظ وتقریر اور عام مجلسی گفتگو میں جب زبان کھل جاتی تو رکنے کا نام نہیں لیتی۔ قدرت نے خطابت کا ملکہ بڑی فیاضی سے عطا کیا تھا، الفاظ کا ذخیرہ غلام و باندی کی طرح صف بستہ خدمت کو حاضر ہوتے۔ بات کرتے ہوئے مضامین کا تسلسل ہوتا، معلومات کی فراوانی چار چاند لگاتی، اکابر کی زندگیوں کی جھلکیاں اس میں نگینہ کا کام کرتیں، پھر خود مولانا کا بیان کئے جانے والے مضامین سے عشق سونے پہ سہاگہ ہوتا، ایسے میں بولنے والے پر عشق کی مستی، گل افشانی گفتار کا منظر اور باتوں کی محویت نہیں ہوگی تو کیا ہوگی؟

مولانا نے خود اس راز سے پردہ اٹھایا ہے کہ "کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ میرے احباب مجھے چھیڑتے، اور ولولۂ تقریر جاگتا بس پھر کیا کہئے، رات آنکھوں میں کٹ جاتی۔ مجھے اکثر گفتگو میں ربودگی اور بے خودی کی کیفیت طاری ہوتی، اور اس وقت گل افشانئ گفتار کا منظر قابل دید ہوتا باتوں کی محویت نے مجھے بہت جگایا ہے۔"(۱۵۴)

یہ کیفیت آخری وقت تک جوان رہی اور ایمانی حرارت نے جو ذکر الٰہی کی کثرت کا نتیجہ تھی، اسے دو آتشہ بنا دیا تھا۔ ہر محفل گل افشانی گفتار کا منظر پیش کرتی، باتوں کی محویت سے آپ پر بے خودی طاری ہوتی اور آپ کی جادو بیانی سے شریک محفل گرد و پیش سے بے خبر ہو جایا کرتے۔ زمانہ طالب علمی میں تو ہر طرح کے مضامین پر منہ سے پھول جھڑا کرتے تھے لیکن عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد مولانا کی ہر گفتگو کی تان یہیں آ کر ٹوٹتی تھی کہ "اپنی آخرت کی فکر کرلیں"، بعض دفعہ تو یہ لگتا کہ آپ دنیا کے سخت دشمن ہو گئے ہیں، اور کبھی کبھار تو طلبہ کے درمیان دل کی آواز زبان کے راستے اس طرح ظاہر ہو جایا کرتی تھی کہ "بھئی! ہم تو چاہتے ہیں کہ ہمارے طلبہ دنیا کے اعتبار سے گھونگا ہو جائیں، جس کے پاس ہاتھ، پاؤں، ناک، آنکھ، کان، کوئی عضو نہیں ہوتا، وہ صرف آخرت

کے ہوکر رہیں۔'' اور کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے جس میں یہ تلقین نہ کی ہو کہ ''تمہاری نظر صرف اللہ کے خزانے پر ہو'' گویا زبان حال سے آپ کہہ رہے ہوں: ع

لوٹ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

قلم کی روانی:

قاری کو اپنی مضبوط گرفت میں لینے کی بھرپور صلاحیت کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ مولانا چھپنے سے چھپتے تھے۔ قلم کی روانی سے اپنے پڑھنے والے پر جادو کر دینے کا فن جانتے تھے اور اس کی شہادت مولانا کا سفر نامہ حج ''بطواف کعبہ رفتم'' سمیت وہ تمام تحریریں دیں گی جو طبع سے آراستہ ہیں لیکن جیسا کہ ذکر ہوا آپ کو لکھنے سے کم مناسبت رہی ہے اور جو کچھ تحریریں رسالوں کی ادارت و سرپرستی کی ذمہ داریوں سمیت وجود میں آگئیں وہ کسی دینی تقاضے، بزرگوں کا حکم، دوستوں کے اصرار اور عزیزوں کی درخواست کی وجہ سے ہوسکیں۔ عام طور سے یہ تحریریں قلم برداشتہ ہیں لیکن اس میں مافی الضمیر کی ادائیگی کے لئے قلم کی روانی کے ساتھ دل موہ لینے والی تعبیرات پر قدرت نمایاں ہے۔

طلبہ سے بے پناہ محبت:

''میں اس وقت سے مریضِ محبت ہوں جب میں جانتا بھی نہ تھا کہ محبت کیا شے ہے؟ اور جب مجھے اس کی خبر ہوئی، تو میں کیا عرض کروں کہ مجھ پر کیا بیتی؟ مجھے خود لفظ ''محبت'' سے محبت ہوگئی (حکایت ہستی: ص۱۳۲)

اس مزاج وفطرت نے پورے ہندوستان کے شاگردوں کو حضرت مولانا کے حلقہ محبوبیت میں گھیر رکھا تھا۔ اپنے طلبہ پر محبت کی وہ بارش کرتے کہ بسا اوقات حیرت ہوتی کہ ایک شخص اپنے ہر چاہنے والوں پر کس طرح محبت کے بوند برسا رہا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا پر وصف نبوی کا پرتو تھا کہ پہلی بار ملاقات ہو تو مارے ہیبت کے بات کرنے کی ہمت نہ پڑے، اور جب مجلس میں تھوڑی دیر بیٹھنے کا شرف حاصل ہو جائے، نوازشات اور عنایات سامنے آئیں تو محسوس ہونے لگے کہ سب سے زیادہ چاہت مجھ سے ہی ہے۔ پھر دن گزرتے یہ رشتہ مضبوط تر ہوتا چلا جائے۔ کسی بھی شاگرد کو مولانا کی صحبت میں شفیق استاذ کی شفقت اور قربان ہونے والے ماں باپ کی محبت کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔ اصلاح وتربیت، علمی راہنمائی اور بوقت ضرورت مالی کفالت

میں آپ اس قدر آگے بڑھے ہوئے تھے، جس سے زیادہ کا تصور ناممکن تو نہیں مگر اس دور قحط الرجال میں نایاب ضرور ہے۔ اور یقین جانئے کہ آپ کے اسی جذبہ فدائیت اور بے لوث محبت کا نتیجہ تھا کہ آپ سے پڑھے ہوئے طلبہ تو خیر شاگرد تھے، بیشتر ہم عمر بلکہ زمانہ طالب علمی کے بعض ہم عصر ہم نوالہ وہم پیالہ ساتھیوں نے بھی آپ کو اپنا مرجع عقیدت اور مربی بنایا اور جانبین سے ٹوٹ کر چاہنے اور محبت کرنے کا وہ نرالا انداز سامنے آیا جو خود غرضی اور اپنی دنیا میں مگن رہنے کے اس دور میں یقیناً ایک منفرد مثال ہے۔ یہ مناظر تاریخ کے اوراق میں تو درج ہیں مگر اس کے دیکھنے کو اب آنکھیں ترس رہی ہیں۔ ع

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

ہر طالب علم کے اساتذہ یقیناً ایک ہی نہیں ہوتے، ہر ایک کے لئے جذبہ احترام و عقیدت کے ساتھ زانوئے تلمذ تہہ کرنے والوں کے دلوں میں..... جن کی اکثریت دین کی نمایاں خدمات انجام دے رہی ہے اور بعضوں کا مشہور اور بڑے علما میں شمار ہے..... حضرت مولانا شان محبوبیت اور مرجع عقیدت کی حیثیت سے جلوہ افروز ہیں، اور آغاز تدریس سے بزرگیت کے اعلی مقام پر فائز ہونے تک ان سے استفادہ کی راہوں سے علمی وروحانی غذا حاصل کرتے رہے اور آج وہ آپ کی رحلت سے اپنے کو یتیم و بے سہارا سمجھ رہے ہیں۔

بہار کی سرزمین عنایتوں کے سائے میں:

صوبہ بہار کی سینکڑوں علمی شخصیات ہیں جنہوں نے فیض رسانی میں اپنے کو صوبہ تک محدود نہیں رکھا بلکہ پورا ہندوستان ان سے فیض یاب ہوتا رہا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جانے انجانے اسباب کی بنیاد پر بہار کے باہر کی علمی وروحانی شخصیتوں نے عام طور سے بہار کو اپنی خدمات کی جولان گاہ نہیں بنایا۔ حضرت مولانا نے اس تفریق کو مٹایا ہی نہیں بلکہ ترجیحی بنیاد پر بہار کے مدھوبنی، دربھنگہ، مظفرپور، ارریا، پورنیہ سمیت دسیوں اضلاع کو اپنی توجہات اور محنتوں کا مرکز بنایا اور زندگی کے آخری سانس تک وسائل زندگی سے محروم علاقوں میں دینی تقاضے، وقت کی گنجائش اور اپنے طلبہ کی محبت وچاہت پر ہفتوں قیام کرکے دین وایمان کی شمع جلاتے رہے، اور اس سلسلے میں وہ قربانیاں پیش کیں کہ تعصب کی بعض عینک کو پریشانی ہونے لگی۔ اگر بہار کی

سرزمین احسان فراموش نہیں ہے تو اس کی اصلاحی تاریخ میں حضرت مولانا کی خدمت آب زر سے لکھی جائے گی۔

کوئی جوان سال عالم جو علم کے تمام لوازمات سے آراستہ ہو، بات کرے تو منہ سے پھول جھڑے، خطاب کرے تو شاہ عطاء اللہ بخاری کا سراپا ذہن میں آنے لگے، قلم سنبھالے تو شورش و آزاد کی یاد تازہ کردے، کتاب اور طلبہ کے سامنے ہو تو افہام وتفہیم کو بھی وجد آجائے، علمی محفل ہو تو زبانیں خاموش اور سماعت گوش برآواز ہو جائے، مطالعہ کا رسیا ایسا کہ کھانے پینے کا ہوش نہ گردوپیش کی خبر۔ جب کسی جواں سال عالم میں اس طرح کی صلاحیتیں موجود ہوں تو وہ کیا کسی کو خاطر میں لائے گا؟ اس کی پرواز ہمیشہ اونچی ہوگی، وہ دیہاتوں اور بیابانوں کی طرف جھانکنا بھی گوارہ نہیں کرے گا مگر عین جوانی میں ان جیسی سینکڑوں خوبیوں اور لیاقتوں کے باوجود حضرت مولانا نے محض دین کی اشاعت کی خاطر وہ جانفشانیاں اور مجاہدے کئے کہ لگا ماضی بعید کے قافلۂ اہل دل کا کوئی فرد بچھڑ گیا ہے۔ ’’دمکا‘‘ کے کفر وشرک زدہ ماحول میں مہینوں پیدل ادھر ادھر بھٹکتے رہنا اور انتہائی ناخواندہ لوگوں کے کانوں تک اللہ اور رسول کی آواز پہونچانا، مدھوبنی کے وہ علاقے جہاں آج سے پانچ سال قبل تک یہاں کے باشندے جاتے ہوئے گھبراتے تھے، کبھی پیدل، کبھی رکشہ سے تو کبھی بیل گاڑی کی پژمردہ اور نیم مردہ کردینے والی سواری سے جگہ جگہ محبت کا پیغام پہونچانا کسی ’’الف، با‘‘ پڑھانے والے مولوی کی مجبوری تو ہوسکتی ہے، صلاحیتوں سے بھرپور کسی جوان سال عالم کا جگرا گوارہ نہیں کرسکتا، مگر آپ صدائے تحسین سے بے نیاز ہوکر، ہر طرح کی آؤ بھگت کو بھلاکر، کوردہ علاقوں، وسائل زندگی سے محروم دیہاتوں اور ضروریات زندگی سے ناواقف قصبات میں مدرسہ کے زمانۂ تعطیل کا پورا وقت صرف کردیتے اور ہزار جانفشانی کے ساتھ تبلیغ دین کا فریضہ انجام دیتے رہتے۔

فقر غیور وزہد پرنور:

اور اب سوچنے کا انداز بدل گیا ہے اس لئے اس راز سے بھی پردہ اٹھتا ہوا دیکھ لیجئے کہ حضرت مولانا کے خاص شاگرد، استاذ گرامی حضرت مولانا محمد حبیب اللہ صاحب قاسمی قاضی شریعت وصدر المدرسین مدرسہ فلاح المسلمین گواپوکھر بھوارہ مدھوبنی بہار، حضرت مولانا کی

قربانیوں اور نوازشوں کو بیان کرتے ہوئے جذباتی ہوجاتے ہیں اور اپنے عظیم استاذ کی عظمت کے احساس پر فخر کی کیفیت نمایاں ہوتی ہے جب وہ بیان کرتے ہیں کہ:

''حضرت بار بار آتے، ہفتوں قیام کرتے، درس قرآن سے ایمان ویقین کی شمع تیز کرتے، وعظ ونصیحت کے ذریعے خلوص عمل کی چنگاری کو بھڑکاتے، بندگان خدا کی اصلاح کے لئے دن ورات کوشاں رہتے، پورے علاقے میں دین وایمان کی باد بہاری چلنے لگتی اور جب ہفتہ دو ہفتہ قیام کر کے حضرت واپس ہوتے تو ہم لوگوں کو اتنا شعور بھی نہیں ہوتا تھا کہ کرایہ کے بقدر ہی کچھ ہدیہ پیش کر دیا جائے جس سے سفر کے اخراجات پورے ہوسکیں، مگر حضرت نے کبھی اس کا احساس تک نہیں ہونے دیا۔''

حقیقت یہ ہے کہ حضرت مولانا نے کبھی اس طرف توجہ ہی نہیں دی بلکہ انہوں نے دنیا کو جس شان بے نیازی سے ٹھکرایا، اس کی مثال اس زمانہ میں شاید وباید ہی ملے۔ مولانا کا یہ رنگ و مزاج قدرت کا خاص عطیہ تھا جو ابتدائے عمر سے ہی رفیق وہمدم بنا رہا اور وقت گزرنے کے ساتھ اس میں مزید پختگی آتی گئی۔ اس شان کے ساتھ آپ نے اپنی زندگی کا آغاز کیا کہ دنیا کی ضرورت کی طرف اس کے بقدر اور آخرت کی ضرورت کی طرف اس کی ضرورت کے بقدر توجہ دی۔ کسی ایک کی وجہ سے دوسرے کا حق ضائع نہیں کیا اور جوانی سے ہی فقر غیوری کے ساتھ لذت آہ سحرگاہی سے سوز دروں کی تمازت کو تیز تر کرتے رہے۔ خانہ آبادی کے دنوں کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ نے راز دل کا یوں افشا کیا ہے:

> ''طبیعت دنیا اور لذاتِ دنیا سے نہ صرف یکسو ہوگئی تھی بلکہ ایک درجہ میں دنیا سے بیزاری کا رجحان پیدا ہوگیا تھا، رہبانیت کی طرف دل کا میلان ہو چلا تھا۔ رہبانیت کی ناپسندیدگی کے متعلق قرآن کریم کی آیت اور احادیث کا استحضار قلب ودماغ میں تھا، اس لئے اس کی طرف کوئی عملی قدم اٹھانے کی ہمت نہیں ہوئی، مگر دل کا رجحان اتنا شدید تھا کہ یہ نصوص دامن گیر نہ ہوتے، تو میں دنیا اور حطام دنیا کو جھٹک کر کہیں گم ہوجاتا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ رات کے سناٹے میں مَیں خود کو تنہا محسوس کرتا تھا، ایک خدا اور ایک بندے کے علاوہ اور کسی کا وجود محسوس نہ ہوتا۔'' (حکایت ہستی: ص ۲۶۴)

آنکھوں دیکھی بات ہے کہ جب احساس ہوگیا کہ ہدیہ کی یہ شکل وعظ وتبلیغ کا نذرانہ ہے تو اسے واپس کردیا گیا اور اس سلسلے میں کوئی رورعایت نہیں کی، جبکہ سنت نبوی سمجھ کر عزیزوں اور شاگردوں کے ہدایا بڑی فراخ دلی سے قبول فرماتے تھے۔

شان جامعیت:

حقیقت یہ ہے کہ حضرت مولانا کے حسن بسیار وشیوۂ ہزار کے سامنے اس عنوان سے زیادہ کوئی اور مناسب لفظ سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ کسی کی تنقیص نہیں، کسی پر طنز نہیں، کسی کا استخفاف نہیں، خدا کی زمین بہت وسیع ہے، قدرت کا خزانہ بھی لامحدود ہے، ہزاروں علوم کے شناور دنیا میں موجود ہیں، محدثین کی کمی نہیں، مفسرین بھی بے شمار ہیں، کڑوڑوں بولنے والے موجود ہیں، لاکھوں لکھنے والے، سینکڑوں تحقیق کے سمندر میں غوطہ خوری کرنے والے ہیں اور سچی بات یہ ہے کہ اللہ عز وجل نے اپنے دین کی حفاظت وبقا کی خاطر ہر میدان کے لئے رجال کار بنا رکھے ہیں مگر معدودے چند شخصیتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو ”**یجمع العالم فی واحد**“ کا مصداق ہوتی ہیں۔ ہمارے مولانا انہیں میں سے ایک تھے۔

علم کی تمام صلاحیتوں سے آراستہ اور اس کے سارے اسلحہ سے لیس ہونے کے ساتھ آپ گفتار دلبرانہ اور کردار مومنانہ کے حامل تھے، آپ میں فقر غیور اور زہد پرنور کی پرکیف آمیزش تھی۔ دین کے لئے تڑپ، انابت الی اللہ کا ذوق اور شوق عبادت سے سرشار تھے۔ مواقع قبولیت میں جب دعاؤں کے لئے ہاتھ اٹھتے تو دیکھنے والوں کو بھی ترس آجایا کرتا اور اس بچہ کا منظر سامنے آجاتا جو اپنی مراد لے کر ہی دم لے گا۔ آپ نشان منزل جاناں سے باخبر اور مادیت کے بحر ظلمات میں بس دین کو ہی نجات کا واحد ذریعہ سمجھتے تھے۔ آپ کی نگاہ میں دین کے علاوہ کوئی اور شئی موضوع گفتگو اور مشغلہ زندگی بننے کے لائق نہیں تھی۔ آپ کی صحبت میں دو چار گھڑی گزار کر ”اللہ“ یاد آجاتا اور دنیا کی بے ثباتی کا یقین بڑھنے لگتا۔ آپ کی بوقلمونیوں کو دیکھ کر یقین ہوتا تھا کہ اللہ تعالی نے جامعیت کی شان سے آپ کو متصف کیا ہے جو کم لوگوں کے نصیبے میں آتا۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت ملت اسلامیہ کے لئے ناقابل تلافی نقصان ہے جس کی بھرپائی کی بظاہر کوئی شکل نظر نہیں آتی۔ **وما ذالک علی اللہ بعزیز**۔ رہے نام اللہ کا۔

❑❑❑

عظیم مربی اور شفیق استاذ
حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی

مولانا شمیم احمد قاسمی صاحب
استاذ جامعہ رحیمیہ مہندیان، نئی دہلی۔۲

حضرت مولانا نے ''سفر قدس'' کے عنوان سے اپنے ۱۴۲۸ھ مطابق ۲۰۰۸ء کے حج کا تفصیلی سفرنامہ لکھا، جو اسی سال ماہنامہ ''ضیاء الاسلام'' کے صفر، ربیع الاول، فروری، مارچ کے شمارہ میں شائع ہوا۔ اس میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''میں مدرسہ کا آدمی ہوں، جب میرا سفر ہوتا تو میرے طلبہ بھی مجھ سے کہتے کہ ہم لوگوں کے لیے بھی اس سفر کی دعا کردیجئے، پھر میں اپنے بچوں کے لیے دعائیں کرتا رہا ہوں۔ اب ان دعاؤں کی قبولیت دیکھ رہا ہوں، کئی سال سے متواتر میرے طلبہ جو میری طرح عربی مدارس میں قلیل تنخواہ پر دین کی خدمت کررہے ہیں، ظاہری سامان ان کے پاس کچھ نہیں ہے مگر پہنچانے والا انہیں مسلسل حج بیت اللہ کے لئے پہنچا رہا ہے''۔

احقر راقم الحروف بھی حضرت مولانا کا ایک شاگرد ہے، اس لیے حضرت مولانا کی دعا کی قبولیت کا اثر مجھ گناہگار پر بھی ظاہر ہوا، رحمت خداوندی کا ایک جھونکا مجھ سیہ کار کی طرف متوجہ ہوا اور مجھے دیار حرم پہنچا دیا۔

حضرت الاستاذ کے انتقال کے وقت اگر میں اپنے وطن میں ہوتا تو نماز جنازہ میں شرکت کی ہمہ تن کوشش کرتا مگر میں اس وقت اس مقدس دیار میں تھا، جہاں حضرت اپنی زندگی میں

بار ہا حاضر ہو ہو کر اپنے آخری سفر کی تیاری کرتے رہے، اور بالآخر انہی مبارک اشہر حج کے ایام میں رخت سفر باندھ لیا۔ **تغمد اللّٰہ تعالی بغفر انہ وجعل مثواہ فی اعلی علیین**

میں نے حضرت کے لیے اس دیار مقدس میں ہر جگہ دعائیں کیں، حضرت کے نام طواف بھی کیا۔ الحمد اللہ کہ میرے علاقہ میں حضرت کا فیض جاری ہے۔ حضرت کے ہاتھ پر بیعت ہونے والوں کی ایک اچھی تعداد ہے۔ شاگردوں کی تعداد تو درجنوں ہوں گی۔ صرف میرے ہی گھرانے میں مجھ سمیت دونسلوں کے تین افراد بلاواسطہ حضرت کے شاگرد ہیں۔ میرے والد صاحب حضرت کے فیض یافتگان میں ہیں۔

حضرت مولانا میرے علاقہ میں کب سے تشریف لا رہے تھے، یہ تو میری کمسنی کی وجہ سے مجھے یاد نہیں غالب گمان یہ ہے کہ ۱۹۷۳/۷۴ء سے یہ سلسلہ جاری ہوا۔ صحابہ کرام کا معمول اپنے چھوٹے بچوں کے بارے میں یہ نقل کیا گیا ہے کہ بچوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے جاتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بچوں کو اپنی گود میں بٹھاتے، پیار کرتے۔ نومولود بچہ خدمت اقدس میں لایا جاتا تو رسول اللہ ﷺ تحنیک فرماتے۔ میرے چچا جان حضرت مولانا رفیع الدین کا بھی اس سنت پر عمل تھا، جب کوئی بڑے عالم یا بزرگ ہمارے یہاں تشریف لاتے تو ہم گھر کے بچوں کو ان کی خدمت میں لے جاتے۔ ملاقات اور دعائیں کراتے ایسا کتنی دفعہ ہوا کہ ہم حضرت مولانا کے سامنے پیش ہوئے؟ کم عمری کی وجہ سے اب ذہن میں محفوظ نہیں۔ دین دار گھرانوں میں آج بھی یہ سنت زندہ ہے۔ میرے اندر جب کچھ سمجھ بوجھ آئی تو گھر میں اور گاؤں محلّہ کے لوگوں سے جن چند بزرگان دین کا تذکرہ سنا کرتا تھا، وہ ہیں حضرت مولانا کمال الدینؒ، حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ اس وقت ہمارے علاقہ میں ''حضرت'' سے حضرت مولانا اسعد مدنیؒ ہی مراد ہوا کرتے تھے۔ حضرت مولانا قاری فخر الدین گیاویؒ خلیفہ مجاز حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ ان کے چھوٹے بھائی حضرت مولانا قاری شرف الدینؒ یہ دونوں حضرات علی الترتیب بڑے قاری صاحب اور چھوٹے قاری صاحب سے متعارف تھے۔ حضرت الاستاذ مولانا اعجاز صاحبؒ آپ کو اس وقت غازی پور کے مولانا صاحب کہا کرتے تھے، بعد میں اعظم گڑھ کے ''حضرت'' سے مشہور ہوئے۔ حضرت الاستاذ مولانا محمد قمر الحسن صاحبؒ، آپ بھاگلپور کے مولانا صاحب سے

جانے جاتے تھے۔ ان کے علاوہ حضرت قاری زین العابدین صاحب اور ماسٹر شمس الضحیٰ صاحب کا ذکر خیر بھی دادا جان سے سنا تھا۔ ان بزرگوں میں مولانا کمال الدینؒ اور حضرت مولانا قاری شرف الدینؒ کے علاوہ بعد میں سب بزرگوں سے ملاقاتیں ہوتی رہیں، اور حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اور حضرت مولانا محمد قمر الحسن صاحب رحمہما اللہ کی شاگردی مجھ ہیچمدان کے حصہ میں آئی۔ ان بزرگوں میں مولانا کمال الدینؒ کے بعد حضرت الاستاذ مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمیؒ کی محنت اس علاقہ میں سب سے زیادہ رہی ہے۔ آپ کے بعد حضرت الاستاذ مولانا محمد قمر الحسن صاحبؒ کا سفر بغرضِ اصلاح اس علاقہ میں زیادہ ہوا ہے۔ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ صاحب جب میرے علاقہ میں آتے تو یہاں ایک روحانی منظر ہوتا، ہر شخص عقیدت ومحبت اور بہت احترام سے ملاقات کرتا۔ حضرت کا بیان سننے کی تمنا کرتا، خصوصی جلسہ منعقد کیا جاتا اور لوگ بڑے شوق سے حضرت کے بیان سے مستفیض ہوتے۔ مسجد میں نمازیوں میں اضافہ ہو جاتا۔

حضرت مولانا اچھی رائے کی قدر کرتے اور اسے ہی اپناتے۔ اس میں رائے دینے والے کی ذات، علم وحیثیت اور عمر کی طرف نظر نہ کرتے۔ چنانچہ آج سے تقریباً چودہ سال پہلے کی بات ہے کہ مولانا ہمارے یہاں تشریف لائے۔ دو تین دن کے بعد جلسہ کا اعلان کرادیا گیا۔ رات کا جلسہ تھا، وقت کا بھی اعلان ہوا، چونکہ انتظام میرے ذمہ تھا اس لیے لوگوں نے مجھ سے پوچھا کہ جلسہ عشا کی نماز کے بعد شروع ہوگا یا پہلے نماز ہوگی؟ میں نے کہا پہلے نماز ہوگی۔ میرے کہنے سے سب کو اطمینان ہوگیا میں بھی مطمئن تھا، اور اب مجھے مولانا کو اس کی اطلاع دینی تھی۔ مولانا مدرسہ اصلاح المسلمین کے دفتر میں تشریف رکھتے تھے اور میں انتظام میں مصروف تھا، اسی درمیان کسی نے مولانا سے بھی یہی پوچھ لیا، مولانا نے کہا نماز جلسہ ختم ہونے کے بعد ہوگی۔ اسی وقت کسی نے مولانا سے میری بات نقل کردی کہ وہ تو اس طرح کہہ رہا ہے، حضرت نے فوراً اپنی رائے بدل لی اور کہا کہ یہ رائے اچھی ہے، ایسا ہی کرو۔ چنانچہ نماز کے بعد جلسہ شروع ہوا، اور حضرت کو کسی طرح کی گرانی نہیں ہوئی۔

حضرت مولانا کے عمدہ اخلاق کا ایک نمونہ مجھے دیکھنے کو ملا اور وہ میرے لیے تعجب خیز بھی ہے۔ پہلے یہ بات جان لینی چاہیے کہ میرے چچا مولانا محمد رفیع الدین صاحب حضرت کے اولین

شاگردوں میں ہیں۔ مولانا مدرسہ اصلاح المسلمین کے اسی دفتر میں چار پائی پر لیٹے ہوئے تھے، دفتر کیا ہے؟ سفالہ پوش ایک چھوٹا سا کمرہ ہے، جس کو اس راحت پسندی کے دور میں کوئی دفتر کہنا بھی گوارا نہیں کرے گا، مگر اسی چھوٹے سے کمرہ سے عمدہ تعلیم وتربیت کا کام اچھے پیمانہ پر ہو رہا ہے۔ ہم تین آدمی، میں، حضرت مولانا کے ایک اور شاگرد اور جامع مسجد مرکٹہ کے مؤذن صاحب حضرت کی خدمت میں موجود تھے۔ دوران گفتگو ہنسی کی کوئی بات آگئی، پھر مؤذن صاحب اور مولانا اس میں دلچسپی لے رہے تھے، اور ہم دونوں شاگرد بھی ان دونوں حضرات کی ہنسی کی اس چہل گامی میں تھوڑی دلچسپی لے رہے تھے۔ پھر ہوتے ہوتے ایسا سماں بندھا کہ چار آدمیوں کی یہ چھوٹی سی مجلس قہقہہ زار بن گئی۔ ہم تینوں خدام تو ہنستے ہنستے بے حال ہو رہے تھے، اور مولانا بھی ہنسی سے نڈھال ہو رہے تھے۔ گویا ان چار شخصوں میں اس وقت کوئی چھوٹا بڑا نہیں تھا، استاذ وشاگرد خادم ومخدوم کی حد بندی چند لمحہ کے لیے مفقود ہوگئی تھی۔ یہ حالت کئی منٹ تک باقی رہی، اسی اثنا میں عم محترم مولانا محمد رفیع الدین صاحب سلام کرتے ہوئے دفتر کے اندر داخل ہوئے۔ ان کے آتے ہی ایک دم مجلس میں خاموشی طاری ہوگئی، سناٹا چھا گیا، اب کوئی نہیں ہنس رہا تھا۔ گویا مجلس کے اوپر سنجیدگی کی چادر تان دی گئی ہو۔ پھر معاً مجلس کا موضوع بھی تبدیل ہو گیا۔

میں اس واقعہ سے آج تک حیرت میں ہوں کہ کیا کوئی ذی وقار قد آور عالم باعمل اپنے کسی شاگرد کی اتنی رعایت کرسکتا ہے؟ اس سے جہاں حضرت کے عالمانہ شان اور اعلیٰ ظرفی کا پتہ چلتا ہے، وہیں اس سے استاذ کے دل میں ایک شاگرد کے مقام ومرتبہ کو معلوم کر لینا بھی مشکل نہیں۔

اس علاقہ میں تقریباً ایک صدی پہلے ایک ہی جگہ عیدین کی نماز ہوتی تھی، پھر کسی رنجش کی بنا پر پرانے زمانہ سے دو جگہ عیدین کی نماز ہونے لگی۔ حضرت مولانا نے پورے علاقہ والوں کو ایک ساتھ عیدین کی نماز پڑھنے پر آمادہ کیا۔ اور صورت یہ تجویز کی کہ سب ایک ساتھ عید کی نماز مرکٹہ کی عیدگاہ میں پڑھیں اور بقرعید کی نماز ایک ساتھ ہیڈنواڈیہہ کی (سرکاری چراگاہ کی عارضی) عیدگاہ میں، تاکہ دونوں آباد رہیں۔ کئی سال تک اسی طرح عیدین کی نماز ہوتی رہی۔ پھر حضرت مولانا نے اتحاد بین المسلمین کے پیش نظر مولانا رفیع الدین کی تحریک پر عیدین کی نماز کے لیے

ایک عیدگاہ مقرر کردی۔

مجھے یاد ہے کہ (۱۴۰۴/۰۵ھ۱۹۸۴/۸۵ء) میں جب حضرت مولانا تشریف لائے اور مرکٹہ کی عیدگاہ میں پورے علاقہ کی میٹنگ ہوئی، تو مولانا نے سب کو سمجھا بجھا کر ایک عیدگاہ (مرکٹہ کی عیدگاہ) میں نماز پڑھنے پر راضی کیا۔ بعض لوگ کسی خاص گاؤں کی طرف عیدگاہ کی نسبت کرنے سے خوش نہیں تھے، حالانکہ عیدگاہ مرکٹہ ہی کی زمین میں ہے، لیکن اس کے باوجود کچھ لوگ اس کی نسبت کو بلاوجہ ناپسند کرتے تھے۔ حضرت مولانا نے اس مسئلہ کو اس طرح حل کیا کہ اس عیدگاہ کا نام مومن پورا عیدگاہ رکھا، اور اپنے آپ کو اس عیدگاہ کا امام مقرر کیا، اور فرمایا کہ اگر میں نہ آسکوں تو مولوی رفیع الدین عیدین کی نماز پڑھائیں گے۔ اس وقت تو سب راضی ہوگئے مگر شاید کچھ لوگ دل سے راضی نہیں ہوئے تھے، یا بعد میں شیطان نے پٹی پڑھائی، جس کی وجہ سے مطلوب اتفاق واتحاد حاصل نہیں ہوا، اور اب جو عید آئی تو دو تین محلوں کے بہت تھوڑے لوگ اپنی پرانی روش پر چل پڑے اور عیدین کی نماز دو جگہ ہونے لگی۔ تقریباً ۲۵/سال تک یہی صورت حال رہی مگر اب چار پانچ سال پہلے کی بات ہے کہ عم محترم مولانا رفیع الدین صاحب مدظلہٗ کی حکمت عملی دور اندیشی اور صلح جو طبیعت نے تقریباً ایک صدی کے اختلاف کی خلیج کو مسدود کردیا اور پورے علاقہ کو اتحاد واتفاق کی سنہری لڑی میں اس طرح پرو دیا کہ اب عیدین کی نماز پورے علاقہ کے لوگ ایک ساتھ مومن پورا عیدگاہ میں ادا کر رہے ہیں۔ **فالحمد للّٰہ علی ذالک و لہ المنة**

شروع کے دور میں حضرت کا قیام اس علاقہ میں طویل ہوتا تھا اور سال میں ایک یا دو مرتبہ یہاں کا سفر ضرور ہوتا۔ درمیان کے دور میں جب حضرت الہ آباد اور پھر غازیپور کے بعد گورینی چلے گئے تو ادھر کا سفر کم ہوگیا۔ پھر آخر کے دور میں جب حضرت شیخوپور تشریف لے آئے تو دور اول کا معمول لوٹ آیا مگر کام کے ہجوم اور کثرت مشاغل کی وجہ سے قیام مختصر ہونے لگا، کبھی ایک ہفتہ اور کبھی ڈیڑھ دو ہفتے ہی ٹھہرتے تھے۔

۱۴۰۹ھ مطابق ۱۹۸۹ء میں مولانا نے پہلا حج کیا۔ عجیب اتفاق ہے کہ جس سال مولانا نے پہلا حج کیا اسی سال ان کے زیر سایہ میں آگے کا اپنا علمی سفر طے کرنے مدرسہ ریاض العلوم گورینی گیا تھا، اور جس سال مولانا نے دوسرا حج کیا، اس سال میں ان سے مدرسہ شیخ الاسلام

شیخوپور میں پڑھ رہا تھا، اور جب کہ میں خود حج کے سفر میں مکہ مکرمہ میں تھا تو مولانا آخرت کے مسافر بن کر ہم سب سے جدا ہو گئے۔ مدرسہ ریاض العلوم گورینی کا زمانہ کہنا چاہیے کہ مولانا کی تعلیمی وتدریسی عروج کا زمانہ تھا۔ وہاں آپ سے مہمات کتب حدیث کا درس متعلق رہا، مجھے جہاں تک معلوم ہے اصح الکتب بعد کتاب اللہ کا درس بھی آپ نے دیا۔

جب گورینی کا ذکر چھڑ گیا تو اس سفر کا تھوڑا سا خاکہ پیش کئے دیتا ہوں، شاید اس سے حضرت مولانا کی زندگی کا کوئی قابل ذکر مخفی گوشہ سامنے آجائے۔ ہوا یوں کہ میرے علاقہ کے اول اور بہترین حافظ قرآن حافظ وقاری عبدالحمید صاحب سے میں نے گذارش کی کہ میں حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب کے پاس گورینی پڑھنے کیلئے جانا چاہتا ہوں، آپ پہونچا دیتے تو مہربانی ہوتی۔ حافظ صاحب ہیں تو نابینا مگر اللہ نے انھیں نور بصیرت سے بہت نوازا ہے۔ ہمت وحوصلہ کی بات ہے کہ بینائی سے محروم ہیں مگر تنہا کئی کئی روز کے طویل سفر سے انہیں کوئی وحشت اور جھجھک نہیں ہوتی۔ میں نے بھی ان کے اس وصف سے فائدہ اٹھایا، میرے کہنے سے حافظ صاحب مجھے مولانا تک گورینی پہونچانے کے لیے تیار ہو گئے۔ چنانچہ ہم دونوں گورینی پہونچے، مولانا سے ملاقات کے بعد جب ہمارا مقصد سفر معلوم ہوا تو کہا کہ تم نے آنے میں بہت دیر کردی۔ یہاں داخلہ بند ہو چکا ہے، کل سے پڑھائی شروع ہوگی، لڑکے بہت ہو گئے ہیں۔ ہر درجہ میں مطلوبہ تعداد سے زیادہ لڑکوں کا داخلہ ہوا ہے۔ ہم لوگ شام کے وقت پہونچے تھے، مولانا نے مدرسہ ریاض العلوم گورینی کے اس وقت کے ناظم تعلیمات حضرت مولانا مفتی حنیف صاحب (متوفی، ۲۶ جمادی الاولی ۱۴۳۵ھ ۱۸/ مارچ ۲۰۱۴ء) سے میرے داخلہ کے متعلق بات کی مگر گنجائش نہیں نکلی۔ حضرت مولانا کو میرے داخلہ نہ ہونے کا افسوس ہوا، خاص طور سے اس وقت زیادہ قلق ہوا جب مولانا نے مجھ سے نحو میر اور میزان کے دو یا تین سوال کئے تو ہر ایک کا صحیح جواب حاضر تھا، ذرا بھی دیر نہیں لگی۔ اس وقت مولانا کا جملہ مجھے اچھی طرح یاد ہے ''مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ تم دیر سے آئے'' اس وقت حضرت مولانا کے انداز گفتگو سے اپنائیت اور محبت محسوس ہو رہی تھی، پھر مولانا نے ہمیں یہ کہہ کر مدرسہ دینیہ غازی پور بھیج دیا کہ دینیہ میں بھی اچھی پڑھائی ہوتی ہے اور آئندہ سال چاہو تو میرے پاس آجانا، دینیہ میں سب اپنے ہی ہیں، میرا وہاں آنا ہوتا رہتا ہے۔

مدرسہ دینیہ میں جو کچھ تعلیمی سرگرمی، پڑھنے لکھنے کا بہترین ماحول تھا، مولانا کی وجہ سے تھا۔ مولانا کے گورینی چلے جانے کے بعد ان تعلیمی ہماہمی کو باقی رکھنے میں حضرت مولانا صفی الرحمٰن صاحب دربھنگوی کی نیک طبیعت اور ضابطہ پسندی کو دخل تھا، جو مولانا کے ہم مزاج بھی تھے اور دوست بھی تھے۔

اس وقت کی ایک خاص بات جو میرے ذہن میں ہے جس سے حضرت مولانا کی بے نفسی وکمال خاکساری معلوم ہوتی ہے، اسے حوالہ قرطاس کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ مولانا کے اخلاق کے مختلف پہلو پر روشنی پڑ جائے۔ صبح فجر کی نماز اور اوراد ووظائف سے جب مولانا فارغ ہوئے تو کچھ دیر کے بعد ایک طالب علم نے جو غالباً مولانا کے بھانجے تھے، ہم لوگوں کو ناشتہ کرایا، ناشتہ سے فارغ ہوئے تو گھنٹہ لگا، پہلے گھنٹہ میں مولانا کے پاس علم الصیغہ کے لڑکے پڑھنے آگئے۔ پندرہ سے زائد طلبہ اس جماعت میں ہوں گے، مجھے اس وقت اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ اگر میں دوچار روز پہلے آجاتا تو اس جماعت میں اس وقت میں بھی ہوتا۔ مولانا نے لڑکوں سے کہا کہ گذشتہ سال بھی تم لوگ میرے پاس پڑھ رہے تھے، اور اس سال بھی تمہاری کتاب میرے پاس آگئی۔ اس کے بعد ہم لوگ غازی پور کے لیے روانہ ہوگئے، راستہ میں ٹرین پر یا مدرسہ دینیہ پہنچنے کے بعد حافظ صاحب نے پوچھا کہ تمہارا کوئی سامان چھوٹا تو نہیں؟ سب سامان لے لیا تھا؟ میں نے کہا پانی کا تھرمس (ڈبہ) حضرت مولانا کے کمرہ میں چھوٹ گیا۔ حافظ صاحب نے کہا خط لکھ دینا کہ اگر آپ غازی پور مدرسہ دینیہ تشریف لائیں یا اور کوئی آنے والا ہو تو وہ ڈبہ بھیج دیں۔ میں تو خاموش تھا حافظ صاحب کے پوچھنے ہی سے میں نے بتایا تھا۔ میرا خیال تھا کہ کوئی بڑی چیز نہیں ہے، دوسرا خرید لوں گا، اس وقت بھی اس کی قیمت ۶ یا ۷ روپئے سے زیادہ نہیں تھی۔ اس زمانہ میں آج کل کی طرح ٹرینوں میں پانی آسانی سے نہیں ملتا تھا بلکہ اسٹیشن پر ہی پانی دستیاب ہوتا تھا، اس لیے پانی کا کوئی برتن واٹر کولر، ڈبہ وغیرہ مسافر اپنے ساتھ ضرور رکھتے تھے۔

حافظ صاحب کے کہنے سے مجھے بہت تردد ہوا کہ خط میں اس بات کا ذکر کروں یا نہیں؟ اس میں گستاخی معلوم ہوتی ہے مگر اسی تذبذب کے عالم میں میں نے یہ گستاخی کر ڈالی، کچھ ہی دنوں کے بعد حضرت مولانا مدرسہ دینیہ تشریف لائے، یہاں مولانا کی آمد سے طلبہ میں خوشی کی لہر اور

چہل پہل کی کیفیت تھی۔ مولانا صفی الرحمٰن صاحب مدظلہٗ کے کمرہ میں حضرت مولانا بیٹھے ہوئے تھے، سارے طلبہ بہت پرشوق انداز میں ملاقات کررہے تھے، ملاقات کے لیے طلبہ کی آمد و رفت نے ایک اچھا سماں باندھ دیا تھا۔ مجھے حیا دامن گیر تھی کہ میں نے ایک گستاخی کا کام کیا ہے، حضرت مولانا کا کس طرح سامنا کروں؟ مگر ملاقات تو بہر حال کرنی ہے۔ میں اس کی تدبیر نکالنے کے فراق میں تھا کہ طلبہ کی بھیڑ میں ملاقات کر کے بعجلت مولانا کی نظر سے اوجھل ہو جاؤں گا مگر اس میں کامیابی نہیں ملی، اور جب میں ملاقات کے لیے پہنچا تو بالکل بھیڑ نہیں تھی۔ ویسے بھی طلبہ غایت ادب کی وجہ سے ایک ایک کر کے کمرہ کے اندر جاتے اور ملاقات کر کے نکل رہے تھے۔ چنانچہ میں نے جب کمرہ کے اندر داخل ہو کر السلام علیکم کہتے ہوئے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو حضرت نے تبسم آمیز لہجہ میں جواب دیتے ہوئے، مصافحہ کیا اور کہا یہ تمہارا سامان آگیا، اب تو خوش ہو؟

مدرسہ دینیہ کے تین سالہ دور میں حضرت سے بار بار ملاقات ہوتی رہی، سال میں ایک دو دفعہ یہاں ضرور تشریف لاتے۔ یہاں کے اساتذہ میں حضرت قاری شبیر صاحب اور مولانا صفی الرحمٰن صاحب مدظلہما سے مولانا کے گہرے روابط تھے، اور حضرت قاری شبیر صاحب تو حضرت مولانا کے زمانہ طالب علمی کے رفقاء اور دوستوں میں تھے۔ ایک مرتبہ مولانا کے شیخ حضرت مولانا عبدالواحد صاحب مدظلہٗ تشریف لائے تھے، اسی موقع پر مولانا بھی آئے، اس وقت مدرسہ کا روحانی منظر قابل دید تھا۔ حضرت مولانا عبدالواحد صاحب پاکستان سے تشریف لائے تھے۔ متوسط قد، درمیانہ جسامت، نورانی چہرہ، سر پر سفید عمامہ، داڑھی بھی سفید، اس نفیس و پاکیزہ حلیہ کی شخصیت کا نقشہ میرے گوشۂ ذہن میں اب بھی محفوظ ہے۔

جس سال میں مدرسہ شیخ الاسلام حضرت مولانا کے پاس پڑھنے گیا، وہ سال مولانا کا مدرسہ شیخ الاسلام میں دوسرا سال تھا۔

حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی علیہ الرحمہ کے سوانح میں لکھا ہے کہ ”ایک دفعہ دارالعلوم دیوبند میں کوئی میٹنگ تھی یا جلسہ تھا، اس میں مہمان بہت آگئے تھے، اس کے انتظام میں مصروفیت کی وجہ سے حضرت کی تکبیر اولیٰ فوت ہوگئی تھی تو حضرت حجۃ الاسلام اس قدر متأسف ہوئے کہ غم و افسوس کے آثار چہرہ پر ظاہر ہوگئے۔ حضرتؒ کو مغموم دیکھ کر کسی نے دریافت کیا تب

حضرتؒ نے فرمایا کہ ۲۲؍ بائیس سال کے بعد آج تکبیر اولیٰ چھوٹ گئی۔

میں نے اپنے اساتذہ میں حضرت مولانا قاری ابوالحسن اعظمی مدظلہٗ سابق صدرالقراء دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ کو نماز کا بہت زیادہ اہتمام کرتے دیکھا ہے۔ حضرت قاری صاحب اذان کے معاً بعد دارالعلوم کی قدیم مسجد میں پہنچ جاتے اور سنن ونوافل کے بعد جماعت کھڑی ہونے تک تلاوت میں مصروف رہتے۔ اس میں بہت التزام تھا کبھی نہیں دیکھا گیا کہ اذان کے دس منٹ کے بعد مسجد میں پہنچے ہوں۔

اسی طرح کا اہتمام حضرت مولانا کو بھی کرتے دیکھا ہے، آپ کے اس اہتمام کو دیکھنے کے بعد اسلاف کے متعلق پڑھے ہوئے عزیمت واستقامت کے حیرت انگیز واقعات جسم وقالب میں ڈھلتے ہوئے محسوس ہونے لگتے تھے۔ مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور میں پورے ایک سال میں کبھی آپ کی تکبیر اولیٰ فوت ہوتے نہیں دیکھا۔ نماز اور اذان کے درمیان نصف گھنٹہ کا وقفہ ہوتا تھا، آپ ہمیشہ جماعت سے پندرہ بیس منٹ پہلے مسجد پہنچ جاتے۔ اس کا اثر طلبہ پر بھی پڑتا تھا۔ اس وقت مدرسہ میں تقریباً پونے دوسو طلبہ تھے، کسی کی جماعت نہیں چھوٹتی تھی۔ کبھی کسی نماز میں دو چار بچوں کی ایک دو رکعت چھوٹتی ورنہ ایک دو رکعت بھی کسی کی نہیں نکلتی تھی۔

حضرت مولانا اپنے طلبہ سے بھی نماز کا ایسا ہی اہتمام دیکھنا چاہتے تھے جیسے خود کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دن مجھ کو مسلسل دو نمازوں میں مولانا نے مسبوق دیکھ لیا، نماز کے بعد مسجد سے نکلتے ہوئے میں قدرے فاصلہ سے گذر رہا تھا، مجھے بلایا، میں مقصد سمجھ گیا۔ قریب گیا تو اپنے مخصوص شفقت وغضب کے ملے جلے انداز میں فہمائش کی کہ تم نماز میں پیچھے کیوں رہتے ہو؟ آئندہ تمہیں مسبوق نہ دیکھوں؟

پندرہ بیس دن میں ایک دفعہ طلبہ کی مجلس ہوتی، اس میں حضرت مولانا کا طلبہ سے خصوصی خطاب ہوتا، اور پندونصیحت ہوتی۔ اس خصوصی خطاب سے طلبہ میں پڑھنے، لکھنے، مطالعہ وتکرار کا شوق، نماز باجماعت کی رغبت واہتمام، سنت وتقویٰ کی طرف میلان پیدا ہوتا تھا۔ طلبہ مجلس سے جب اٹھتے تو پڑھنے کی لگن، محنت کی امنگ اور نیک وصالح بننے کا جذبہ لے کر اٹھتے۔ حضرت مولانا کو کبھی بہت غصہ میں یا طلبہ کو ڈانٹ ڈپٹ کرتے یا کسی طالب علم کو مارتے ہوئے نہیں دیکھا۔

البتہ ایک طالب علم کو میرے سال میں حضرت نے قینچی سے مارا تھا۔ غالباً گورکھپور کا رہنے والا ایک خوشحال گھرانے کا طالب علم، جو حافظ قرآن تھا، اور فارسی یا عربی اول میں پڑھتا تھا، اس کے گھر والوں کی بہت کوشش تھی کہ کسی طرح آگے بھی پڑھ لے مگر وہ پڑھنا نہیں چاہتا تھا۔ شریر بھی تھا، کبھی مدرسہ سے بھاگ جاتا، کبھی سبق چھوڑ کر کمرہ میں بیٹھا رہتا، غرض بار بار اس کی شکایتیں مولانا کو موصول ہوئیں۔ پہلے مولانا نے اس کو کئی دفعہ سمجھایا مگر وہ شرارت سے باز نہیں آیا تو اس طالب علم کے بارے میں ساتھیوں نے بتایا کہ مولانا نے آج اُس کی قینچی سے پٹائی کی ہے۔ یہ سال مدرسہ شیخ الاسلام میں جماعت پنجم قائم ہونے کا دوسرا اور طلبۂ انجمن کی دیواری پرچہ کا پہلا سال تھا۔ سال کے اختتام پر سالانہ امتحان سے ایک ماہ قبل میں نے سالانہ اختتامی پروگرام کے بارے میں مولانا سے اجازت طلب کی، اور اپنے دیگر ساتھیوں کا بھی خیال ظاہر کیا تو بہت خوش ہوئے۔ حالانکہ مولانا کے انداز و مزاج سے محسوس ہو رہا تھا کہ جلسہ کی اجازت نہیں ہوگی مگر بخوشی اجازت دینے سے طلبہ میں بھی خوشی اور امنگ کی لہر دوڑ گئی، اور پھر تیاری میں سب نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ چنانچہ بہتر پیمانہ پر جلسہ ہوا، پوسٹر شائع ہوئے اور مؤرخ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوریؒ (۱۳۳۴ھ، ۱۹۱۴ء متوفی، ۱۴۱۷ھ ۱۹۹۴ء) کی صدارت میں جلسہ منعقد ہوا۔ سخت سردی کا موسم تھا اس کے باوجود مسجد جو بہت وسیع ہے، اس کا اندرونی حصہ سامعین سے بھر گیا۔ اور حضرت قاضی صاحب کے ہمراہ مفتی عزیز الرحمٰن چمپارنی بھی جلسہ میں تشریف لائے۔ چونکہ اس نوعیت کا اس مدرسہ میں پہلا جلسہ تھا، اس لیے طلبہ، اساتذہ اور سامعین میں کافی جوش و خروش تھا اور اتنا ہی کامیاب بھی رہا۔

مدرسہ شیخ الاسلام میں حضرت مولانا کے شبانہ یوم کا معمول اس طرح تھا کہ فجر کی نماز سے کم از کم نصف گھنٹہ قبل گھر سے مکمل تیار ہو کر مدرسہ آتے، آپ کے آنے سے پہلے مؤذن جو ایک طالب علم تھا، اور درجۂ حفظ کے کچھ ہی بچے بیدار ہوتے، ورنہ پورا مدرسہ محو خواب ہوتا۔ آپ ہر کمرہ کے باہر سے آواز لگا کر طلبہ کو بیدار کرتے۔ اس کے بعد مسجد جاتے جماعت کھڑی ہونے تک ذکر و اذکار اور زبانی تلاوت میں مصروف رہتے۔ پانچوں نمازیں اور جمعہ کی نماز خود پڑھاتے (کبھی احقر راقم کو نماز پڑھانے کے لیے آگے کر دیتے) جمعہ میں قبل الخطبہ وعظ فرماتے۔ فجر کی

نماز میں بقدر طوال مفصل سے کم قرأت نہیں ہوتی تھی، آپ کی قرأت میں مشاق قاری کا لحن تو نہیں ہوتا تھا البتہ اس میں ایک طرح کا سوز و گداز ہوتا، جس سے توجہ کا انتشار کالعدم ہو کر نماز میں انہماک ہوتا تھا۔ ہمارے سال میں فجر کی نماز میں سورۂ بقرہ سے روزانہ ترتیب وار قرأت شروع کی تو شعبان کی چھٹی تک سورۃ مریم تک ہو گیا تھا۔ یہ یاد نہیں کہ حج سے آنے کے کتنے دنوں بعد سورہ بقرہ شروع کیا تھا۔ نہ کہیں مشابہت لگتی اور نہ کبھی لقمہ کی ضرورت پیش آتی۔ فجر کی نماز کے بعد ہوا خوری کے لیے (جیگہاں کی طرف) جاتے، واپس آنے کے بعد وقت ہوتا تو تھوڑا آرام کر لیتے، اتنے میں گھر سے ناشتہ کا ٹفن آ جاتا۔ ناشتہ کے بعد استنجا اور وضو سے فارغ ہوتے، آپ ہر وضو سے پہلے مسواک ضرور کرتے۔ درس کے درمیانی وقفہ میں استنجاء کی حاجت ہوتی تو بھی مسواک کے ساتھ وضو کرتے۔ خود گھنٹہ لگواتے، آپ کے حجرہ کے سامنے برآمدہ کے باہر کی طرف گھنٹہ لٹکا ہوا تھا۔ پورے دن کے چھ گھنٹے بھی اکثر آپ لگواتے۔ چار گھنٹے کے بعد دوپہر کو کبھی چھٹی ہوتے ہی اور کبھی تھوڑا رک کر گھر جاتے۔ ظہر میں تقریباً آدھا گھنٹہ پہلے مدرسہ آ جاتے، ضرورت محسوس ہوتی تو طلبہ کو جگاتے، ورنہ اس وقت دوسرے اساتذہ لڑکوں کو جگاتے۔ جماعت سے پندرہ بیس منٹ پہلے مسجد پہنچ جاتے، جماعت سے اتنی دیر قبل مسجد پہنچنے کا آپ کا معمول ہر نماز میں تھا۔ ظہر کے بعد عصر تک مصروف درس رہتے، عصر کے بعد کبھی کہیں چلے جاتے اور اکثر برآمدے کے باہر چار پائی پر بیٹھ جاتے، دو چار اساتذہ بھی اس وقت آپ کے حلقہ بگوش ہو جاتے، اور علم و افادہ کی مجلس منعقد ہو جاتی۔ مغرب کی نماز کے بعد کچھ دیر تک اوابین اور اوراد و وظائف میں مشغول رہتے، پھر اپنے کمرے میں تشریف لاتے اور عشاء تک مطالعہ اور لکھنے کا شغل رہتا۔ عشاء کے بعد تھوڑی دیر انھی امور میں مصروف رہتے۔ ادھر طلبہ کھانا کھا کر پھر سے تکرار و مطالعہ میں مشغول ہو جاتے، اوپر کی جماعت کے کچھ طلبہ خدمت میں پہنچ جاتے، تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد گھر چلے جاتے۔

اس وقت طلبہ کی انجمن میں چھوٹی چھوٹی کتابیں تھیں، اس لیے میں مطالعہ کے لیے مولانا ہی سے کتابیں لیا کرتا تھا۔ حضرت بخوشی مرحمت فرماتے، مولانا کے پاس اس وقت بھی اپنی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ مولانا کا حجرہ خاصہ وسیع تھا، اس کے چاروں طرف دراز میں کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ ''سیرۃ النبی'' کی مکمل تین جلدیں اور جلد چہارم کا معتد بہ حصہ، رسالہ ''البلاغ''

کراچی کا کوئی خاص نمبر جو بہت مبسوط تھا، اس کے آٹھ سو صفحہ سے زائد کا مطالعہ، اور علامہ یوسف بنوریؒ کی کتاب ''الاستاذ المودودی'' جس کا ترجمہ ''مولانا مودودی اپنے افکار ونظریات کے آئینہ میں'' کے نام سے مولانا کے قلم حقیقت رقم سے نکل کر کئی سال قبل شائع ہو چکا تھا، ان کے علاوہ دوسری کتابوں کا مطالعہ حضرت مولانا ہی کی عنایت سے کر سکا۔ یہ ترجمہ اتنا سلیس شستہ اور رواں ہے کہ کہیں ترجمہ پن کی جھلک محسوس نہیں ہوتی، مستقل کتاب معلوم ہوتا ہے۔

اس سال حج سے ایک کتاب ''**معجزات الشفا بماء زم زم**'' ساتھ لائے، اس کے ترجمہ کا کام کسی استاذ کے حوالہ کیا، انھوں نے کچھ حصہ کا ترجمہ کیا مگر مولانا کو وہ ترجمہ پسند نہیں آیا تو خود ہی ترجمہ کیا۔ جو ''برکات زمزم'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ اس سال مولانا نے '' گاؤں میں جمعہ'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا، جو ''فقہ اسلامی'' میں شائع ہوا تھا، جس کی تبییض مجھ سے کرائی تھی۔ اس میں مولانا نے گاؤں میں جمعہ کے جواز کا فتویٰ دینے کے لیے علماء ومفتیان کرام کو غور وفکر کی دعوت دی تھی، اور اپنے مضمون کو دلائل سے مبرہن کرتے ہوئے مسئلہ مفقود الخبر کی طرح اس مسئلہ میں امام شافعیؒ کے قول پر فتویٰ دینے کی استدعا کی تھی۔ اس مضمون کے جواب میں حضرت مولانا افضال الحق جوہر قاسمیؒ (جو مولانا کے استاذ تھے) کا مضمون شائع ہوا۔

مدرسہ کی تعطیل میں جو طلبہ گھر نہ جاتے، ان کو کسی نہ کسی علمی مصروفیت میں لگائے رکھتے۔ اس سال ششماہی کی چھٹی میں کئی لڑکوں کو جو حافظ نہ تھے، تیسواں اور انتیسواں پارہ یاد کرایا۔ لڑکے شوق سے یاد کر کے مولانا کو سناتے، اسی موقع پر میں نے حضرت مولانا سے گذارش کی کہ غازی پور میں چچا (مولانا رفیع الدین) کو آپ نے قرآن مشق کرایا تھا، میں بھی مشق کرنا چاہتا ہوں، اس پر شاید یہ کہا کہ ہاں کرایا تو تھا مگر تم کیا کرو گے؟ غالباً حافظ ہونے کی وجہ سے مجھے اس کا موقع نہ مل سکا، پھر حسب سابق یہ چھٹی بھی میرے مطالعہ کتب کے لیے بہترین موقع ثابت ہوئی۔

ایک مرتبہ مولانا کو کسی حدیث کی تلاش تھی، حدیث کی ایک اہم کتاب کی طرف اشارہ کر کے اس میں مجھے تلاش کرنے کو کہا، میں اس وقت جلالین، ہدایہ وغیرہ پڑھ رہا تھا، تدقیق وجستجو کے کسی مرحلہ سے گذرنے کا سابقہ مجھے پہلی دفعہ پڑا تھا۔ جب تلاش بسیار کے بعد بھی ناکام رہا تو

کہا کہ چلو رہنے دو بعد میں دیکھیں گے۔ اس وقت تک مولانا نے بیعت وارشاد کا سلسلہ شروع نہیں کیا تھا، ایک مرتبہ میرے استفسار پر بتایا کہ اجازت وخلافت تو مجھے بہت پہلے مل چکی ہے مگر میں بیعت نہیں کرتا ہوں۔

بڑی شخصیات میں ایک خاص چیز یہ نظر آتی ہے کہ ایک مقام پر رہ کر علم وعرفان کی شمع روشن کرتے، پھر خلائق کا رجوع وہجوم ہوتا، مگر تاریخ میں کچھ شخصیات کی زندگی ایسی بھی ملتی ہیں کہ ایک جگہ استقرار واستقامت میسر نہیں آئی، پھر بھی ان سے چشمہ فیض برابر جاری رہا۔ حضرت مولانا انہیں مؤخرالذکر شخصیات میں تھے، مولانا جہاں بھی گئے وہیں اپنا بساط علم بچھا دیا اور اس طمطراق سے بچھایا کہ طلبۂ علوم نبوت پروانہ وار آپ کی طرف اُمڈ پڑے۔ چھوٹے سے چھوٹے مدرسہ کو آپ کے حسن تعلیم وتربیت سے ایسا عروج حاصل ہوا کہ دو چار سال میں بڑے ادارہ کی شکل اختیار کر گیا اور ملک کے مختلف صوبوں سے طلبہ کا قافلہ کشاں کشاں مولانا کی تربیت گاہ میں اترنے لگا۔ مدرسہ دینیہ غازی پور اور مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور کو مولانا کے دور میں اسی تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ آپ کو ریاض العلوم گورینی کے علاوہ دوسرے بڑے ادارہ سے پیشکش ہوئی مگر آپ اپنے قرب وجوار میں رہ کر اپنا علمی وروحانی فیضان جاری رکھنے کے حق میں تھے، اس لیے معذرت فرمادی۔

حضرت مولانا کے بعض معتمد اور خاص شاگرد سے میں نے سنا کہ مولانا صاحب کرامت بزرگ تھے، اور گاہے بگاہے ان سے کرامت کا ظہور بھی ہوا ہے۔

اس خیال کی تائید اور کرامت کی معمولی سی جھلک ایک چھوٹے سے میرے چشم دید واقعہ سے ہوتی ہے۔ ایک دفعہ ہمارے علاقہ میں حضرت مولانا تشریف لائے ہوئے تھے اور قیام مدرسہ اصلاح المسلمین ہی میں تھا۔ ایک دن صبح کا ناشتہ مرکٹھ میں مولانا کے ایک شاگرد نے اپنے یہاں منظور کرالیا، ناشتہ کی اس دعوت میں حضرت مولانا کے ساتھ علماء وحفاظ اور پڑھے لکھے لوگوں کا ایک چھوٹا سا قافلہ بھی مدعو تھا، جس میں میں بھی شامل تھا۔ ناشتہ سے فارغ ہوکر مدرسہ اصلاح المسلمین کی طرف واپس ہونے لگے۔ مرکٹھ کی گلی میں جہاں سے تالاب کی طرف کو مڑتے ہیں، وہیں کسی نے مروجہ مسابقات کے متعلق مولانا سے سوال کیا، حضرت مولانا وہیں رک کر جواب دینے لگے۔

مولانا رکے تو پورا قافلہ جو مولانا کی متابعت کر رہا تھا، ٹھہر گیا۔ اور حضرت مولانا کا جواب سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہوگیا۔ جواب کا حاصل یہ تھا کہ اس طرح کے مسابقوں میں فائدہ کم، نقصان زیادہ ہوتا ہے، اور نقصان کی قدرے تفصیل بیان کرتے ہوئے بطور استدلال آیت مبارکہ " **فیھما اثم کبیر و منافع للناس** " کی تلاوت فرمائی، اسی درمیان علاقہ کے ایک مشہور گھرانے کا پروردہ ایک جوان جو گذشتہ چند سالوں سے حضرت مولانا سے قریب ہوگیا تھا، اور حضرت جب تشریف لاتے تو یہ جوان نیازمندانہ حاضر خدمت ہوتا، دعائیں کراتا، عرض ومعروض کرکے اپنے گھر لے جاتا، بیان کراتا۔ یہ جوان اپنی بلیٹ لے کر آیا، اور مولانا سے اپنی بلیٹ پر سوار ہونے کی درخواست کی۔ مولانا تو اولاً تیار نہیں ہوئے، مگر اس کی طرف سے اصرار ہوا تو اس پر بیٹھ گئے۔ ابھی سوار ہوکر تقریباً سو قدم گئے ہوں گے کہ گاڑی سمیت وہ جوان زمین پر گر گیا، اور گاڑی میں ایسا پھنسا کہ بمشکل تمام اٹھ سکا۔ اگرچہ دونوں میں سے کسی کو چوٹ یا کوئی خراش نہیں آئی مگر اس وقت جو عجیب بات پیش آئی وہ یہ کہ مولانا زمین پر گاڑی کے پاس اس طرح سیدھے کھڑے تھے، جیسے گاڑی پر پہلے سے سوار ہی نہ ہوئے ہوں، جبکہ دور نزدیک سے پچاسوں آدمی دیکھ رہے ہوں گے، کسی نے بھی مولانا کو زمین پر پڑے ہوئے یا زمین سے اٹھتے ہوئے یا اپنے کپڑے سے گرد جھاڑتے ہوئے نہیں دیکھا۔ معاملہ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر کس طرح مولانا زمین پر کھڑے رہ گئے جبکہ گاڑی پر سوار دوسرا ہٹا کٹا جوان گاڑی کے ساتھ زمین پر ڈھیر ہوگیا تھا۔

حضرت مولانا کو اپنے شاگردوں کی تربیت کی طرف خاص توجہ رہتی تھی، خواہ بحیثیت طالب علم زیر تعلیم ہو یا آپ سے پڑھے ہوئے مدت گذر گئی ہو۔ آپ سے پڑھ کر جو تدریسی یا دوسرے دینی خدمات میں مصروف ہوگئے ہوں، ان کی بھی خطوط وغیرہ سے راہنمائی کرتے رہتے تھے، اور آپ کے سعادت مند تلامذہ رسمی طور پر فارغ ہونے کے بعد بھی آپ کے نصائح اور رہنمائی سے فیض حاصل کرتے رہتے۔ کم وبیش کے فرق کے ساتھ احقر راقم الحروف کے ساتھ بھی یہ سلسلہ قائم رہا۔ میں دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث میں پڑھ رہا تھا، اس دوران کے مکتوب میں کئی زریں نصیحتوں سے میری راہنمائی فرمائی۔ چنانچہ ایک مکتوب میں حضرت مولانا نے لکھا کہ "یہ دورۂ حدیث کا سال ہے، اس میں وقت کم ملے گا۔ زیادہ تر مطالعہ کتب میں مشغول رہنا اور درس کا

کوئی وقت خالی ہو تو کتب خانہ میں جا کر کتابیں دیکھو، کام کی باتوں کا نوٹ تیار کرو، خصوصیت کے ساتھ فیض الباری شرح بخاری کا مقدمہ اور تمہیدات ضرور پڑھ لو، اس میں بڑا علم ہے۔ کوئی بحث سمجھ میں نہ آئے تو لفظ بلفظ نقل کرلو، بعد میں اردو میں ترجمہ کر لینا۔'' ایک دفعہ میں نے اپنے ضعف حافظہ کی شکایت کی کہ جو کچھ مطالعہ کرتا ہوں دو چار دن تک تو ذہن میں تازہ رہتا ہے، اس کے بعد ذہن میں نہیں رہتا ہے۔ اس کے جواب میں حضرت نے لکھا کہ کسی بات کے ذہن میں محفوظ رہنے کے لیے صرف ایک مرتبہ مطالعہ کر لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ مطالعہ کرنے کے بعد ساتھیوں سے اس کا مذاکرہ اور تکرار بھی ہونا چاہیے۔

ایک مکتوب میں اصلاح کے سلسلے میں تحریر فرمایا کہ آدمی اپنے دینی و علمی اور قلبی و باطنی احوال پر مطمئن ہو کر بیٹھ نہ جائے بلکہ ہمیشہ اس ادھیڑ بن میں لگا رہے کہ اس کے اندر کیا کیا کمی ہے؟ اور اس کے دور کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ اور طریقہ معلوم کر کے اس پر عمل درآمد بھی شروع کر دے یہی کامیابی کی کلید ہے۔

❑❑❑

حدیث کی مشہور کتاب مسلم شریف میں ایک روایت ہے، حضرت ام سلمہ ام المومنین رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا کہ جب مسلمان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے اور وہ وہی بات کہتا ہے جس کا اللہ نے حکم دیا ہے یعنی إنا للہ وإنا إلیه راجعون اور پھر کہتا ہے أَللّٰهُمَّ اُجُرْنِیْ فِیْ مَصِیْبَتِیْ وَاخْلُفْ لِیْ خَیْراً مِّنْهَا (اے اللہ مجھے اس مصیبت میں اجر و ثواب عطا فرمایئے اور اس سے بہتر چیز مجھے دیجئے) تو اللہ تعالیٰ اس کا نعم البدل عطا فرماتے ہیں، فرماتی ہیں کہ جب میرے شوہر ابوسلمہ کا انتقال ہوا تو میں سوچنے لگی کہ ابوسلمہ سے بہتر شوہر مجھے کہاں ملے گا، یہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کی جانب ہجرت کی، تاہم میں نے حضور ﷺ کی بتائی ہوئی دعا پڑھ لی، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے بدلے میں مجھے رسول اللہ ﷺ جیسا شوہر عنایت فرمایا۔

یہ دعا بہت مجرب ہے، سب سے پہلے تو ام المومنین نے اس کا تجربہ کیا، پھر ان کے بعد سینکڑوں ہزاروں لوگوں نے اس کا تجربہ کیا۔ (حدیث دوستاں)

حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ کو میں نے کیسے پایا

مولانا رفیع الدین نعمانی صاحب
مہتمم مدرسہ اصلاح المسلمین نانہی ڈیہہ دیوگھر، جھارکھنڈ

دنیا کی ہر ذی روح کو موت کا کڑوا گھونٹ پینا ہے اور ہادم اللذات کے سخت ترین مرحلہ سے گذر کر اس منزل کی طرف جانا ہے جو اس دنیائے فانی کے بعد ہر ذی نفس کے لیے مقرر ہے۔ حضرت الاستاذ مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ بھی اپنی طبعی عمر پوری کر کے خالق الموت والحیات کے جوار رحمت میں چلے گئے۔ حضرت مولانا کا ہمارے درمیان سے ہمیشہ کیلئے رخصت ہو جانا ایک ایسا حادثہ تھا جس نے لاکھوں کو آبدیدہ کر دیا اور ہزاروں کو تڑپا دیا۔ نماز جنازہ میں عوام وخواص کے ہجوم سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ حضرت کے انتقال سے کتنے لوگ مغموم وسوگوار ہوئے۔ تقریباً ڈیڑھ سال تک مہلک بیماری میں مبتلا رہے اس کے باوجود اس مدت میں لکھنے، پڑھنے، پڑھانے ، وعظ وتقریر، بیعت وارشاد، تلقین وتذکیر شب بیداری، ذکر وشغل، نوافل و عبادات وغیرہ شب وروز کے معمولات پر بہت معمولی فرق کے ساتھ پابند عمل رہے۔

۱۹۷۳ء کی بات ہے کہ جب میں مشرقی یوپی کے مشہور ادارہ جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب بنارس میں قدوری وغیرہ پڑھ رہا تھا، وہ سال مولانا کی تدریس کا پہلا سال تھا اور میں حضرت مولانا کے اولین شاگردوں میں شامل ہوا۔

یہ بات حضرت مولانا کا ہر شاگرد اچھی طرح جانتا ہے کہ مولانا اپنے شاگردوں پر اپنی اولاد کی طرح بہت شفقت فرماتے تھے اور مولانا کا ہر شاگرد یہ سمجھتا تھا کہ مولانا کی مجھ پر خاص نظر ہے اور میں مولانا کے بہت قریب ہوں۔ یہ خصوصیت ہمارے طبقہ علماء میں دیگر اساتذہ وعلماء

میں بھی پائی جاتی ہے مگر مولانا کے اندر یہ خصوصیت بہت نمایاں تھی، جس کا احساس مولانا کے زیر تربیت رہنے والے ہر طالب علم کو بہت جلد ہوجاتا تھا، اور یہ وہ جوہر اور عمدہ خصوصیت ہے جس سے تربیت کی راہ آسان ہوجاتی ہے، اور جانبین کے لیے افادہ واستفادہ کا باب کشادہ ہوجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا کی تربیت سے طلبہ میں پڑھنے لکھنے، مطالعہ کا شوق اور نماز باجماعت کا اہتمام پیدا ہوجاتا تھا۔ گویا آپ ایک طرف درس وتدریس سے جام شریعت بھی پلاتے اور دوسری طرف منفرد طریقۂ تربیت سے سندان عشق بھی عنایت فرماتے۔

میں جس علاقہ سے تعلق رکھتا ہوں وہ جھارکھنڈ (سابق بہار) کا ایک پسماندہ علاقہ ہے، اس کا ضلع دیوگھر ہے۔ یہ علاقہ اپنی پسماندگی اور پچھڑے پن کے ساتھ جہالت وبے دینی میں بھی اپنی مثال آپ تھا، جہاں پورے علاقہ میں دین کی معلومات رکھنے والے کسی معمولی مولوی کا ملنا تو بہت دور کوئی ناظرہ قرآن پڑھا ہوا نہیں تھا۔ اس علاقہ کے تفصیلی حالات اور آج سے تقریباً پینتالیس سال قبل یہاں کے لوگوں کے دینی احوال کی منظر کشی حضرت مولانا نے ماہنامہ ''ضیاء الاسلام'' کے کئی شماروں میں ''پہاڑیوں کی دیس میں'' اور ''مولوی کمال الدین مرحوم'' کے عنوان سے کی ہے۔ اور یہی علاقہ ہے جہاں حضرت مولانا کے عوامی اصلاحی کاموں کا آغاز ہوا ہے، اور مجھے معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ مولانا نے اپنی حیات کے آخری دن بھی اس علاقہ میں اپنی اصلاحی کوششوں کو موضوع گفتگو بنائے رکھا، اور طلبہ کے سامنے اور نجی مجلسوں میں گھنٹوں یہاں کے حالات بیان کرتے رہے۔ اس سے یہ بات بآسانی سمجھ میں آتی ہے کہ اس علاقہ کی اپنی اصلاحی محنت کو حضرت مولانا اپنے لیے سرمایۂ آخرت سمجھتے تھے۔

اس علاقہ میں واقع مدرسہ اصلاح المسلمین جو مضبوط تعلیم اور عمدہ تربیت میں پورے ضلع دیوگھر کا اقامتی مشہور مدرسہ ہے، جس کی ذمہ داری میرے ناتواں کندھے پر ہے، حضرت مولانا کی اس پر خصوصی توجہ تھی۔ اس کی بنیاد اگرچہ مولانا کمال الدین رحمۃ اللہ علیہ ہی ڈال چکے تھے مگر اس کی تعمیری شکل اور اس کا تعلیمی وتربیتی اور کامیابی کے اس مرحلہ تک پہنچنا حضرت مولانا کی کوششوں آپ کی دعاؤں اور توجہات کا ثمرہ ہے۔ آپ تادم آخر اس مدرسہ کے سرپرست رہے۔ آپ کے علاوہ حضرت مولانا محمد قمر الحسن صاحب بھاگلپوریؒ کی سرپرستی بھی اس مدرسہ کو حاصل

رہی، دونوں بزرگوں کی خصوصی نگاہیں اس مدرسہ پر ہمیشہ رہیں، دونوں حضرات کے زیرنگرانی یہ مدرسہ پروان چڑھتا رہا اور آپ دونوں ہی بزرگوں کے مشورے سے اس کے اہم کام انجام پاتے رہے۔

بلاشبہ حضرت مولانا شیخ وقت اور مرشد کامل تھے، اور آپ اپنی زندگی کی آخری دہائی میں بیعت وسلوک کی طرف زیادہ متوجہ ہوئے۔ ویسے آپ کی ہر تحریر وتقریر میں اصلاح کا پہلو نمایاں ہوتا تھا مگر جب آپ نے بیعت وارشاد کی طرف عنان توجہ کو ملتفت کیا تو آپ کی تحریر وتقریر میں اصلاح کا مضمون غالب ہونے لگا۔ اس آخری دور میں خلائق آپ کی طرف بغرض اصلاح وارشاد زیادہ متوجہ ہونے لگی۔

حضرت مولانا کی ذات گرامی ان مخصوصین اور خاصان خاص بزرگان دین میں سے تھی جنہیں اللہ نے عوام وعلماء دونوں طبقہ میں یکساں مقبولیت عطا فرمائی تھی۔ حضرت مولانا کو اللہ نے افہام وتفہیم کا وہ اعلیٰ اور عمدہ ملکہ عطا فرمایا تھا جس کی مثال ونظیر مشکل سے ہی ملتی ہے۔ درسی کتابوں کے پیچیدہ مباحث ہوں یا وعظ کی مجلس، منطق وفلسفہ کی کتابوں کے اسباق ہوں یا عوام الناس کا مجمع، طلبہ کی محفل ہو یا خطاب عام کا موقع، ہر جگہ آپ کی تشریح وتعبیر بیان وخطابت، مناسب حال، حشو وزوائد سے پاک، مرکزی مضمون اور مقصد موضوع پر حاوی ہوتی تھی۔ انداز دلچسپ ہوتا، الفاظ بہت آسان استعمال فرماتے، مشکل اور کٹھن الفاظ کے استعمال سے گریز کرتے۔ اصطلاحی الفاظ کو عام فہم انداز میں تلفظ فرماتے تھے، جنہیں ہر خرد وکلاں، ادنیٰ واعلیٰ پڑھا لکھا اور ان پڑھ، ذہین وکم سمجھ بھی بآسانی سمجھ لیتا، اور آپ کی مجلس خاص اور محفل وعظ کو سن کر اٹھنے والا ہر شخص اپنے اندر ایمانی جذبہ میں ایک تازگی اور دین سے قربت ورغبت محسوس کرتا۔

آپ کی تحریر بہت چشم کشا اور بصیرت افروز ہوتی تھی۔ تحریر ہو یا عوامی تقریر، مجلس خواص وعلماء کی گفتگو ہو یا درسی تقریر کسی میں تکلف وتصنع کی آمیزش نہیں ہوتی تھی۔ ہلکی پھلکی، صاف شستہ اور سلاست وروانی کا آئینہ دار ہوتی۔ مضامین آپ کے الفاظ تحریر کا جامہ پہن کر زبان کے راستہ سے گذرتے ہی قلب وضمیر کے بام ودر پر دستک دینے لگ جاتے، اور قاری وسامع تادیر اپنے روح ووجدان میں حلاوت محسوس کرتا رہتا۔

مولانا نے اپنی خودنوشت سوانح ''حکایت ہستی'' میں کہیں لکھا ہے کہ ''میں بچپن سے محبت کا آدمی ہوں مجھے محبت کے لفظ سے محبت ہے۔'' واقعی مولانا کا یہ جملہ صداقت سے پُر ہے۔ چالیس سال کا یہ طویل عرصہ جس میں مولانا سے میرا استاد وشاگرد کا تعلق نہ صرف قائم رہا بلکہ اول دن سے مولانا کی زندگی کے آخری لمحہ تک وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ استوار ہوتا گیا۔ میں جہاں بھی رہا، ہمیشہ خط وکتابت کا سلسلہ جاری رہا، اور بعد میں فون اور موبائل نے خط وکتاب کا دروازہ بند کر کے سہولت کی ایک نئی راہ پیدا کر دی، تب تو شاید کوئی مہینہ ایسا گذرا ہو جس میں کم از کم ایک دو دفعہ ہم کلامی نہ ہوئی ہو۔ مولانا جس زمانہ میں دوبارہ مدرسہ دینیہ غازی پور آئے تو مجھے بھی وہیں بلالیا۔ چنانچہ میں مولانا کے زیر سایہ تدریس کی خدمت پر مامور ہو گیا، مدرسہ دینیہ کے پہلے دور میں مولانا سے میں نے شرح وقایہ، ہدایہ وغیرہ پڑھی تھی۔ اس کے بعد مولانا الہ آباد چلے گئے اور ہم ساتھیوں نے دارالعلوم دیوبند کا رخ کیا۔ دوسرے دور کے بعد مولانا ریاض العلوم گورینی جونپور چلے گئے۔ اور میں جامعہ محمدیہ عربیہ شاہ جنگی بھاگلپور آ گیا۔ تب سے آج تک یہیں تدریس کی خدمت انجام دے رہا ہوں۔ مولانا کا ہمیشہ میرے ساتھ الفت ومحبت کا سلوک رہا، اور کیا بتاؤں؟ کہ مولانا کتنی شفقت کا معاملہ کرتے تھے۔ اس طویل زمانہ کے سرد وگرم حالات کو اور مولانا کی عنایتوں کو جب یاد کرتا ہوں تو آبدیدہ ہو جاتا ہوں: ع

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

ہم لوگوں کی طرف سے حضرت مولانا کو یہی خراج عقیدت ہوگا کہ ان کے طرز پر دین اور علم دین کی خدمت کی جائے۔ ان کے کام کو آگے بڑھایا جائے اور ان کے اہل خانہ کا خاص خیال رکھا جائے۔

اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کو غریق رحمت کرے اور ان کی خدمات کا بہترین جزا عطا فرمائے۔ آمین!

* * *

رفیق مکرم حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی
کچھ یادیں۔ کچھ باتیں

مولانا ابوعبیدہ صاحب
ابن حضرت مولانا زین العابدین صاحب پورہ معروف

مولانا اعجاز سے میرا تعارف پرانا ہے، جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں وہ عربی درجات کے طالب علم تھے اور میں درجہ پرائمری میں۔ مدرسہ کے جنوبی دروازے کے غربی سمت کا پہلا کمرہ والد صاحب کی درس گاہ تھی، اور مولانا اعجاز صاحب بھی زیادہ تر اسی میں رہتے تھے، اور کھانا بھی وہیں کھاتے تھے۔ گفتگو بہت کم کرتے تھے مگر جب کسی موضوع پر بولتے تو بے تکان بولتے۔ کتابوں میں ہمہ وقت غرق رہنا ان کی اصل شان اور خصوصی پہچان تھی۔ میں عمر میں مولانا سے پانچ چھ سال چھوٹا ہوں، اپنے بچپن کی شرارت کی وجہ سے جب کبھی ان کے مطالعہ میں خلل انداز ہوتا تو کبھی سمجھاتے اور نصیحت کرتے، جب میری شرارت زیادہ ہوتی تو کبھی خفا بھی ہوجاتے مگر ایسا بہت کم ہوتا۔ جب زیادہ تنگ ہوجاتے تو اٹھ کر مولانا جمیل صاحب کی درسگاہ میں چلے جاتے جو اسی لائن میں غربی سمت کا آخری کمرہ تھا، اس کی کنجی انہیں کے پاس رہتی تھی، دروازہ بند کرکے اندر اپنے مطالعے میں مصروف ہوجاتے۔ البتہ کھانے کے وقت میری شرارت کا بدلہ اس طرح لیتے کہ جب کھانے کے دوران کبھی بجلی کٹ جاتی تو میری پلیٹ آہستہ سے ہٹا لیتے اور میں دسترخوان پر لقمہ لگا کر چلاتا کہ میری پلیٹ کیا ہوئی؟ اس پر پہلے وہی ہنستے اور میں سمجھ جاتا کہ یہ انہیں کا کام ہے۔ میرے تلملانے سے وہ خوب محظوظ ہوتے، درحقیقت یہ ان کی شفقت تھی۔ ان

شرارتوں کے باوجود ہمارا آپسی تعلق ومحبت روز افزوں ترقی پذیر رہا۔

میں پڑھنے میں بدشوق، اپنے وقت کا ناقدرا، آج تک ایک بے حیثیت اور ننگ خلائق، علم وفن سے بے گانہ، آداب واخلاق سے ناآشنا۔ مگر ان کا کیا پوچھنا! انہوں نے تو وہ زقند لگائی کہ آسمان علم وعمل، تعلیم وتعلم، تحریر وتقریر، زہد وتقوی اور رشد وہدایت کے آفتاب وماہتاب بن کی عالم اسلام کے افق پر چمکے اور اپنی شعاعوں سے ہزاروں لوگوں کو فیض یاب کیا۔

حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب اصول کے پابند اور اپنی فکر پر پہاڑ کی طرح اٹل رہنے والے انسان تھے، اور ان میں ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ فکری اختلاف کی وجہ سے تعلق نہیں توڑتے تھے بلکہ ”**لکم دینکم ولی دین**“ پر عمل پیرا رہتے۔ ایک واقعہ سنئے:

ذی الحجہ ۱۴۱۵ھ مطابق مئی ۱۹۹۵ء میں پورہ معروف میں والد صاحب (مولانا زین العابدین صاحب) کی سرپرستی میں خالص لڑکیوں کی اعلی تعلیم کے لئے ایک غیر مخلوط تعلیمی ادارہ قائم کرنے کا ارادہ ہوا، اور یہ بھی طے پایا کہ ایک ہلکا پھلکا جلسہ کیا جائے جس میں والد صاحب چند بچیوں کو سبق پڑھا کر تعلیم کا آغاز کردیں۔ اس مدرسہ کی ترغیب میں نے ہی والد صاحب کو دلائی تھی، چنانچہ تقریر کے لئے والد صاحب نے ایک خط مولانا اعجاز صاحب کے نام لکھ کر مجھے بھیجا۔ مرقات العلوم مئو میں مولانا سے ملاقات ہوئی، ظہر بعد کا وقت تھا، تپاک سے ملے، خاطر مدارات کی۔ ان سے یہ ملاقات ایک مدت کے بعد ہوئی تھی، میں نے پوچھ لیا کہ پہچانتے ہیں؟ مسکرا کر فرمایا بالکل نہیں! پھر فرمایا کہ تم کو بھولوں گا، پلیٹ کون سرکاتا تھا؟ میں تو پلیٹ والا واقعہ بھول چکا تھا مگر مولانا نے یاد دلایا۔ پھر دیر تک خیریت دریافت کرتے رہے۔ میں نے آنے کا مقصد بیان کیا کہ پورہ معروف میں لڑکیوں کا مدرسہ قائم کرنا ہے، اسی کی دعوت دینے آیا ہوں، آپ کو چلنا ہے۔ کہنے لگے کہ بالکل نہیں جاؤں گا، لڑکیوں کی تعلیم گاہ سے مجھے سخت اختلاف ہے۔ میں نے کہا کہ چلیں گے کیسے نہیں؟ ابا کا خط لایا ہوں، کہنے لگے کہ خط پہلے دینا چاہئے تھا، لاؤ! خط پڑھ کر کچھ سوچتے رہے پھر فرمایا کہ معذرت چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ تب جواب لکھ دیجئے۔ انہوں نے لکھا کہ:

”حضرت الاستاذ کا حکم سرآنکھوں پر، لیکن مجھے لڑکیوں کے مدرسہ سے اتفاق نہیں ہے،

اور میں نہیں سمجھتا کہ آدمی اپنی فکر اور ضمیر کے خلاف کیا بیان کرے گا؟ اور کیسے بیان کرے گا؟ اس لئے معذرت چاہتا ہوں، اگر معذرت قبول نہ ہوئی تو حکم کی وجہ سے حاضری دوں گا۔‘‘

والد صاحب نے جوابی خط پڑھ کر فرمایا کہ ان کی معذرت قبول ہی کرلو۔

مقررہ تاریخ پر ہمارے گھر کے سامنے جلسہ ہوا، پورہ معروف کے مؤقر علما اور ذمہ داران کے نام دعوت نامے بھیجے گئے لیکن اکثر بڑے لوگوں نے شرکت نہیں کی بلکہ مخالفت کی، مگر ان کی مخالفت سیاست پر مبنی تھی اور مولانا کا اختلاف ان کی فکر اور صدائے ضمیر پر مبنی تھا۔ وہ اصول کے پختہ اور عمل میں نہایت مخلص تھے۔

والد صاحب سے خصوصی تعلق ومحبت:

یوں تو حضرت مولانا کو اپنے تمام ہی اساتذہ سے تعلق خاطر تھا اور سبھی اساتذہ سے دعائیں بھی پاتے تھے لیکن بہت ہی خاص تعلق حضرت مولانا مسلم صاحب اور مولانا افضال الحق صاحب سے رکھتے تھے۔ اہم معاملات میں انہیں بزرگوں سے مشورہ کرتے اور ان کی رائے کو ترجیح دیتے تھے۔ مولانا مسلم صاحب کے انتقال کے بعد والد صاحب سے بھی اسی قدر گہرا تعلق قائم ہوا، جو عام طور سے معروف ہے۔ بار بار بنارس، پورہ معروف اور سہارن پور ملاقات کی غرض سے تشریف لے جاتے۔ ایک بار عید کے موقع پر پورہ معروف تشریف لائے، میرے چچا مولانا عثمان صاحب کے آنگن میں امرود کے نیچے والد صاحب کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ اتفاقاً میں اس وقت وہاں موجود نہیں تھا، والد صاحب نے بلوایا، مولانا سے سلام مصافحہ ہوا، چونکہ والد صاحب موجود تھے، اس لئے بے تکلفانہ بات چیت نہیں ہوسکی۔ البتہ بڑی مسرت کا اظہار فرمایا اور کہنے لگے کہ تمہارا ایک شاگرد ہمارے پاس آگیا ہے، پھر خود ہی وضاحت کی کہ مولوی حمزہ گورکھ پوری۔ میں کہا ہاں فراغت کے بعد نیا نیا فیروز آباد گیا تھا تو ان کی نحو میر اور پنج گنج میرے ہی پاس تھی، میں انہیں کیا پڑھاتا، اسی بہانے میں نے ان سے یہ دونوں کتابیں پڑھ لیں۔ وہ خوش نصیب ہیں کہ آپ کے پاس پہونچ گئے، امید ہے کہ اب کچھ بن جائیں گے۔ مولانا اس زمانہ میں گورینی میں پڑھاتے تھے۔

اصل بات جو مجھے بتانی ہے وہ یہ ہے کہ مولانا کے جانے کے بعد اسی دن ایک اور عالم

تشریف لائے، واالدصاحب ان سے بڑے والہانہ انداز میں مولانا اعجاز صاحب کا تذکرہ کرنے لگے اوران کے پڑھنے کے زمانے کی بہت سی خوبیاں بیان کیں۔ ان صاحب نے کہا کہ وہی مولانا اعجاز جو دیوبند کے ’’مُخرج‘‘ ہیں؟ اس جملہ پر والدصاحب کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور فرمایا کہ ’’ہاں! ہیں تو وہ مخرج ہی لیکن بہت سے فارغین سے بہتر ہیں‘‘۔ انہوں نے اپنے قصور کی معافی مانگ لی ہے اور کئی علما نے انہیں معاف بھی کردیا ہے، معافی مانگنے پر اللہ بڑے بڑے مجرموں کو معاف کردیتے ہیں، میں نے بھی انہیں تہ دل سے معاف کردیا ہے، اور پھر غلطی سے مبرا کوئی انسان نہیں ہے۔ فرق یہ ہے کہ کسی کی غلطی گرفت میں آجاتی ہے اور کسی کی نہیں آتی۔

پتہ نہیں یہ بات مولانا کو معلوم ہوسکی یا نہیں؟ لیکن اس کے بعد ان کا تعلق والدصاحب سے گہرا سے گہرا ہوتا گیا۔ استاذ وشاگرد کا یہ تعلق عام طور پر علما کے درمیان معروف بھی ہے، جیسا کہ مولانا نے خود اپنے قلم سے تحریر بھی کیا ہے۔

غالباً ۲۰۱۰ء کی بات ہے، میں اپنی بچی کی علالت سلسلے میں شیخوپور مولانا کے پاس گیا اور بتایا کہ چند مہینے سے گھر میں ایک آزمائش آئی ہوئی ہے، پہلے میری تینوں بہنیں باری باری بیمار ہوئیں، جب تک والدصاحب گھر پر رہے انہوں نے علاج کیا، وہ ٹھیک ہوئیں، والدصاحب سہارن پور چلے گئے تو پھر سے بیمار ہوگئیں۔ بہت سے جھاڑ پھونک والے آئے، کبھی افاقہ ہوا، کبھی نہیں ہوا۔ ادھر پندرہ بیس روز سے میری بچی بھی اسی عارضہ میں مبتلا ہوگئی ہے۔ یہ سن کر پہلے تو بہت خفا ہوئے اور کہا کہ میں نے بھی سنا تھا مگر تم میرے پاس اب آئے ہو، پہلے کیوں نہیں آئے؟ میرے گھر کی بات تھی، میرے استاذ کی بچیاں ہیں، میری بہنیں ہیں، تم نے خبر تک نہیں کی، اب اپنی بیٹی پر پڑی ہے تو یہاں تک آگئے۔ دراصل مولانا مجھے ڈانٹ نہیں رہے تھے بلکہ والدصاحب کی محبت ان سے یہ باتیں کہلوا رہی تھی۔ اس سے پہلے کبھی بھی مولانا نے اتنے سخت جملے مجھ سے نہیں کہے تھے۔ میں نے معذرت کی کہ آپ کے پاس نہ آنے کی وہ وجہ نہیں ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں بلکہ مجھے آپ کے بارے میں علم ہی نہیں تھا کہ آپ بھی تعویذ وغیرہ بناتے ہیں۔ یہ تو ابھی چند روز پہلے معلوم ہوا۔ پھر مولانا نے مجھے ترکیب اور آیتیں بتلائیں کہ جاکر ایسے ایسے کردینا اور بہنوں پر بھی یہی ترکیب کرنا، چنانچہ ان کی ترکیب سے بہنوں کو خوب فائدہ ہوا اور میری لڑکی کو بھی

آرام ملا۔

رمضان ۱۴۳۲ھ کے آخری عشرہ میں ہمارے مدرسہ کے سفیر نے مجھ سے کہا کہ ممبئی میں ایک صاحب اعظم گڑھ کے ہیں، آپ ان سے ملاقات کرلیں۔ میں ان سے ملا، مدرسہ کا تعارف کرایا اور تعمیری ضروریات پر ان کو متوجہ کیا تو انہوں نے کہا کہ کسی ایسے عالم سے تصدیق کروادیں جنہیں میں جانتا ہوں، جیسے مولانا اعجاز احمد صاحب شیخو پور والے، تو میں آپ کا پورا مدرسہ تعمیر کرادوں گا۔ میں نے کئی لوگوں سے بات کی مگر براہ راست مولانا سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ مولانا کو لڑکیوں کے مدرسے سے فکری اختلاف ہے۔ وہ سال گزر گیا، دوسرے سال رمضان میں ان صاحب نے وہی بات کہی تو میں نے والد صاحب سے اس کا تذکرہ کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ بھیرہ میں جلسہ دستار بندی ہے، وہی داعی ہیں، اور ایک مدعو میں بھی ہوں۔ تم بھی ساتھ چلو اگر موقع ملا تو بات کرلیں گے۔ چنانچہ بھیرہ میں والد صاحب نے مولانا سے بات کی اور پوچھا کہ کیا آپ اس مدرسہ کے تعلق سے ہماری تصدیق کرسکتے ہیں؟ میری توقع کے خلاف مولانا نے جواب دیا کہ حضرت! تصدیق کیا؟ میں تو سفارش کردوں گا۔ اور مجھ سے فرمایا کہ پرسوں میں شیخوں پور جاؤں گا، دو ایک روز کے بعد تم بھی آجاؤ، تو اطمینان سے بات کرلیں گے۔ مولانا نے اختلاف فکر کے باوجود اپنے استاذ کی بات کا پاس ولحاظ کیا اور اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش تعاون کی کی۔

۲۷؍مارچ کو مغرب کے بعد مولانا سے ممبئی میں ملا، خیریت دریافت کی تو اطمینان کا اظہار کیا اور کہا کہ دعا کرو کہ ڈائلیسیس کے چکر سے نجات مل جائے۔ اور پھر مدرسہ کی تصدیق کے بارے میں پوچھا کہ ان صاحب سے ملے تھے۔ میں نے ساری بات بتلائی تو فرمایا ۳۵ سو روپے میں دوں گا مگر یہاں نہیں گھر آکر۔ کل دہلی جارہا ہوں، دو روز میں واپس آجاؤں گا اور دو اپریل کو ان شاء اللہ شیخوپور پہونچ جاؤں گا اور ۴؍اپریل کو پورہ معروف آؤں گا۔

حسب وعدہ سخت علالت کے باوجود مولانا پورہ معروف آئے، بلکہ کہنا چاہئے کہ استاذ سے تعلق ومحبت انہیں کھینچ لائی۔ زیادہ تر علمی باتیں ہوتی رہیں، نماز عصر کے بعد مولانا نے مسجد ہی سے واپسی کی اجازت لے لی، اور اپنی گاڑی کے پاس پہونچے۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد مجھ سے

فرمایا کہ یہ رقم والد صاحب کو دے دینا، میں کوئی ہدیہ نہیں دے سکا، اور یہ تمہارے مدرسہ کا اور یہ تم کو میری طرف سے ہدیہ۔ اس طرح تین الگ الگ رقم میرے ہاتھ میں دی۔

حضرت مولانا کو والد صاحب سے بحیثیت استاذ ایسا تعلق اور ایسی محبت تھی کہ اس کی نظیر شاید کم ملے۔ ایام علالت میں والد صاحب کی مشغولیت اور معمولات کی پابندی پر فرمایا تھا کہ ”یہ شان درویشی ہے، یہ مومن کامل کی علامت ہے، اللہ مجھے بھی اس کا کچھ حصہ عطا فرمائے۔“ مولانا نے نہ جانے کس درد سے یہ دعا کی تھی کہ بارگاہ رب العزت میں فوراً قبول ہوئی۔ اور ان کی بیان کردہ ”شان درویشی، اور مومن کامل کی علامت“ خود ان پر بھی پوری طرح صادق آئی۔

زندگی بھر والد صاحب سے مولانا کا گہرا تعلق رہا، اور ۱۶/ جمادی الاخری ۱۴۳۴ھ مطابق ۲۸/اپریل ۲۰۱۳ء کو جب والد صاحب اس دار فانی سے رخصت ہوئے تو مولانا ان کے محاسن کی اشاعت میں لگ گئے اور کئی مضامین قلم بند فرمائے۔ اور پھر سہ ماہی ”سراج الاسلام“ کا پہلا شمارہ والد صاحب کا خاص نمبر بنایا۔ افسوس کہ اس شمارہ کے شائع ہونے سے قبل مولانا بھی وہیں پہونچ گئے جہاں ان کے استاذ پانچ مہینے قبل جا چکے تھے۔ گویا اپنے استاذ کے بعد قمری حساب سے پانچ ماہ چھ دن کا جو وقفۂ زندگی ملا، اسے بھی استاذ ہی کی محبت اور انہیں کی خدمت میں گزارا۔ کاتب تقدیر نے ان کی زندگی کا آخری کام بھی استاذ کی خدمت کرجانا مقدر کر دیا تھا۔ رحمہ اللہ تعالی

❑❑❑

دنیا میں کیا ہے؟ یہاں جو کچھ ہے، وہ درد ہے، دکھ ہے، چوٹ ہے، تڑپ ہے، زخم ہے، ایک زخم بھر نہیں چکتا کہ دوسرا لگ جاتا ہے، ساری زندگی چوٹ کو سہلاتے اور زخم پر ناکام مرہم رکھتے گذر جاتی ہے، پھر دنیا کی یہ ناکامیاں، نامرادیاں، ناکارگیاں، جب بارگاہِ الٰہی میں قبولیت پائیں گی، تو انھیں ٹھیک عکس کر دیا جائے گا، اتنا بڑھایا جائے گا کہ یہ زخم خوردہ انسان، یہ ناکام آدمی بول اٹھے گا کہ پروردگار! یہ تو اس سے بہت زیادہ ہے، جو میں سوچ سکتا تھا، وہاں سے ارشاد ہوگا، ابھی کیا؟ بس چاہتے جاؤ، مانگتے جاؤ، انسان کا حوصلہ تمام ہو جائے گا، تب ندا آئے گی: وَلَدَیْنَا مَزِیْدٌ، ابھی تو ہمارے پاس بہت کچھ ہے

(حدیث دوستاں)

بندہ کامل
حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی

مولانا محمد عامر اعظمی صاحب
ابن حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی

دنیا میں انسانوں کی آمدورفت کا سلسلہ سیدنا آدم علیہ السلام سے شروع ہوا اور تا قیامت جاری رہے گا، جو شخص بھی دنیا میں آیا ہے ایک نہ ایک دن اسے آخرت کی طرف کوچ کرنا ہے، **کل من علیہا فان ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام**. انسان کی پیدائش و موت کا سلسلہ روزانہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور کسی نہ کسی حد تک متأثر بھی ہوتے ہیں، مگر یہ تأثر اس وقت دو چند ہو جاتا ہے جب کوئی اپنا قریبی عزیز دنیا سے چلا جائے یا کوئی بہت ہی محترم، مفید اور محبوب شخصیت دنیا سے کوچ کر جائے، جن کے چلے جانے کے بعد بھی ان کی محبت کی حرارت دلوں کو پگھلاتی رہے۔

ایسی ہی محبوب اور مفید شخصیت ہمارے والد بزرگوار حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب نوراللہ مرقدہ کی ذات گرامی تھی۔ خدا نے انہیں بے انتہا کمالات اور بے پایاں صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ آپ بیک وقت جلیل القدر عالم دین، بلند پایہ مفسر قرآن، بے مثال واعظ، باکمال مدرس، بہترین مربی، بلند پایہ انشا پرداز، اور راہ شریعت و طریقت کے عظیم راہنما تھے۔ ایک طویل عرصہ تک علما و صلحا، طالبین علوم نبویہ، اور سالکین راہ طریقت آپ سے استفادہ کرتے رہے۔ حضرت والا کے انتقال سے ان کے متعلقین میں سے ہر ایک کو بقدر محبت و تعلق قلق ہوا، جن لوگوں

نے انتقال کی خبر پائی رنج وغم میں ڈوب گئے، اور صدمے سے نڈھال ہو گئے، لیکن ہمیں کتنا اور کیسا صدمہ پہونچا، بیان نہیں کیا جا سکتا۔ آج بھی حادثہ بالکل تازہ معلوم ہوتا ہے، اور قلب زخموں سے چھلنی ہے۔ سچائی تو یہ ہے کہ حضرت والدصاحب کی موت سے ہماری کائنات ہی لٹ گئی، ذرا تصور کریں، ایک شخص جس کے شفیق والد، بے حد محبت کرنے والے شیخ ومربی، مشفق استاذ، ہمدرد و غمگسار سرپرست دنیا سے اپنا منہ موڑ لیں اور داغ مفارقت دے جائیں تو اب اس کے لئے اس دنیا میں بچا ہی کیا؟ اب تو ہر طرف سناٹا ہی سناٹا ہے۔ اب اپنا غم غلط کرنے کہاں جائیں؟ جب غمگسار سرپرست ہی نہ رہا۔ تسلی حاصل کرنے کہاں جائیں؟ جب بے حد محبت کرنے والا مربی ہی نہ رہا۔ صبر کا درس لینے کہاں جائیں؟ جب مشفق استاذ ہی نہ رہا۔ کس کی آغوش میں سر رکھ کر دل کا بوجھ ہلکا کریں؟ جب بے انتہا شفقت کرنے والا والد ہی نہ رہا۔

لیکن کیا کیا جائے یہ فیصلہ خدا کی طرف سے ہے، اور خدا کے ہر فیصلہ پر راضی رہنا ہی بندگی ہے۔ موت تو ہر شخص کو آنی ہے، والدصاحب کا بھی وقت متعین تھا، ایک نہ ایک دن یہ حادثہ ہونا ہی تھا، مگر انسان جس سے بہت گہرا تعلق رکھتا ہے، شدید محبت کرتا ہے، اس سے جدائی کا تصور بھی نہیں کر پاتا۔ والدصاحب عرصہ سے بیمار تھے، جسم کمزور ہو چکا تھا، کئی سال قبل فالج کا اٹیک ہوا تھا، اس کے بعد صحت سنبھل نہ سکی، بیماریاں بڑھتی رہیں، ادھر اخیر میں دونوں گردوں نے کام کرنا بند کر دیا، ممبئی علاج ہوتا رہا، اور گردوں کی دھلائی کا عمل ہوتا رہا، کبھی طبیعت بگڑتی کبھی افاقہ ہو جاتا، دعائیں ہوتی رہیں، علاج ومعالجہ کا سلسلہ جاری رہا، طبیعت مطمئن تھی کہ ان شاء اللہ شفا ہو جائے گی، صحت لوٹ آئے گی، ذہن موت کی طرف جاتا ہی نہیں تھا، مگر حادثہ ہونا تھا اور ہوا، **انا لله وانا اليه راجعون۔**

میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے والدصاحب کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت میں سرشار پایا، آپ اپنے ہر عمل میں اللہ کی رضا اور خوشنودی کو ملحوظ رکھتے تھے، نگاہیں ہمیشہ پروردگار کی طرف جمی رہتیں تھی، رسول پاک ﷺ کی سنتوں سے ان کی زندگی مزین تھی، ہر کام میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی پاسداری ملحوظ رہا کرتی تھی، خلاف شریعت تو دور کبھی خلاف سنت کام کو بھی گوارا نہیں فرماتے تھے۔ یہی تعلیم اپنی اولاد اور جملہ متعلقین کے لئے بھی تھی۔ اپنی زندگی کو

کتاب وسنت کے مطابق ڈھال رکھا تھا، قلب ذکر اللہ سے معمور تھا، آپ کی خدمت میں جاتے ہی خدا یاد آنے لگتا تھا۔ اختیاری تمام سنتوں پر کوشش کر کے عمل پیرا رہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسی کی برکت سے اللہ نے ۶۳/ سال کی مسنون عمر میں اپنے پاس بلا کر اس غیر اختیاری سنت پر بھی عمل کرادیا۔

والدصاحب کی پوری زندگی ورع وتقوی، عزم واستقلال، اور زہد واستغنا سے عبارت تھی، دنیا اور متاع دنیا کی طرف کبھی آپ کی نگاہ نہیں اٹھی، مال ودولت، جاہ ومرتبہ کی ذرا بھی محبت آپ کے دل میں نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے اپنی اولاد کو کبھی دنیا کمانے کی اجازت نہیں دی، اور نہ ہی کبھی ان سے مال دولت کی خواہش کی بلکہ ان کی دلی خواہش تھی کہ میرے تمام بیٹے دین اور خدمت دین کے لئے وقف ہوجائیں، اور اپنی زندگی میں ہر ایک کو خدمت دین کے لئے وقف فرمادیا۔ (اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل وکرم سے استقامت عطا فرمائیں)

والدصاحب دنیا کے اندر ضرور تھے مگر اسے اپنا مقصد نہیں بنایا بلکہ صرف دنیا کو برتا، دنیا سے گریز واحتراز کا یہ عالم تھا کہ سفر ہو یا حضر کبھی پیسہ اپنی جیب میں نہیں رکھتے تھے۔ ہم لوگوں میں جب کسی کو اوپر کی جیب میں پیسہ رکھتے ہوئے دیکھتے تو فرماتے کہ نیچے کی جیب میں پیسہ رکھا کرو، تاکہ اس کی محبت دل میں نہ اتر جائے۔ دل اللہ کی محبت اور اس کے ذکر سے آباد وشاداب رکھنے کی جگہ ہے۔ دنیا سے اس قدر بے رغبتی تھی کہ زندگی بھر خاص اپنے لئے مکان تک کا انتظام نہیں کیا، فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اللہ سے عہد کیا ہے کہ اپنے لئے کبھی اینٹ پر اینٹ نہیں رکھوں گا۔ زندگی انتہائی سادہ تھی اور سادگی کو پسند فرماتے تھے۔ بدن میں جب تک قوت وطاقت رہی عموماً ہر موسم میں کھدر کا کپڑا استعمال فرماتے رہے، جب صحت بگڑنے لگی اور قوت مدافعت میں کمی آگئی تو گرمیوں میں باریک کاٹن اور سردیوں میں دبیز اونی کپڑوں کا استعمال فرمانے لگے۔ ایک مرتبہ ہم کئی بھائیوں نے والدصاحب کے لئے اور خود اپنے لئے لنگی اور بنیائن خریدی، والدصاحب نے پوچھ لیا کہ کتنے کا سامان خریدے ہو؟ چھوٹے بھائی مولانا محمد راشد صاحب نے بتلایا کہ آٹھ سو روپئے کا۔ فرمانے لگے کہ واپس کردو، میری ذات پر اتنا خرچ مت کیا کرو، اپنی ذات پر کم خرچ کرنا ہی سعادت ہے۔ بھائی نے کہا کہ ہم لوگوں نے اپنے لئے بھی خریدا ہے، فرمایا تب ٹھیک ہے،

میں سمجھا کہ صرف میرے لئے اتنی رقم تم لوگوں نے خرچ کردی۔ یہی تعلیم ہم لوگوں کے لئے بھی تھی۔ دارالعلوم دیوبند میں جب میں زیر تعلیم تھا تو والد صاحب نے بطور خاص ایک خط میں تاکید فرمائی اور لکھا کہ اپنے اوپر کم خرچ کرنا سعادت کی بات ہے۔

والد صاحب اپنی اولاد کی تربیت کا خاص اہتمام فرماتے تھے، خلاف شریعت ہی نہیں خلاف سنت کاموں پر بھی تنبیہ فرماتے تھے، اور فرماتے کہ باپ بیس سال پہلے اگر بیٹے سے بیس سال بڑا تھا تو بیس سال کے بعد بھی اتنا ہی بڑا رہے گا، اس لئے اپنی اولاد کو ہر عمر میں تنبیہ کرتے رہنا چاہئے۔ اولاد کی تربیت کے سلسلہ میں بہت وسیع الظرف تھے، ہمیشہ مزاج کی رعایت کرتے، اور اعتدال کا راستہ اختیار کرتے۔ ہاں خلاف شرع امور میں کوئی رعایت نہیں کرتے۔ اس سلسلہ میں فرماتے تھے کہ بکری کی گردن میں اتنی لمبی رسی باندھی جائے کہ آزادی کے ساتھ چر لے، اور کنٹرول سے باہر بھی نہ جانے پائے۔ اولاد کے ساتھ ہمیشہ عدل ومساوات کا معاملہ کرتے، سب کے ساتھ یکساں سلوک فرماتے۔

والد صاحب نے طے کیا کہ میں اپنے تمام بیٹوں کو حج کراؤں گا، چنانچہ سب سے پہلے ۲۰۰۳ء میں حافظ محمد عادل صاحب جو بڑے بھائی سے چھوٹے ہیں، اپنی اور والدہ کی معیت میں حج پر لے جانا چاہا مگر کچھ قانونی رکاوٹوں کی وجہ سے نہ جاسکے، انہیں دہلی سے واپس آنا پڑا، حالانکہ والدین کی خدمت کے لئے کسی ایک بھائی کا ہونا ضروری تھا، مگر اس سال خدا کو منظور نہیں تھا، سو نہ جاسکے۔ اس کے بعد ۲۰۰۶ء میں بڑے بھائی مولانا محمد عارف صاحب کو اپنے ساتھ حج پر لے جانے کا فیصلہ کیا، اور منظوری بھی ہوگئی۔ الحمد للہ بڑے بھائی، بھائیوں میں سب سے پہلے حج کی دولت سے مالا مال ہوئے۔ والد صاحب نے فرمایا کہ پہلے عادل کو لے جانا چاہ رہا تھا، ترتیب صحیح نہ تھی، اس لئے نہیں جاسکا، اب ترتیب صحیح ہے، ان شاء اللہ سب یکے بعد دیگرے حج کرلیں گے۔ چنانچہ ۲۰۰۷ء میں حافظ محمد عادل صاحب زیارت حرمین شریفین سے شرفیاب ہوئے، اور ۲۰۰۸ء میں حضرت والد صاحب نے ارادہ فرمایا کہ امسال مجھ سے بڑے بھائی مولانا محمد عابد صاحب اور چھوٹے بھائی مولانا محمد راشد صاحب، اور مجھے ایک ساتھ اپنی رفاقت میں حج کے لئے لے جائیں گے۔ چار افراد کا ایک ساتھ حج پر جانا ظاہر ہے کہ کافی سرمایہ درکار ہوگا، مگر واہ رے والد

صاحب کا توکل! اور خدا کی ذات پر غیر متزلزل یقین! انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں حج کا فارم بھر دیا گیا، اور فرمایا کہ فارم کی منظوری اور انتظام کی سہولت کے لئے اللہ سے خوب خوب دعا کرو، ان شاء اللہ سب کو ساتھ ہی جانا ہے۔ الحمد للہ منظوری بھی ہوگئی اور اللہ نے خزانہ غیب سے انتظام بھی فرمادیا، اور ہم تین بھائی ایک ساتھ حضرت والد صاحب قدس سرہ کی معیت میں سعادت حج سے سرفراز ہوئے۔ پھر ۲۰۱۲ء میں چھوٹے بھائی مولانا محمد عرفات صاحب کو اپنے ساتھ حج میں لے جانے کا ارادہ فرمایا، اپنے ساتھ مولانا محمد راشد صاحب کا بھی فارم بھرا۔ مولانا راشد صاحب دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد ہی سے والد صاحب کی خدمت کے لئے وقف تھے، اور تادم اخیر بحسن وخوبی خدمت کرتے رہے، سفر وحضر میں ہر جگہ ہر وقت سایے کی طرح والد صاحب کے ساتھ رہے۔ بیماری کی وجہ سے صحت زیادہ خراب ہوچکی تھی، خدمت کے لئے کسی ایک کا ہر وقت ساتھ رہنا ضروری تھا۔ مولانا راشد صاحب نے خدمت کے لئے اپنے آپ کو پیش کیا اور نہایت مستعدی اور مکمل دلجمعی کے ساتھ خدمت انجام دیتے رہے۔ اللہ تعالی نے حضرت والا کی خدمت کی برکت سے دومرتبہ حج کی سعادت عطا فرمائی۔ بہرحال حج کی منظوری آگئی اور دونوں بھائی والد صاحب کے ساتھ حج کی دولت سے سرفراز ہوئے۔ والد صاحب کا یہ آخری حج تھا۔ جو بیڑا انہوں نے اٹھایا تھا اسے بخوبی پار لگایا، اور سبھی بھائیوں کو اپنی رفاقت اور نگرانی میں حج جیسی اہم عبادت ادا کروائی۔ **فالحمد للہ**

حضرت والد صاحب صبر و رضا کے پیکر تھے، حالات چاہے جیسے بھی ہوں نگاہ ہمیشہ پروردگار کی طرف جمی رہتی تھی۔ ابتدائی زندگی تنگی میں گزری، ، لیکن نہ کبھی خود تنگی محسوس کی اور نہ ہم لوگوں کو اس کا احساس ہونے دیا۔ پھر جب خوش حالی آئی تو بیماریوں نے آگھیرا، اس میں بھی صبر و شکر کے پیکر بنے رہے۔ بیماریوں سے نہ کوئی گھبراہٹ تھی اور نہ کوئی شکایت، ہمیشہ پروردگار کا شکر ادا کرتے رہے، اور اس کی مشیت پر راضی رہے۔ اخیر عمر میں جب گردوں نے اپنا عمل بند کردیا اور کمزوری حد سے زیادہ بڑھ گئی، کمرے سے نکل کر مسجد تک جانا بھی دشوار ہوگیا۔ ایک روز ہم کئی بھائی حاضر خدمت تھے، والد صاحب کچھ نصیحت فرمارہے تھے، درمیان میں چھوٹے بھائی مولانا محمد عرفات نے بیماریوں کے تعلق سے تشویش اور رنج کا اظہار کیا تو والد صاحب نے کہا کہ فکر مت

کرو، صحت اور بیماری دونوں اللہ کی طرف سے ہے، کوئی بھی کام خدا کی مشیت کے بغیر نہیں، اور نہ ہی کسی چیز میں مشیت کے بغیر تاثیر پیدا ہوتی ہے۔ زندگی میں صحت و بیماری کا سلسلہ تو لگا ہی رہے گا، ہر صورت میں خدائے پاک کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ پھر آبدیدہ ہو کر فرمانے لگے، اصل تو یہ ہے کہ اللہ ناراض نہ ہو، اگر وہ راضی ہے تو پھر ہر چیز آسان ہے۔

دارالعلوم کی طالب علمی کے زمانہ میں والد صاحب نے مجھے ایک خط میں تحریر فرمایا:

> ''الحمد للہ بخیر ہوں، ادھر کئی دنوں سے طبیعت نرم چل رہی ہے، سستی بے حد رہتی ہے، تاہم اللہ کا شکر ہے، وہ پروردگار ہے، جس حال میں رکھے اس پر دل و جان سے راضی رہنا بندہ کا شیوہ ہے، یہی مشق ہر دم رکھنی چاہئے۔''

ایک خط میں اور تحریر فرماتے ہیں:

> اللہ تعالی اپنے فضل و کرم سے تم کو صحت و عافیت عطا فرمائے، اپنی رضامندی کے کاموں کی توفیق عطا فرمائے۔ اصل چیز یہی ہے کہ خدا راضی رہے، پھر صحت بھی نعمت اور بیماری بھی نعمت ہے، اگر ان کی رضا کی فکر نہیں تو صحت کس کام کی؟ اور بیماری پر افسوس کا ہے کو۔''

والد صاحب کی پوری زندگی کا شیوہ یہی رہا ہے، ان کا نفس نفس یاد الٰہی میں ڈوبا ہوا تھا، ان کا مقصد زیست اور متاع زیست ہی خدا کی رضا تھی۔ وہ زندہ رہے تو محض رضائے الٰہی اور لقائے الٰہی کے شوق میں۔ ان کا خدا سے رشتہ دیگر تمام علائق سے فائق تھا، جب تک زندہ رہے موت کا انتظار کرتے رہے، اب ان کا انتظار شرمندہ عمل ہو چکا ہے، اب ان کی بے قرار روح کو قرار آ گیا ہوگا، اب ان کی آنکھیں اپنے ہم نفسوں اور ہم مشربوں کے دیدار سے ٹھنڈی ہو گئی ہوں گی، اور دربار الٰہی سے اپنے انتظار کا صلہ پا چکے ہوں گے۔

اخیر میں دعا ہے کہ اللہ ان کی تربت کو ٹھنڈا رکھے، دنیا میں ان کی روح بہت بے چین تھی اپنی رضا کا مژدہ سنا کر ان کی روح کو صبر و قرار عطا فرمائیں، اور ہم لوگوں کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

❑❑❑

مدرسہ تعلیم الاسلام اعظم گڑھ سے
حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی کا تعلق

مولانا قمرالحسن صاحب
استاذ: مدرسہ تعلیم الاسلام اعظم گڑھ

مدرسہ تعلیم الاسلام و فاطمہ یتیم خانہ، ضلع اعظم گڑھ، جامع مسجد اعظم گڑھ کے ایک جز کی طرح ہے۔ ۱۹۸۹ء میں بابو عزیز الرحمان صاحب اور ان کے معین و مشیر ماسٹر علاؤالدین صاحب اور دیگر رفقا نے باہم مشورہ سے یہ طے کیا کہ جامع مسجد ماشاءاللہ بہت بڑی ہے، علاوہ جمعہ و عیدین کے دیگر نمازوں میں نہیں بھر پاتی۔ مسجد کی آبادی نمازیوں سے ہے، اطراف مسجد میں اتنے مصلی نہیں ہیں کہ جن سے مسجد پر ہو سکے، اس کو آباد کرنے کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا جائے، جس میں مہمان رسول کے رہنے کا نظم کیا جائے، جن سے مسجد بھی آباد ہوگی اور مسجد آباد کرنے اور کرانے والے افراد بھی تیار ہوں گے، جو صرف شہر اعظم گڑھ کی مساجد ہی کو نہیں بلکہ پورے ملک کی مساجد کو آباد کریں گے۔

۱۹۹۰ء میں جامع مسجد میں جمعیۃ العلما کی میٹنگ ہو رہی تھی، اس میٹنگ میں بابو عزیز الرحمان صاحب نے درس قرآن کی تجویز پیش کی، اور مولانا عبدالرب صاحب نے درس قرآن کے لئے مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب کا نام پیش کیا۔ اس وقت قدرت شہر کے مسلمانوں کی اصلاح کا فیصلہ کر رہی تھی، اور راستے سے بھٹکے ہوئے مسلمانوں کو صراط مستقیم پر لانے کا انتظام کر رہی تھی، نیز مدرسہ تعلیم الاسلام کی قسمت بیدار ہو رہی تھی۔ کسے معلوم تھا کہ میٹنگ میں جس کا

نام پیش کیا جا رہا ہے وہ مدرسہ کی ترقی کا زینہ ہوگا۔

مولانا جامع مسجد اور مدرسہ کی انتظامیہ کمیٹی کے ممبر نہ تھے، نہ کسی منصب پر فائز تھے، نہ ہی انتظامیہ کمیٹی کے رجسٹر میں ان کا نام تھا، لیکن کاتب تقدیر کے رجسٹر میں آپ جامع مسجد کے درس قرآن کے مخلص مدرس تھے، شہر کے بھٹکے ہوئے مسلمانوں کے رہبر و رہنما تھے، پریشان اور الجھے ہوئے لوگوں کے لئے بہترین مشیر تھے، پیچیدہ مسائل کو سلجھانے والے فقیہ تھے، بگڑے ہوئے اخلاق کو سدھارنے والے معلم اخلاق تھے، راہ سلوک کو طے کرنے والوں کے لئے شیخ طریقت تھے، مدرسہ کے اساتذہ وطلبہ کے لئے مصلح ومربی تھے۔

١٤٢٣ھ میں بابو عزیز الرحمان صاحب نے انتقال سے کچھ پہلے مسجد کی امامت اور مدرسہ کی نظامت مولانا انتخاب عالم اعظمی صاحب کے حوالے کردی تھی، مولانا ایک صالح جوان، قاری خوش الحان، بہترین مہمان نواز اور خدمت گزار عالم ہیں۔ یہ اگرچہ حضرت مولانا کے باضابطہ شاگرد نہیں ہیں، لیکن سعادت مند شاگرد کی طرح ہمیشہ بنفس نفیس مصروفِ خدمت رہتے، اور خدمت کرکے خوش ہوتے۔ انہیں کوئی اہم معاملہ درپیش ہوتا ہے خصوصاً مدرسہ کے تعلق سے تو فوراً مولانا سے مشورہ کرتے، اور مولانا جو مشورہ دیتے اس پر عمل کرتے، اور اس میں خیر پاتے۔

بابو عزیز الرحمان صاحب کے انتقال کے دو سال کے بعد ١٤٢٥ھ میں شعبہ عربی کا قیام عمل میں آیا، شعبہ حفظ سے چند بچے فارغ ہوئے اور کچھ بچے مکتب سے نکل کر آئے تھے۔ ٦/٧ بچوں پر مشتمل فارسی کی جماعت قائم ہوئی۔ دوسرے سال ١٤٢٦ھ میں مولانا کے ایما پر راقم الحروف کی تقرری ہوئی، اسی دن دارالاقامہ جدید کی بنیاد مولانا مجیب اللہ صاحب، مفتی ابوالقاسم صاحب اور حضرت مولانا کے ہاتھوں رکھی گئی۔ مولانا جب رخصت ہونے لگے تو تو مدرسہ کے لئے پانچ سو روپئے کا تعاون پیش کیا۔ میں نے دیکھا تو نگاہ اٹھی کی اٹھی رہ گئی کہ مولوی جس کی تنخواہ قلیل ہوتی ہے وہ پانچ سو کا تعاون کر رہا ہے، جو اس وقت کے لحاظ سے میری تنخواہ کا چوتھائی تھا۔ کم از کم یہ واقعہ میرے علم ومشاہدہ کے لحاظ سے پہلا تھا، لیکن نہیں، مجھے یاد آیا کہ جب میں مدرسہ شیخ الاسلام میں طالب علم تھا، جمعہ کے دن مدرسہ کے جنریٹر کے لئے مولانا چندہ کر رہے تھے، تو مولانا نے خود پہلے پانچ سو روپئے کا تعاون کیا، اس کے بعد دوسروں سے تعاون کے لئے کہا۔

مولانا کے ہاتھوں ۱۴۲۶ھ میں جس کی بنیاد رکھی گئی تھی، دیکھتے ہی دیکھتے دومنزلہ عالیشان عمارت بن گئی۔ یہ تعمیری ترقی ہوئی اور تعلیمی ترقی یہ ہوئی کہ مدرسہ مکتب، ناظرہ، حفظ سے ترقی کرکے شعبہ فارسی سے عربی پنجم تک پہونچ گیا۔ اللہ اسے تادیر قائم رکھے۔ آمین

مولانا چونکہ مدرسہ کے آدمی تھے، مدرسہ میں تعلیم پائی تھی، اور تعلیمی دور سے نکلنے کے بعد بھی ساری عمر مدرسہ میں کھپائی تھی، اس لئے مدرسہ کی ترقی دیکھ کر مولانا خوش ہوتے تھے۔

اس دور میں جبکہ عوام تو عوام خواص کا بھی رجحان دنیوی تعلیم کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے، مدرسے بساغنیمت ہیں۔ مولانا اپنے لئے اور اپنے متعلقین واحباب کے لئے بھی مدرسہ کے احاطہ ہی کو پسند فرماتے تھے۔ مدرسہ سے باہر ایمان وعمل کے لئے خطرہ محسوس کرتے تھے۔ مولانا کا بس یہ نظریہ ہی نہیں تھا بلکہ مولانا اس پر خود بھی عامل تھے۔ مولانا کے سات صاحبزادے ہیں، جن میں چھوٹے صاحبزادے معذور ہیں، باقی چھ کو مولانا نے حافظ، عالم بنا کر مدرسہ ہی میں لگایا ہے۔ یہ مولانا کی امتیازی خصوصیات میں سے ایک بڑی خصوصیت ہے۔

مدرسہ سے مولانا کا تعلق ولگاؤ بڑھتا رہا، مولانا دور کہیں سفر پر جاتے یا سفر سے آتے تو تھوڑی دیر کے لئے سہی، مدرسہ میں تشریف لاتے۔ مدرسہ کی کوئی چھوٹی یا بڑی تقریب مولانا کے بغیر یا کم از کم ان کے مشورہ کے بغیر منعقد نہیں ہوتی، اور جلسہ دستار بندی کبھی مولانا کے بغیر کسی نے سوچا ہی نہیں۔ ۱۴۳۴ھ کی جلسہ دستار بندی کے موقع پر چونکہ مولانا بغرض علاج ممبئی میں مقیم تھے، اس لئے ان کی شرکت اس میں نہ ہوسکی، لیکن دعا کے ذریعہ برابر شریک رہے۔

۱۴۳۲ھ میں مولانا کو ٹائیفائڈ بخار ہوا، جون پور کے حکیم کا علاج شروع ہوا، حکیم صاحب نے سفر کرنے سے بالکل منع کردیا، اور آرام کے لئے کہا، تو مولانا نے مدرسہ سے خصوصی تعلق کی بنیاد پر یہیں قیام کو ترجیح دی، کئی مہینہ مستقل قیام رہا۔

اس قیام کے دوران دوپہر میں کھانے کا انتظام مولانا انتخاب عالم صاحب امام جامع مسجد نے اپنے ذمہ لیا، اور شام کے میزبان جناب سلیم صاحب (پپو بھائی) رہے۔ اس قیام سے اساتذہ، طلبہ اور مدرسہ کو خوب فائدہ ہوا۔ دور دراز سے علما کا قافلہ مولانا کی عیادت کے لئے آتا، مولانا کی برکت سے مدرسہ کے لوگوں کو علما وصلحا کی زیارت کا شرف خوب خوب حاصل

ہوا، ان کے قدومِ میمنت مدرسہ کے احاطہ میں پڑے۔ اللہ ان نفوس قدسیہ کے صدقے مدرسہ کو قائم ودائم رکھے۔

عصر کے بعد چائے کا معمول تھا، اس میں مدرسہ کے بعض اساتذہ اور کبھی شہر کے کچھ لوگ تشریف لاتے، اگر طبیعت میں نشاط ہوتا تو کچھ ارشاد فرماتے، یا کوئی سوال کرتا تو اس کا جواب مرحمت فرماتے، اور اگر طبیعت ٹھیک نہ ہوتی تو خاموش رہتے، کبھی لیٹے رہتے۔ صبح میں عموماً بعض اساتذہ چائے میں مولانا کے ساتھ شریک رہتے۔ اساتذہ کی جو گھنٹیاں خالی ہوتیں اس میں آ کر بیٹھتے، اور اپنی علمی پیاس بجھاتے، جس کو جو اشکال ہوتا یا کوئی عبارت حل نہ ہوتی تو مولانا کی خدمت میں پیش کرتے، اسے مولانا حل فرما دیتے۔

ایک مرتبہ میں جلالین کا مطالعہ کر رہا تھا، ایک جگہ عبارت سمجھ میں نہیں آئی، کچھ مہمان مولانا کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے فوراً پڑھانے کے لئے جانا تھا، میں نے جا کر مولانا سے آہستہ سے عرض کیا کہ ایسی ایسی بات ہے، مولانا نے کہا ٹھیک ہے، کتاب لے کر آؤ۔ میں کتاب لے کر حاضر ہوا، ایک لمحے میں نہایت وضاحت وخوبصورتی سے حل کر دیا۔

مولانا جب یہاں سے دو یا تین ماہ کے بعد اپنے مدرسہ جا رہے تھے تو طلبہ واساتذہ نمناک آنکھوں سے رخصت کر رہے تھے، ایسا لگ رہا تھا کہ مولانا اصل اسی مدرسہ کے مدرس تھے، اب کسی وجہ سے چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ مولانا یہاں سے چلے گئے لیکن ہر مجلس میں مولانا کا ذکرِ خیر ہوتا رہا۔

مولانا کی آمد ورفت کا سلسلہ لگا رہا، جب علاج کے لئے ممبئی چلے گئے اور طبیعت زیادہ ناساز ہوگئی تو مولانا نے ایک وظیفہ بتلایا تھا، اکثر اس کو پڑھ کر طلبہ اور اساتذہ مولانا کے لئے شفاء کی دعا کرتے۔ مولانا کے لئے وظیفہ پڑھ کر دعا کرنا ہر فرد اپنی سعادت سمجھتا تھا۔

مولانا شیخوپور سے چھپرا چلے گئے، لیکن عید کے بعد درس کا سلسلہ جاری رکھا۔ مدرسہ میں آتے، آرام فرماتے، طبیعت بہتر ہوتی تو درس دیتے، ورنہ موقوف کر دیتے۔ آخر مولانا کی طبیعت درس کے قابل تھی ہی کب؟ وہ تو مولانا کی روحانی قوت کارفرما تھی۔ ڈاکٹر کی رپورٹ کے اعتبار سے تو آپ کئی سال پہلے عمل سے معذور ہو چکے تھے۔ ایک ڈاکٹر نے دو تین سال پہلے رپورٹ دیکھ کر امام صاحب سے کہا تھا کہ مولانا چند دن کے مہمان ہیں، جتنی چاہو خدمت کر لو،

لیکن دیکھنے والی آنکھوں نے دیکھا، اور سننے والے کانوں نے سنا، اور پڑھنے والوں نے ان کی تحریریں پڑھیں کہ مولانا ہمت ہارنے والے، حالات سے شکست کھانے والے، حوادث کے سامنے سپر ڈالنے والے نہیں تھے، ان کے عزائم بلند تھے، ان کا جسم بیمار تھا، لیکن ان کی روح صحت مند تھی، ان کا جسم بوڑھا ہو چکا تھا، لیکن ان کی ہمت جوان تھی۔ مولانا کی سوچ علامہ اقبال کے اس شعر کے مصداق تھی:

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

مولانا نے اس مہلک بیماری میں بھی وہ کارنامہ انجام دیا جسے اچھے خاصے صحت مند لوگ سوچ نہیں سکتے۔ عین وفات کے دن اسباق پڑھائے ''سراج الاسلام'' مولانا زین العابدین نمبر، کے سلسلے میں مدیر کو بلا کر مناسب مشورے دئے، اور مسودہ کی تصحیح کی۔ تمام معمولات پورے کئے۔ کسے معلوم تھا کہ ۲۸؍ستمبر۲۰۱۳ء کا سورج غروب ہوتے ہوئے اپنی آڑ میں آسمان علم کے اس نیر تاباں کو بھی روپوش کر دے گا۔

جس وقت یہ حادثہ کبری پیش آیا اور ناظم صاحب کو اطلاع ملی تو وہ بے خود ہو گئے، طلبہ کو معلوم ہوا تو وہ بھی پریشان ہو گئے۔ ناظم صاحب بے خودی کے عالم میں دار الاقامہ جدید میں آئے، ان پر گریہ طاری تھا اور ہچکی بندھی ہوئی تھی۔ طلبہ غم سے نڈھال تھے ہی، اپنے ناظم صاحب کو دیکھ کر وہ بھی بے خود ہو گئے۔ زار و قطار رونے لگے، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ہر فرد کے گھر میں حادثہ پیش آیا ہے۔ پورا مدرسہ سوگوار تھا، غمگسار تھا، صبح ہوتے ہی سارے لوگ چھپرا پہونچے، اور تجہیز و تکفین میں شرکت کی۔ وسرے دن تعزیتی پروگرام ہوا، مولانا کے لئے ایصال ثواب ہوا، اور پسماندگان کے لئے صبر جمیل کی دعا ہوئی۔ اس کے بعد والے اتوار کو جامع مسجد میں شہر والوں کی طرف سے تعزیتی پروگرام ہوا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالی مولانا کے درجات کو بلند فرمائے، اور اعلی علیین میں ان کو جگہ مرحمت فرمائے، اور ان کی اولاد و احفاد کو ان کا سچا جانشیں بنائے، اور تمام متعلقین و منتسبین کو ان کے نقش قدم پر چلائے، اور ان کے عزائم کو سو فیصد کامیاب بنائے۔

* * *

رفاقت کے چند روز

محمد عرفات اعجاز اعظمی

ہر وہ شخص جو اس عالم رنگ و بو میں آنکھیں کھولتا ہے اسے موت کی بدیہی حقیقت سے دوچار ہونا ہے، ہر جانے والے پر کچھ نہ کچھ لوگوں کو بقدر تعلق تکلیف ہوتی ہے۔ کسی کا باپ جاتا ہے تو اسے بیٹے کی حیثیت سے، کسی کا استاذ مرتا ہے تو اسے شاگرد کی حیثیت سے، کسی کا پیر رخصت ہوتا ہے تو اسے مرید کی حیثیت سے رنج ہوتا ہے، مگر آپ اس کی تکلیف کا اندازہ کریئے جس کی تینوں حیثیتوں کا مرجع ذات واحد ہو، اور وہ ذات دنیا سے گزر جائے، اس پر کیا گزرے گی؟ اس کا اندازہ صرف وہی شخص لگا سکتا ہے جو اس طرح کے حادثے سے دوچار ہوا ہو۔ ابونا، استاذنا، مربینا، مرشدنا حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب کی ذات میرے لئے یہی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ میرے والد بھی تھے میرے استاذ بھی تھے اور میرے پیر و مرشد اور مربی بھی تھے۔ یہ میرے ہی ساتھ کچھ خاص نہیں ہے بلکہ میرے تمام بھائیوں اور نہ جانے کتنے لوگوں کے وہ تنہا مرجع تھے۔

زمانہ کے سرد و گرم سے ہماری حفاظت کرنے والے مشفق باپ، باب تعلیم و تہذیب میں کامل دسترس رکھنے والے ماہر استاذ، اور فن تربیت میں یکتا و کامل مرشد و مربی کا سایہ اٹھ جانے کی وجہ سے ہم لوگ اپنے آپ کو کتنا یتیم ویسیر محسوس کر رہے ہیں اس کو زبان قلم سے بیان کرنا حیطہ قدرت سے باہر ہے، بس ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گھنے درخت کے سایے سے ہمیں نکال کر تپتے ہوئے صحرا کی چلچلاتی ہوئی دھوپ میں لاکر کھڑا کر دیا گیا ہے۔ والد صاحب ہمارے لئے سب کچھ تھے، دنیا کا سرمایہ بھی وہی تھے اور دین کی درست راہ نمائی کرنے والے بھی وہی تھے۔ ان کا دنیا سے رخصت ہوجانا نہ صرف ہمارے لئے دنیا کا خسران ہے بلکہ دینی اعتبار سے بھی ایک بڑی

محرومی کا باعث ہے۔ ہم لوگ صرف ایک باپ سے محروم نہیں ہوئے بلکہ کامل استاذ، ماہر مربی، اور ہر جہت سے راہ نمائی کرنے والے پیرومرشد سے محروم ہوگئے۔ باپ کا سایہ سر سے اٹھنے کے بعد آدمی پیرومرشد یا استاذ کو دیکھ کر تسلی حاصل کرلیتا ہے کہ یہ ابھی موجود ہیں۔ پیرومرشد کے بعد آدمی استاذ کو دیکھ کر اپنا غم ہلکا کرسکتا ہے، ایک کے بعد دوسرے کو دیکھ کر آدمی تلافی کے راستے تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے، مگر جن لوگوں کا سب کچھ بلکہ کہنا چاہئے کہ پوری کائنات ہی اٹھ کر زیر زمین دفن ہوجائے وہ اپنی محرومیوں کا ازالہ کیسے کریں؟ اور کیوں کر کریں؟ خدا کی ذات بہت بڑی ہے وہ ایک بعد دوسرے کو پیدا کرتی ہے مگر بظاہر ہمارے سب کچھ تو وہی تھے، ان کے نہ ہونے سے حرماں نصیبی کا احساس شدید سے شدید تر ہوجانا فطری ہے۔ انہیں کی وجہ سے ہماری دنیا میں رنگ ونور تھا اب وہ نہیں تو دنیا ویران ویران اور کائنات سونی سونی سی لگتی ہے۔ بہت کچھ ہونے کے باوجود ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کچھ نہیں ہے، جو کچھ تھے وہی تھے، جو ملنا تھا انہیں کے توسط سے ملنا تھا، محبت، تربیت، تعلیم، تہذیب، دین، دنیا یہ ساری چیزیں ابھی تک انہیں کے واسطے سے ملتی رہی ہیں۔ اب وہ نہیں تو جیسے کچھ بھی نہ ہو، سب چھن گیا ہو، سب لٹ گیا ہو، ساری چیزوں سے ہمیں محروم کردیا گیا ہو۔

ادھر اخیر عمر میں مجھے والد صاحب کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ تقریبا ایک سال میں مسلسل ان کے ساتھ رہا، ان کے قریب رہا، ان کو دیکھا، ہر طریقہ سے دیکھا، ہر زاویہ سے دیکھا، سوتے، اٹھتے، بات کرتے، لوگوں سے ملاقات کرتے، سفر میں، حضر میں، بیماری کی حالت میں، تکلیف میں، بہت زیادہ تکلیف میں، آرام میں۔ غرض ہر ممکن زاویے سے دیکھا، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس مجلس میں اپنی ایک سالہ رفاقت کی سرگزشت بیان کردوں۔ شاید والد صاحب سے تعلق رکھنے والوں اور ان سے محبت کرنے والوں کی تشنگی کا کچھ مداوا ہوجائے، اور یہ تذکرہ میرے دل سے غم کے بوجھ کو کچھ ہلکا کردے۔

زمانہ طالب علمی میں مجھے والد صاحب کے ساتھ رہنے اور ان کی خدمت کرنے کا موقع کم ملا، مگر ارادہ ہمیشہ یہی رہا کہ فراغت کے بعد سال دوسال مسلسل ان کی خدمت میں رہوں گا۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد طالب علمی کی رسمی پابندیوں سے آزاد ہوا تو میں نے اپنی اس خواہش

کا ذکر کیا، تھوڑے پس وپیش کے بعد والد صاحب نے اپنے ساتھ رہنے کی اجازت دیدی۔

والد صاحب کے ساتھ میرا پہلا سفر دمکہ کا ہوا۔ شوال ۱۴۳۳ھ میں والد صاحب بغرض علاج حیدرآباد گئے اور مجھ سے کہہ گئے کہ میرے جانے کے ایک ہفتہ کے بعد تم بھی آجانا، مگر بوجوہ میں نہیں جاسکا۔ بقرعید سے کچھ قبل حیدرآباد سے دمکہ آگئے اور مجھے بھی وہیں بلالیا۔

دمکہ جھارکھنڈ میں ایک جگہ ہے، جہاں والد صاحب اپنی نوجوانی کے زمانہ سے بغرض دعوت واصلاح جاتے رہے ہیں۔ وہاں کی غالب آبادی غیر مسلموں کی ہے، معاشی اور ثقافتی اعتبار سے بہت پس ماندہ علاقہ ہے، مسلمانوں پر ہندوانہ رسم ورواج کا تسلط تھا، شرک وبدعت کا دور دورہ تھا، توحید وسنت کی شمعیں مدھم پڑ چکی تھیں۔ والد صاحب کے دو تین شاگرد اسی علاقے کے تھے، انہوں نے صورت حال بتا کر والد صاحب کو رمضان کی تعطیل میں وہاں جانے اور رہنے پر آمادہ کیا۔ والد صاحب وہاں گئے، مصیبتیں جھیلی، مشقتیں برداشت کیں، مگر لگ لپٹ کر ان کے اصلاح حال کی کوشش کرتے رہے، تا آنکہ کوشش بارآور ہوئی اور وہ دن بھی آیا کہ مشرکانہ اعمال و بدعات ختم ہوئے، اور ان کی جگہ توحید وسنت کا نور جگمگایا۔ توحید وسنت کے اس نور سے ایک بڑا علاقہ فیضیاب ہوا۔ والد صاحب کی اسی خدمت کی وجہ سے اس علاقہ کے لوگ ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں اور ان کو اپنا محسن سمجھتے ہیں۔ انہوں نے ایک لمبے عرصے تک عید اور بقرعید دونوں انہیں لوگوں درمیان کی ہے، اس لئے ان کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ مشغولیت اور بیماری کے زمانے میں بھی عید نہیں تو کم از کم بقرعید ان کے ساتھ کریں، ان کی اسی خواہش اور مطالبے کے پیش نظر حیدرآباد سے دمکہ آئے تھے۔

میں اعظم گڑھ سے دمکہ پہونچا، ساتھ میں حاجی بلال صاحب بھی تھے۔ والد صاحب سے ملاقات ہوئی، ڈیڑھ مہینے قبل جس صحت اور کیفیت میں دیکھا تھا صحت اس سے خراب ہی نظر آئی۔ پورے جسم پر بیماری کا تسلط ہو چکا تھا، روز بروز صحت گرتی جارہی تھی، مگر والد صاحب نے اس پورے سفر میں، پورے سفر میں کیا تادم اخیر، اپنے اوپر بیماری کو سوار ہونے نہیں دیا۔ پوری قوت اور تندہی سے معمولات ادا کرتے رہے، ان تمام مدارس کا دورہ کیا جو والد صاحب کی سرپرستی یا نگرانی میں اس علاقے میں کام کررہے ہیں۔ تقریریں بھی کرتے، دعائیں بھی کرتے، لوگوں کی

ضروریات و حاجات بھی سنتے اور تابحد امکان پورا کرنے کی کوشش بھی کرتے۔ جن کو تعویذ کی ضرورت تھی ان کو تعویذ بھی دی، لوگ رات میں پانی کا بوتل رکھ جاتے صبح تہجد کے وقت اس پر دم بھی کرتے۔ پوری مدتِ قیام میں دو جمعہ وہاں ادا کیا، جمعہ سے پہلے وعظ بھی ہوا، بقرعید کی نماز سے قبل بھی لوگوں سے خطاب کیا۔ جس مدرسہ میں ہم لوگ ٹھہرے ہوئے تھے اس کے سرپرست والد صاحب ہی تھے، مدرسے کے منتظمین نے آمد کو غنیمت سمجھتے ہوئے مدرسہ کے تعلق سے ایک میٹنگ رکھ دی تھی، اس میں بھی شرکت کی اور تقریبا چار گھنٹے تک بیٹھے رہے، ان کو سمجھاتے رہے صلاح و مشورہ دیتے رہے۔ یہ تمام کام اسی گرتی ہوئی صحت اور تکلیف دہ مرض کی حالت میں کرتے رہے، جبکہ معالجوں کا مشورہ زیادہ سے زیادہ آرام کا تھا، مگر دین کی تڑپ اور لگن، مخلوق خدا کی محبت، خصوصا اس علاقے کے لوگوں کی محبت جن کے ایمان کی آبیاری خود ان کے ہاتھوں سے ہوئی تھی، چین سے یا بیکار بیٹھنے نہیں دیتی۔ کبھی زیادہ دیر تک لوگوں کے درمیان بیٹھ جاتے یا دیر تک تقریر کر لیتے تو بہت زیادہ کمزوری اور اضمحلال کا احساس ہوتا، مگر طبیعت کے اضمحلال یا بدن کی کمزوری کو اپنے دین کے کام میں حارج نہیں ہونے دیا۔ وقتی طور پر تھوڑی دیر آرام کر لیتے مگر جیسے ہی طبیعت میں تھوڑی سی بشاشت محسوس کرتے یا لوگ حلقہ بنا کر ارد گرد بیٹھ جاتے تو پھر وعظ و نصیحت، اصلاح حال، یا لوگوں کی دینی یا دنیای ضرورتوں کو پورا کرنے میں لگ جاتے۔

والد صاحب کو ہمیشہ سے کتابوں کے مطالعہ سے بہت زیادہ شغف رہا ہے، شغف کیا معنی؟ کہنا چاہئے کہ جنون رہا ہے۔ بیماری، کمزوری اور صحت کی کمی بھی ان کے اس جنون پر اثر انداز نہیں ہو سکی۔ اس کا ایک ہلکا سا نمونہ دملہ کے سفر میں دیکھنے میں آیا۔ میں نے سفر میں مطالعہ کے لئے ’قدرت اللہ شہاب‘ کی ضخیم آپ بیتی ’’شہاب نامہ‘‘ رکھ لی تھی جو تقریبا گیارہ سو صفحات پر مشتمل ہے، تاکہ دیہات کے اس سفر میں کچھ مشغولیت رہے۔ وقتا فوقتا اس کو پڑھتا رہتا تھا، نہ جانے والد صاحب کی نگاہ اس پر کیسے پڑ گئی، جبکہ ہم لوگوں کا کمرہ الگ تھا۔ میری عدم موجودگی میں کسی سے کتاب منگائی اور پڑھنا شروع کر دیا۔ میں پہونچا تو پوچھنے لگے کہ تمہیں یہ کتاب کہاں سے ملی؟ جواب دیا کہ خریدا ہوں، سن کر خوش ہوئے، پھر پوچھا کہ تم پڑھ چکے؟ جی ہاں مکمل ہو گئی ہے، پوچھا کیسی لگی؟ تمہارا کیا تأثر ہے؟ پھر کہنے لگے کہ میں نے کئی سال قبل اس کا نام سنا تھا۔

پاکستان میں اس کتاب کو دیکھا بھی تھا، مگر پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ اب یہ کتاب ملی ہے اور اس کو پڑھنا شروع کر دیا ہوں، ابھی کچھ صفحات پڑھے ہیں۔ پھر میں دیکھتا رہا کہ اس کتاب کو گھنٹوں لیٹ کر بیٹھ کر پڑھے جا رہے ہیں، کسی کام میں مشغول ہیں جیسے ہی فراغت ہوئی کتاب کے صفحات کھول لئے اور مطالعہ شروع کر دیا، نہ تھکن کا احساس نہ بیماری کی پرواہ۔ کبھی کبھی کہتے بھی تھے کہ زیادہ دیر تک مطالعہ کرتا ہوں تو کمزوری کی وجہ سے دماغ چکرانے لگتا ہے، مگر اس کے باوجود مطالعہ کے جنون نے کتاب کی تکمیل سے قبل انہیں سکون نہیں لینے دیا۔ دوران مطالعہ جب کوئی عبرت انگیز واقعہ نگاہ سے گزرتا تو اس کا تذکرہ بھی کرتے۔ ایک مرتبہ کہنے لگے کہ غلام محمد (پاکستان کا سابق وزیراعظم) کے بارے میں پڑھا؟ کیا لکھا ہے؟ فالج زدہ جسم کے ساتھ اس کے ناز ونخرے اور عیاشیوں کے چونچلے دیکھ رہے ہو، یہ سب اقتدار کا نشہ ہے، اقتدار کا نشہ آدمی کو کہیں کا نہیں چھوڑتا، دین کا نہ دنیا کا، ہر دو جگہ رسوا کرتا ہے، اس سے اللہ کی پناہ۔ اس کے پاس تو عارضی اقتدار تھا تب اس کے یہ چونچلے ہیں۔ اسی سے اندازہ کرو، ان نوابوں اور راجاؤں کے بارے میں جن کا اقتدار پانچ سالہ یا ووٹ کا رہین منت نہیں ہوتا تھا۔ اس کا ہلکا سا اندازہ ’’دربار دربار‘‘ (تصدق حسین صدق جائسی کی ایک دلچسپ کتاب) کتاب سے لگایا جا سکتا۔ پھر کہنے لگے کہ سب بیکار اور لغو چیزیں ہیں، آدمی کو اقتدار کا نہیں اللہ کا بن کر رہنا چاہئے، وہی قادر مطلق ہے اسی کی مرضی میں اپنی مرصی فنا کر دینا چاہئے، پھر سب کچھ خود بخود مرضی کے مطابق ہونے لگے گا، کیوں کہ خدا کی جو مرضی ہوگی وہی اس کی مرضی ہوگی۔

بقرعید کے دن باہر میدان میں درخت کے سائے میں بیٹھے تھے، سامنے عام گزرگاہ تھی۔ ایک مداری والا بندر لئے کھیل تماشہ دکھانے کے لئے کہیں جا رہا تھا، والد صاحب نے حاضرین سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو لوگوں نے بتایا کہ عید، بقرعید کے موقع سے لوگوں کے دروازے پر جاتا ہے بندر نچاتا ہے اور مختلف قسم کے کھیل تماشے دکھاتا ہے۔ والد صاحب نے کہا کہ اس کو بلاؤ ہم لوگ بھی دیکھیں۔ اس کو بلایا گیا۔ اس وقت ہم لوگ کمرے میں تھے، ہم لوگوں کو بھی بلوایا، کہ آؤ بندر کا تماشہ دیکھ لو۔ سامنے چوکی پر خود تھے، اردگرد دوسرے لوگ کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے، اور درمیان میں بندر والا اپنا کرتب دکھا رہا تھا۔ والد صاحب کھیل دیکھ رہے تھے

اور بار بار مسکرا رہے تھے، ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کھیل سے بہت حظ اٹھا رہے ہیں۔ جب کھیل مکمل ہو گیا تو پوچھا کہ بس؟ اس نے جواب دیا کہ بندر کا کرتب تو بس اتنا ہی ہے، مگر میرے بھائی کے پاس بھالو ہے اس کا کھیل اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ والد صاحب نے بدست خود اس کو پیسہ دیا اور فرمائش کی کہ کل بھالو بھی لے کر آنا، اس کا بھی کھیل دیکھیں گے۔ اس کے جانے کے بعد فرمانے لگے کہ آج بقر عید کا دن ہے، آج کے دن کو رسول اللہ ﷺ نے خوشی کا دن قرار دیا ہے، آج کے دن اس طرح کے کھیلوں سے لطف لینا جائز ہی نہیں بلکہ مستحسن ہے۔ یہ بھی خوشی کے اظہار کا ایک طریقہ ہے۔ بقر عید کا دن خدا کے انعام وضیافت کا دن ہے، اس دن حدود شرع میں رہ کر خوشی کا اظہار کرنا چاہئے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے اس دن مدینہ کی بچیوں کو دف بجاتے ہوئے اور کھیلتے ہوئے دیکھا مگر اس سے منع نہیں فرمایا بلکہ اس سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

دمکہ جھارکھنڈ میں تقریبا پندرہ دن قیام رہا، اس کے بعد واپس گھر لوٹ آئے۔ ارادہ تھا کہ کچھ دن گھر رہ کر پھر دوبارہ حیدرآباد چلے جائیں گے، مگر ممبئی کے لوگوں کا اصرار تھا کہ سیدھے حیدرآباد جانے کی بجائے ممبئی آجایئے، یہاں ایک ہفتہ رہ کر یہاں کے ڈاکٹروں سے مشورہ اور چیک اب وغیرہ کرالیجئے، پھر حیدرآباد چلے جایئے گا۔ والد صاحب نے ان لوگوں کے اصرار پر ان کے مشورہ پر عمل کرنے کا ارادہ کیا کہ کچھ دن ممبئی رہ کر حیدرآباد چلے جائیں گے، مگر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ممبئی جانے کے بعد حیدرآباد جانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ممبئی پہونچے تو مرض نے شدت اختیار کر لی کھانا پینا بالکل چھوٹ گیا، صحت روز بروز گرتی چلی گئی، یہاں تک کہ حیدرآباد جانے کی سکت بھی باقی نہیں رہی۔

ممبئی والد صاحب کے ساتھ راشد بھائی اور مولوی اصغر گئے تھے، میں گھر ہی تھا۔ والد صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ راشد واپس ہوں گے تو تم آجانا۔ راشد بھائی گھر آگئے، اصغر کی شادی تھی وہ بھی گھر جانے کے لئے پر تول رہے تھے، بس میرے پہونچنے کا انتظار تھا، جلدی میں میرا ٹکٹ بنا اور میں ممبئی پہونچا۔ ادھر درمیان میں تقریبا بیس دن کا وقفہ ہو گیا تھا، بیس دن کے بعد میں نے والد صاحب کو دیکھا تو بھونچکا رہ گیا، صحت تو پہلے ہی خراب ہو چکی تھی، دونوں بازؤں اور مونڈھوں کے گوشت گل چکے تھے مگر مجھے محسوس ہوا کہ اب مزید صحت گر گئی ہے، اور مسلسل گرتی

جارہی ہے۔ کمزوری تو اس قدر تھی کہ استنجا وغیرہ کے لئے دو قدم تنہا بغیر سہارے کے چلنا مشکل تھا، مگر اس حالت میں بھی نماز پڑھنے کے لئے مسجد ہی جاتے تھے، جو رہائش گاہ سے چند قدم کے فاصلے پر تھی، جب کبھی بہت زیادہ کمزوری ہوجاتی بالکل کھڑا ہونا مشکل ہوتا تو بیٹھ کر کمرے ہی میں نماز پڑھ لیتے ورنہ حتی الامکان مسجد میں جماعت سے نماز ادا کرنے کی کوشش کرتے۔

والد صاحب کی اصل بیماری گردوں کی تھی، ڈاکٹروں کی تشخیص تھی کہ گردہ ناکارہ ہوگیا ہے، مگر یونانی معالجین بضد تھے کہ بیماری گردہ کی نہیں ہے بلکہ پرانا بخار ہے جو آنت میں اتر گیا ہے، والد صاحب یونانی معالجین کی تشخیص کے مطابق بہت دنوں تک ان کی دوائیں کھاتے رہے، مگر نتیجہ صفر کا صفر ہی رہا۔ ان کی اس تشخیص کی وجہ سے گردوں کی طرف توجہ کم ہوگئی اور وہ دن بدن خراب ہوتا گیا، یہاں تک کہ جب ممبئی پہونچ کر جانچ کرائی تو معلوم ہوا کہ گردہ مردہ ہوکر بالکل سوکھ گیا ہے، ایک فیصد بھی کارکردگی کی اس میں طاقت نہیں ہے۔

۱۴؍ ذی الحجہ ۱۴۲۴ھ میں والد صاحب پر فالج کا حملہ ہوا تھا، علاج ومعالجہ کے بعد فالج سے افاقہ ہوگیا، اس کے تمام اثرات آہستہ آہستہ جسم سے تو ختم ہوگئے مگر گردوں پر اس کا کچھ اثر باقی رہ گیا، اور وہ کمزور ہونے شروع ہوگئے۔ اسی زمانہ میں دلی جاکر جانچ کرائی تو ڈاکٹروں نے بتلایا کہ گردے متأثر ہیں مگر ابھی بالکل ابتدائی مرحلے میں ہیں، دوا کے ذریعہ وہ اپنی سابقہ حالت پر آسکتے ہیں۔ دوا، پرہیز وغیرہ شروع ہوا مگر ان کو ٹھیک نہیں ہونا تھا نہیں ہوئے۔ گردوں کی کمزوری بڑھتی گئی یہاں تک کہ دلی کے ڈاکٹروں نے گردوں کی دھلائی یعنی ڈائلیسیس کا فیصلہ کردیا۔ والد صاحب بوجوہ ڈائلیسیس نہیں کرانا چاہتے تھے، ڈاکٹروں کے مشورہ کو نظر انداز کردیا۔ طبیعت بگڑتی رہی، کھانا، پینا بالکل چھوٹ گیا۔ تین سال متواتر ایسا گزرا کہ کسی بھی دن دونوں وقت کا کھانا نہیں کھایا، دوپہر میں جبراً کچھ کھا لیتے تھے مگر شام میں صرف چائے بسکٹ یا توس وغیرہ لے لیا کرتے تھے۔ ناشتہ کے نام پر صرف فجر بعد کی چائے تھی۔ اخیر میں ڈائلیسیس کا عمل شروع ہونے سے قبل ایک سال ایسا گزرا کہ کھانے کے نام سے چڑ ہوگئی تھی، کھانے کی بو بھی برداشت نہیں کر پاتے تھے، فوراً متلی شروع ہوجاتی تھی، متلی کی کثرت سے مسواک وغیرہ کرنا بھی دوبھر ہوگیا تھا، مسواک منھ میں ڈالی نہیں کہ متلی شروع، جس کی وجہ سے کافی تکلیف ہوتی، جسم پسینے سے بھیگ جاتا

اور نکلتا کچھ بھی نہیں، اور نکلے بھی کیا؟ جب پیٹ میں کچھ ہو تب تو نکلے۔

طبی اعتبار سے گردوں کی خرابی کی جو علامتیں جسم پر ظاہر ہونی چاہئے تھیں ان میں کوئی بھی علامت والد صاحب کے جسم پر نہیں تھی، مثلاً جسم کا سوج جانا، پیشاب کا کم ہو جانا یا بند ہو جانا۔ اسی لئے یونانی معالجین کی تشخیص بھی درست معلوم ہوتی تھی کہ اگر گردے خراب ہوتے تو اس کی علامتیں بھی ظاہر ہوتیں، مگر حقیقت یہی تھی کہ گردے خراب تھے، اس وقت یہ بات ہم لوگوں کو سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

والد صاحب کی صحت کی فکر کرنے والے مخلصین ومحبین نے متعدد مرتبہ والد صاحب کو حیدرآباد، دلی، ممبئی بلایا۔ حیدرآباد میں ایک یونانی معالج کے زیر علاج تھے، مگر ان کے علاج سے صحت پر خاطر خواہ اثر نہیں ہوا۔ ممبئی اور دہلی کے ڈاکٹروں نے ڈائلیسیس کا حتمی فیصلہ کر دیا تھا مگر ہم لوگوں کے ذہن میں ڈائلیسیس کی ایسی بھیانک صورت تھی کہ ہم لوگ خود بھی نہیں چاہتے تھے کہ والد صاحب ڈائلیسیس کرائیں، اور والد صاحب بھی اس عمل سے گریزاں تھے۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ ڈائلیسیس کا عمل ایک وقت طلب عمل ہے، جس میں تین چار گھنٹے لگتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تین چار گھنٹے تک میرا جسم ڈاکٹروں کے ہاتھ کا کھلونا بنے، نہ جانے ڈائلیسیس کرنے والا ڈاکٹر مسلمان ہو یا غیر مسلم؟ اور یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ عمل مرد کرے گا یا عورت؟ کیونکہ ہسپتالوں میں عموماً مخلوط نظام ہوتا ہے، اور پھر سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ اس میں چار گھنٹے لگتے ہیں اور اس مدت میں نماز قضا ہونے کا خدشہ ہے۔

والد صاحب کا ممبئی کا وہ سفر جس میں ڈائلیسیس شروع ہوئی تھی وہ اصلاً حیدرآباد کا سفر تھا، مخلصین کے اصرار پر ایک ہفتہ کے لئے ممبئی گئے تھے، جیسا اوپر ذکر ہوا ہے۔ ابھی والد صاحب ممبئی ہی میں تھے کہ ایک مخلص دوست، ٹوٹ کر محبت کرنے والے ساتھی اور حیدرآباد کے میزبان مولانا فاروق صاحب کی وفات کا حادثہ رونما ہو گیا، اور ابھی اس حادثہ کا غم تازہ ہی تھا کہ والد صاحب کے استاذ، جن سے والد صاحب حد درجہ عقیدت ومحبت رکھتے تھے، مولانا افضال الحق جوہر قاسمی صاحب کا سانحۂ وفات پیش آ گیا۔ بیماری، کمزوری، اس پر مستزاد یہ دونوں حادثات، دل پر خاصا اثر ہوا، طبیعت بجھ سی گئی، صحت تیزی سے روبزوال ہو گئی۔ یہاں تک کہ اتنی بھی قوت نہیں

رہی کہ ممبئی سے حیدرآباد چلے جائیں، مگر اب بھی کسی صورت سے ڈائلیسیس کے لئے تیار نہیں ہوئے۔

والد صاحب سے ازحد محبت کرنے والے ایک ڈاکٹر، ڈاکٹر محتشم شولکر جو کوکن کے رہنے والے ہیں، بچوں کے ڈاکٹر ہیں، بڑے مخلص، نیک اور دیندار آدمی ہیں۔ وہ صبح و شام پابندی سے والد صاحب کی عیادت کے لئے آتے تھے، اور ہر مرتبہ ڈائلیسیس کے لئے آمادہ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کی مسلسل کوشش، اور پیہم اصرار کے سامنے والد صاحب نے سپر ڈال دی، اور اس حد تک آمادگی کا اظہار کیا کہ ان سے کہا کہ کچھ دن ٹھہر جائیے، میں استخارہ کرلوں، اس کے بعد فیصلہ کروں گا۔ استخارہ کی مدت غالباً ایک ہفتہ طے ہوئی تھی۔ ابھی ایک ہفتہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ ایک دن والد صاحب استنجا کے لئے اٹھے، ڈاکٹر صاحب بھی موجود تھے، میں بھی وہیں تھا مگر کسی کام میں مشغول تھا، والد صاحب بمشکل دو چار قدم چلے ہوں گے کہ کمزوری کی وجہ سے پاؤں لڑکھڑا گئے، سامنے دیوار تھی اس کا سہارا لیا، اور گرتے گرتے بچے۔ میں تیزی سے گیا اور سہارا دے کر استنجا خانے تک پہونچایا۔ فراغت کے بعد سہارے سے بستر پر آئے تو ڈاکٹر صاحب کہنے لگے کہ بیماری نے آپ کے پورے جسم کی طاقت نچوڑ لی ہے، اب حد سے زیادہ کمزوری ہوگئی ہے۔ میں نے تیسری مرتبہ آپ کو لڑکھڑاتے اور گرنے سے بچتے ہوئے دیکھا ہے، اب مجھ سے مزید آپ کی یہ کیفیت دیکھی نہیں جاتی، جو بھی صورت ہو، آپ ڈائلیسیس کے لئے تیار ہو جائیے۔ یہ بات انہوں نے کچھ ایسے درد بھرے انداز میں کہی کہ والد صاحب کو ہامی بھرتے ہی بنی۔ طے ہوا کہ آج شام میں چل کر جانچ وغیرہ کرا لیتے ہیں، رپوٹ اور ڈاکٹر کے مشورہ کے اعتبار سے ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہو جائیں گے۔ شام میں جانچ کرانے کے لئے اسپتال گئے تو وہاں ڈاکٹر شولکر کے قریبی دوست ڈاکٹر گورنگ شا سے ملاقات ہوئی، جو گردے ہی کے ڈاکٹر ہیں، انہوں نے ہر ممکن طریقہ سے سمجھا بجھا کر والد صاحب کو ڈائلیسیس کے لئے ہموار کیا۔ ادھر مولانا لیاقت صاحب نے والد صاحب کے یوپی کے معالجین ڈاکٹر فرقان صاحب، ڈاکٹر فیاض صاحب سے فون پر مشورہ کیا، صورت حال جان کر ان لوگوں نے بھی جلد از جلد ڈائلیسیس شروع کرا دینے کا مشورہ دیا، ان تمام ڈاکٹروں کی ایماء کے بعد طے ہوا کہ کل ہی اسپتال میں داخل کر دیا جائے۔

دوسرے دن ڈاکٹر شولکر صاحب ہاسپٹل لے جانے کے لئے گاڑی لے کر آئے، والد صاحب نے کہا کہ میں ایڈمٹ ہونے اور ڈائیلیسیس کرانے کے لئے تیار ہوں مگر میری کچھ شرائط ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا بسر وچشم، جو آپ کہیں منظور ہے۔ والد صاحب نے کہا کہ میں کسی غیر مسلم ڈاکٹر سے علاج نہیں کرانا چاہتا، اس لئے میرا جو ڈاکٹر ہو، وہ کلمہ گو ہونا چاہیئے۔ ہاسپٹل میں میرے کمرہ میں کسی بھی کام کے لئے کوئی لڑکی یا عورت نہیں آنی چاہیئے، جو کچھ بھی کرنا ہوگا وہ مرد کریں گے۔ ڈائیلیسیس کے لئے ایسا وقت طے کیا جائے جس میں میری نماز قضا نہ ہو، مثلاً فجر بعد کا وقت رکھا جائے یا عشاء بعد کا وقت۔ ہاسپٹل کا کمرہ ایسا ہو جس میں وضو وغیرہ کی سہولت ہو اور اتنا بڑا ہو کہ آرام سے کھڑے ہو کر نماز پڑھی جاسکے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا آپ بے فکر رہیئے ان شاء اللہ آپ کی تمام شرائط پوری کردی جائیں گی، آپ خاطر جمع رکھئے جیسا آپ کہیں گے بالکل ویسا ہی ہوگا۔

والد صاحب ہاسپٹل میں داخل کردئے گئے، تمام کاروائیاں مکمل ہوگئیں، ساتھ میں صرف میں تھا، گھر والوں میں سے کوئی اور نہیں تھا۔ طبیعت بے چین تھی، بہت بے چین تھی، عجیب سی خلش تھی۔ ڈائیلیسیس کا جو بھیانک تصور ذہن میں تھا وہ بار بار ابھر کر سامنے آرہا تھا، عجب بدمزگی اور گھبراہٹ طاری تھی، بار بار دل سے دعا نکل رہی تھی یا خدا! اس بھیانک اور ناتمام طریقۂ علاج سے والد صاحب کو بچالیجئے صحت کی کوئی دوسری سبیل پیدا فرمادیجئے۔ اسی اضطراری کیفیت میں شام ہوگئی، مغرب کی نماز کے بعد میں اور مولانا لیاقت صاحب کسی کام سے نیچے اتر رہے تھے، دیکھا کہ سامنے سیڑھی سے ڈاکٹر شاہد صاحب آرہے ہیں، سلام، کلام کے بعد انہوں نے پوچھا کہ مولانا آپ یہاں کیسے؟ صورت حال بتائی، اور کہا کہ کل سے حضرت کی ڈائیلیسیس شروع ہوجائے گی، ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ افسوس مجھے پہلے اطلاع ہوئی ہوتی تو میں کچھ کرتا۔ میں ایک ایسے ڈاکٹر کو جانتا ہوں جو ایسے مریضوں کا علاج ڈائیلیسیس کی بجائے دوا سے کرتا ہے، بہت سے ایسے مریض جن کے بارے میں ڈاکٹروں نے ڈائیلیسیس کا فیصلہ کردیا تھا اس کی دوا سے شفایاب ہوئے اور ڈائیلیسیس سے بچ گئے۔ آپ لوگ یہاں سے پہلے اس کو دکھالیتے تو بہتر ہوتا، مگر اب تو ممکن نہیں ہے، ہاسپٹل میں داخل ہوچکے ہیں، یہاں سے نکال کرلے جانا مناسب نہیں ہے، مگر پھر

بھی یہاں سے چھٹی کے بعد آپ لوگ اس ڈاکٹر سے ضرور مل کر مشورہ کر لیجئے گا۔ ڈاکٹر صاحب کی بات سن کر دل کو بہت تسلی ملی۔ ڈوبتے کو تنکے کا ہی سہی مگر سہارا ملا ضرور، لیکن ساری امیدوں اور سہاروں پر اس وقت اوس پڑ گئی جب ہم لوگ اس ڈاکٹر سے ملے، مسیحا سمجھ کر گئے تھے مگر وہ سرے سے قاتل نکلا۔ شفا و صحت کی امید کے ساتھ گئے تھے مگر اس کی باتوں نے یک قلم ہماری امیدوں کا گلا گھونٹ دیا۔ اس نے قطعی طور پر یہ فیصلہ سنایا کہ آپ کا گردہ اس پوزیشن پر پہونچ چکا ہے کہ ڈاکٹری اعتبار سے اس کا درست ہونا ناممکن ہے، اب اس کا علاج یا تو ڈائلیسیس ہے یا پھر گردہ کی تبدیلی ہے۔ گردے کی تبدیلی کا مسئلہ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ زیر بحث آچکا تھا، والد صاحب کی رائے پہلے ہی دن سے تبدیلی کے سلسلے میں عدم جواز کی تھی، مگر لوگوں کے اصرار پر والد صاحب نے اس سلسلہ میں ایک بڑے ادارہ کے معتبر مفتی سے بھی استفسار کیا، انہوں نے اپنے ادارہ کے مفتیان کرام سے مشورہ کر کے عدم جواز ہی کی بات کہی۔ مزید گردہ کی تبدیلی کے حق میں خود قریبی معالجین بھی نہیں تھے، ان کا کہنا تھا کہ اس عمر میں گردہ کی تبدیلی عموماً کامیاب نہیں ہوتی ہے۔ اسباب کے درجہ میں بس ایک راستہ ڈائلیسیس کا بچا تھا، سو اسی کو اختیار کیا گیا۔

والد صاحب جس دن ہاسپٹل میں داخل ہوئے تھے اس کی رات بڑے کرب و اضطراب میں گزری تھی، زندگی کی پہلی رات تھی جو اتنی دل آزار اور پریشان کن تھی۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور، ایسا لگتا تھا کہ جیسے نیند اور آنکھ میں کبھی آشنائی ہی نہ رہی ہو۔ خود والد صاحب بھی اس رات بڑی تکلیف میں رہے، شدید ٹھنڈک محسوس کر رہے تھے، جس کی وجہ سے بار بار نیند کھل جاتی تھی، بدن پر کپکپی طاری ہو جاتی، میں کمبل پر کمبل، چادر پر چادر اڑھا رہا تھا، مگر ٹھنڈک تھی کہ جانے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ سوتے جاگتے کسی طرح رات گزری، اور تہجد کا وقت ہوا، تہجد کے لئے اٹھے تو بالکل ٹھیک تھے، نہ ٹھنڈک تھی اور نہ ہی بخار تھا۔

صبح نو بجے والد صاحب کو لے جانے کے لئے اسپتال کے کارندے آئے کہ نیچے ''آئی، سی، او' میں ڈاکٹر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ والد صاحب ابھی تک ہاسپٹل کا لباس نہیں پہنے تھے، جلدی سے لباس تبدیل کیا اور جانے کے لئے تیار ہو گئے، میں بھی ساتھ گیا مگر آئی، سی، او، کے دروازہ پر روک دیا گیا۔ میں وہیں پر انتظار کے لئے بیٹھ گیا، میں سمجھ رہا تھا کہ ڈائلیسیس کے لئے

اندر لے جایا گیا ہے۔ اس وقت میری کیا کیفیت تھی بیان سے باہر ہے، جسم کا انگ انگ زبان حال سے دعا میں مشغول تھا، اس وقت میں خود کو اتنا بے بس اور ٹوٹا ہوا محسوس کر رہا تھا کہ جیسے برسوں سے مجھے ذہنی اذیت کے شکنجے میں کس کر میرے جسم کی توانائی کو نچوڑ لیا گیا ہے۔ ذہن منجمد، قوت گویائی مفلوج سی لگ رہی تھی، موبائل سے کچھ لوگوں کو اطلاع کر کے دعا کی درخواست کرنے کی کوشش کی مگر وہ بھی آدھی ادھوری رہی۔ بمشکل دو تین لوگوں کو فون کیا تھا کہ ہمت جواب دے گئی، خاموش چھت کی طرف ٹکٹکی باندھے بیٹھا تھا، تقریباً پینتالیس منٹ بعد والد صاحب آئی، سی، او، کے دروازے سے نکلتے ہوئے نظر آئے، دوڑا ہوا پاس گیا، خیریت پوچھی، پوچھا ڈائلیسیس ہوگئی؟ فرمایا ابھی تمہید شروع ہوئی ہے۔ میری نگاہ گردن کے داہنے حصے پر پڑی، دیکھا کہ پٹی بندھی ہوئی ہے، اور دو پائپ لٹک رہے ہیں، پوچھا یہ کیا ہے؟ فرمایا کہ یہی تمہید ہے، آپریشن کر کے گردن کی رگ میں پائپ ڈالا گیا ہے، کل صبح اسی پائپ کے ذریعہ ڈائلیسیس ہوگی، پھر میں نے سوال کیا کہ آپریشن میں تکلیف تو نہیں ہوئی؟ کہنے لگے نہیں اللہ کا شکر ہے تکلیف کا کچھ زیادہ احساس نہیں ہوا، بس جب پائپ داخل کر رہے تھے تو ایک دو مرتبہ شاک سا لگا۔

جانچ کی رپوٹ کے اعتبار سے والد صاحب کے جسم میں ہیموگلوبین (خون) کی مقدار تین سے چار گرام تک تھی، ڈاکٹروں کی ہدایت تھی کہ ڈائلیسیس کے وقت خون کا انتظام کر لیجئے گا، ڈائلیسیس کے ساتھ آپ کے جسم میں خون بھی چڑھایا جائے گا۔ خون لانے کی ذمہ داری قاری علاؤالدین صاحب نے لی تھی، رات ہی میں انہوں نے خون کا انتظام کر دیا۔ فجزاہ اللہ احسن الجزا

دوسرے دن فجر کی نماز کے تھوڑی دیر بعد ڈائلیسیس کے لئے ڈائلیسیس کے کمرے میں لے جایا گیا۔ میں بھی ساتھ ہی تھا، ڈائلیسیس کا بھیانک ہیولی پہلے ہی سے ذہن میں تھا، مشین کی جسامت دیکھ کر پرانے تصور کی مزید تائید ہوگئی۔ اس وقت مجھ پر عجیب سی دہشت سوار تھی، میں سوچ رہا تھا کہ ڈائلیسیس کرانے میں نہ جانے مریضوں کو کتنے تکلیف دہ مراحل سے گزرنا پڑتا ہوگا۔ والد صاحب کو میں نے دیکھا وہ بالکل اطمینان وسکون کے ساتھ کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے، ان کے چہرہ پر کسی طرح کا کوئی تغیر نہیں تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد مشین کے بغل میں بستر پر لٹا دیا گیا، گردن کی دونوں پائپ مشین کی دو پائپوں میں جوڑ دی گئی، تھوڑی دیر میں سفید پائپ سرخ ہوگئی

اورخون مشین میں جانا شروع ہوگیا۔ ایک پائپ سے خون جسم سے نکل کر مشین میں جاتا پھر صاف ہوکر دوسری سے جسم میں چلا جاتا، یہ عمل چار گھنٹے چلتا رہا۔ عمل مکمل ہوا کمرہ میں آئے، میں نے پوچھا زیادہ تکلیف تو نہیں ہوئی؟ فرمایا زیادہ تکلیف کیا؟ تھوڑی بھی نہیں ہوئی، میں آرام سے پورے چار گھنٹے سوتا رہا، درمیان میں نیند کھلتی تھی مگر تھوڑی دیر بعد پھر سو جاتا تھا۔ اس وقت سمجھ میں آیا کہ اللہ پر توکل اور خود سپردگی مومن کے لئے کتنی بے بہا دولت ہے، میں مریض نہیں تھا مگر اس وقت میری حالت دگرگوں ہوئی جارہی تھی۔ میں بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ اس پوزیشن میں اچھے اچھوں کے دل تھرا جائیں گے، مگر والد صاحب پر گھبراہٹ کجا ایک گونہ سکون کی کیفیت تھی، تب تو چار گھنٹے کے پورے وقفے میں آرام سے سوتے رہے، حالانکہ ابھی اس چیز کے عادی نہیں ہوئے تھے، یہ پہلا تجربہ تھا۔ یہ خدا کی ذات پر غیر متزلزل یقین ہی تھا جس نے والد صاحب کو اس گھبرا دینے والی پوزیشن میں بھی سکون واطمینان کے ساتھ رکھا، یہ اطمینان اور قلبی سکون ''تا نہ بخشد خدائے بخشندہ'' کے قبیل سے ہے، یہ چیز ہرکس وناکس کو حاصل نہیں ہوتی۔

ابتدائی چار دنوں میں روزآنہ ڈائلیسیس ہوئی اور جسم میں خون ڈالا گیا، جب خون کی مقدار اطمینان بخش حد تک پہونچ گئی تو اس کا سلسلہ روک دیا گیا، اور خون کے تحفظ وتکثیر کے لئے انجکشن کا سلسلہ شروع ہوا۔ خون کا خریدنا ایک مشکل امر تھا، اس میں ایک مرحلہ وہ بھی آیا جو بڑا پریشان کن تھا۔ ہوا یہ کہ اتوار کا دن تھا، عشا کے بعد ڈائلیسیس تھی، خون کا انتظام ضروری تھا، قریب کے تمام ہاسپٹل جن میں بلڈ بینک ہیں، معلوم کیا گیا تو پتہ چلا کہ اتوار کی وجہ سے سارے بلڈ بینک بند ہیں، تشویش بڑھی، میں نے قاری علاؤالدین صاحب سے بات کی، جنھوں نے خون لانے کی ذمہ داری لے رکھی تھی۔ انہوں نے اطمینان دلایا کہ آپ فکر نہ کریں، میں کہیں سے بھی اس کا انتظام کروں گا، ان شاء اللہ، خواہ اس کے لئے مجھے ممبئ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جانا پڑے۔ مغرب کے بعد واقعتاً وہ خون لے کر پہونچ گئے۔ معلوم ہوا ستر کلومیٹر کا سفر کر کے خون حاصل کیا ہے۔ اللہ ان کو جزائے خیر دے، انہوں نے والد صاحب کی بہت خدمت کی۔

والد صاحب کی ڈائلیسیس کی خبر جیسے جیسے عام ہوتی گئی عیادت کرنے والوں کی بھیڑ میں اضافہ ہوتا گیا، جو لوگ ممبئ یا اطراف میں تھے وہ خود ہاسپٹل عیادت کے لئے آئے، اور جو دور

تھے جن کا فوری طور پر پہونچنا ممکن نہیں تھا، انہوں نے فون پر عیادت کی۔ غرض فون کرنے والوں اور عیادت کے لئے آنے والوں کا تانتا بندھ گیا، جن میں ہر طرح کے لوگ ہوتے اور ہر طرح کی باتیں کرتے۔ بیماری کے سلسلہ میں اپنے تجربات بیان کرتے، نوع بنوع کے مشورے دیتے، کچھ ایسے بھی ہوتے جن کی باتیں سن کر تسلی ہوتی، اور کچھ لوگ ایسے بھی آتے جن کی باتیں سن کر گھبراہٹ میں مزید اضافہ ہوجاتا۔ آنے والوں کو تو روکنا ممکن نہیں تھا، مگر موبائل پر عیادت کرنے والوں کی یہ تدبیر کی گئی کہ والد صاحب سے مشورہ بصورت درخواست کیا گیا کہ جب تک آپ ہاسپٹل میں ہیں، موبائل اپنے پاس رکھنے کی بجائے مجھے دیدیجئے، اور میرا موبائل اپنے پاس رکھئے تاکہ بوقت ضرورت میری عدمِ موجودگی میں مجھے فون کرکے بلاسکیں، اور آپ کا فون میں وصول کرکے آپ کی طبیعت اور صحت کے بارے میں لوگوں کو مطلع کردیا کروں گا، تاکہ آپ اس جھنجھٹ سے بچے رہیں، والد صاحب نے ہم لوگوں کی بات پر صاد کیا، اور اس پر عمل درآمد شروع ہوگیا۔

والد صاحب ابھی ہاسپٹل ہی میں تھے اور ان کا موبائل میرے پاس ہی رہتا تھا، ایک دن قاری عبدالسلام مضطرؔ صاحب کا فون آیا، انہوں نے والد صاحب سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی، میں نے بات کرادی۔ عیادت کے بعد انہوں نے شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ کے حوالے سے ایک وظیفہ بتلایا کہ حضرت نے لکھا ہے کہ جسم کے مفلوج حصہ پر اگر ہاتھ رکھ کر سات سات مرتبہ سورہ فاتحہ پڑھ کر سات مرتبہ دم کیا جائے تو مفلوج حصے میں زندگی پیدا ہوجاتی ہے، آپ بھی اپنے گردے کے مقام پر دم کروائیے، ان شاء اللہ زندگی کے آثار پیدا ہوجائیں گے۔ فون رکھنے کے بعد والد صاحب نے اس کا تذکرہ کیا، ہم لوگوں نے کہا کہ پھر دیر کس بات کی، ابھی شروع کردیتے ہیں۔ اس وقت میں اور بڑے بھائی مولانا راشد صاحب موجود تھے، ایک گردے کے مقام پر میں نے ہاتھ رکھا اور دوسرے پر راشد بھائی نے اور دم کرنا شروع کردیا۔ دم کرنے کا یہ سلسلہ بلاتخلف والد صاحب کی وفات تک چلتا رہا، دن بھر میں دو مرتبہ دم کیا جاتا، ایک مرتبہ دوپہر میں اور دوسری مرتبہ رات میں جب سونے کے لئے لیٹ جاتے تھے۔

ہاسپٹل سے چھٹی سے تین دن قبل تمام قریبی ڈاکٹر والد صاحب کے کمرے میں اکٹھا ہوئے، والد صاحب کو ایک دوسرے آپریشن کیلئے تیار کرنے کی غرض سے، جو اہم اور ضروری تھا۔

پہلا آپریشن گردن میں ہوا تھا، دوسرا بائیں ہاتھ میں ہونا تھا، گردن میں آپریشن کے ذریعہ جو پائپ ڈالی جاتی ہے وہ عارضی ہوتی ہے، اس کے میعاد چھ ماہ ہوتی ہے۔ ہاتھ میں آپریشن کے ذریعہ دو رگوں کو باہم جوڑا جاتا ہے، جس سے وہاں خون کی رفتار تیز ہوجاتی ہے، اتنی تیز کہ کرنٹ جیسا محسوس ہونے لگتا ہے، پھر اسی ملی ہوئی رگ میں موٹی سی سوئی چبھو کر ڈائلیسیس کی جاتی ہے۔ اس کو ڈاکٹری زبان میں ’’اے، وی، فسچولا‘‘ کہتے ہیں۔ فسچولا کو آپریشن کے بعد ڈائلیسیس کے قابل ہونے میں کم از کم ایک مہینہ کی مدت درکار ہوتی ہے، اس مدت میں ڈائلیسیس گردن سے ہوتی ہے۔ فسچولا کو مضبوط اور پائیدار بنانے کے لئے ڈاکٹر ایک نرم گیند ہاتھ میں پکڑا دیتا ہے، جس کو دبا کر ورزش کرنی ہوتی ہے، ورزش جتنی زیادہ ہوگی فسچولا اتنا ہی مضبوط ہوگا۔ اسی آپریشن کے سلسلہ میں مشورہ اور والد صاحب کو تیار کرنے کے لئے ڈاکٹر جمع ہوئے تھے۔ دوسرے دن صبح والد صاحب ’’آئی، سی، او‘ لے جائے گئے، اور بمشکل آدھے گھنٹہ میں بغیر کسی تکلیف کے آپریشن مکمل ہوگیا، واپس آئے تو کلائی کے پاس پٹی بندھی ہوئی تھی اور ہاتھ میں گیند تھی۔

ہسپتال میں والد صاحب نو دن رہے، اس پوری مدت میں ڈاکٹر پوری توجہ سے نگرانی کرتے رہے۔ صابو صدیق اسپتال کے ڈائرکٹر جناب ڈاکٹر عبدالرؤف سمار صاحب خود بھی کبھی کبھار عیادت کے لئے آتے رہتے تھے، جس کا اچھا اثر ہاسپٹل کے عملہ پر پڑا۔ ہاسپٹل میں عام طور سے مریضوں کو دوا وغیرہ نرسیں کھلاتی ہیں، والد صاحب کے کمرے میں چونکہ ان کو داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی، اس لئے میں ان سے دوا لے کر آتا اور کھلاتا۔ جب بھی دوا دینے کے لئے بلاتیں تو عموماً والد صاحب کی طبیعت اور خیریت دریافت کرتیں۔ ایک دن دوا لینے گیا تو ان کی جو سربراہ تھی، کہنے لگی کہ ہم لوگوں کو افسوس ہے کہ ہمیں مولانا کی خدمت کا موقع نہیں مل رہا ہے، ہماری خواہش ہے کہ پردہ کے پیچھے سے ہمیں کچھ نصیحت کردیں، آپ ہماری طرف سے ان سے درخواست کردیجئے، اگر اجازت ہو تو یہ پردہ ہے، اس کو کمرہ میں لگا دیجئے، ہم لوگ اس کے پیچھے بیٹھ کر سن لیں گے۔ میں نے ان کی بات والد صاحب سے نقل کی تو کہا کہ ٹھیک ہے پردہ لگا کر ان کو بلا لو۔ وہ سب جمع ہوگئیں تو خطبہ مسنونہ کے بعد والد صاحب نے انہیں کئی نصیحتیں کیں، ان میں سے دو ایسی تھیں جن کی خاص تاکید فرمائی۔ ایک نماز کی، کہ جہاں بھی رہو، جس کام میں بھی

رہو، اذان کی آواز جیسے ہی کان میں پہونچے، نماز پڑھنے کی کوشش کرو، اگر مریضوں کے ساتھ بہت زیادہ مشغولیت ہو اور وقت کم مل رہا ہو تو صرف فرض ہی پڑھو مگر پڑھو ضرور۔ اس کے بعد سنت کا جب بھی موقع ملے پڑھ لو، اگر نہ ملے تو کوئی بات نہیں، مگر فرض موقع ملے یا نہ ملے بہر صورت ادا کرو۔ اور دوسری حسن سلوک کی، خصوصاً مریضوں کے ساتھ کہ مریض تم لوگوں کی نگرانی میں ہوتے ہیں، اور ہر طرح کے مریض ہوتے ہیں، عموماً بیمار ہونے کے بعد آدمی چڑ چڑا اور تندخو ہو جاتا ہے تم لوگوں کا دن رات کا ان سے سابقہ ہے، مزاج کے خلاف ہو جانا اور تلخی کا پیدا ہو جانا فطری چیز ہے، مگر تم لوگ صبر کر کے ضبط کر کے ان کی خدمت کرو، منہ بگاڑ کر یا پیشانی پر بل ڈال کر ان کے سامنے نہ جاؤ، بلکہ مسکراتے ہوئے، ہنس مکھ چہرے کے ساتھ ان کے سامنے جاؤ تسلی کی باتیں کرو، ان کو اطمینان دلاؤ، ان کی مایوسی دور کرو۔ گاہے گاہے ان کے تیمارداروں کو بھی تسلی دیتی رہو تا کہ ان کا دل خوش ہو، اگر ان چیزوں کا تم لوگوں نے خیال کیا تو مخلوق خدا بھی خوش ہوگی، اور ان شاء اللہ، اللہ بھی تمہارے ان اعمال کا بڑا اجر دیں گے۔

ہاسپٹل سے نکلنے کے بعد حکیم عبد المنان صاحب کے تجویز کردہ ایک عمدہ فلیٹ میں جو جے جے اسپتال کے دوسری سمت پر سڑک کے کنارے واقع تھا، اس میں منتقل ہوئے۔ وہ فلیٹ تھا تو دوسری منزل پر مگر ہر طرح سے مناسب تھا، صابو صدیق ہاسپٹل جہاں والد صاحب کی ڈائلیسس ہوتی تھی، وہ بھی قریب تھا اور بی، آئی، ٹی، بلاک کی مسجد جہاں مولانا لیاقت صاحب امام ہیں، وہ بھی پانچ منٹ کی مسافت پر تھی۔ نیچے جامعہ ملیہ کا کتب خانہ بھی تھا۔

ابتداء میں ڈائلیسس ہفتہ میں دو مرتبہ ہوتی تھی، سنیچر اور بدھ کو، یہ سلسلہ ایک ڈیڑھ مہینے چلتا رہا۔ شروع میں سنیچر سے بدھ تک کا وقفہ ٹھیک ٹھاک گزرا، مگر جیسے جیسے دن گزرتا گیا، تکلیف بڑھتی گئی۔ اتوار اور سوموار کے دن تو ٹھیک رہتے مگر منگل کو تکلیف بڑھ جاتی، متلی کی شکایت عود کر جاتی، کھانے سے طبیعت متنفر ہو جاتی۔ جب صورت حال کی خبر ڈاکٹر کو دی گئی تو اس نے ڈائلیسس کا وقفہ کم کر کے ہفتہ میں تین دن کر دیا، سنیچر، سوموار اور بدھ۔ اس سے طبیعت تو ٹھیک رہنے لگی مگر سوموار کی ڈائلیسس گلی کی ہڈی بن گئی، سنیچر اور بدھ کی ڈائلیسس صبح فجر بعد متعین تھی، سوموار کی ڈائلیسس درمیان میں بڑھ جانے کی وجہ سے پریشانی یہ ہوتی تھی کہ سوموار کو صبح سے لے

کرشام تک سارے بیڈ مشغول رہتے تھے، سوموار کی ڈائلیسیس کبھی تین بجے شام میں شروع ہوتی تو کبھی عشا کے بعد۔ بعض اوقات نماز بھی خطرہ میں پڑ جاتی، پھر صبح کی ڈائلیسیس اس معنی کر بھی اچھی ہوتی ہے کہ رات میں مشین دھل دھلا کر صاف ہو جاتی ہے، فجر بعد کی ڈائلیسیس دن کی پہلی ڈائلیسیس ہوتی ہے، مشین صاف ہونے کی وجہ سے عموماً درمیان میں طبیعت خراب نہیں ہوتی تھی، اور ڈائلیسیس کے بعد معمول سے زیادہ طبیعت میں تغیر نہیں ہوتا تھا، اور جس دن تین بجے یا عشا بعد ہوتی تھی تو اکثر درمیان میں بھی طبیعت کچھ اوپر نیچے ہوتی تھی اور ڈائلیسیس کے بعد بالکل نڈھال ہو جاتے، واپس آنے کے بعد بالکل بے سدھ ہو کر پڑ جاتے تھے، ملنے ڈولنے کی بھی سکت نہیں رہتی۔

ہفتہ میں تین ڈائلیسیس ایک ڈیڑھ مہینہ ہوتی رہی، اس کے بعد طبیعت اعتدال پر آنی شروع ہوئی، یہاں تک کہ طبیعت اس لائق ہوگئی کہ ہفتہ میں دو ڈائلیسیس سے بھی کام چل سکتا تھا۔ ڈاکٹر سے کہا گیا تو اس نے مشورہ دیا کہ کچھ دن اور دیکھ لیجئے اگر طبیعت اسی طرح اعتدال پر رہی تو دو کر لیجئے گا، ڈاکٹر کے مشورہ کے مطابق مزید کچھ دن تین روز ہوتی رہی کہ اسی درمیان ایک نئی افتاد آن پڑی۔ ڈائلیسیس کرنے والے کی ناتجرکاری کی وجہ سے فسچولا خراب ہوگیا، اس کی حرکت بند ہوگئی۔ ڈاکٹر کو دکھلایا گیا تو اس نے کہا کہ یہ بیکار ہو گیا ہے، نیا بنوانا پڑے گا۔ اس کو ڈائلیسیس کے قابل ہونے کے لئے ایک مہینہ کی مدت چاہئے، اس مدت میں ڈائیلیسیس گردن کے ذریعہ ہوگی، جیسا اس سے پہلے ہوئی تھی۔ گردن کی پائپ سے والد صاحب گھبراتے تھے، اس کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ یہ گردن میں پائپ نہیں ہے بلکہ پھانسی کا پھندا ہے۔ یہ پائپ خود ایک بڑی مصیبت تھی، اس پر سے متعدد بیماریوں کا گھر تھی، اس کی وجہ سے اکثر انفکشن ہوتا رہتا تھا، جب تک پائپ گردن میں رہتی بخار، درد اور طرح طرح کی شکایات اکثر ہوتی رہتی، مگر کیا کیا جاتا اس پھانسی کے بغیر چارۂ کار بھی تو نہیں تھا، لگوانا مجبوری تھی۔ والد صاحب نے دوسری مرتبہ بجبر واکراہ یہ پھانسی لگوائی تاکہ وقت پر ڈائلیسیس ہو سکے۔

ڈائلیسیس شروع ہونے کے بعد دن بدن صحت میں ترقی ہو رہی تھی، کھانا پینا جو ایک مدت سے چھوٹا ہوا تھا پہلی ڈائلیسیس کے بعد ہی اس کی ابتدا ہوگئی تھی۔ پہلے کھانا دیکھ کر طبیعت

چڑ چڑا جاتی تھی، متلی شروع ہو جاتی تھی، اب وہ کیفیت ختم ہوتی جا رہی تھی، گو کہ اب بھی کھانے کی طرف رغبت نہیں ہوتی تھی مگر ڈاکٹروں کی تاکید اور صحت کے خیال سے کچھ نہ کچھ زہر مار کر لیتے تھے۔ جب کھانا شروع کیا تو زیادہ کھایا بھی نہیں جاتا تھا، بمشکل آدھی یا ایک روٹی کھا پاتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ تین سال متواتر نہ کھانے کی وجہ سے زبان اور معدہ کھانے سے نامانوس ہو گئے ہیں، نہ کھانے میں لذت ملتی ہے اور نہ زیادہ کھایا جاتا ہے، معدہ سکڑ کر چھوٹا ہو گیا ہے تھوڑے سے کھانے سے بھر جاتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ ساری چیزیں معمول پر آنے لگیں کھانے کی مقدار بھی بڑھی اور صحت میں بھی اضافہ ہونا شروع ہو گیا، کندھے کے گوشت جو بالکل ختم ہو گئے تھے پر ہونے شروع ہوئے، چہرے اور ناخنوں میں سرخی کے آثار پیدا ہونے لگے۔

ہم لوگ جس فلیٹ میں رہتے تھے وہ تیسری منزل پر تھا، فلیٹ اور زمین کے درمیان تقریبا تیس سیڑھیوں کا فاصلہ تھا۔ والد صاحب ڈائلیسس کے لئے یا نماز کے لئے جب نیچے اترتے تو بذات خود چھڑی کے سہارے سے اترتے تھے، ابتدا میں جب ساتھ میں صرف میں تھا تو سیڑھیاں اترنے کے بعد پیدل ہاسپٹل بھی چلے جاتے تھے جو ایک کلومیٹر یا اس سے کچھ ہی کم دوری پر تھا۔ ڈائلیسس کے بعد جب کہ عموماً کمزوری زیادہ ہو جاتی تھی تب بھی پیدل کبھی کبھار واپس آجاتے تھے۔

جب صحت قدرے ٹھیک ہوئی اور بلا تکان کچھ دیر بیٹھنے کے قابل ہوئے تو عصر کی نماز کے بعد ایک وظیفہ شروع کیا، جس میں ہم سب لوگ اور باہر کے بھی کچھ لوگ آکر شریک ہوتے تھے۔ وظیفہ کے بعد اجتماعی دعا کراتے، خصوصاً اپنی صحت اور دوسرے مریضوں کی صحت کے لئے۔ وظیفہ یہ تھا ”درود شریف“ ایک ہزار مرتبہ ”**لااله الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین**“ ایک ہزار مرتبہ۔ چوتھا کلمہ ”**لااله الا الله وحده لاشریک له، له الملک وله الحمد وهو علی کل شئی قدیر**“ ایک ہزار مرتبہ۔ یہ وظیفہ مغرب سے کچھ قبل تک چلتا رہتا، اس کے بعد چائے پی جاتی پھر اذان کے بعد مغرب کی نماز ادا کی جاتی۔

والد صاحب کے جسم میں کیلشیم کی کمی کی وجہ سے ہمیشہ درد رہا کرتا تھا، ڈاکٹر نے کیلشیم کی دوا دی تھی جو پابندی سے کھا رہے تھے، مگر درد میں تخفیف نہیں ہو رہی تھی۔ ایک دوسرے ڈاکٹر سے

درد کی شکایت کی تو انہوں نے کہا کہ دوا کھاتے رہیۓ اور ساتھ میں تھوڑی دیر ٹہلنے نکلا کیجیۓ، صبح کے سورج کی سرخ روشنی کیلشیم کو بڑھاتی ہے۔ اس تفریح کو والد صاحب ''غسل آفتابی'' کہتے تھے۔ فجر کے بعد ہم لوگوں سے کہتے کہ چلو غسل آفتابی کے لئے چلتے ہیں، نیچے اترتے تو کبھی جے جے ہاسپٹل کے پارک میں چلے جاتے، اگر مولانا لیاقت صاحب ساتھ ہوتے تو وہ عموماً مولانا مستقیم احسن اعظمی صاحب کے یہاں ناگ پاڑہ لے کر جاتے۔ مولانا مستقیم صاحب کا معمول ہے کہ وہ روزانہ فجر کی نماز کے بعد گھر کے قریب پارک میں ٹہلا کرتے ہیں، والد صاحب جب پہونچتے تو فجر کے بعد کی چائے ان کے ساتھ پیتے، اور انہی کے ساتھ چہل قدمی کرتے، پھر تھوڑی دیر بیٹھ کر اخبار دیکھتے، جب گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گزر جاتا تو ان کے ساتھ ناشتہ کر کے واپس آجاتے۔ اور کبھی نکلتے تو قاری ولی اللہ صاحب کے پاس چلے جاتے جو ''مسجد نور'' ڈونگری کے امام وخطیب ہیں، والد صاحب کا ان سے بہت دیرینہ اور عقیدت مندانہ تعلق ہے، اور وہ بھی والد صاحب سے بہت محبت فرماتے ہیں، وہ بھی گردے کے مریض ہیں، ان کی بھی تقریباً تین سالوں سے ڈائلیسیس ہو رہی ہے۔ فجر کے بعد ان کے یہاں مجلس لگتی ہے والد صاحب اس میں شرکت کی غرض سے جایا کرتے تھے۔ خصوصاً اتوار اور جمعہ کو ان کے یہاں جانے کا اہتمام کرتے تھے، کیونکہ ان دنوں میں ان کے یہاں ڈاکٹروں کا اجتماع ہوتا تھا جو تصحیح قرآن اور حفظ احادیث کے لئے جمع ہوتے تھے، یہ مجلس آٹھ ساڑھے آٹھ بجے ناشتہ پر ختم ہوتی تھی۔ اس کے بعد سارے لوگ چلے جاتے مگر والد صاحب بیٹھے رہتے اور مزید قاری صاحب سے باتیں کرتے، نو سوا نو کے قریب وہاں سے رخصت ہوتے۔ فجر کے بعد روزانہ غسل آفتابی کے لئے نکلتے تھے مگر جس دن قاری صاحب کے یہاں چلے جاتے اس دن کا غسل آفتابی قاری صاحب کی مجلس کی نذر ہو جاتا۔

والد صاحب کو ممبئی آئے دو ڈھائی مہینے ہو گئے تھے، اب کچھ ناگزیر وجوہ کی بنیاد پر والد صاحب نے مدرسہ جانے کا ارادہ کیا۔ حالانکہ اب بھی صحت سفر کے لائق نہیں تھی مگر وہ یہی کہتے رہے کہ میرا مدرسہ جانا ضروری ہے۔ ربیع الثانی کے پہلے عشرہ میں ہم سب لوگوں کا ٹکٹ بنا، اور مدرسہ پہونچے، اساتذہ وطلبہ میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی، ایک خوشی تو طویل غیر حاضری کے بعد دیدار کی تھی، اور دوسری خوشی صحت کی تھی جو مدرسہ سے جاتے وقت کافی خستہ تھی، مگر اب ماشاء اللہ

اس کے مقابلے میں بہت حد تک ٹھیک تھی، جو لوگ والد صاحب کی صحت کے متعلق ادھر ادھر سے سن کر تشویش میں پڑے رہتے تھے ان کو خوشگوار حیرت ہوئی۔

والد صاحب کا ارادہ تھا کہ مہینے ڈیڑھ مہینے مدرسہ میں رہیں گے، پھر ممبئی کا ارادہ کریں گے مگر افسوس کہ اس وقت تک مدرسہ کی حالت ایسی مخدوش ہو چکی تھی کہ جلد از جلد وہاں سے نکل جانا ہی مناسب سمجھا اور محض دو ہفتے رہ کر واپس ممبئی آ گئے۔ بہت سے لوگوں نے اس قدر جلد واپسی کی وجہ پوچھی تو ایک ضمنی وجہ بتلا کر انہیں مطمئن کر دیا۔

یادش بخیر، والد صاحب جن دنوں مدرسہ میں تھے انہیں ایام میں ان کے استاذ محترم مولانا زین العابدین صاحب اپنے مرض وفات کی علالت کی وجہ سے اپنے گاؤں پورہ معروف میں قیام پذیر تھے۔ والد صاحب ان کی عیادت کے لئے پورہ معروف بھی گئے، اور مولانا بھی والد صاحب کی عیادت کے لئے مدرسہ تشریف لائے تھے، حالانکہ اس وقت ان کی صحت سفر کے لائق بالکل نہیں تھی، مگر محبت میں جب دونوں طرف اخلاص اور للہ فی اللہ کی کارفرمائی ہوتی ہے تو ہر طرح کی تکلیف گوارہ ہوتی ہے، جس کا تذکرہ والد صاحب نے اپنے مضمون میں کیا ہے۔ مولانا جب بغرض علاج ممبئی تشریف فرما تھے تو وہاں بھی متعدد بار والد صاحب ان سے ملنے گئے تھے، ایک مرتبہ میں بھی والد صاحب کے ساتھ ملنے گیا تھا، ان کی باتیں سنی تھی، ان کی مجلس میں بیٹھا تھا۔ ان کی مجلس میں از اول تا آخر جب تک ہم لوگ رہے شوق آخرت اور لقاء الٰہی کی باتیں ہوتی رہیں، جس کی کچھ دلچسپ جھلکیاں والد صاحب نے اپنے مضمون میں پیش کی ہے۔ اخیر میں واپس آنے کی اجازت چاہی گئی تو مولانا نے جیب سے پانچ سو کا نوٹ نکالا اور والد صاحب کو دیتے ہوئے فرمایا ”مولوی اعجاز“ یہ رکھو، میری طرف سے تبرک ہے“۔ باہر نکلنے کے بعد والد صاحب نے وہ نوٹ مجھے دے دیا کہ اسے سنبھال کر رکھو۔ واپسی میں پورے راستے ان کے استحضار موت اور شوق آخرت کا تذکرہ کرتے رہے، گھر تک پہونچتے پہونچتے یہ تذکرہ پھیل کر بہت دور تک پہونچ گیا۔ گھر پہونچ کر گھنٹوں صحابہ کرام، اکابر علماء دین کے ذوق وشوق کو بیان کرتے رہے، ہم لوگوں پر جو وقتی اثر ہونا تھا ہوا، مگر صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اس تذکرہ سے ان کی آتش شوق تیز سے تیز تر ہو رہی ہے، اور کیوں نہ ہوتی یہی تو ان کی زندگی کا موضوع تھا، جب اصل موضوع چھڑا تو دور تک بات کا

پہونچنا لازمی تھا۔ یہی ان کی زندگی کا محور تھا جس پر ان کی زندگی گرم وسرد ہر حالت میں گردش کرتی رہی۔

والد صاحب کا جو دوسرا سفر ممبئی کا ہوا تھا وہ کم وبیش چار مہینے کا تھا، اس سفر میں مجموعی اعتبار سے پچھلے سفر کے مقابلہ میں صحت غنیمت ہی رہی۔ بیماری کی سختی کے زمانہ سے اب تک لکھنے کا کام معرض التوا میں پڑا تھا، اس سفر میں والد صاحب کا ارادہ اپنے استاذ ''مولانا افضال الحق جوہر قاسمی صاحب'' کی سوانح عمری لکھنے کا تھا، جس کے ضروری مواد اکٹھا کر کے اپنے ساتھ ہی ممبئی لے کر گئے تھے۔ چونکہ لمبے عرصے سے لکھنے کا کام بند تھا اس لئے بہت سی ضروری چیزیں جن کی تکمیل زیادہ مدت طلب نہیں تھی، سوانح عمری کے کام سے پہلے اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس وقفہ کے بعد سب سے پہلی جو چیز لکھی وہ مولانا فاروق صاحب پر تأثراتی مضمون تھا، جس کے ابتدائی دو تین صفحے بول کر مجھ سے املا کرائے تھے، بقیہ خود لکھا۔ املا کرانے کے درمیان دو تین مرتبہ مجھ سے کہا کہ بول کر لکھانے کی عادت نہیں ہے، اس لئے خود سے لکھنے میں جو بات ہوتی ہے وہ بول کر لکھانے میں پیدا نہیں ہو رہی ہے۔ مولانا فاروق صاحب کے مضمون سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ ایک نوعمر خاص شاگرد مولانا ثناء اللہ صاحب سونگر کا حادثہ وفات پیش آ گیا، جن کی وفات سڑک کے حادثہ میں ہوئی تھی۔ ان کی وفات کا بہت اثر طبیعت پر پڑا، اس کی وجہ سے کئی دن تک بجھے بجھے سے رہے، جب کچھ طبیعت سنبھلی تو ان کے اہل خانہ کو ایک تعزیتی خط اور ایک مضمون لکھا جو ابھی تک کہیں طبع نہیں ہوا ہے۔

لکھنے کا سلسلہ چل پڑا تو ایک دن میں نے کہا کہ اب تو قرطاس وقلم کا رشتہ استوار ہو گیا ہے، مولانا کی سوانح اور تسہیل الجلالین کا کام کب شروع کریں گے؟ فرمایا کہ جلالین کی شرح کا کام بہت لمبا ہے، سوچ رہا ہوں کہ پہلے چھوٹی چھوٹی چیزیں نمٹا لوں، اس کے بعد اس کو شروع کروں، اور مولانا کی سوانح کے سلسہ میں خیال آ رہا ہے کہ سوانح سے قبل ایک مفصل مولانا پر تأثراتی مضمون لکھوں، اس کے بعد سوانح کے کام کو چھیڑوں۔ ابھی مولانا پر مضمون کی ابتدا نہیں کی تھی کہ اس سے قبل والد صاحب کے بچپن کے ساتھی حافظ عیسی صاحب طویل علالت کے بعد رخصت ہو گئے، اور پھر کچھ ہی دنوں کے بعد مولانا زین العابدین صاحب کے وفات کی خبر ملی۔ قلم

کا رخ جو مولانا کی طرف تھا گھوم کر ان حضرات کی طرف ہوگیا، پہلے حافظ عیسی صاحب پر ایک مضمون لکھا جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہے، اس کے بعد اپنے استاذ مولانا زین العابدین صاحب پر تین مفصل مضمون لکھا جو ”سراج الاسلام“ کی خصوصی اشاعت میں جو مولانا زین العابدین صاحب پر تھی، طبع ہوا ہے۔ جب ان تمام مضامین سے فارغ ہوئے تو اپنے محبوب استاذ مولانا افضال صاحب پر لکھنا شروع کیا اور تقریباً تیس صفحہ پر مشتمل ایک مفصل مضمون لکھا، جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس مضمون میں مولانا کی زندگی کی اہم جھلکیاں اور مولانا کے افکار کو اختصار کے ساتھ پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے، چونکہ مولانا کی سوانح لکھنے کا ارادہ کر چکے تھے اس لئے بہت سی اہم اور ضروری تفصیلات کو نظر انداز کر دیا کہ اس کو سوانح میں پوری شرح وبسط کے ساتھ لکھیں گے۔

مولانا پر لکھا گیا مضمون تقریباً دس دن میں مکمل ہوا، لکھتے جاتے اور مجھ کو دیتے جاتے کہ ٹائپ کرو، میں ٹائپ کرنے سے پہلے خود اس کو دو تین مرتبہ پڑھتا اس کے بعد ٹائپ کرنا شروع کرتا۔ ایک دن میں نے باتوں ہی باتوں میں کہا کہ آپ نے جو مضمون حافظ عیسی اور مولانا ثناء اللہ پر لکھا ہے اس میں وہ بات نہیں ہے جو اس مضمون میں ہے، ان مضامین میں اور اس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ فرمانے لگے کہ یہ تعلق اور محبت کی بات ہے، جو مضمون میں فرق پیدا کر رہی ہے۔ مولانا سے جو تعلق اور محبت مجھ کو ہے اور مولانا کی طرف سے جو محبت مجھے ملی ہے، وہ کہیں اور مجھے نہیں ملی ہے، مولانا پر جو مضمون لکھا گیا ہے وہ ان کے تعلق کی کشش اور محبت کی سرشاری کے عالم میں لکھا گیا ہے۔ مولانا پر مضمون مولانا کی محبت نے مجھ سے لکھوایا ہے، اس لئے اس میں اور دوسرے مضامین میں بون بعید ہونا یقینی ہے۔ مولانا پر لکھا گیا یہ مضمون ”ترجمان دار العلوم“ میں شائع ہوا ہے جو تادم وفات مولانا افضال صاحب ہی کی زیر ادارت رہا ہے۔

ممبئی کے اس سفر میں لکھنے کے ساتھ معمولات بھی قدرے مختلف رہے، پہلے سفر میں عدم صحت کی وجہ سے نماز گھر ہی پر ادا کرتے تھے، مگر اس سفر میں صحت قدرے ٹھیک رہی، اس لئے فجر اور ظہر کے علاوہ تمام نماز میں مسجد جاتے۔ معمول یہ تھا کہ عصر کی اذان کے بعد لکھنے پڑھنے اور دوا وغیرہ تمام سامان لے کر مسجد جاتے، عصر کی نماز کے بعد معمول کا وظیفہ جس کا ذکر پیچھے ہوا ہے،

پڑھا جاتا، اس کے بعد چائے پی جاتی، حاضرین سے گفتگو کرتے، یا کوئی تعویذ وغیرہ کے لئے آتا تو اس کا کام کرتے۔ مغرب کی نماز کے بعد اپنے معمول کے وظائف پورے کر کے لکھنے بیٹھ جاتے، لکھنے سلسلہ کبھی عشاء کی اذان تک چلتا اور کبھی اذان سے دس پندرہ منٹ قبل ختم ہوتا۔ اگر اذان میں کچھ وقت ہوتا تو تھوڑی دیر آرام کرنے کے لئے لیٹ جاتے، عشاء کی نماز کے بعد تھوڑی دیر مسجد میں رہتے پھر گھر آجاتے، یہ معمول بلاتخلف ممبئی سے واپسی تک چلتا رہا۔

اس کے علاوہ وعظ وتقریر کا بھی سلسلہ جاری رہا، مولانا لیاقت صاحب کی مسجد میں ہر جمعہ کو پابندی سے جمعہ سے قبل آدھا گھنٹہ تقریر کرتے تھے۔ اس کے علاوہ موقع بموقع یا کسی خاص تقریب میں لوگوں کا اصرار ہوتا تو وعظ کہتے۔ دارالعلوم امدادیہ کے ایک مدرس جنھوں نے اپنے مدرسہ میں ایک اجلاس رکھا تھا ان کے اصرار پر اس جلسہ میں بھی شریک ہوئے اور تقریر کی، جب کہ جلسے جلوس میں شرکت خصوصاً رات کے جلسہ میں شریک ہونا والد صاحب کی طبیعت کے خلاف تھا۔ امارت شرعیہ کی جانب سے اسی دوران ممبئی میں دار القضا کا قیام عمل میں آیا، رات میں عمومی جلسہ تھا، اس میں تو نہیں شریک ہوئے مگر صبح میں خصوصی میٹنگ تھی جس میں صرف علما کرام اور ذمہ دار حضرات کا اجتماع تھا، اس میں شرکت کی۔ والد صاحب پہونچے تو لوگوں نے کچھ بولنے اور دعا کرانے کی فرمائش کی، پندرہ سے بیس منٹ اس چھوٹے اجتماع کو خطاب کیا اور دعا کرائی۔ الغرض اس بیماری کی حالت میں بھی وہ تمام کام انجام دیتے رہے جو صحت کی حالت میں کرتے تھے، بس فرق اتنا تھا کہ صحت کی حالت میں ان کاموں کے کرنے سے تھکتے نہیں تھے، مگر بیماری کی حالت میں تھک جاتے، بعد میں پریشان ہوتے، مگر کرتے ضرور تھے۔

ہم لوگ جہاں ٹھہرے ہوئے تھے وہاں سے تقریباً دو کلومیٹر کے فاصلہ پر دارالعلوم امدادیہ، مدرسہ ہے، جہاں قاری نسیم الحق صاحب پورہ معروفی اور قاری علاؤالدین صاحب پڑھاتے ہیں۔ یہ دونوں حضرات والد صاحب سے بہت زیادہ محبت اور تعلق خاطر رکھتے ہیں، اور والد صاب بھی ان دونوں حضرات سے بہت محبت کرتے تھے۔ ہفتہ میں ایک دو دن دارالعلوم امدادیہ بھی جاتے، عموماً صبح آٹھ بجے جاتے اور ظہر سے قبل واپس آتے۔ دارالعلوم امدادیہ ہی میں آسام کے ایک بزرگ مولانا احمد علی آسامی کے خلیفہ، قاری علاؤالدین صاحب، جب تشریف

لاتے تو ٹھہرتے تھے۔ اس دوران ان کی آمد ہوئی، والد صاحب ان سے ملنے کے لئے گئے، ان کی ذکر جہر کی مجلس بھی لگتی تھی اس میں بھی شریک ہوئے۔ چونکہ شیخ اردو سے نابلد تھے، اردو بولتے بھی تو وہ نئے سننے والے کے لئے ناقابل فہم ہوتی، اس لئے والد صاحب سے تو مختصر گفتگو ہوئی مگر چہرے بشرے معلوم ہو رہا تھا کہ والد صاحب سے مل کر بہت خوش ہیں۔ قاری نسیم الحق صاحب نے والد صاحب کی بیماری کا ذکر کیا تو افسوس کا اظہار کیا، تسلی دی، اور طلب صحت کے لئے ایک وظیفہ بھی بتلایا۔ جب والد صاحب وہاں سے رخصت ہوئے تو اپنے تأثرات کا اظہار قاری نسیم الحق صاحب سے ان الفاظ میں کیا ''مولانا بہت اچھے آدمی ہیں، ان کو ابھی ماٹی میں بہت دنوں تک رہنا ہے''۔ یعنی یہ ابھی بہت دنوں تک زندہ رہیں گے، مگر افسوس ان کا کہا ہوا بہت دن بعجلت تمام مکمل ہو گیا۔

ممبئی سے واپسی سے قبل شعبان کی ابتدائی تاریخوں میں والد صاحب نے حیدر آباد کا سفر کیا۔ یہ سفر تو اصلاً مولانا فاروق صاحب کی تعزیت کی غرض سے تھا مگر درمیان میں ایک اور تقریب دار العلوم حیدر آباد میں ختم بخاری کی نکل آئی، جس میں والد صاحب کے علاوہ حیدر آباد اور بیرون حیدر آباد کے متعدد علما شریک ہوئے تھے۔ دار العلوم حیدر آباد میں والد صاحب کا قیام دو رات رہا، اس کے بعد حیدر آباد شہر میں مولانا فاروق صاحب کے گھر ایک رات قیام کیا، پھر کشٹا پور مولانا فاروق صاحب کے آبائی وطن اور ان کے مدرسہ، مدرسہ فیض القرآن گئے، جو شہر حیدر آباد سے سو کلومیٹر کی مسافت پر واقع ہے۔

کشٹا پور غالب غیر مسلموں کی آبادی پر مشتمل ایک دیہات ہے، جس میں گنتی کے چند مسلمان ہیں۔ مولانا فاروق صاحب کے والد عمر صاحب نے مولانا عاقل حسامی صاحب کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا، اور انہوں نے ہی مدرسہ فیض القرآن کی بنیاد رکھی تھی۔ ان کی وفات کے بعد مولانا فاروق صاحب نے اس کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا اور اس کو ترقی کی راہ پر ڈالا، یہ ادارہ جس ماحول اور جس علاقہ میں ہے اس کی ترقی تو دور اس کی بقا بھی معرض خطر میں ہونی چاہئے، مگر بانی مدرسہ کا خلوص اور مولانا کی مخلصانہ جدوجہد کی برکت ہے کہ کفر وشرک سے گھرے ہوئے ماحول میں ایمانی شمع فروزاں ہوئی اور اس کی لو روز بروز تیز سے تیز تر ہوتی رہی، علما اور حفاظ کا انبوہ یہاں

سے تیار ہو کر آس پاس کے دیہاتوں میں دینی خدمات انجام دینے کے لئے پھیلا ہوا ہے۔

والدصاحب کا مولانا فاروق صاحب سے تعلق بہت پرانا تھا، اس سے پہلے بھی مولانا کی دعوت پر والدصاحب کا متعدد بار کشٹا پور کا سفر ہو چکا تھا۔ حیدرآباد جب بھی والدصاحب کا سفر ہوا میزبانی کا فریضہ مولانا نے ہی انجام دیا، مولانا والدصاحب سے بہت محبت رکھتے تھے اور والدصاحب بھی مولانا سے دلی تعلق رکھتے تھے۔ اس سفر سے پہلے شوال ۱۴۳۴ھ میں جب حیدرآباد گئے تھے تو اس وقت مولانا اسپتال میں تھے۔ مولانا کو شوگر کی بیماری تھی، جو ہمیشہ نقطہ اعتدال سے دوگنی رہتی تھی، جب تک اعضاء میں قوت مدافعت رہی اس کا دفاع کرتے رہے، مگر کب تب؟ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے بہت سے اندرونی اعضا ناکارہ ہو گئے، گردہ نے اس حد تک کام کرنا چھوڑ دیا کہ ڈائیلیسیس سے بھی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا، پورے جسم پر ورم آ گیا، اور یہی بیماری مولانا کی مرض الوفات بنی۔

والدصاحب کا قیام مولانا کے مدرسہ میں چار دن رہا، اس مدت میں وعظ وتقریر اور لوگوں سے ملاقات کا سلسلہ جاری رہا، پھر وہاں سے واپس ممبئی آئے۔ شعبان کا پہلا عشرہ ختم ہو چکا تھا، سامنے رمضان المبارک کا مہینہ تھا، والدصاحب رمضان میں ممبئی کی بجائے گھر رہنا چاہتے تھے جو سالہا سال کا معمول تھا۔ سب سے اہم مسئلہ روزوں کا تھا کہ ڈاکٹر روزوں کی اجازت دے گا یا نہیں؟ کیونکہ ڈائیلیسیس کے مریضوں کو عموماً ڈاکٹر روزہ رکھنے سے منع کرتے ہیں۔ واپسی اور روزوں کے سلسلہ میں ڈاکٹر سے بات ہوئی تو اس نے وقت پر ڈائیلیسیس کی تاکید کے ساتھ واپسی کی اجازت دیدی، اور روزہ کے بارے میں کہا کہ ڈائیلیسیس کے علاوہ دنوں میں اگر آپ کی طبیعت روزہ کی متحمل ہو سکتی ہے تو بے تکلف روزہ رکھئے گا۔

حیدرآباد سے واپسی کے بعد چار پانچ دن ممبئی میں قیام کر کے گھر کا ارادہ بنا، پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق سیدھے گھر آنے کی بجائے دیوبند گئے۔ دیوبند کا یہ سفر والدصاحب کے پرانے شاگرد مولانا عبداللہ ابن القمر صاحب کی دعوت پر ہوا تھا، جو بہت دنوں سے دیوبند آنے کی دعوت دے رہے تھے مگر بیماری اور دوسرے عوارض کی وجہ سے ٹلتا رہا، دیوبند ایک دن دو رات قیام رہا، پھر وہاں سے دہلی گئے، دہلی ایک دن ٹھہر کر گھر واپس آئے۔

والدصاحب مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور سے اپنا تعلق ختم کرنے کا حتمی فیصلہ کر چکے تھے، اس لئے شیخوپور جانے کی بجائے بھیرہ اترے۔ چھپرہ کا مکان چونکہ ابھی زیر تعمیر تھا اس لئے شعبان کے بقیہ ایام بھیرہ ہی میں گزارے، ڈائلیسیس کے لئے مئوشہر کے اسی اسپتال میں جاتے تھے جس میں اس سے پہلے والے سفر میں چار پانچ مرتبہ ڈائلیسیس کرائی تھی۔ شعبان کی تیس تاریخ کو بھیرہ سے چھپرہ کے نئے مکان میں جواب قابل رہائش ہو چکا تھا منتقل ہو گئے، اور رمضان کا پورا مہینہ چھپرا میں گزارا۔

چھپرا اعظم گڑھ اور غازی پور کے درمیان ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، اس کے اطراف میں چھوٹے بڑے دیہاتوں کا ایک سلسلہ ہے، اس پورے علاقے میں غالب اکثریت غیر مسلموں کی ہے، جس کے مضر اثرات مسلم معاشرہ پر طرز معاشرت سے لے کر شکل وشباہت سب پر پڑے ہیں۔ دین اور علم دین سے اس علاقہ کے مسلمانوں کی اکثریت نابلد ہے، غیر مسلموں کی اکثریت اور مسلمانوں کے ساتھ اختلاط نے عقائد اور دیگر بنیادی چیزوں پر بھی گہرا اثر ڈالا ہے، اس علاقہ میں کوئی قابل ذکر ادارہ نہیں ہے جو ان کی ضرورتوں کو سمجھ کر ان کو دینی تعلیم اور بنیادی چیزوں سے روشناش کرائے۔ ۲۰۰۰ میں چھپرا میں ایک چھوٹے سے ادارہ کی بنیاد والدصاحب کی سرپرستی میں رکھی گئی، جس کا بنیادی مقصد پاس پڑوس کے دیہی علاقوں سے مسلمان بچوں کو لاکر ان کو مکتب کی تعلیم دینا اور ان کی ذہن سازی کرنا ہے، جس پر یہ مدرسہ ایک لمبی مدت سے کاربند تھا، اور بہت حد تک کامیاب بھی تھا۔ والدصاحب نے جب اس مدرسہ میں مستقل قیام کا ارادہ کیا تو اس کی محدود اور مختصر عمارت میں عربی درجات کا قیام عمل میں آیا، گویا یہ ایک طرح سے اس مدرسہ کی نشأۃ ثانیہ تھی۔ عمارت کی کمی کی وجہ سے صرف دو جماعت عربی ششم اور ہفتم کی رکھی گئی، ارادہ تھا کہ جیسے جیسے عمارت تیار ہوگی عربی کے دیگر درجات کا قیام عمل میں آتا رہے گا۔

چھپرا میں قیام کے اول دن سے والدصاحب نے درس وتدریس کا کام شروع کر دیا تھا، رمضان المبارک میں پنجم کے طلبہ جو مدرسہ شیخ الاسلام میں زیر تعلیم تھے ان کی اکثریت چھپرا میں دارالعلوم کی تیاری کے لئے آ گئی، ان کے قیام، طعام کا نظم والدصاحب نے مدرسہ ہی میں کیا، اور پورے مہینے ان کو تیاری کرائی۔ اس کے علاوہ باہر سے آنے والے دیگر مہمان جو رمضان کا مہینہ

والدصاحب کے پاس گزارتے تھے وہ بھی چھپرا آگئے۔ پورا مہینہ معمول کے مطابق گزرا، بیماری اور کمزوری کے باوجود تراویح کی نماز مسجد میں پڑھتے اور کھڑے ہوکر پڑھتے۔ سابقہ معمول کے مطابق تراویح کے بعد ذکر بالجہر کی مجلس بھی لگتی، میر مجلس خود والد صاحب ہوتے، اس کے بعد تھوڑی دیر وعظ بھی کہتے۔ غرض تمام معمول اس بیماری میں بھی پورا کرنے کی اللہ نے عزیمت اور توفیق عطا فرمائی، بس صرف ڈائلیسیس کے دن روزہ میں تخلف ہوجاتا، کیونکہ ڈائلیسیس کے بعد کمزوری اور بھوک کا شدید احساس ہوتا ہے جو ناقابل برداشت ہوتا ہے اور ڈائلیسیس ہی کی وجہ سے اعتکاف سے بھی معذور رہے۔

رمضان المبارک کی برکت اور خدا کی خاص رحمت والدصاحب کے حال پر واضح طور سے نظر آرہی تھی، ورنہ ڈائلیسیس کا مریض اور روزہ؟ بعید از تصور بات سمجھی جاتی ہے۔ ممبئ میں مَیں نے بہت سے ڈائلیسیس کے مریضوں کو دیکھا اور ان کے بارے میں معلوم کیا، بلا استثنا سارے لوگ فدیہ دینے والے ملے، استثنائی ذات صرف والدصاحب کی ملی۔ یہ انہیں کی عزیمت وہمت تھی کہ نہ صرف روزوں کا تحمل کیا بلکہ دن میں دو گھنٹے طلبہ کو بھی پڑھاتے، تلاوت اور دیگر وظائف بھی پورے کرتے، اور رات میں جماعت کے ساتھ تراویح کی نماز بھی ادا کرتے۔

رمضان کے بعد طے شدہ پروگرام کے مطابق مجھے دہلی جانا تھا، نصف شوال کے قریب میں دہلی کے لئے روانہ ہوگیا۔ اخیر شوال میں دو ہفتے کے لئے والدصاحب ممبئ گئے، ممبئ کے قیام میں مستقل طبیعت میں اتار چڑھاؤ رہا، دو تین دن ہاسپٹل میں بھی رہے۔ ممبئ کے لوگوں نے مزید قیام پر اصرار کیا مگر مدرسہ کی ذمہ داریوں کے پیش نظر ٹھہرنا منظور نہیں کیا، اور ذیقعدہ کی ابتدائی تاریخ میں واپس آگئے۔

گھر آنے کے بعد طبیعت بہتر رہنے لگی، مگر طبیعت کی یہ بہتری شمع کی آخری لو تھی۔

میں دہلی میں تھا، بقرعید میں گھر آنے کا ارادہ تھا، ٹکٹ وغیرہ بن گیا تھا، گاہے گاہے والدصاحب سے فون پر بات بھی ہوتی رہتی تھی، راشد بھائی سے تو تقریباً روزانہ ہی والدصاحب کی طبیعت کے بارے معلوم کرلیا کرتا تھا۔ ۲۲/ ذیقعدہ کی شام میں بھی راشد بھائی کے پاس فون کیا تھا، طبیعت کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے اطمینان کا اظہار کیا، دل مطمئن تھا، کسی طرح کا

اندیشہ ووسوسہ بھی مرگ ناگہانی کے سلسلہ میں نہیں تھا۔ میں اپنی پڑھائی میں مشغول تھا، رات کے گیارہ بجے فون کی گھنٹی بجی، دیکھا تو مولانا ابرالحق صاحب تھے، اتنی رات گئے ان کا فون؟ دل نے سرگوشی کی کہ ضرور کسی ناگہانی حادثہ کی اطلاع ہوگی، میرا ذہن نانی کی طرف گیا، جن پر ان دنوں فالج کا حملہ ہوا تھا، انہیں کو سوچ کر میں نے فون بھی اٹھایا تھا کہ انہیں کے بارے میں اطلاع دیں گے، سلام کے بعد انہوں نے کہا: ”ابا اب اس دنیا میں نہیں رہے۔“

دل تھرا گیا، خون شریانوں میں منجمد ہوتا سا محسوس ہوا، قوت گویائی سلب ہوگئی، ہوش و حواس معطل ہوگئے، تھوڑی دیر کے لئے خود میرا بھی وجود اس دنیا سے منقطع ہوگیا۔ جب کچھ حواس بحال ہوئے تو بجلی سی سرعت سے ذہن میں خیال آیا کہ جب وہ نہیں تو میں رہ کر کیا کروں گا؟ مگر عملی اقدام سے پہلے اسی نیم حواسی کے عالم میں ان کا سراپا ابھرا اور ذہنی رو کو دوسری طرف موڑ گیا۔

گیارہ بجے رات میں مجھے اطلاع ملی، صبح پانچ بجے نکلنا تھا، چھ گھنٹے کی رات برسوں میں بدل گئی، مگر تھی رات ہی، قانون الٰہی کے مطابق اس کی بھی ایک سحر تھی، لیکن یہ رات عام راتوں سے ہٹ کر تھی، بڑی دردناک تھی، بہت کرب تھا اس رات کے دامن میں، وحشت ہی وحشت تھی، ویرانی ہی ویرانی تھی، دل کی دنیا اجڑ گئی تھی، دماغ کی چولیں ہل گئی تھیں، چین وقرار چھن گیا تھا، ایک بےقراری سی بےقراری تھی، دنیا اپنی تمام تر دل فریبیوں اور حسن وآرائش کے باوجود بےنور ہوگئی تھی، کیا کیفیت تھی؟ کیا حالت تھی؟ کیا گزر رہی تھی؟ اور میں کیا سوچ رہا تھا؟ بیان کرنے کے لئے نہ میرے پاس الفاظ ہیں اور نہ ہی مجال بیان ہے۔ بس کرب ہی کرب تھا، درد ہی درد تھا، شدت غم سے آنسو خشک ہوگئے تھے، رونے کی تمام کوشش بیکار ہوچکی تھی، جسم کا سارا پانی خشک ہوگیا تھا، بس شریانوں میں خون کی نمی تھی، اگر آنکھ سے کچھ نچڑتا تو وہ لہو ہوتا، مگر کرب کی شدت نے اس پر بھی بند باندھ دیا تھا۔ ہوش وحواس یکسر معطل ہوگئے تھے، اگر کچھ یاد تھا تو بس اتنا کہ مرکز محبت نہیں رہا، ملجا وماوا چھن گیا، وہ ذات جس کی ایک نگاہ محبت، جس کا ایک مرتبہ بیٹا کہہ دینا سارے ہموم وغموم کو کافور کردیتا تھا، اب نہ وہ نگاہ محبت رہی اور نہ بیٹا کہنے کی صدا رہی۔ غم کی آندھی میں سائبان، اور مصائب کی دھوپ میں سایہ جو ذات فراہم کرتی تھی اس نے اپنے مالک کے حکم سے ہمارے سروں سے سائبان اور سایہ اٹھالیا، یقین ہے کہ اس کی دعاؤں اور توجہات کا سایہ

ہمارے سروں پر ہے، مگر کیا کریں انسان ہیں، اسباب کے مارے اور قلب ونظر کے پیاسے ہیں، سالہا سال سے دل اس کی محبت اور نگاہیں اس کے دیدار کی عادی ہیں، جب چاہا اس بحر محبت سے محبت حاصل کرلی، جب چاہا اس کے دیدار سے تسکین قلب کا سامان کرلیا، اب کہاں جائیں گے؟ دل کی پیاس کہاں بجھائیں گے؟ اتنی محبت اب کون دے گا؟ کون ہے جو ہمارے درد وغم کا مداوا کرے گا؟ ہمارے لئے خوشیوں کا سامان فراہم کرے گا؟ کون ہماری پریشانی سے پریشان ہوگا؟ اب کون کہے گا کہ بیٹے! تمہارا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر مجھے پریشانی ہونے لگتی ہے، جو پریشانی ہو مجھ سے کہو، میں تدبیر کروں گا، دعا کروں گا، مگر خدارا چہرے پر کرب کے آثار کے ساتھ میرے سامنے مت آؤ، میرا دل بے چین ہوجاتا ہے، تم سے زیادہ مجھے تکلیف محسوس ہونے لگتی ہے۔

وہ انسان تھے، تمام انسانی خصوصیات ان میں تھی، مگر محبت کے معاملہ میں عام انسانوں سے ہٹ کر تھے، وہ سرتاپا محبت ہی محبت تھے۔ خدا کے پاس سے وہ اتھاہ محبت لے کر آئے تھے، وہ دل دردمند کے مالک تھے۔ محبت سمیٹنا اور محبت لٹانا ان کا کام تھا۔ زندگی بھر انہوں نے محبت بانٹی اور بلاتفریق بانٹی۔ ان کے دل میں سب کے لئے جگہ تھی، انہوں نے اپنے دل سے کسی کو نہیں نکالا، کسی کو اپنی محبت سے محروم نہیں رکھا، جن لوگوں نے ان کی محبت کی قدر نہیں کی ان کو بھی اپنے دل سے نہیں نکالا، وہ خود ہی نکل بھاگے ہیں۔ جانے والوں کو انہوں نے پکڑ کر باندھنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کی محبت غیور تھی اور بردبار بھی، اخیر تک ناقدری سہتی تھی مگر ناقدرے کو محروم نہیں کرتی تھی، اگر خود ہی ان کی محبت کا دروازہ کوئی اپنے اوپر بند کرلے تو وہ پرواہ بھی نہیں کرتی تھی۔ ایسی تھی ان کی محبت، اور ہم لوگ انہیں کی محبت کے خوگر ہیں، انہیں کی محبت کے قتیل ہیں۔

وہ رات زندگی کی بھیانک ترین رات تھی، طویل بہت طویل، کاٹے نہیں کٹ رہی تھی، نیند آنکھوں سے دور بہت دور تھی۔ اس رات میں سونا نہیں چاہتا تھا، نہ مجھے سونے کی ضرورت تھی، میں رونا چاہتا تھا، مجھے ایک کاندھے کی ضرورت تھی، جس پر میں سر رکھ سکوں، جو میرے آنسوؤں کو جذب کرسکے، مگر ہائے دیار غیر کی مجبوری، وائے لاچاری، نہ آنسو نکلا، نہ کاندھا ملا۔ پوری رات خشک آنکھوں کے ساتھ ٹکٹکی باندھے صبح کے انتظار میں دل میں رنج والم کی طغیانی لئے پڑا رہا۔ دل و دماغ شل تھا، اعضاء بوجھل تھے، رگوں میں لہو کے بجائے غموں کی روانی تھی، بار بار اٹھتا، بیٹھتا،

ٹہلتا، سوتا، مگر کسی کل چین نہیں تھا، کسی پہلو سکون نہ تھا۔ چین ہوتا بھی تو کیسے؟ سکون آتا بھی تو کہاں سے آتا؟ کیسے آتا؟ سکون وچین کا جتن کرنے والا تو ہمیشہ کے لئے کاروبار دنیا سے، اس کی مضطرب اور بے چین فضاؤں سے بے نیاز ہوکر چین کی نیند سو گیا۔ اس ہنگامہ خیز دنیا میں کون ہماری دیکھ ریکھ کرے گا؟ کس کے پاس جائیں گے؟ کس کو دکھڑا سنائیں گے؟ اب کون ہمارے اقلیم دل پر سلطانی کرے گا؟ اس ملک کا سلطان تو چلا گیا۔ یہ ملک اجڑ گیا، لٹ گیا، ویران ہوگیا۔ اب کس کے سامنے اپنی محبتوں کی سوغات پیش کریں گے، اور جواب میں دوگنی محبت حاصل کریں گے۔

وہ بادشاہ تھے، محبت کے بادشاہ، ان کے یہاں خلعت وتوشہ انعام میں نہیں ملتا تھا، محبت ملتی تھی، اتھاہ محبت، بیکراں محبت، ان کی حکومت مٹی پر نہیں تھی، بلکہ مٹی کے بنے انسانوں پر تھی۔ انسانوں کا جم غفیر ان کی محبت میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ انسان تھے مگر عام انسانوں سے الگ تھے، وہ انسانیت نواز تھے، ساتھ ہی انسانیت ساز بھی۔ ان کا مردم گری کا کاروبار اخیر سانس تک چلتا رہا۔ ان کو مردم گری کے تمام ہنر آتے تھے، انہوں نے مردم گری کی تحریر سے، تقریر سے، تدریس سے، تصوف وسلوک سے، اور دعا وتعویذ سے۔ جو جس راستے سے آیا اسے قبول کیا، بنایا، سنوارا، سجایا، چمکایا، اور نمونے کا انسان بنادیا۔ وہ کمزوروں اور نچلے طبقے کے لوگوں کو جن کے بارے میں عام تصور گھٹیا ہونے کا ہے، دیکھ کر منہ نہیں پھیرتے تھے، بلکہ خندہ پیشانی سے استقبال کرتے تھے۔ ان کو گلے سے لگاتے، اپنے پاس بٹھاتے، اپنا مہمان بناتے، ان سے باتیں کرتے، ان کی دلجوئی کرتے، اور دلبستگی کا سامان کرتے۔ بسا اوقات غریبوں اور ناداروں کے استقبال میں وہ تپاک اور مسرت دیکھی گئی جو اونچے طبقہ یعنی ہائی سوسائٹی کے لوگوں کے استقبال میں نہیں ہوتی۔

ان کا مزاج، ان کی فکر، ان کی جولانگاہ، ان کے ہم مشربوں سے الگ تھی، وہ علم کے پہاڑ تھے، متقیوں کے سرخیل تھے، بحر معرفت کے شناور تھے، محبت الٰہی سے سرشار تھے۔ ان کی زندگی اسی دشت کی آبلہ پائی میں گزری تھی۔ وہ اہل علم، اور اہل تقوی سے محبت کرتے تھے، ان کو اس طبقہ کی تلاش رہتی تھی، ہر جگہ ان کی جستجو کرتے۔ ان کے حج کی خاص دعا تھی ’’اے اللہ! اپنی اس

مقدس سرزمین پر اپنے کسی برگزیدہ بندے سے ملاقات کرا دے۔‘‘

ان کا دل بہت بڑا تھا، ان کا ظرف بہت وسیع تھا، ان کی محبت سارے شناشاؤں کو محیط تھی، ہر کہ ومہ ان کے دل میں بار پاتا تھا، ان کی محبت کے گھائل انتہائی زیرک انسان بھی تھے اور پرلے درجہ کے کودن بھی تھے۔ ان کے یہاں آنے والوں میں سے بعض ایسے بھی تھے جن کو عام لوگ منھ لگانا بھی پسند نہ کریں، مگر وہ آتے، ان کے مہمان بنتے، ان کے پاس رہتے۔ وہ ان کے ساتھ خاص سلوک کرتے، ان کی زیبا ونازیبا باتوں اور حرکتوں کو بغیر کسی ناگواری کے برداشت کرتے۔ ان کے پاس ایسے بھی لوگ آتے جو آداب مجلس تو کجا؟ ہر طرح کے آداب سے یکسر عاری ہوتے، دوسرے لوگوں کو ان سے الجھن ہونے لگتی، مگر ان کے چہرے پر کبھی تغیر نہیں آتا، ان کی خلاف آداب باتوں پر یا حرکتوں پر تنہائی میں تنبیہ کرتے، ان کو سمجھاتے، بجھاتے، بتاتے، سکھلاتے، مگر ناگواری کا اظہار نہیں کرتے، اور نہ ہی کوئی ایسی بات کہتے جو ان کی دل شکنی کا باعث ہو۔

ایسا تھا ہمارا مرکز محبت، ایسا تھا ہمارے دلوں کا سلطان۔ وہ ہم سے جدا ہو گیا، ہم سے دور چلا گیا، وہاں چلا گیا جہاں سے واپسی ممکن نہیں، ہم کو قلق کیوں نہ ہو؟ ہمارے دلوں میں اضطراب کی لہریں کیوں نہ اٹھیں؟ ہم پر رنج والم کیوں نہ طاری ہو؟ ہم سوگوار کیوں نہ ہوں؟ ہم انسان ہیں اور یہ چیزیں انسانی فطرت میں داخل ہیں۔ رنج ہوا، اور بہت ہوا، اتنا ہوا کہ گذشتہ اور آئندہ امکانی غم سب پر بھاری پڑ گیا، سب سے بڑھ گیا۔ ان کی موت نے خود ہم کو زندگی سے ایک طرح سے بیزار کر دیا، زیست کے چہرے پر غم وحزن کا غازہ مل دیا، چہرہ کو بے نور اور دل کو بے کل کر دیا۔ مہینوں گزر گیا مگر ابھی تک ہم ان کے غم سے نہیں نکل سکے، سنبھل تو گئے ہیں مگر یہ سنبھلنا ایسا ہی ہے کہ ہر دو چار قدم کے بعد لڑکھڑا جاتے ہیں۔ وقت کے بارے میں سنا تھا کہ وہ ہر زخم کو مندمل کر دیتا ہے، مگر یہ ضرب قلب وجگر پر ایسا کاری ضرب ہے کہ جس پر وقت کے مرہم نے اثر تو کیا مگر اس سست روی کے ساتھ کہ محض ایک ٹیس ہی اس کے اندمال کو مٹا دینے اور زخم کو ہرا کر دینے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ انتظار ہے کہ دیکھئے کب وقت ہمارے زخموں کو بھر کر اس کرب سے رہائی دلائے، مگر رکئے! رہائی، کیسی رہائی؟ کیسی زخم پری؟ ہم خود اس کرب سے آزادی نہیں چاہتے۔ وہ

نہیں تو ان کی یادوں کی ٹیس ہی سہی، ان کی موت کی کلفت ہی سہی، ہم اسی کے ساتھ گزربسر کریں گے، ہم اسی بہانے انہیں یاد کرتے رہیں گے۔ ان کو اپنے قلب میں زندہ رکھیں گے، ان کی حرکات وسکنات کا تصور کرکے، ان کی گفتار وکردار کو یاد کرکے اپنی شام وسحر منور کرتے رہیں گے۔ ہماری دعا ہی یہی ہے کہ ’’اے خدا! یہ غم جو تونے بخش دیا اس کی آزادی سے دوبارہ ہمیں رنجورمت کرنا۔‘‘

میں دہلی سے گھر آیا، غسل وغیرہ دیا جاچکا تھا، سفید کپڑا پہنا کر باہر برآمدے میں چوکی پر لٹایا گیا تھا، ہزاروں کا مجمع تھا، لوگ قطار لگائے آخری دیدار کررہے تھے۔ میرے سارے بھائی چوکی کے اردگرد بیٹھے تھے، ماحول پر مکمل سوگواری چھائی ہوئی تھی، لوگ تڑپ رہے تھے، بلک رہے تھے۔ میں دل کو کڑا کرتے ہوئے پہونچا، ضبط کی کوشش کررہا تھا، مگر آہ! چہرے پر نگاہ پڑتے ہی سارا ضبط پادرہوا ہوگیا، دل پھٹ گیا، جگر شق ہوگیا، کلیجہ چھلنی ہوگیا، ایسا محسوس ہوا جیسے پوری کائنات موت کی آغوش میں چلی گئی ہو۔ ہرطرف مردنی سی چھائی ہوئی تھی، میں بے اختیار ان کی طرف بڑھا، جی چاہ رہا تھا کہ میں بھی سر پٹک کران کے ہم آغوش ہوجاؤں، ان تک پہونچنے سے پہلے ہی بھائی نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا، میں نے اپنے سر کو ان کے کاندھے پر رکھا اور غموں کو آنسوؤں سے دھلنے کی ناکام کوشش کی۔

میں ان کے سرہانے بیٹھا تھا، سفر سے آیا تھا، تھکا تھا، پریشان تھا، مگر آہ! سفر کی پریشانیوں کو پوچھنے والا ہمیشہ کے لئے خاموش ہوچکا تھا۔ اس سے پہلے میں جب بھی سفر سے آیا انہوں نے مسکرا کر استقبال کیا، کئی مرتبہ تو اٹھ کر کھڑے ہوگئے اور پھر مصافحہ کیا۔ معمول تھا کہ آنے کے بعد کم ازکم آدھ گھنٹہ بات کرتے، پوچھتے کہ کیسے رہے؟ کیا پڑھا؟ کیا تأثر قائم ہوا؟ سفر میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟ دوران سفر بھی فون کرکے پوچھتے رہتے کہ کیسے ہو؟ کہاں پہونچے؟ مگر آہ! یہ سفر؟ دلی سے گھر کا سفر، کس کس مپرسی کے عالم میں ہوا کچھ مت پوچھئے، نہ کوئی فون کرنے والا، نہ کوئی خیریت پوچھنے والا، ایک آدمی کیا چلا گیا کہ پوری دنیا اداس ہوگئی، پورا چمن ویران ہوگیا۔ پہونچنے کے بعد نہ کوئی مسکرانے والا، نہ کوئی خبر لینے والا، پہلے آتا تھا تو طبیعت بے چین ہوتی تھی ان سے ملنے کو، سیدھا انہیں کے پاس جاتا تھا، مگر اب نہ وہ بے چینی رہی، اور نہ وہ تقاضا رہا، کس کے پاس جائیں؟ کہاں بیٹھیں؟ وہ نہیں تو کچھ نہیں۔

میں ان کے پاس بیٹھا تھا اور دماغ کی اسکرین پر ایک ایک کر کے سارے منظر ابھر رہے تھے۔ میں کمرے میں پہونچتا، سلام کرتا تو کس اپنائیت کے ساتھ جواب دیتے، آنکھوں کو خاص انداز میں حرکت دیتے، خفیف سا مسکراتے، دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرتے، اور ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیتے، دیر تک ہاتھ پکڑے رہتے، کبھی محبت سے کان کھینچتے، اور چپت بھی رسید کرتے، الگ الگ انداز سے محبت کا اظہار کرتے، دیر تک بات کرتے، کچھ اپنی کہتے، کچھ میری سنتے۔ ان کی کم زیادہ میری ہی رہتی تھی، پھر بہت یگانگت سے کہتے کہ گھر جاؤ اپنی اماں سے مل لو۔ مگر اس مرتبہ کچھ نہیں ہوا، حالانکہ میں اس مرتبہ بھی سفر ہی سے آیا تھا، ان کے پاس گیا، سلام کیا، ان کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا، مگر انہوں نے آنکھ کھول کر مجھے دیکھا تک نہیں، ان کے پاس بیٹھا، دیر تک بیٹھا، مگر انہوں نے مجھ سے بات نہیں کی۔ میں اداس تھا، میں تکلیف میں تھا، مگر انہوں نے پوچھا تک نہیں کہ بیٹے! کیا ہوا ہے؟ اتنے غمگین کیوں ہو؟ ہائے مجبوری! ہائے لاچاری! کبھی میرے تصور میں بھی نہیں تھا کہ مجھ پر غموں کا کوہ گراں گر پڑے گا اور وہ آنکھ کھول کر دیکھیں گے بھی نہیں، مگر یہ قدرت کا فیصلہ ہے، تقدیر کا لکھا ہے، یہ ہونا تھا، اور ہو کر رہا۔ قدرت باپ بیٹے کی محبت کی پابند نہیں ہے کہ باپ کے جانے کے بعد بیٹے کو کون پوچھے گا؟ اس سے کون محبت کرے گا؟ قدرت کا فیصلہ ہوا، وقت معین آ گیا، چلے گئے، مگر یہ بھی قدرت ہی کا عطیہ اور فیصلہ تھا کہ اتنے بڑے صدمہ سے نبرد آزما ہونے کی قوت و طاقت عطا فرمائی، صبر کرنے کا حوصلہ بخشا، ورنہ صدمہ جتنا بڑا تھا اس پر صبر کر لینا بظاہر ممکن نہیں تھا، خصوصاً مجھ جیسا جلد باز، نہ جانے کن واہی تباہی میں مبتلا ہو جاتا، مگر خدا کا شکر ہے کہ اس نے صبر دیا، اور صرف صبر ہی نہیں بلکہ اپنی تقدیر پر راضی رہنے اور شکر ادا کرنے کی توفیق دی۔ اس صبر آزما مرحلہ میں خدا کا یہ خاص عطیہ ہم لوگوں پر تھا، اس پر جتنا شکر ادا کیا جائے کم ہے۔

تین بجے جنازہ کی نماز تھی، چوکی سے اٹھا کر مرن سیج پر لٹا دیا گیا، لوگ کاندھا دینے کے لئے ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ اسی بھیڑ میں، میں بھی تھا، مگر میں تنہا تھا۔ میرے گرد انسانوں کے ہجوم کی بجائے غموں کا ہجوم تھا۔ لوگ ان کے جسم کا بوجھ اپنے کاندھے پر اٹھانے کے لئے بیتاب تھے، میں ان کے غموں کے بوجھ کو سہارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جنازہ کب ہاتھوں ہاتھ جنازہ گاہ میں پہونچ

گیا، مجھے پتہ بھی نہیں چلا، سامنے وہ لیٹے ہوئے تھے، میں کچھ دور ہٹ کر کھڑا تھا، لوگ صف لگائے تکبیر کے انتظار میں تھے۔ کتنی بے بسی تھی، کتنی لاچاری تھی، جس کی اقتدا میں زندگی بھر نماز ادا کی تھی آج اسی پر نماز پڑھنے کے لئے کھڑا تھا۔ دل کی حالت تیزی سے بدل رہی تھی، دل بے قابو ہوا جارہا تھا۔ ابھی نماز ہوگی اور مٹی کے سپرد کردیا جائے گا۔ دنیا کی ریت یہی ہے، قانون الٰہی یہی ہے، آدمی مٹی سے اٹھتا ہے اور مٹی میں سما جاتا ہے، تنہا آتا ہے اور تنہا چلا جاتا ہے۔ دنیا میں ہزاروں نسبتیں اس کے ساتھ لگی رہتی ہیں، فلاں کا باپ ہے، فلاں کا بیٹا ہے، فلاں کا شوہر ہے، مگر اخیر میں وہی نسبت غالب آجاتی ہے جو اصل الاصول ہے، خدا کا بندہ ہے خدا کے پاس چلا گیا۔ اولاد جو زندگی میں ٹوٹ کر محبت کرتی ہے، جو زندگی کے دکھ سکھ کا بظاہر سہارا ہوتی، دیکھتی رہ جاتی ہے، بے بس، مجبور، کچھ نہیں کرسکتی، بس خدا کے دروازہ تک پہونچا کر واپس آجاتی ہے۔ اولادیں یہ بھی تو نہیں کرسکتیں کہ ایک دو ان کے ساتھ قبر میں چلی جائیں، کیونکہ دنیا میں آنے کی وجہ سے خود ان کے ساتھ بھی ہزاروں نسبتیں جڑ چکی ہیں، محض ایک نسبت کے لئے ہزاروں نسبتوں کو ٹھکرا دینا عقلمندی نہیں ہے۔

محض ایک جنازے میں آدمی کے لئے ہزاروں عبرتیں اور نصیحتیں ہیں، خصوصاً جب کہ وہ کسی قریبی عزیز کا جنازہ ہو۔ آدمی زندگی بھر جس کی محبت اور وفاداری کا دم بھرتا ہے جب اس کو ابدی تنہائی پیش آتی ہے تو بے وفائی کردیتا ہے، صرف بے وفائی کر کے ساتھ نہیں چھوڑتا بلکہ اپنے ہاتھوں سے قبر کے گڑھے میں رکھ کر اوپر سے منوں مٹی ڈال دیتا ہے۔ رسم یہی ہے کہ میت کا سب سے قریبی سب سے پہلے مٹی ڈالتا ہے۔ خود اس رسم میں عبرت پنہاں ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ محبت کرنے والا وفادار جو تھا، جس کی نسبت سب سے مستحکم اور مضبوط مانی جاتی تھی وہی سب سے بڑا بے وفا ہے، وہی سب سے پہلے مٹی ڈال کر منھ پھیرتا ہے۔ وہ نسبت جو اصل ہے جس کو ہزاروں عارضی نسبتوں کی وجہ سے آدمی بھلا بیٹھتا ہے، جس نسبت کا لحاظ عموماً آدمی زندگی میں نہیں رکھتا، وہ محض قبر تک ساتھ نہیں دیتی بلکہ قبر کے اندر بھی وہی کام آتی ہے۔ سچ ہے، انسان دوسروں کا کم، اللہ کا زیادہ ہوتا ہے، اسی لئے دنیا و آخرت کے میزان پر وہ بھاری پلڑے کی طرف جھک جاتا ہے، اور لوگ بے بسی کے ساتھ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

جنازہ کی نماز ادا کی گئی، نماز بڑے بھائی مولانا عابد صاحب نے پڑھائی، اس کے بعد ہم بھائیوں نے مل کر ان کو قبر میں اتارا، کتنا عبرت ناک منظر تھا وہ! جب ہم ان کو قبر میں اتار رہے تھے۔ جن ہاتھوں نے قصداً کبھی ایسی حرکت نہیں کی جو ان کی تکلیف کا باعث ہو، جو ہاتھ ہمیشہ ان کی راحت وآرام کا سامان فراہم کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے، آج انہیں ہاتھوں سے زمین پر بغیر گدے، بغیر تکیہ کے محض سر کے نیچے ایک ٹھیکرا لگا کر لٹا رہے تھے۔ ہم سے اتنا بھی نہیں ہو سکا کہ آخری وقت میں ان کے آرام کا کچھ خیال کر لیتے۔ انہوں نے زندگی بھر ہمارے آرام کا خیال کیا، مگر ہم نے آخری وقت ان کو کچھ نہیں دیا، کیونکہ ہماری نسبت فانی تھی، وہ فنا کے حدود سے نکل کر بقا کی منزل میں پہونچ چکے تھے، جس منزل کی تیاری میں انہوں نے زندگی گزاری تھی، جس کے حصول کے لئے انہوں نے جدوجہد کی تھی، پریشانیاں جھیلی تھیں، مجاہدے کئے تھے۔

❑❑❑

> ''انسان اصل کے اعتبار سے کیا ہے؟ عدم محض اور لاشیٔ فقط، اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نورِ وجود سے منور فرمایا، موجود ہو گیا، بقا صرف اللہ کی ذات وصفات کو ہے، انسان کی نہ ذات باقی، نہ صفات باقی، نہ احوال باقی، سب متغیر، سب فانی، ہر روز ایک نیا حال، ہر دن ایک نیا مقام، دل کبھی اِدھر کبھی اُدھر، ہاں اگر کوئی اپنی صفات کو، اپنی ذات کو، اپنے ارادوں اور خواہشات کو بارگاہِ عالی میں قربان کر دے، ان کی مرضیات کا تابع ہو جائے، اپنی آرزوؤں میں گرفتار نہ رہے تمناؤں کی قید سے آزاد ہو جائے، پھر اس کی حالت میں تلون باقی نہیں رہتا، استقامت پیدا ہو جاتی ہے، جسے حضراتِ صوفیہ کی اصطلاح میں ''تمکین'' کہتے ہیں، اب اگر کچھ تغیر ہوتا ہے تو یہ کہ دنیا کی تنگنائے سے نکل کر عالم غیب کی فضاؤں میں پرواز کرتا رہتا ہے، دنیا کی کوئی زنجیر اس کے پاؤں میں نہیں رہ جاتی۔ انسان کو حق تعالیٰ نے اپنے اوصاف وکمالات کا مظہر بنایا ہے، اس آئینہ میں اگر انھیں کے اوصاف وکمالات کا مسلسل ظہور ہوتا رہے تو بلاشبہ آئینہ کے لئے معراجِ کمال ہے۔ لیکن یہ تو اس پر طرح طرح کی کالک لیپ پوت کر اس کو خراب کر دیتا ہے، اس کو صیقل کرتے رہنا چاہئے، ہر وقت اس کی فکر رہنی چاہئے، اپنے نفس اور قلب کا جائزہ لیتے رہنا چاہئے کہ اس پر کوئی زنگ نہ لگنے پائے، اگر لگ جائے تو اسے جلد سے جلد توبہ کے پانی سے دھل دھلا کر پاک وصاف کر دینا چاہئے'' (حدیث دوستاں)

مکتوب

مولانا مفتی مجد القدوس صاحب خبیب رومی

مفتی دار الافتاء، مدرسہ عربی مظاہر علوم، سہارنپور

سراپا اعجاز

بوئے گل سیر ندیدم کہ بہار آخر شد!

عزیز گرامی قدر مولوی محمد عابد صاحب قاسمی زیدت عبدیتہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کے والد محترم میرے محبّ ومحبوب، صادق ومخلص، کرم فرما مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمیؒ کے سانحۂ ارتحال کی اطلاع پر شدید ملال ہوا۔ **انا للہ وانا الیہ راجعون. ان للہ مااخذ ولہ ما اعطی و کل عندہ اجل مسمی فلتصبر ولتحتسب.**

اللہ تعالیٰ ان کو بلا حساب جنت الفردوس نصیب فرمائے اور آپ سب متعلقین کو صبر واجر عطا فرمائے۔ (آمین) واقعہ یہ ہے کہ وہ صرف میرے ہی نہیں بلکہ میرے والد صاحب اور تایا و چچا وغیرہ کے بھی محبّ ومحبوب اور ممدوح تھے۔ میں نے ان کی تدریس کا غلغلہ اور ان کی تعریف وتحسین سب سے پہلے اپنے بعض رفقائے درس سے سنی تھی، جس زمانے میں وہ مدرسہ دینیہ غازی پور سے مدرسہ وصیۃ العلوم الہ آباد، حضرت مولانا محمد حنیف صاحب کے مدرسہ ریاض العلوم گورینی اور مولانا قمر الزماں صاحب ومولانا عمار الحسن صاحب کے مدرسہ بیت المعارف منتقل ہو جانے کے بعد عملاً صدر مدرس ہو کر آئے تھے تو وہاں ان کی درس وتدریس کا خاص طور پر چرچا سنا۔ اس کے بعد مدرسہ

ریاض العلوم گورینی میں بھی طلبہ کے درمیان تعلیم وتربیت کی پسندیدگی اوران کی گفتار وکردار کی مقبولیت ومحبوبیت سننے میں آتی رہی، مگر بقول بعض اہل دل کہ اہل علم میں اپنے معاصرین کے ساتھ حسدِ معاصرین کا رذیلہ بری طرح سے کارفرما ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ ایسے لوگوں کی نظروں میں کھٹکنے لگے۔ ایک مدرسہ کے طالب علم نے مجھ سے ذکر کیا تھا کہ طلبہ کو مولانا اعجاز احمد صاحب کے اس مدرسہ سے چلے جانے پر جتنا افسوس وغم ہوا تھا، ان کے ایک معاصر کے مدرسہ سے رخصت ہو جانے پر اتنی ہی خوشی اور مسرت محسوس ہوئی تھی، البتہ ان کے بڑے اور مصلحین ومشائخ کے یہاں ان کا اعتبار واعتراف تھا۔ اکابر ملت کی نگاہ میں وہ کامیاب مصلح وداعی الی الحق سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ میرے والد محترم جنہیں بجا طور پر مسلک اہل حق کا بہترین ترجمان قرار دیا گیا جو **لا یخافون فی اللہ لومة لائم** کا بلاشبہ مصداق تھے اورکسی معاصر کی لائق تنقید بات پر برملا تنقید بغیر کسی لاگ لپیٹ کے نقد ادا کر دیا کرتے تھے اور ہر کس وناکس کے معترف یا معتقد نہ ہوتے بلکہ **کل مایلمع لیس بذھب** کے قائل رہتے تھے اوراس میں پورے تیقظ اور علم وفہم کی روشنی میں حفظ حدود کیساتھ اکابر ومعاصر واصاغر کے فرق مراتب کو ملحوظ رکھنے کے عادی تھے۔ وہ فرقِ باطلہ اور جماعت وافراد ضالہ ومضلہ (مثلاً رافضی وشیعہ، قادیانی ونیچری، نیم نیچری، رضاخانی، غیر مقلد ومودودی اوراباحت پسند وغیرہ) کی تردید وتعاقب کے لئے جن چند اصحاب علم وفکر ونظر کے قائل و معترف اور مداح تھے، ان میں مولانا اعجاز احمد اعظمی مرحوم ومغفور بھی تھے۔ اسی مناسبت طرفین کو محسوس کرتے ہوئے مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم (مدیر معارف اعظم گڑھ) نے ایک موقع پر والد صاحبؒ سے پوچھا تھا کہ مولانا اعجاز احمد اعظمی بھی غالباً آپ کے شاگرد ہیں؟۔

ربنا اغفرلنا ولا خواننا الذین سبقونا بالایمان ولاتجعل فی قلوبنا غلا للذین اٰمنوا ربنا انک رؤوف رحیم.

حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ کی کتاب ”**الاستاذ المودودی وشئ من حیاته و افکارہٖ**“ کا عربی سے اردو ترجمہ کرنے کے لئے والد صاحبؒ نے اولاً مولانا سید نفیس اکبر اُویس ہنسوی مدظلہٗ (شیخ الحدیث وصدر مدرس جامعہ عربیہ ہتورا باندہ) اورثانیاً اس کی تکمیل کے لئے مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی کا انتخاب فرمایا تھا، جس سے ان کی مترجمانہ صلاحیت بخوبی واضح ہوتی

ہے۔ والد صاحب کو مولانا سے جو تعلق خاطر تھا اس کا اندازہ اس موقعہ پر بھی ہوا جب مؤرخہ ۲؍صفر ۱۴۲۵ھ مطابق ۲۴؍مارچ ۲۰۰۴ء کو جامعہ اسلامیہ مظفرپور اعظم گڑھ میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ سے متعلق علمی مذاکرہ منعقد ہوا، وہاں حافظ ریاض احمد اعظمی سے یہ معلوم ہوا کہ مولانا اعجاز احمد صاحب پر فالج کا حملہ ہوا ہے، تو اپنی پیرانہ سالی اور معذوری کے باوجود شیخوپور بغرض عیادت جانے کے لئے فوراً تیار ہو گئے اور مولانا کو دیکھتے ہی آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ آپ ''ذکر جامی'' لکھ کر مجھ سے پہلے جانے کے لئے کیسے تیار ہو گئے؟ ابھی تو آپ کو ''ذکر رومی'' بھی لکھنا ہے۔ مولانا یہ سن کر محظوظ و مسرور ہوئے، چنانچہ والد صاحب کے انتقال کے بعد میں نے مولانا کو فون پر ذکر رومی لکھنے کی یاددہانی کی تو مولانا نے فرمایا کہ ہاں مجھے یاد ہے، آپ والد صاحب کی مصنفات و مولفات کا ایک مجموعہ بھیج دیجئے۔ میں نے جو کچھ مل سکیں وہ بھیج دیں مگر مولانا اپنی بیماری، معذوری اور مشغولی کی وجہ سے شاید کچھ لکھ نہ سکے اور جلد ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ **وکم حسرات فی بطون المقابر**

وہ اپنے اساتذہ کرام کی نظر میں کیسے تھے؟ اس پر تفصیل سے ان کے پورے واقفین ہی لکھ سکتے ہیں، مجھے تو صرف ایک واقعہ یاد آ گیا۔ میں نے ان کے استاذ محترم حضرت مولانا زین العابدین معروفیؒ سے ایک مرتبہ دریافت کیا تھا کہ مولوی اعجاز احمد بھی آپ کے شاگرد ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا ''ہاں، مولوی اعجاز نے مجھ سے فلاں فلاں کتابیں پڑھی تھیں مگر وہ جب تکرار کراتے تھے تو ان کا تکرار سن کر میں عش عش کرتا، ان کی تعبیر و تفہیم مجھ سے اچھی ہوتی تھی، وہ شروع سے اچھا بولنے اور لکھنے پر خوب قدرت رکھتے تھے۔'' **ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء** واقعی جامع عالم وہ ہے جو منقول و معقول اور تحریر و تقریر چاروں کا جامع ہو۔

وہ ساری زندگی اپنی بساط کے مطابق مسلک علمائے دیوبند کی ترجمانی کرتے رہے، ان کا اہل اللہ سے والہانہ تعلق تھا، وہ تصوف و سلوک (چشتی ونقشبندی) کے والہ وشیدا تھے۔ حضرت مولانا سراج احمد چشتی امروہیؒ، حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب چشتی فتح پوریؒ اور حضرت شیخ حماداللہ ہالیجوی نقشبندیؒ [۱] وغیرہم اکابر سلسلۂ چشتیہ ونقشبندیہ کے سوانح حیات لکھے اور حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامی الہ آبادیؒ، حضرت قاری حبیب احمد صاحب الہ آبادیؒ اور حضرت مولانا محمد

فاروق صاحب اترانویؒ کے تذکرے لکھے۔ مولانا کی دینی حمیت اور علمی غیرت کی جھلکیاں ان کے اداریہ اور وقتی مضامین نیز ان کے خطوط میں صاف طور پر دکھائی دیتی ہیں۔ مولانا نے ''قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے احوال وآثار وباقیات ومتعلقات'' پراس کے مرتب وجامع کونہایت مفید وتسلی بخش مکتوب تحریر فرمایا تھا، جس میں مصنف کی حد سے بڑھی ہوئی شکایت کودور کیا گیا تھا۔ شیخ الہند اکیڈمی دار العلوم دیوبند کے ایک سابق محقق صاحب نے حضرت نانوتویؒ کی کتاب ''تقریر دل پذیر'' ایڈٹ کی تھی، جس میں ''روڑکی'' کی تحقیق لفظی خدا جانے کہاں سے ''روڑا کوٹنے کی مشین''، لکھی تھی۔ اس تحقیق کی داد مولانا اعجاز احمد صاحب نے بہت پُر لطف انداز میں دی تھی اور اس جیسی دوسری اغلاط پر بھی محقق کو تنبیہ کی تھی جس میں انہوں نے حضرت نانوتویؒ کے محاورات خود نہ سمجھنے کی وجہ سے ان محاورات ہی کی اصلاح کر دی تھی۔ ایسے ہی ایک ترجمان ندوہ کی ''تفسیر بالرائے'' پرانہیں متنبہ فرمایا تھا۔

مولانا کی فقہی بصیرت کے آئینہ داران کے فقہی اسباق اوران کے رسائل خاص طور پر اذان وتکبیر میں افراط فی المد کی اصلاح، تفریط فی المد کی صورت سے کئے جانے پر اعتدال کی متوازن راہ دکھلانے کے لئے مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی کے ایماء پر برادرم مفتی زین الاسلام صاحب قاسمی الہ آبادی کی سعی سے رسالہ ''**المد التعظیمی لاسم الجلالة**'' بھی ہے اور اسلامک فقہ اکیڈمی آف انڈیا کی ''مقلد نما غیر مقلدیت'' کی ترویج واشاعت پر قدغن لگانے کے لئے مولانا کے قلم اعجاز رقم سے ان کے فقہی محاکمے مجلّہ ''الماثر'' میں موجود ومحفوظ ہیں جن کی دوبارہ طباعت واشاعت مفید ونافع ہوگی۔

ایک دفعہ مولانا اعجاز احمد صاحبؒ حضرت مفتی مظفر حسین صاحب اجراڑویؒ سے ملنے آئے تھے۔ مفتی صاحبؒ نے چائے کے لئے پوچھا، انہوں نے معذرت کی کہ ابھی ابھی پی ہے۔ مفتی صاحبؒ نے کہا دودھ پی لیجئے، اس پر مولانا غالباً **ثلاثة لاترد** کے خیال سے ادباً خاموش ہو گئے۔ پھر مفتی صاحبؒ نے سنایا کہ ہمارے استاذ مولانا منظور احمد صاحب سہارنپوریؒ ایسے موقع پر فرمایا کرتے تھے'' **من زا رقوماً ولم يذق منه شيئاً فكانمازار ميتاً** '' یہ سن کر مولانا اعجاز صاحب نے آہستہ سے عرض کیا کہ جی ہاں یہ مقولہ حضرت شیخ نظام الدینؒ کے مکتوبات میں بھی نقل کیا گیا

ہے۔ اس میں ہے **من زار حیاً الخ** اس لقمہ کو سن کر مفتی صاحبؒ بھی محظوظ ہوئے کہ **حیاً و میتاً** کا تقابل خوب ہے کیوں کہ اس سے اس کی معنویت میں بلاشبہ اضافہ ہوگیا، دوسرے اہل علم و ذوق بھی محظوظ ومسرور ہوئے۔

مولانا اعجاز احمد صاحبؒ کا قلم اسم بامسمیٰ اعجاز رقم کا مصداق تھا، ان کی تحریریں پڑھ کر بالکل ایسا محسوس ہوتا تھا:

واہ رے ''تحریر'' کی لذت کہ جو اس نے ''لکھا''
میں نے یہ جانا کہ گویا وہ بھی میرے دل میں ہے

ان کے ادبی ذوق اور اسلوبِ نگارش کی تصدیق وتوثیق بلکہ سند وشہادت عرب وعجم کے مسلم صاحب علم وقلم، ادیب ومؤرخ اور انشاء پرداز جن کا ساری زندگی یہی موضوع ومشغلہ رہا۔ یہ ہے:

''ان میں تصنیفی سلیقہ، تحریر میں شگفتگی اور سلاست، حسن ترتیب اور مضامین کا صحیح انتخاب...... جو کہ کہنہ مشق مصنفوں اور اہل قلم میں پایا جاتا ہے۔''

یہ تصدیق وتوثیق اور سند وشہادت ندوۃ العلماء کے ناظم اعلیٰ، آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے صدر اور رابطۂ ادب اسلامی عالمی کے ذمہ دار حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں حسنی رائے بریلی ندویؒ کے قلم زمرد رقم سے ہے، جو بلاشک وریب ایک صاحب فضل وکمال کی شہادت ہے۔

انما یعرف ذاالفضل من الناس ذووہٗ

چنانچہ مولانا کا تحریری سلیقہ، شگفتگی وسلاست اور مرتب ومنتخب حسین مضامین دیکھ کر ہی چچا میاں مرحوم نے اپنے ایک ہونہار صاحبزادہ (مفتی حمزہ سلّمہٗ) کو مدرسہ ریاض العلوم کی تعلیم سے فراغت کے بعد مضمون نگاری اور تحریری تربیت حاصل کرنے کے لئے مولانا کی خدمت میں کچھ عرصہ کے لئے بھیجا تھا۔ مجلّہ سراج الاسلام کا پہلا تازہ شمارہ برادر عزیز حافظ مولوی معاویہ سلّمہٗ نے دیا تو اس میں آغازِ سخن کے تحت شیخوپور سے چھپرہ تک مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمیؒ کی ''بپتا'' پڑھ کر دل بہت متاثر ہوا۔

اضاعوہ ای فتی اضاعوہ

لیکن ’’رحلۃ العلم‘‘ کے تکوینی معمول کے مطابق یہ اچھا ہوا کہ مولانا شیخوپور کی پوری شیخی سے نکل کر ’’حق کی ضیا باری‘‘ کے لئے سراج نگر منتقل ہو گئے تھے:

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں

مولانا کے باکمال تلامذہ میں کون کون ہیں؟ اس کا مجھے پورے طور پر علم نہیں، خدا کرے کہ ان کے اخلاف، ان کے ناتمام چھوڑے ہوئے کاموں کو بحسن وخوبی مکمل کر سکیں، بالخصوص ان کے صاحبزادگان سلمہم اللہ تعالیٰ اور ان کے خاص تربیت یافتہ گرامی قدر مولوی ضیاء الحق خیرآبادی سلمہٗ

ہر چہ پدر نہ تواند پسر تمام کند اور **کم ترک الاول للآخر**

مولانا کے علمی، دینی، فکری، اصلاحی افادات ان کی تصنیفات وتالیفات جو پہلے مجلّہ ’’المآثر‘‘ مئو اور مجلّہ ’’ضیاء الاسلام‘‘ شیخوپور سے منصۂ شہود پر آچکی ہیں، وہ اب بھی مجلّہ سراج الاسلام، مدرسہ سراج العلوم سراج نگر چھپرہ ضلع مئو (یوپی) سے خیر وخوبی کے ساتھ جاری رہیں اور امت مسلمہ کے سامنے آتی رہیں جن سے عظمت الٰہی، محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور عقیدت اسلاف صالحین کی یادیں تازہ ہوتی رہیں:

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

میری والدہ صاحبہ مرحومہ کے وصال پر میرے مصلح ومربی نے مجھے تعزیت کرتے ہوئے جو نصیحت کی تھی وہ یاد رکھنے کی ہے:

’’مرنے والے کو لوگ ذرا جلدی بھول جاتے ہیں مگر آپ انہیں جلدی نہ بھول جائیے گا اور اس کی صورت یہ کیجئے کہ روزانہ بلاناغہ انہیں ایصال ثواب کرنے کا معمول بنا لیجئے‘‘۔ فقط

والله الموفق والمعين فی كل امر وحی

❑❑❑

(۱) حضرت شیخ حماد اللہ ہالیجوی، سلسلہ نقشبندیہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کا تعلق سلسلہ قادریہ سے تھا۔ اور حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب بھی سلسلہ قادریہ میں ہی بیعت تھے اور اسی سلسلہ سے انہیں اجازت بیعت حاصل تھی۔

جہات اعجاز:

حضرت الاستاذ اور محبت نبوی ﷺ

مفتی عطاء اللہ صاحب قاسمی
استاذ: مدرسہ ضیاء العلوم پورہ معروف

موت جسے جانداروں کے لئے قانون آفرینش کہئے یا کائنات کے لئے لازمہ آرائش و زیبائش، ہے بہرحال دنیائے آب وگل کا اٹل قانون، ایسا قانون جس سے کسی جاندار کو مفر نہیں۔ حضرت الاستاذ پر بھی اس قانون کا نفاذ ہونا تھا، ہو کر رہا۔ حادثہ وفات پیش آ کر رہا۔

دن ہفتوں میں، ہفتے مہینوں میں اور مہینے سالوں میں بدل گئے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہماری ہر نقل وحرکت میں شریک اور ہر قدم پر ساتھ ہیں۔ کوئی واقعہ پیش آتا ہے، کوئی نئ الجھن سر ابھارتی ہے تو اچانک تصور کی دنیا میں وہ پیکر محبت سامنے آجاتا ہے، پھر اس کی آواز، آواز کا لب ولہجہ، اور خطاب کا انداز ایک پیکرِ محسوس بن کر دل ودماغ میں ہلچل ڈال دیتا ہے۔ لگتا ہے کہ حضرت الاستاذ کی زندگی میں یہ کائنات میرے لئے کچھ اور تھی اور ان کے بعد کچھ اور ہوگئی۔ دونوں میں وہی نسبت ہے جو بہار اور خزاں یا آبادی اور ویرانے میں ہے۔

آہ! میری ایک محبوب ترین ہستی دنیا سے پردہ فرماگئی، جس میں اللہ تعالی نے میرے لئے ایک شفیق ترین باپ کی محبت، ایک بالغ نظر استاذ کی توجہ، ایک شیخ ومربی کی عنایات اور ایک مونس وغمگسار کی ہمدردیاں جمع فرمادی تھیں۔ حضرت الاستاذ جب باحیات تھے، آپ کے جلوہ جہاں آرا کی دید وزیارت دسترس میں تھی تو ان کی دلآویز شخصیت میں ہر مشکل کا حل، ہر پریشانی کا علاج ہر فکر وغم کا مداوا موجود تھا۔ ہزار الجھنوں اور پریشانیوں کے درمیان جب حضرت سے ملاقات ہوجاتی تو ان کی شفقتوں اور محبتوں سے میرا وجود بھیگ جاتا، ہر الجھن کافور ہوجاتی اور یوں محسوس

ہوتا جیسے کائنات کا سارا روحانی سکون اس ایک پیکر محبت میں سمٹ آیا ہو۔

حضرت الاستاذ پیکر محبت تھے، محبت حضرت کا مایۂ خمیر تھا اور محبت نبوی ان کا مزاج۔ اس لئے اتباع سنت نبوی ان کا مذاق زندگی ٹھہرا، جس میں ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ پوری طرح ڈھلا ہوا تھا۔

چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی اگر میں یہ دعوی کروں کہ محبت نبوی میں ڈھلی ہوئی اور اتباع سنت سے سجی اور سنوری زندگی کو میں سمجھ چکا ہوں۔ اگر بالفرض کوئی بھی سمجھ چکا ہو تو مزاج و مذاق ریاضی کا کوئی فارمولہ نہیں ہوتا جسے دو اور دو چار کی طرح سمجھا دیا جائے۔ وہ کوئی منطقی اصطلاح نہیں ہوتی جس کی تشریح پورے فوائد قیود کے ساتھ کردی جائے۔

محبت نبوی ایک خوشبو ہوتی ہے جو کسی عظیم انسان کی عظمت شان کی روح ہوتی ہے۔ اس کے رگ و ریشہ میں رچی بسی ہوتی ہے اور جہد و عمل کی دنیا میں اس کی اداؤں سے پھوٹتی ہے۔ اس خوشبو سے مشام جان کو معطر تو کیا جاسکتا ہے لیکن اس کی جامع و مانع تعریف نہیں کی جاسکتی۔ الفاظ اپنی کثرت اور تعبیرات اپنی وسعت کے باوجود کما حقہ اس کی تعبیر سے قاصر ہیں۔

البتہ اس بات پر حق تعالیٰ کا جتنا شکر ادا کیا جائے کم ہے کہ حضرت الاستاذ شریعت و طریقت کے جامع انسان، سراپا اخلاص واحسان تھے۔ پوری زندگی محبت نبوی میں رچی بسی تھی۔ اسی طرح حضرت الاستاذ قلم کے دھنی تھے، اعلی پائے کے ادیب، صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ سوز دروں کی کیفیات، قلب و نظر کے تأثرات اور عشق فراواں کے کچھ حالات کو جب الفاظ و تعبیرات کا پیکر عطا کرتے ہیں تو ادب وانشا کا ایک نیا اسلوب جنت نگاہ بنتا ہے۔ ادب اسلامی کا شاندار نمونہ وجود میں آجاتا ہے۔ ان تحریروں میں حضرت کا محبت نبوی والا مزاج و مذاق از خود جھلکتا ہے۔ لہٰذا اگر میں اس مزاج و مذاق کو اپنے الفاظ میں بیان پر قادر نہیں تو کم از کم حضرت کی تحریروں سے کچھ اقتباسات ضرور مرتب کرسکتا ہوں، جو عشق نبوی کے آئینہ دار، علم و عرفان کے ترجمان اور عشق فراواں کے غماز ہیں۔

اگرچہ مجھے حسرت وافسوس ہے کہ میں نے ان قیمتی تحریروں سے اب تک کوئی سبق نہ لے سکا، لیکن شاید انہیں مرتب کرنے کی برکت سے اس کا کچھ حصہ نصیب ہوجائے اور کیا بعید ہے

کہ قارئین اس سے وہ فائدہ حاصل کرلیں جو میں حاصل نہ کرسکا۔

محبت کا اتھاہ جذبہ:

حضرت الاستاذ کو مبدأ فیاض سے محبت ومودت، عجیب دردوسوز اور ہمدردی وغمخواری کی طبیعت عطا ہوئی تھی، اس کا ہلکا سا اندازہ ''حکایت ہستی'' سے ہوتا ہے۔ حضرت لکھتے ہیں:

> ''ایک بات جسے میں آغازِ شعور سے محسوس کرتا ہوں، اور جس کے محور پر میری زندگی، عمر کے ہر مرحلہ میں گردش کرتی رہی، وہ ہے جذبۂ محبت کی فراوانی! مجھے بارہا یہ محسوس ہوا کہ میرا دل صرف محبت کے لئے وضع ہوا ہے، ہر بچہ اپنے والدین سے محبت کرتا ہے، اپنے بھائی بہنوں سے محبت کرتا ہے، یہ ایک فطری جذبہ ہے، لیکن میں اپنی محبت کو کس طرح بتاؤں؟'' (ص ۱۵۷)
>
> ''میں اس وقت سے مریضِ محبت ہوں جب میں جانتا بھی نہ تھا کہ محبت کیا شے ہے؟ اور جب مجھے اس کی خبر ہوئی، تو میں کیا عرض کروں کہ مجھ پر کیا بیتی؟ مجھے خود لفظ ''محبت'' سے محبت ہوگئی۔'' (ص ۱۵۸)

رسول اللہ ﷺ کی محبت:

محبت کا یہ اتھاہ جذبہ محبت نبوی کی طرف کب اور کیسے مڑا؟ دریائے محبت کا یہ دھارا سرچشمۂ عشق ومحبت، منبع علم ومعرفت تک کب اور کیسے بہنے لگا؟ حضرت الاستاذ نے یہ کہانی اپنے مخصوص انداز میں سنائی ہے۔ حضرت الاستاذ کے بیان کے مطابق گھر اور خاندان کا دینی ماحول، والد بزرگوار کی تربیت کا اس میں پورا دخل ہے۔ ''بطواف کعبہ رفتم'' میں بیان کرتے ہیں:

> ''اب تو مجھے یاد بھی نہیں کہ عمر کی کس گنتی میں تھا کہ فخر دوعالم، سرکارِ مدینہ، سیّد الاولین والآخرین حضور جناب نبی کریم ﷺ کی محبت دل کی گہرائی میں اتری۔ اس وقت مجھے کچھ شعور بھی نہ تھا، جب والدمحترم باتوں باتوں میں میرے دل میں کچھ ایسی باتیں اتار دیتے تھے جن کی قدر وقیمت کا اندازہ اب ہورہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ حروف شناسی کی عمر سے پہلے ہی والدمحترم نے حضور اکرم ﷺ کی محبت میرے دل کے ہر رگ وریشہ میں پیوست کردی تھی۔ میرے دادا بھی بڑے عاشق رسول تھے۔ حضور کا ذکر وہ بڑے والہانہ انداز میں کرتے تھے۔'' (۱۲۸)

محبت نبوی کا اثر:

یہ تربیت بہت قوی التاثیر تھی، آغاز شعور سے ہی اس کے اثرات محسوس ہونے لگے۔

خواب میں زیارت نبوی ہونے لگی۔ حضرت آگے لکھتے ہیں کہ عمر کے اضافہ کے ساتھ ساتھ اس محبت میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ حضرت الاستاذ کا قلم یہ داستان سنا رہا ہے:

> ”مجھے خوب یاد ہے کہ چھٹپنے میں، جبکہ غالباً میں مکتب کے درجہ دوم یا سوم میں پڑھتا تھا، جاڑوں کی ایک رات تھی میں اپنی بہنوں کے قدموں کی جانب سویا ہوا تھا، خواب دیکھتا ہوں کہ دادا محترم گھر میں تیزی سے تشریف لائے، اور والد صاحب سے جو گھر کے کسی کام میں مصروف تھے، ڈانٹ کر کہا تم ابھی یہیں ہو اور حضور اکرم ﷺ تشریف لا رہے ہیں۔ والد صاحب فوراً کام چھوڑ کر لپکے، اور میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ میں ان سے زیادہ تیزی کے ساتھ باہر کی جانب دوڑا، دروازہ پر پہونچا تو حضور ﷺ تشریف لا چکے تھے، عجلت میں والد صاحب کو کوئی چار پائی نہ مل سکی تو ایک چھوٹا سا کھٹولا ہی بچھا دیا، سرکار اس پر تشریف فرما ہوئے۔ میں یہ سوچ کر کہ حضور ﷺ بچوں پر نہایت شفیق و مہربان ہیں، آپ کے پاؤں کے پاس کھٹولے پر بیٹھ گیا، آپ نے کاغذ اور قلم طلب کیا، والد صاحب نے لا کر حاضر کیا، میں سوچنے لگا کہ کتابوں میں پڑھا ہے کہ آپ لکھنا نہیں جانتے تھے، پھر دیکھا کہ آپ کچھ لکھ رہے ہیں، کاغذ کا وہ ٹکڑا اور آپ کا دست مبارک اب تک نگاہوں میں موجود ہے۔“ (بطواف کعبہ رفتم: ص ۱۲۹)

ایک بزرگ کی پیشین گوئی:

بالائے سرش ز ہوش مندی　　　می تافت ستارہ سر بلندی

مستقبل میں اس بچہ کو جس حیثیت سے لوگوں کے درمیان مشہور ہونا تھا، اور اس کی ذات سے دین و شریعت اور علم و عرفان کی جو خدمت وجود میں آنے والی تھیں، انہیں ایک بزرگ شخصیت نے اپنی نگاہ بصیرت اور نور فراست سے محسوس کر لیا تھا۔ یہ بزرگ تھے ایک نقشبندی شیخ حضرت حافظ حامد حسن صاحب خلیفہ حضرت صوفی عبدالرؤف صاحب مئوی۔ حافظ صاحب اور ان کے خلیفہ سے حضرت کے دادا اور والد صاحب کا گہرا تعلق تھا۔ اسی تعلق سے صوفی صاحب حضرت کے گھر آمد و رفت رکھتے تھے۔ حضرت لکھتے ہیں:

> ”میں نے انھیں بچپن میں کئی مرتبہ دیکھا ہے۔ ان کے پاس بیٹھا ہوں، عجب نورانی چہرہ تھا، خوبصورت دمکتا ہوا، اس پر نہایت حسین و جمیل سفید بڑی بڑی گول داڑھی۔ میں نے اتنا

نورانی چہرہ کم دیکھا ہے، ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اندر سے نور کی شعاعیں پھوٹ رہی ہوں، بچوں سے بہت پیار کرتے تھے، ان سے خوب میٹھی میٹھی باتیں کرتے۔

ایک بار بڑے والد صاحب کے گھر چھوٹے سے کھٹولے پر پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے، نیچے چٹائی پر ان کے پاؤں سے لگ کر بڑے والد صاحب کے دو بیٹے بیٹھے ہوئے تھے اور ایک کنارے میں بھی دبکا ہوا تھا۔ انھوں نے باری باری ہر ایک کے سر پر دست شفقت رکھا، ان کا ہاتھ کیا تھا جیسے دبیز ریشمی مخمل! پوچھا تمھارا کیا نام ہے؟ بتایا محمد بلال، فرمایا بلال موذن، حضرت بلال ؓ حضور ﷺ کے موذن تھے، پھر پوچھا اور تمھارا کیا نام ہے اس نے کہا ابو ہریرہ، مسکرانے لگے فرمایا بلی کا باپ! پھر حضرت ابو ہریرہ ؓ کا ذکر کیا، اخیر میں میرے سر پر ہاتھ رکھا اور پوچھا کہ تمھارا کیا نام ہے، عرض کیا اعجاز احمد، فرمایا تم احمد کے معجزے ہو، ہم لوگوں کو بہت خوشی ہوئی۔'' (حکایت ہستی، طبع دوم: ص۷۳)

گھر خاندان کی دینداری، دینداروں سے تعلق کام کر گیا، آگے چل کر سلوک و معرفت، درس وافادہ، علم وتحقیق، مردم سازی، وعظ وتلقین، ادب وانشا کے مختلف النوع میدانوں میں جب یہ شخصیت جلوہ گر ہوئی، ہر میدان میں آپ کو جو مہارت وحذاقت اور یکساں مقبولیت حاصل ہوئی، آپ کی ذات اقدس سے جو کارہائے نمایاں انجام پائے، ان سب پر نظر جاتی ہے تو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ ''اعجازِ احمد'' کا ظہور ہے۔

سچ تھا ان کا فرمایا ہوا

محبت نبوی کا جذبہ فراواں:

حضرت لکھتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ کی محبت مَیں اپنے قلب وجگر میں ابتداء شعور سے پاتا تھا، جب سے حروف پڑھنے کی کچھ شُد بُد ہوئی ہے، میں نے سیرتِ پاک کا جو بھی چھوٹا بڑا رسالہ پایا، بڑے ذوق وشوق سے پڑھا۔ مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور کی طالب علمی میں سیرۃ النبی (علامہ شبلی نعمانی وسید سلیمان ندوی) بطور تلاوت کے پڑھا کرتا تھا، گھر پر عبادت کی یکسوئی حاصل ہوئی، تو جوشِ محبت میں بہت اضافہ ہوا۔'' (حکایت ہستی، طبع دوم ۲۹۲)

> ’’پھر جوں جوں عمر بڑھتی گئی ہر چیز میں مدوجزر آتا رہا، مگر ایک چیز جس میں زندگی کے کسی دور میں کمی نہیں آئی وہ رسول اللہ ﷺ سے محبت وتعلق کی متاعِ گرانمایہ ہے۔‘‘ (بطواف کعبہ رفتم ص ۱۲۹)

محبت نبوی کے جذبہ فراواں کا لازمی نتیجہ سنت نبوی ہے۔ حضرت کے شاگرد رشید مولانا ضیاء الحق صاحب لکھتے ہیں:

> ’’حضرت مولانا علیہ الرحمہ کا خاص وصف جذبہ اتباع سنت ہے، میں نے سالہا سال سفر وحضر میں ساتھ رہ کر اس کا مشاہدہ کیا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا نے فرمایا کہ میں نے سیرت نبوی کا تین سال تک مطالعہ محض اتباع سنت کی نیت سے کیا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ کے اندر اتباع سنت کا کیسا جذبہ فروزاں رہا ہوگا۔‘‘ (نمونے کے انسان: ص ۳۱۱)

جمال نبوی کی دید وزیارت:

حضور رسالت مآب ﷺ کی ذات بابرکات سے عشق ومحبت کی فراوانی اس درجہ کو پہونچی ہوئی تھی کہ متعدد بار خواب میں بھی اور بیداری میں بھی ذات اقدس ﷺ کی دید وزیارت سے آپ کو مشرف فرمایا گیا۔ اس کا بہت تھوڑا حصہ قلم کے ذریعہ کاغذ کے صفحات پر ٹپک پڑا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی کے ہر مرحلے میں یہ سعادت عظمیٰ آپ کو حاصل رہی ہے۔

بچپن میں زیارت نبوی کا تذکرہ اوپر گزر چکا ہے۔ امروہہ میں حدیث شریف کی سبق خوانی کے دوران حالت بیداری میں یہ سعادت آپ کو حاصل رہی ہے۔ حضرت لکھتے ہیں:

> ’’ایک روز حضرت مولانا عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں، میں ابوداؤد شریف کی عبارت پڑھ رہا تھا، مولانا نہایت پاک باطن اور صاف دل بزرگ ولی تھے، سادات میں تھے۔ میں حدیث نبوی کی مسلسل قرأت کر رہا تھا، اسی دوران مجھ پر ایک ربودگی کی سی کیفیت طاری ہوئی، اسی حالت میں پڑھتے پڑھتے میری نگاہ باہر کی طرف اٹھ گئی، میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ چند اصحاب کے ساتھ ایک طرف جا رہے ہیں، احرام جیسا لباس زیب تن فرمائے ہوئے، چہرۂ اقدس دوسری طرف تھا، میں نے پیچھے سے دیکھا، خوبصورت زلفیں تھیں۔ چندے زیارت ہوئی پھر وہ منظر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔‘‘ (حکایت ہستی، طبع دوم: ص ۲۶۱)

حضرت الاستاذ کے دل وجگر میں محبت نبوی کا پودا بچپن کی لاشعوری میں ہی لگا دیا گیا تھا۔ پھر حالات وماحول کے ذریعہ اس کی آبیاری کی جاتی رہی تو وہ پھلتا پھولتا رہا۔ دل ہمہ وقت اس جمال جہاں آرا میں غرق رہنے لگا، رات کو بستر پر بیٹھ کر زیارت نبوی کے وظیفے پڑھتے تھے۔ محبت میں ڈوب کر اشعار پڑھتے تھے اور آنسو بہاتے۔ حضرت لکھتے ہیں:

> ’’جن دنوں میں شرح وقایہ پڑھ رہا تھا، ایک شب خواب میں دیکھا کہ میں مدینہ طیبہ میں حاضر ہوں، طبیعت خوشی سے بے تاب ہے، میں تلاش کر رہا ہوں کہ رسول اکرم ﷺ کہاں تشریف فرما ہیں، رات کا سماں ہے، اچانک مشہور صحابی حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی، انھوں نے میرا ہاتھ پکڑا، اور فرمایا چلو تم کو میں حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں پہونچا دوں میں شوق کے قدموں سے ان کے ساتھ چلا، کچھ دور چل کر فرمایا، ابھی ٹھہرو، تمہارا وقت ابھی نہیں آیا ہے، کچھ دنوں بعد تم کو پہونچایا جائے گا۔ اتنا فرمایا تھا کہ میری آنکھ کھل گئی اور دل میں زیارت وحاضری کی خلش رہ گئی۔
>
> یہ خواب مجھے ہمیشہ مستحضر رہا، گھر پر جب یکسوئی حاصل ہوئی، اور دل کا زخم ناسور بنتا رہا، تو یہ خلش بھی بڑھی اور بہت بڑھی۔ میں نے زیارت نبوی کے وظائف پڑھنے شروع کئے۔ دل اس جمالِ جہاں آرا کے تصور میں ہمہ وقت غرق رہتا، رات کو عشاء کے بعد بستر پر بیٹھ کر وظیفہ پڑھتا، اور محبت میں ڈوب کر یہ اشعار دہراتا، پھر آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی
>
> اتنا پیغام دردؔ کا کہہ دے جب صبا کوئے یار میں گزرے
> کون سی شب وہ آئیں گے دن بہت انتظار میں گزرے
>
> ایک عرصہ کے درد وکسک کے بعد زیارت وحاضری نصیب ہوئی، اور متعدد بار ہوئی۔ ایک بار دیکھا کہ آپ سے حدیث شریف کا سبق پڑھ رہا ہوں، ایک بار دیکھا کہ سحری کا وقت ہے، اور میں گھی روٹی کا ملیدہ بنا کر خدمت اقدس میں پیش کر رہا ہوں، آپ نے تناول فرمایا، اور مجھے بھی اس میں سے حصہ عطا فرمایا۔‘‘ (حکایت ہستی، طبع دوم: ص۲۹۳)

بات لمبی ہوتی جارہی ہے، کیا کروں؟ محبت کی مجلس ہے، محبت کا تذکرہ ہے، اہل محبت کا

ذکر ہے، بات تو لمبی ہوگی ہی۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

ایک اور اقتباس نقل کئے بغیر بات شاید نامکمل رہ جائے۔ حضرت لکھتے ہیں:

’’مزدلفہ کی رات بہت بابرکت ہے، یہ مقام بھی انتہائی متبرک ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی ایک دعا جس کی قبولیت عرفات میں نہیں ظاہر ہوئی تھی، یہاں مقبول ہوئی۔ اس رات میں توفیق والے خوب جاگتے ہیں اور عبادت میں وقت گزارتے ہیں، لیکن میں ہمیشہ کا آرام پرور، راحت کا خوگر! بڑے موقع سے حدیث یاد آئی کہ مزدلفہ میں رسول اللہ ﷺ نے پوری رات استراحت فرمائی تھی، بس مجھ بے حیا کو بھی آرام کا موقع ہاتھ آ گیا۔ عشاء کے بعد تھوڑی دیر دعا میں مشغول رہ کر چٹائی پر لیٹ گیا، میں تو سوگیا لیکن میری قسمت بیدار تھی۔ آج کے سونے پر بیداریاں قربان! سویرا ہو رہا تھا، ابھی صبح صادق میں گھنٹہ بھر سے زیادہ وقت باقی تھا کہ ایسا ہوا کہ پیچھے سے سیّدی ومولائی حضرت رسول کریم ﷺ فداہ روحی وقلبی تشریف لائے، اور انبساط وبشاشت کے ساتھ فرمارہے ہیں کہ میں ادھر ہوں، تم ادھر کیوں رخ کئے ہو۔ یہ سننا تھا کہ میں فرطِ مسرت سے بے قابو ہوکر ادھر متوجہ ہوا، کروٹ بدلنی تھی کہ آنکھ کھل گئی۔ دیر تک تاثر رہا، خوشی ومسرت سے طبیعت جھوم اٹھی، جی چاہ رہا تھا کہ پھر سو جاؤں شاید بازدید ہو جائے، مگر دل نے کہا کہ آپ کی عنایت نے جگا دیا ہے، اشارہ ہے کہ اب عبادتِ الٰہی میں لگو۔‘‘ (بطواف کعبہ رفتم ص ۸۷)

شہادت دیگراں:

حضرت کے عقیدت مندوں میں ایک شخصیت دربھنگہ بہار کی الحاج نوراللہ صاحب مدظلہ کی ہے۔ ان کو ۲۰۰۶ء کے حج میں حضرت کی معیت میں حج کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنے تائثرات کو قلم بند کیا ہے۔ حاجی صاحب لکھتے ہیں:

’’مسجد میں جدید طرز کی دو چھتریاں لگی ہوئی ہیں، جو دن میں کھول دی جاتی ہیں، اور سائبان کا کام کرتی ہیں، پھر شام کو بند کر دی جاتی ہیں۔ ایک چھتری کے نیچے اس جگہ پہونچا جہاں سے گنبد خضرا صاف نظر آتا ہے، یہی وہ مقام ہے، جہاں ایک سفر میں حضرت بیٹھ کر قرآن کریم کی تلاوت کیا کرتے تھے، اور اسی جگہ متعدد بار دوران تلاوت بیداری میں حضور اکرم ﷺ

کی زیارت سے مشرف ہوئے تھے۔‘‘

’’ایک دن فون پر حضرت کے چھوٹے داماد مولانا ابرار صاحب نے خواب میں آپ ﷺ کے دیدار کا مژدہ سنایا کہ وہ حضرت کے ساتھ روضۂ اقدس میں داخل ہو رہے ہیں، اور پیارے نبی ﷺ اپنا دست مبارک حضرت کے شانے پر رکھے ہوئے ہیں، اس خوش بختی پر آسمان بھی نازاں ہوا ہوگا۔‘‘ (بطواف کعبہ رفتم: ص ۲۲۶)

محبت وشیفتگی کے کچھ شہ پارے:

رسول اللہ ﷺ کی محبت آپ کے رگ وریشہ میں بسی ہوئی تھی۔ زندگی میں مد و جزر آتے ہی رہتے ہیں، حضرت کی زندگی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھی لیکن ایک چیز جس میں زندگی کے کسی موڑ پر کمی نہیں آئی، وہ ہے رسول اللہ ﷺ سے محبت وتعلق کی متاع گرانمایہ۔ آپ ﷺ کے واسطے سے مدینہ طیبہ کے ساتھ بھی ایسا ہی والہانہ تعلق دل میں رہا، آپ ﷺ کے واسطے سے آپ کا فرمایا ہوا، آپ کی زبان مبارک سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ جسے ’’حدیث شریف‘‘ کہتے ہیں، اس سے بھی تعلق خاطر وارفتگی کی حد تک رہا۔ آپ کے واسطے سے آپ کی ایک ایک ادا جسے ’’سنت‘‘ کہا گیا ہے، اس سے اس قدر شیفتگی رہی کہ سنت نبوی آپ کا مزاج و مذاق بن گئی۔

حضرت الاستاذ نے اپنے حج کی روداد اپنے قلم اعجاز رقم سے بڑے والہانہ انداز میں سنائی ہے۔ جب اس شہر مدینہ کا تذکرہ لکھنا ہوا تو لگتا ہے کہ طبیعت پوری طرح منشرح ہو کر وجد میں آ گئی، اس حالت میں قلم سے جو تحریر نکلی، وہ ایک ادبی شہ پارہ بن گئی۔ لکھتے ہیں:

شہر مدینہ:

ذکر مدینہ طیبہ

زباں پر بارِ الٰہا! یہ کس کا نام آیا
کہ نطق نے مرے، بوسے مری زباں کے لئے

مدینہ شریف کا تصور آتے ہی ایک مومن کے قلب پر ایمان کی بادِ بہاری چلنے لگتی ہے، روح تر و تازہ ہو جاتی ہے، وجدان پر مستی چھانے لگتی ہے۔ وہ شہر بھی کیا شہر ہے؟ جہاں دنیا

جہان سے عقیدت ومحبت کے بادل امنڈ امنڈ کر آتے ہیں، اور کسی کے پاؤں چوم کر سرشار ہوجاتے ہیں۔ کائنات کے گوشے گوشے سے جنونِ عشق کی لہریں آتی ہیں، اور کسی کی خاکِ پا میں جذب ہوجاتی ہیں۔

دنیا میں شہر بہت ہیں، ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت، پُرفضا، روشن اور بارونق! لیکن کیا کوئی شہر اس شہر کا مقابلہ کرسکتا ہے؟ جس کے ذرے ذرے سے قلب وجگر کا ریشہ ریشہ بندھا ہوا ہے، اس شہر کی مٹی بھی ویسی ہی مٹی ہے، جیسی دوسرے شہروں کی مٹی ہے، اس شہر کی فضا، اس کا آسمان، اس کا سورج، اس کا چاند، اس کے ستارے سب وہی ہیں، جو دوسرے شہروں کے ہیں، لیکن اس کی آغوش میں رحمت عالم کا جو لازوال سرمایہ ہے، وہ اور کہاں ہے؟ اسی رحمۃ للعالمین کی دلنواز شخصیت ہے جس نے دنیا کے ہر گوشے کے باشندوں کو جذب کر رکھا ہے۔'' (بطواف کعبہ رفتم ص ۲۳۹/۴۰)

حدیث نبوی اور حضرت الاستاذ:

احادیث کیا ہیں؟ نبوت کا فیضان ہیں، نبوت کا فرمان ہیں اور نبوت کے انوار وبرکات ہیں۔ ایسے سانچے اور نمونے ہیں جن میں انسانیت کا ڈھل جانا ہی انسانیت کی معراج ہے، بارگاہ الٰہی کا سب سے زیادہ مطلوب سرمایہ ہے۔ اس سے انسانیت روشنی حاصل کرتی ہے اور جگمگاتی ہے۔ اس کو صرف فقہی مسالک کے سانچوں میں بند کرنا نامناسب ہے۔ آج مدارس میں جس انداز سے احادیث پڑھائی جاتی ہیں کہ فقہی دلائل، اعتراضات اور جوابات، رجال واسانید پر لمبی لمبی بحثیں ہیں، مخصوص ابواب پر پورا زور ہے، لیکن وہ احادیث جس میں رسول اللہ ﷺ کی عبدیت جھلکتی ہے، آپ کا تخلق باخلاق اللہ پورے عروج پر ہے، ان احادیث سے سرسری طور سے گزار دیا جاتا ہے، نہ اس پر زور بیان صرف ہوتا ہے اور نہ ہی طلبہ واساتذہ میں اس کی جھلک اور اس کا کچھ شائبہ محسوس ہوتا ہے۔

حضرت الاستاذ کی حدیث نبوی سے محبت وشیفتگی بڑی باغیرت ہے، اس صورت حال سے تڑپ اٹھتی ہے۔ آپ نے اپنے ایک خط میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، جس سے ایک طرف حضرت کا نظریہ جھلکتا ہے، وہیں وہ ایک ادبی شہ پارہ بھی ہے۔ حضرت ایک خط میں لکھتے

ہیں:

’’بہر کیف میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حنفی مسلک نہایت قوی اور مضبوط دلائل پر قائم ہے، اس کی خاطر احادیث کے صریح مدلولات کو توڑنا مناسب نہیں۔ اگر کوئی حدیث امام شافعی علیہ الرحمہ کی تائید کرتی ہے تو چشم ما روشن و دلِ ما شاد، ہمارے لئے بھی نبی کا اسوہ موجود ہے۔ ہاں نبی کا کوئی اُسوہ نہ ہو تب الزام دو۔ خلاصہ یہ کہ **تحنف فی الحدیث** کا طریقہ مجھے پسند نہیں ہے، شاید مشکوٰۃ شریف کے درس میں بھی اس کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا۔ تم حدیث میں رسول اللہ ﷺ کی پوری زندگی کا مطالعہ کرو، حنفیت و شافعیت کا جھگڑا ایک طرف رکھ دو۔ ان چند مسائل کے سوا عام زندگی کے اَطوار و عادات میں حنفیت و شافعیت کا اختلاف نہیں ہے، صرف اختلافی مسائل میں ہی آپ کا عمل اُسوہ نہیں، بلکہ آپ کا ہر ہر طریقہ، ہر ہر عقیدہ اور ہر ہر عمل اُسوہ ہے۔ احناف والی نماز بھی حضور نے پڑھی ہے، بس مطمئن رہو۔ پوری زندگی کیلئے آپ کو معیار بنا کر حدیث پڑھو۔

سیدھی بات یہ ہے کہ حدیث کا مدلول جو ہو رہنے دو، یہ دیکھو کہ ان احادیث کے آئینے میں آپ کی سیرت کیسی نظر آتی ہے، اپنی سیرت کو اسی پر جانچو۔ اس کے لئے احادیث کو بہت غور سے پڑھنا ہوگا، بالخصوص وہ احادیث جو آپ کی عبدیت، ذوقِ عبادت، اخلاق و اوصاف، خشوع و انابت اور سیرت کی بلندی کا آئینہ پیش کرتی ہیں، یا وہ احادیث جو غیبی حقائق مثلاً صفاتِ الٰہیہ، جنت و دوزخ، برزخ و قیامت اور اس قسم کے احوال پر روشنی ڈالتی ہیں، ان کا غائر نظر سے مطالعہ کرنا چاہئے، لیکن افسوس یہ ہے کہ ہمارے یہاں سارا زور اختلافی مسائل پر صرف کر دیا جاتا ہے، اور اس قسم کی احادیث سے آنکھیں بند کر لی جاتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان سے ہمارا تعلق ہی نہیں، اسے کیا کہوں مجھے تو **أفتؤمنون ببعض الكتاب وتكفرون ببعض** کا منظر نظر آتا ہے۔ خدا تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائے، گو کہ یہ بات ذرا سخت ہے لیکن غلط نہیں ہے۔ انداز کچھ ایسا ہی ہو گیا ہے، ورنہ احوالِ آخرت اور سیرت و اخلاق کی احادیث کے ساتھ یہ بے اعتنائی کا سلوک کیوں ہے؟ ہمارے متقدمین اکابر دیوبند کو ان اختلافی مسائل پر ضرورۃً کلام کرنا پڑا تھا، کیونکہ غیر مقلدیت ان دنوں نئی نئی اٹھی تھی، اور شور و طوفان برپا کر رکھا تھا، لیکن

ان حضرات کا کلام مختصر ہوتا تھا، دوسرے وہ حضرات سیرت نبوی کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے، آدمی اگر ایک طرف ان سے اختلافی مسائل کی تحقیق کرتا تھا تو دوسری طرف ان کے اخلاق وعمل سے روشنی بھی حاصل کرتا تھا، اب صرف اختلاف ہی اختلاف رہ گیا ہے، وہ روشنی گل ہوگئی ہے۔ اس لئے میں تو یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ ہر حدیث میں حنفیت کی تلاش مناسب نہیں ہے، اصل میدان محنت واجتہاد کا یہ ہے جس کی طرف میں نے اشارہ کیا۔ والقصة بطولها۔''

(حدیث دوستاں ص ۳۱۹/۲۱)

عمل کے میدان میں:

ماحول کا دباؤ شدید ہوتا ہے، رسم ورواج کا برتاؤ بڑا جارحانہ ہوتا ہے۔ بڑے بڑے علم وعمل کے سورماؤں کو ماحول میں دبتے اور رسم ورواج کے آگے جھکتے دیکھا جاسکتا ہے، لیکن عملی زندگی کے اس اہم موڑ پر حضرت الاستاذ کا رویہ مصالحانہ نہیں ہوتا ہے۔ عشق نبوی والا مزاج حرکت میں آتا ہے اور جرأت رندانہ کا ظہور ہوتا ہے۔ اتباع سنت جوش میں آتا ہے تو ایسا اقدام قلندرانہ سامنے آتا ہے جس سے آپ کا کردار داعیانہ برملا محسوس ہوتا ہے۔ حضرت نے اس مرحلے کی ایک داستان اپنے مخصوص لب ولہجے میں سنائی ہے، جو انہیں کے الفاظ میں سننے کے لائق ہے:

''میں جب گھر آکر رہنے لگا، اور حفظ قرآن کے ساتھ گھریلو مشاغل میں ضم ہوا، تو والد صاحب کو خیال ہوا کہ اب خانہ آبادی ہوجانی چاہئے۔ میرا نکاح اس وقت ہوگیا تھا، جب میں عمر کی دسویں منزل میں تھا، اس وقت ہمارے معاشرے میں نابالغی کے نکاح کا بکثرت رواج تھا۔ غالباً ۱۹۶۰ء یا ۱۹۶۱ء رہا ہوگا، گاؤں ہی میں ایک جگہ رشتہ طے ہوا، اور مسجد میں مجھے بیٹھا کر کسی نماز کے بعد دادا مرحوم نے نکاح کا خطبہ پڑھا اور ایجاب وقبول کرادیا۔ میں قدرے باشعور تھا، مگر نابالغ تھا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد رخصتی کی سلسلہ جنبانی ہونے لگی۔

میری اہلیہ تین بہنیں ہیں، دو بڑی بہنوں کا نکاح ایک ساتھ ہوا تھا، تیسری بہن کی نسبت طے تھی، مگر ابھی عقد نکاح نہ ہوا تھا۔ سسرال کی جانب سے تحریک تھی کہ تینوں کی بارات ساتھ میں آئے، جس کا نکاح نہیں ہوا ہے، اس کا صرف نکاح ہوجائے، اور دو کی رخصتی ہوجائے۔

تیاریاں گفتگو کی حد تک شروع ہوگئی تھیں۔ میرے نانا مرحوم شادی بیاہ کے معاملات میں

> گاؤں کے چودھری تھے، اس مسئلہ میں ان سے مشورہ ضرور لیا جاتا تھا۔ وہ زیادہ پڑھے لکھے تو نہیں تھے مگر وجاہت اور رعب داب میں ممتاز تھے۔ گاؤں میں ان کا بڑا لحاظ تھا، وہ گھر پر تشریف لائے اور والد صاحب سے اس موضوع پر گفتگو کرنے لگے، کتنے باراتی جائیں گے؟ کون کون ہوں گے؟ بارات کے لوازم کو کس کس طرح برتا جائے گا وغیرہ؟ اس طرح کے معاملات میں لڑکوں کو دخل دینے اور بولنے کی گنجائش نہ تھی، میں ایک طرف بیٹھا سن رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ معاملہ میں اصل میں ہوں، اور علم دین کی تکمیل کرکے فارغ التحصیل ہو چکا ہوں، اور بارات میں بہت سی غیر شرعی رسمیں ہوتی ہیں، لیکن معاشرہ کی ریت یہ ہے کہ صاحب معاملہ کچھ نہ بولے، اسی لئے نانا کا خطاب میری طرف سرے سے ہے ہی نہیں، میں سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے؟ پھر دل نے فیصلہ کیا جو کچھ بھی ہو، مجھے خاموش نہیں رہنا چاہئے۔ میں نے سر جھکا کر ڈرتے ڈرتے نانا سے پوچھا کس کی بارات کی بات ہو رہی ہے؟ نانا جھٹک کر بولے تمہاری بارات کی! میں نے اپنے اسی ڈر کے لہجے میں سر جھکائے عرض کیا کہ آپ لوگوں نے مجھے علم دین پڑھایا ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ دین پر عمل کیا جائے۔ میں فقہ اور حدیث دونوں طرح کی کتابیں پڑھ چکا ہوں، ان میں نکاح کا تذکرہ تو ہے مگر بارات کا ذکر کہیں نہیں ہے، اس کا کوئی تعلق شریعت وسنت سے نہیں ہے، اس لئے بارات میں مَیں نہیں جاؤں گا، اس کے بعد آپ کو اختیار ہے۔ میری معروضات سن کر ابتداءً تو نانا کو جلال آیا مگر دیندار تھے، ٹھنڈے ہو گئے۔ والد صاحب بھی خاموش رہ گئے، مشورہ بکھر گیا۔ دوسرے دن سسرال پیغام بھیج دیا گیا کہ محض رخصتی ہوگی، بارات نہیں جائے گی۔ میرے خسر بھی دیندار تھے، انھوں نے اصرار نہیں کیا، بلکہ اور دونوں باراتیں بھی انھوں نے منسوخ کر دیں۔'' (حکایت ہستی ص ۲۸۸)

اب تک حضرت الاستاذ کی محبت نبوی والے مزاج ومذاق کی کچھ جھلکیاں حضرت ہی کی تحریروں کی روشنی میں دکھانے کی کوشش کی گئی ہے، ظاہر ہے کہ اس سے سراپا شفقت، پیکر محبت، سراپا اخلاص واحسان ہستی کے بھرپور تعارف کا حق ادا نہیں ہو سکتا اور ممکن بھی نہیں ہے۔ یہ تو شخصیت ہی سے سیکھنے اور برتنے کی چیز ہے، کاغذ کے صفحات پر کما حقہ منتقل کرنے کی چیز نہیں۔ دعا ہے کہ حق تعالیٰ شانہ حضرت اقدس کی محبت نبوی میں ڈوبی ہوئی شخصیت کو اپنی رحمت ورافت کے

سائے میں رکھے اور حضرت کے پسماندگان، تلامذہ، معتقدین اور منتسبین کو حضرت کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

❑❑❑

آپ خیال کیجئے، حضرت بلال سوختہ دل (رضی اللہ عنہ) سے جب پوچھا گیا، اور اس وقت پوچھا گیا، جب ہر طرح کی نعمتیں انھیں میسر تھیں، کلفت و مشقت کی بدلیاں چھٹ چکیں تھیں۔ راحت و آرام کی فراوانی تھی۔ پوچھنے والے نے اس وقت پوچھا، جب بلال دنیا میں ہر طرح مطمئن تھے کہ حضرت! آپ کا یہ دور زیادہ فرحت بخش ہے، جب غم کا کانٹا نکل چکا ہے، یا وہ دور بہتر تھا جس کا لمحہ لمحہ اذیت ناک تھا۔ جب لونڈوں کے ہاتھ میں پتھر ہوتا، اور آپ کے جسم نیم برہنہ پر مشق ستم ہوتی، اوپر سے سورج چمکتا ہوتا، نیچے آگ دہکتی ہوتی۔ گلے میں رسی کا پھندا ہوتا، اور مکہ کی گلیاں آپ کے گرم خون سے سیراب ہوتیں۔ آپ بتائیے وہ وقت کیسا تھا اور یہ وقت کیسا ہے؟ ایک آہِ سرد بھری اور فرمایا، اس وقت کی لذت کیا پوچھتے ہو؟ جب بدن زخموں سے چور ہوتا، جسم کے ہر ہر حصے پر خون کی نالیاں رواں ہوتیں، درد کی کسک اٹھتی، زخموں میں ٹیس ہوتی، جراحتیں سوزشِ نہاں سے بے چین کرتیں، ظاہری سہارے مستور ہوتے، اس وقت جس درد و سوز کے ساتھ نام پاک ''أحد أحد'' زبان دل سے ادا ہوتا، اس کی حلاوت اور اس کا لطف کچھ نہ پوچھو۔ آج اس لذت کا تصور مشکل ہے، اور دل میں حسرت ہوتی ہے اے کاش...... (حدیث دوستاں)

''مولا کو حق ہے کہ بندے کا امتحان لے، اور امتحان اسی کا ہوتا ہے جس کو کچھ درجات اور کوئی سند عطا کرنی ہوتی ہے، انبیاء کا امتحان ہوا، اولیاء و صالحین کا امتحان ہوا، صحابۂ کرام کا امتحان ہوا، ان حضرات کا ایسا ایسا امتحان ہوا کہ آج ہم لوگ محض سن کر گھبرا جاتے ہیں، پتّہ پانی ہو جاتا ہے، ان حضرات نے جان پر کھیل کر، آبرو لٹا کر، مال و دولت کی قربانی دے کر یہ امتحان دیئے ہیں، ہم نے انھیں کی پیروی کا دم بھرا ہے، انھیں کی اقتداء میں نیت باندھی ہے، انھیں کی راہ پر چلنے کا ارادہ کیا ہے تو ضرور ہے کہ تھوڑا بہت ان کا رنگ جھلکے تاکہ جس صبر و استقامت کی وہ حضرات بنیادیں قائم کر گئے ہیں ان کی تعمیر میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہو جائے۔'' (حدیث دوستاں)

حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب کی فقہی بصیرت

مولانا ولی اللہ مجید قاسمی
استاذ: جامعۃ الفلاح بلریا گنج

فقہ کے معنی کھولنے اور پھاڑنے کے ہیں، یعنی کوئی چیز کسی پردے میں پوشیدہ ہے جس سے پردہ کو ہٹانے اور کھولنے کی ضرورت ہو۔ اور کسی کلام کے لئے یہ لفظ استعمال ہو تو مفہوم ہوگا اس کی بات کی تہہ اور حقیقت تک پہونچ جانا اور اس کے مقصد کو جان لینا۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''ناپ تول میں کمی نہ کرو، لوگوں کو کم سامان مت دو، اس طریقے سے زمین میں فساد پھیلتا ہے''۔ وہ کہنے لگے ''یہ ہمارا مال ہے ہم اس میں اپنی مرضی کے مالک ہیں، زیادہ سے زیادہ مال حاصل کرنا ہمارا حق ہے۔ تم تو بڑے بھولے معلوم ہوتے ہو اور تمہاری کہی ہوئی بہت سی باتوں کو ہم سمجھ نہیں پاتے۔ ''**ما نفقه كثيراً مما تقول**''. (سورہ ہود/۹۱)

ظاہر ہے کہ حضرت شعیب انہیں کی زبان میں گفتگو کر رہے تھے، اس لئے کہ ہر نبی نے اپنی قوم کو انہیں کی زبان میں مخاطب کیا ہے۔ اس لئے وہ ان کی بات بخوبی سمجھتے تھے لیکن وہ خود غرضی اور مفاد پرستی میں اندھے ہو چکے تھے، اس لئے اس کی حقیقت اور مقصد ان کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

کسی بات کی حقیقت اور روح تک رسائی ایک دشوار اور دقت طلب کام ہے۔ ہر شخص

میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی، اس لئے تمام لوگ اسے انجام نہیں دے سکتے بلکہ اس طرح کے لوگ پوری انسانیت کا حاصل اور مغز ہوتے ہیں اور لعل و گہر کی طرح کمیاب ہوتے ہیں۔ اسی لئے قرآن مجید میں کہا گیا ہے کہ ’’مختلف قبیلوں اور گروہوں میں سے کچھ منتخب اشخاص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں رہ کر دینی ’’فقہ‘‘ حاصل کریں، اور جب ان کی قوم کے لوگ جہاد سے واپس آئیں تو یہ ان کے درمیان ’’انذار‘‘ کا کام کریں۔‘‘ (سورہ توبہ/۱۲۲)

حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب اللہ کے ان چنندہ بندوں میں سے تھے جنہیں اللہ تبارک وتعالی نے اس وصف کا بڑا حصہ عطا فرمایا تھا۔ انہوں نے چلتی پھرتی کتابوں کی تصنیف کا بیڑا اٹھایا تھا، یہی ان کا شوق تھا اور یہی ان کا مشغلہ۔ اس لئے ان کے متروکات میں حروف ونقوش کا ذخیرہ بہت کم ہے، تاہم جو کچھ بھی ہے اس سے ان کی فقہی بصیرت کا قدرے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ صرف ضرورت اس بات کی ہے کہ اس موضوع پر وہ لوگ قلم اٹھائیں جو ان کے ہم رتبہ اور اس میدان کے شہسوار ہیں۔ اور اپنا یہ حال ہے:

یہ رمزی بے بصیرت ہے تیرے رتبے کو کیا جانے
جو ہم رتبہ ہو تیرا وہ ترے اوصاف پہچانے

اس لئے محض اظہار عقیدت ومحبت کے لئے یہ چند صفحات سیاہ کئے گئے ہیں، اگر اس سے ان کی کچھ فقہی بصیرت واضح ہوتی ہو تو یہ اللہ کا کرم ہے اور اگر اس میں کچھ کمی محسوس ہوتی ہو تو یہ میرا نقص ہے۔ اللہ مجھے معاف فرمائے۔

لفظ ’’اللہ‘‘ میں مد کی تحقیق:

بعض لوگ اذان میں لفظ ’’اللہ‘‘ کی ’’الف‘‘ پر قواعد تجوید کا لحاظ کرتے ہوئے مد کرنے کو غلط بتایا کرتے تھے، اور اسے جائز نہیں سمجھتے تھے۔ اس مسئلہ میں ان میں بڑی شدت پائی جاتی تھی، اس طرح اذان دینے پر وہ شدت کے ساتھ نکیر کرتے اور مؤذنوں کو برملا ٹوک دیتے اور ان کی عزت نفس کا خیال بھی نہیں کرتے۔ چونکہ وقت کے ایک بڑے بزرگ کی طرف سے یہ آواز اٹھ رہی تھی اس لئے کسی کو کچھ کہنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی، لیکن ’’انذار‘‘ اور ’’خبردار‘‘ کرنا ایک فقیہ کا فرض منصبی ہے، اور اس سلسلہ میں کسی کی پرواہ نہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ حضرت والا نے اس سلسلے میں

پہل کی اور مفصل تحریر لکھی جس میں انہوں نے ثابت کیا کہ:

قواعد تجوید کی رعایت قرآنی الفاظ کے ساتھ خاص ہے۔ کیوں کہ تجوید و ترتیل کا وجوب جیسا کہ اہل علم میں معروف ہے، آیت ”ورتل القرآن ترتیلاً“ سے ثابت ہوتا ہے، اور کھلی بات ہے کہ یہ وجوب صرف قرآن کے سلسلہ میں ثابت ہوتا ہے، کلمات اذان، احادیث اور دوسری عبارات پر اس کا اطلاق مشکل ہے۔ اذان میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ ایسی کوئی غلطی نہ ہو جس سے معنی میں خرابی پیدا ہو، لیکن قواعد تجوید کا لحاظ کرنا لازمی نہیں ہے۔ اور لفظ اللہ میں مد کرنے سے معنی میں کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی بلکہ آواز کی بلندی اذان میں مطلوب ہے اور اس کے ذریعہ اس میں مدد ملتی ہے۔ اس میں آواز کو طول دینا اور بڑھانا آج کی کوئی چیز نہیں ہے یہ تو توارثاً منقول ہوتی آئی ہے۔ پچھلوں نے اگلوں سے حاصل کیا اور کسی نکیر کے بغیر مسلسل اسی طرح سے اذان دی جاتی رہی ہے۔ اگر یہ چیز غلط ہے تو فقہی کتابیں اس سے خاموش کیوں ہیں؟ جس میں اذان کی ہر چھوٹی بڑی غلطی بیان کی گئی ہے۔ اس رسالہ میں انہوں نے قواعد تجوید کے اعتبار سے بھی اس مد کے صحیح ہونے کو ثابت کیا ہے۔ (دیکھئے **المد التعظیمی لاسم الجلالة**)

گاؤں میں جمعہ:

گاؤں میں جمعہ کا مسئلہ ائمہ فقہ کے درمیان ایک اختلافی معاملہ ہے، حنفیہ کے یہاں جمعہ کے جواز کے لئے ”مصر جامع“ شرط ہے۔ مصر کے لفظ سے عام طور پر ذہن ایک بڑی اور کثیر آبادی کی طرف منتقل ہوتا ہے، اور اسی کے پیش نظر بعض لوگوں نے مصر کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”مصر وہ ہے جہاں کی آبادی چار ہزار ہو۔“ (الکوکب الدری: ج۱ ص۱۹۹) اور بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ ”جہاں کی آبادی ایک ہزار ہو، وہ مصر کہا جائے گا۔“ (حاشیہ حوالہ مذکورہ)

اور لفظ ”جامع“ کی طرف کسی کا دھیان نہیں جاتا اور اگر کبھی خیال بھی آتا ہے تو سوچ لیا جاتا ہے کہ ایک زائد اور بے معنی لفظ ہے۔ لیکن گاؤں میں جمعہ سے متعلق حضرت والا کے مضمون کے ذریعے اس لفظ کی معنویت واضح ہوتی ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ جسے نظر انداز کیا گیا ہے وہی اصل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ فقہ کی کتابوں میں مصر جامع اور سلطان کی شرطیں الگ الگ مذکور ہیں، اور ان دونوں کے مستقل احکام بیان کئے گئے ہیں، لیکن مصر کی جو تعریف ائمہ سے منقول ہے، اسے

بنظرِ غور دیکھا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان میں ایک شرط اصل ہے اور دوسری اس کے تابع اور فرع ہے۔ اگر اصل ختم ہوجائے تو جو تابع ہے وہ آپ سے آپ ختم ہوجائے گی۔ اس کے بعد انہوں نے مصر کی متعدد تعریفیں نقل کی ہیں اور آخر میں امام ابوحنیفہ کے مایۂ ناز استاذ حضرت عطا بن ابی رباح کے حوالے سے ''قریہ جامعہ'' کی یہ تعریف ذکر کی ہے:

''قریہ جامعہ ایسا قریہ ہے جہاں جماعت، امیر اور قاضی ہوں اور ملے جلے مکانات ہوں، جیسے جدہ۔'' (فتح الباری: ج۲ ص۳۸۵)

اور اس کے بعد رقم طراز ہیں:

> ''اس تفصیل سے مسئلہ کی یہ صورت سامنے آتی ہے کہ جمعہ کے لئے مطلق مصر کافی نہیں ہے، بلکہ مصر جامع ہونا چاہئے۔ جامع کی یہ اصطلاح حضرت عطا کے اثر میں بھی موجود ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جامع کی اصطلاح دورِ اول ہی میں رائج ہوچکی تھی۔ دوسرے یہ کہ مصر، مصر جامع اس وقت بنتا ہے جب کہ اس میں حاکم، نائب حاکم، یا قاضی موجود ہو، ورنہ وہ مطلق مصر تو ہوگا، مصر جامع نہ ہوگا۔
>
> پس حاصل یہ ہے کہ جمعہ اسی مصر میں درست ہوگا جس میں مذکورہ بالا افراد میں سے کوئی ہو، اور جس مصر میں امیر یا قاضی وغیرہ موجود نہ ہوں، وہ مصر جامع نہیں، اور اس میں جمعہ بھی درست نہ ہوگا۔ اور پھر اسی سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ کسی گاؤں میں اگر ان افراد میں سے کوئی موجود ہو، یعنی وہاں مستقل اس کا تعین ہو تو خواہ چھوٹا ہی گاؤں کیوں نہ ہو، اس میں جمعہ جائز ہے، لیکن یہ استدلال چونکہ مفہومِ مخالف سے ہے اور بعض مواقع پر یہ استدلال حنفیہ کے یہاں معتبر نہیں ہے، اسی لئے اس باب میں فقہا کی تصریحات پیش کی جاتی ہے۔'' (علوم و نکات: ج۱ ص۱۲۲)

اور ان تصریحات کے بعد لکھتے ہیں:

> ''حاصل یہ کہ ان فقہی عبارتوں پر غور کرنے سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ مصریت کی شرط بذاتِ خود مطلوب نہیں ہے، بلکہ مطلوب اصل حاکم و والی ہے، اور والی و حاکم چوں کہ عموماً ایسے ہی شہروں میں رہتے ہیں جن میں بازار و ملحقات ہوتے ہیں، نیز ان کی آبادی زیادہ ہوتی ہے،

> اس لئے مصر ہونا بھی اس کے ضمن میں مطلوب ہے .... گو کہ اس حاصل مطالعہ کے تسلیم کرنے میں حضرات فقہا واصحاب فتاوی کو تأمل ہوگا، لیکن وہ خود غور کریں، کیا اس کی کوئی تصریح ملتی ہے کہ جمعہ کے لئے مصر بذات خود مطلوب ہے؟ ہر جگہ ''مصر جامع'' یا ''قریہ جامع'' کی صراحت ہے، اور مصر جامع اور قریہ جامع کی روح ہے حاکم یا نائب حاکم کا اقامت گزیں ہونا۔'' (علوم ونکات: ج۱ص۱۲۶)

مضمون کا حاصل یہ ہے کہ مصر جامع میں حاکم کی شرط اصل ہے اور آبادی اور شہریت تابع اور ضمنی چیز ہے۔ اور جب ہندوستان کے پس منظر میں اصل شرط کے بغیر جمعہ جائز ہے تو ضمنی شرط پر کیوں اس قدر اصرار ہے؟ اس مضمون میں دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ جس لفظ کو زائد سمجھا گیا یا نظر انداز کیا گیا، اسے ایک فقیہ کی فقہی بصیرت نے یہ دیکھ لیا کہ وہی روح اور اصل مقصد ہے، اور اسی کے پیش نظر کوئی حکم لگانے کی ضرورت ہے۔

شرعی پنچایت یا قاضی:

ہندوستان میں بعض حلقوں کی طرف سے دار القضا قائم کئے گئے ہیں، جہاں شریعت کے مطابق فیصلہ کرنے کے دعوے کئے جاتے ہیں۔ کیا کافر حکمراں کی ماتحتی میں دار القضا کا قیام عمل میں لایا جاسکتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں عام طور پر اس طرح کی فقہی عبارتوں سے استدلال کیا جاتا ہے کہ:

> ''ویصیر القاضی قاضیا بتراضی المسلمین''. (ردالمختار: ج۴ص۳۰۸)
>
> ''مسلمانوں کی باہمی رضامندی سے قاضی، قاضی بن سکتا ہے۔''

یہ مروج اور بظاہر مضبوط دلیل کس قدر کمزور ہے، اس کی حقیقت حضرت الاستاذ کی اس تحریر سے آشکارا ہوتی ہے:

> ''عربی داں حضرات جانتے ہیں کہ ''صیر ورت'' میں کسی چیز کا ایک حالت سے دوسری حالت میں بدل جانا ہے، جیسے دودھ دہی بن گیا۔ اس عبارت کا مطلب یہ ہوا کہ جو شخص قاضی ہے وہ مسلمانوں کے حق میں قاضی اس وقت بن سکتا ہے جب مسلمانوں کی باہمی رضامندی اسے حاصل ہو جائے۔ اب غور کرنے کی بات ہے کہ ایسی کون سی صورت ہوگی کہ پہلے سے کوئی

شخص قاضی مقرر ہو مگر مسلمانوں کی رضامندی کے بغیر اس کی قضا معتبر نہ ہو، تو فقہا کی عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کا تعلق ایسی جگہ سے ہے جہاں مسلمانوں کی آبادی تو ہو مگر اقتدار کفار کا ہو، اور انہوں نے انتظامی مصلحتوں کے پیش نظر خاص مسلم مسائل کے تصفیہ کے لئے مسلمانوں ہی میں سے کسی کو قاضی بنادیا ہو، تو ایسا شخص حکومت کا قاضی تو ہے مگر مسلمانوں کے حق میں اس کے فیصلوں کا نفاذ مسلمانوں کی رضامندی کے بعد ہوگا۔'' (علوم نکات: ج ا ص ۱۳۶)

اس مفہوم کی تائید میں بعض فقہی عبارتوں کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

''حاصل ان سب عبارتوں کا ایک ہی ہے، وہ حکومت کافرہ کا مقرر کردہ قاضی بشرط رضامندئ اہل اسلام معتبر اور صحیح ہے۔ ان عبارتوں سے عامۃ المسلمین کی جانب سے قاضی کے تقرر پر کوئی روشنی نہیں پڑتی، البتہ اگر ہمیں اجازت ملے تو ہم یہ ضرور عرض کریں گے کہ ان عبارتوں کے مفہوم مخالف سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی رائے عامہ سے کسی کا قاضی بننا مطلقاً درست نہیں ہے، کیوں کہ اگر اس کی ذرا بھی گنجائش ہوتی تو فقہا کرام اس کا ذکر ضرور کرتے، اور اس طول عمل کی کوئی ضرورت نہ ہوتی کہ اولاً حکومت کافرہ کسی کو قاضی مقرر کرے پھر اہل اسلام اس پر اظہارِ رضامندی کریں، پھر وہ قاضی بنے۔ آخر جب ایک مختصر راہ موجود تھی کہ مسلمانوں کی رائے عامہ یا اربابِ حل وعقد کا انتخاب قاضی بنانے کے لئے کافی ہے تو اس طول طویل راہ اختیار کرنے کی حاجت کیا تھی؟ معلوم ہوا کہ فقہا کا ذہن رائے عامہ سے قاضی بنانے کی صورت سے یکسر خالی ہے۔ اس لئے اس طریقۂ انتخاب کو اختیار کرنا ایک بدعت ہے، جو بے دلیل بلکہ خلاف دلیل ہے۔ اب خلاف دلیل ہونا ملاحظہ فرمائیے.........'' (علوم و نکات: ج ا ص ۱۴۰)

اس کے بعد بعض فقہی عبارتیں نقل کی گئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ رائے عامہ سے قاضی کا تقرر معتبر نہیں ہے، اور مسلمانوں کو ضرورت تقرر قاضی کی نہیں بلکہ تقرر والی کی ہے کہ سب مسلمان مل کر کسی کو والی اور سلطان بنائیں اور قاضی کا انتخاب کریں۔

فی سبیل اللہ کا مصداق:

اس عنوان کے تحت رقم طراز ہیں:

> ’’فی سبیل اللہ کا مصداق اصالۃً تو وہی ہے جو عہدِ صحابہ وتابعین میں معروف تھا، جس کو تمام ائمہ نے نقل کیا ہے، اور وہی عہدِ نزولِ قرآن میں عام طور سے متعارف تھا، اور چاروں ائمہ اس کے قائل ہیں، یعنی ’’غازی‘‘ اور ’’مجاہد فی سبیل اللہ‘‘۔......... اس کا یہ مفہوم متواتر اور قطعی ہے، اس میں کسی طرح کے تردد اور ریب کی گنجائش نہیں ہے۔‘‘ (علوم ونکات: ج۱ ص۱۶۵)

ایک حدیث کے ذریعے اس کے مفہوم میں عموم پیدا کرنے کو کوشش کی جاتی ہے۔ حضرت والا اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> ’’اس حدیث سے بلاشبہہ یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حج بھی فی سبیل اللہ کا ایک فرد ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی بہت نمایاں طور پر ثابت ہوتی ہے کہ فی سبیل اللہ کا مصداق حضرات صحابہ کرام کے نزدیک حج نہیں تھا (صرف جہاد تھا) کیوں کہ اگر ان کے عرف میں حج اس کا مصداق ہوتا تو ام معقل حضور اکرم ﷺ کے ساتھ آپ کے آخری حج کی سعادت سے محروم ہونا گوارا نہ کرتیں، وہ خود بخود ساتھ ہو جاتیں، یا اگر شبہہ کے درجے میں بھی فی سبیل اللہ کا مصداق حج کو سمجھتیں تو آپ سے دریافت کر لیتیں، لیکن جب ایسا نہیں ہوا، حالانکہ ان پر حج فرض تھا، جانے کا شوق بھی تھا، تیاری بھی تھی، مگر نہ گئیں، اور نہ مسئلہ دریافت کیا، تو یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ حضرات صحابہ کرام کے عرف میں فی سبیل اللہ کا ایک ہی مصداق متعین تھا۔‘‘
>
> (علوم ونکات: ج۱ ص۱۶۶)

آگے انہوں نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے امت کی سہولت کے پیش نظر مرضیٔ حق پا کر فی سبیل اللہ کے لغوی مفہوم پر نظر فرماتے ہوئے اس میں حج کو بھی داخل فرمایا، تو درحقیقت یہ اس کا مصداق نہیں ہے۔ مصداق میں بہ لحاظ عموم لفظ کے داخل ہے، لیکن اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے مصارف زکوۃ میں آئے ہوئے ’فی سبیل اللہ‘ میں حاجی کو داخل کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس لئے حدیث میں ’فی سبیل اللہ‘ ایک دوسرے موقعہ پر آیا ہے، اور وہ مسئلہ وقف کا ہے۔ اور یہاں زکوۃ کا ہے۔ اور جس قدر احتیاط اور اہتمام زکوۃ میں درکار ہے جو اسلام کے بنیادی فرائض میں سے ایک ہے، اس قدر احتیاط و اہتمام وقف میں نہیں ہے۔

اس دقت نظر اور فقہی بصیرت کو بار بار پڑھئے اور دیکھئے کہ کس طرح سے نکھر کر یہ بات

سامنے آ گئی کہ مصارف زکوۃ میں 'فی سبیل اللہ' سے مراد خیر کے تمام کام نہیں ہیں۔ کیوں کہ اس عموم کی صورت میں مصارف زکوۃ کی فہرست بے معنی ہے بلکہ اس سے مراد صرف اللہ کی راہ میں جہاد و قتال کرنا ہے۔ اور اس کے عموم کے سلسلے میں جو دلیل پیش کی جاتی ہے وہ خود بتلاتی ہے کہ اس کا مصداق خاص ہے، عام نہیں۔

دارالحرب میں سود:

بعض لوگ کہتے ہیں کہ دارالحرب میں سودی معاملات کے جواز کے لئے قرآن وسنت میں کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ قرآن وحدیث میں عمومی طور پر ''ربا'' کو حرام قرار دیا گیا ہے، اس میں دارالحرب کا کوئی استثنا نہیں ہے، بلکہ جس طرح سے زنا، چوری اور شراب نوشی ہر جگہ حرام ہے، اسی طرح سے ربا بھی ہر ملک اور ہر شہر میں حرام ہے، خواہ مسلمان سے معاملہ ہو یا غیر مسلم سے۔

اس طرح کی پرزور اور پرشور عبارتوں کے ذریعہ یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ اس مسئلے میں حنفیہ کی دلیل نہایت کمزور ہے، اس لئے کسی بھی طور پر اس پر عمل کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن حقیقت کیا ہے؟ اس سلسلے میں حضرت والا کی تحریروں کا حاصل پڑھئے۔ وہ لکھتے ہیں ''حربی کا مال معصوم نہیں ہوتا، اور معصوم نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں حق تعالی نے مالِ غنیمت کو اہل اسلام کے حق میں حلال قرار دیا ہے۔ اور مالِ غنیمت اہلِ حرب کا وہ مال ہے جو ان سے جنگ میں حاصل کیا گیا ہو، اگر وہ مباح نہ ہوتا تو اس پر ملکیت بھی ثابت نہ ہوتی..........

اس میں نکتہ یہ ہے کہ اموال میں اصل اباحت ہے، حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک یہی مختار ہے، جب تک شریعت انہیں کسی خاص فرد یا جماعت کے ساتھ مخصوص کر کے دوسروں کے لئے نا قابل دست اندازی نہ قرار دیدے۔ البتہ جب اس پر کسی کا شرعاً قبضہ اور ملکیت ثابت ہو جائے تو وہ مال معصوم بن گیا۔''

''اب اس پر غور کرنا ہے کہ مال میں عصمت اور احراز کب اور کہاں پیدا ہوتا ہے؟ اس سلسلہ میں فقہا کی تصریحات دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ احراز کا تعلق کسی کے قبضے میں آ جانے سے نہیں، بلکہ اس کا تعلق دارالاسلام میں آ جانے سے ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مال دارالحرب میں مال غنیمت نہیں ہے بلکہ وہ اپنی اصلی اباحت پر ہے، جو اہل اسلام کے لئے مال غنیمت بن سکتا

ہے۔‘‘

’’واضح رہے کہ یہ مسئلہ یعنی یہ کہ مال حربی دارالحرب میں معصوم نہیں ہوتا ہے، مختلف فیہ نہیں، متفق علیہ ہے۔ ورنہ اگر وہ مال معصوم ہوتو مال غنیمت بننے کا محل نہیں ہوسکتا ہے۔ اس لئے حربی کا مال فی نفسہ مباح ہے لیکن اس کی رضامندی کے بغیر لینا درست نہیں، کیوں کہ اس میں معاہدہ کی خلاف ورزی ہے، لیکن جب ان کی رضامندی حاصل کرلی گئی تو خلاف ورزی کا معنی باقی نہیں رہا۔ اب اس کا مال لینا مال مباح پر تسلط حاصل کرنا ہے۔ اور یہ معاملہ تملک نہیں بلکہ شرط تملک کی تحصیل ہے اور وہ رضامندی ہے۔ کیوں کہ حربی کی ملکیت اس کے بغیر زائل نہیں ہوگی، اور جب حربی کی ملکیت زائل ہوگئی تو مسلم کے قبضہ کے بعد ملکیت ثابت ہوگئی، اور یہ ملکیت قبضہ سے ہے نہ کہ عقد سے۔ پس ربا کا تحقق نہیں ہوا۔ کیوں کہ ربا اس فضل (اضافہ) کو کہتے ہیں جو عقد کے نتیجے میں حاصل ہو۔‘‘

اس کے بعد رقم طراز ہیں:

> ’’اس گفتگو سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دارالحرب میں ربا کی حلت کا کوئی مسئلہ نہیں ہے، ربا خواہ کہیں ہو حرام ہے، اور نص قطعی کے رو سے حرام ہے، اس میں نہ کسی کا اختلاف ہے اور نہ ہوسکتا ہے، کیونکہ نصوص صریحہ سے اس کی حرمت ثابت ہے۔ اختلاف جو کچھ ہے، اس میں ہے کہ ربا کا مصداق کیا ہے؟ جو کچھ ربا کے دائرے میں آئے گا وہ حرام ہے، خواہ وہ دارالاسلام میں ہو یا دارالحرب میں۔ اور جو ربا کے دائرہ سے خارج ہے، اسے حرام کہنے کی کوئی وجہ نہیں الا یہ کہ کوئی اور وجہ حرمت پائی جائے۔‘‘ (علوم ونکات: ج۱ص۱۰۲)

ربا کیا ہے؟ اس کے مصداق کے سلسلے میں ربا کی دوسری قسم ’’ربا الفضل‘‘ میں بھی فقہا کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ حدیث میں گیہوں، جو، نمک، کھجور اور سونے چاندی میں ’’ربا الفضل‘‘ کا ذکر ہے۔ اس میں ربا کی علت کیا ہے؟ اس سلسلہ میں ائمہ کی رائیں مختلف ہیں، اور اس اختلاف کی وجہ سے بعض چیزیں ایک فقیہ کے نزدیک ربا کا مصداق ہیں جبکہ دوسرے کے نزدیک اس میں ربا نہیں ہے۔ بلکہ ظاہریہ کے نزدیک ان چھ کے علاوہ کسی چیز میں ربا الفضل نہیں ہے، تو کیا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان کے نزدیک ربا حلال ہے؟ اس سلسلہ میں تفصیلی بحث کے بعد آگے

لکھتے ہیں:

> ’’حاصل یہ ہے کہ مسئلہ کی نوعیت یہ نہیں کہ دارالحرب میں سود جائز ہے، سود تو کسی حال میں جائز نہیں ہے۔ اصل صورت حال یہ ہے کہ دارالحرب میں جو مال حربی سے لیا جاتا ہے، اس پر شرعاً سود کا اطلاق ہوگا یا نہیں؟ اس مسئلہ کا تعلق اجتہاد سے ہے۔ نصوص قطعیہ میں اس کی تصریح نہیں، حدیث مکحول اور حربی کے مال کی شرعی حیثیت سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ اس پر سود کا اطلاق نہیں ہوگا، کیونکہ وہ مال مباح ہے، جو محل ربا نہیں ہے۔‘‘ (علوم ونکات: ج۱ص۱۰۴)

ان مثالوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ فقہ کسے کہتے ہیں؟ اور فقہی بصیرت کیا ہے؟ اور حضرت والا کا اس سلسلہ میں کیا مقام ومرتبہ تھا؟ اور انہوں نے فقہی ذخیرے میں کتنے بیش قیمت اضافے کئے ہیں۔

مدارج احکام کی رعایت:

کتاب وسنت کے نصوص دلالت کے اعتبار سے یکساں نہیں ہیں، اسی طرح ان سے مستنبط مسائل کے درجے میں بھی یکسانیت نہیں ہے۔ اور فرق مراتب کا لحاظ رکھنا بھی فقہی ذوق و بصیرت کا آئینہ دار ہے۔ حضرت والا فقہ حنفی کے مقلد بلکہ اس میں ایک گونہ متصلب تھے، تاہم منصوص واجماعی مسائل اور اجتہادی واختلافی امور میں فرق کے قائل تھے۔ پہلے میں معمولی انحراف بھی انہیں گوارا نہیں تھا، اور دوسرے میں تشدد اور انتہا پسندی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اور اس طرح کے مسائل میں مختلف نقطۂ نظر کے حاملین کی عزت واحترام کا بھرپور لحاظ رکھتے، اور تنقیص کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ لفظ اللہ میں مد کے مسئلے میں لکھتے ہیں کہ:

> ’’اساتذہ کی صحبت اور کتابوں کے مطالعہ سے میرے دل میں ایک عرصے سے یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ اس جیسے فروعی اور اجتہادی مسائل میں کسی پہلو پر شدت اختیار کرنی مناسب نہیں ہے‘‘۔ (ص۶)

اور گاؤں میں جمعہ کے مسئلے پر لکھتے ہیں:

> جمعہ کے لئے اشتراط مصر کا مسئلہ ایسے قطعی مسائل میں سے ہرگز نہیں ہے، جن میں اختلاف کی گنجائش نہ ہو۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ تین امام اس پر متفق ہیں کہ اس میں مصر شرط نہیں

ہے۔ پھر احناف کے یہاں بھی دوراول کے بعض مسائل وآراء میں نسخ وترمیم کا سلسلہ چلتا رہا، فقہ کی کتابوں میں دیکھ لیجئے، سلطان وحاکم کا مسئلہ کس شدومد کے ساتھ مع اس کی جزئیات کے بیان کیا گیا ہے، لیکن اب اس پر عمل نہیں ہے۔ ابتدائی روایات میں ایک شہر میں دو جمعہ کی گنجائش سرے سے نہ تھی، ایک ہی جمعہ جائز تھا، دوسرا کالعدم تھا۔ پھر بعض خاص حالات میں دو جمعہ کی اجازت دی گئی۔ اور اب یہ سب قصے کہانیاں ہیں، ایک ہی شہر میں نہ جانے کتنے جمعے پڑھے جاتے ہیں، اور سب جائز ہیں۔ کیا اس صورت حال میں اس کی گنجائش نہیں ہے کہ گاؤں میں جمعہ پڑھنے کی اجازت دیدی جائے؟............‘‘

’’بعض حضرات یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ گاؤں جمعہ کا محل نہیں ہے، لہٰذا اس میں جمعہ پڑھنے کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی بمبئ جاکر حج کرآئے۔ ظاہر ہے بمبئ حج کا محل نہیں ہے، اگر کوئی ایسا کرے تو ساری دنیا اسے بےوقوف کہے گی، ایسے ہی گاؤں جب محل جمعہ نہیں ہے تو اس میں جمعہ کا کیسا سوال؟ بادی النظر میں یہ مثال بہت برمحل معلوم ہوتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس جگہ کے لئے یہ مثال قطعاً موزوں نہیں ہے، کیونکہ حج کے لئے عرفات، مزدلفہ، منی، اور مکہ معظّمہ کی سرزمین نص قطعی سے متعین ہے، اسی لئے وہاں تو کسی اور محل کا تصور ہی نہیں۔ اور جمعہ کے لئے کون سی نص قطعی ایسی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہو کہ جمعہ کا محل صرف مصر ہے، اور کوئی نہیں۔ اگر ایسی کوئی نص قطعی یہاں بھی ہوتی تو یہ اختلاف ہی کیوں پیدا ہوتا؟ یہ مثال بےجا تشدد پر مبنی ہے، جو اہل علم کے شایان شان نہیں۔‘‘ (علوم ونکات: ج۱ص۱۳۲)

دارالحرب میں حربی کو سود دینے کے سلسلے میں رقم طراز ہیں:

’’اور اسی سلسلے میں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ سود دینے اور سود لینے میں یکساں حرمت ومعصیت ہے یا کچھ فرق بھی ہے؟ اس سوال پر غور کرنے سے پہلے یہ قاعدہ یاد کرلینا چاہئے کہ جس چیز کی حرمت براہ راست قرآن کریم سے ثابت ہو، اور جس چیز کی حرمت خبر واحد سے ثابت ہو، فقہا دونوں کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ کیونکہ قرآن قطعی الثبوت ہے، اور حدیث ظنی الثبوت۔ قرآن کا منکر کافر ہوگا اور حدیث کا منکر کافر نہیں ہے۔ اسی طرح دونوں کے آثار میں بھی فرق ہوگا۔ ایک کی معصیت بڑھی ہوگی، اور دوسرے کی معصیت اس کے مقابلے میں

> ہلکی ہوگی۔ ایک میں اباحت کی گنجائش نہ ہوگی، بجز حالتِ اضطرار کے، اور دوسرے میں حالتِ اضطرار سے کم پر بھی گنجائش مل سکتی ہے۔‘‘ (علوم ونکات: ج ا ص ۱۰۵)

یسر اور سہولت کا خیال:

حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو جب دو معاملوں میں سے کسی ایک کے انتخاب کا موقع دیا جاتا تو آپ آسان تر کو اختیار کرتے۔ اور امام سفیان ثوری کہتے ہیں کہ:

> ’’ہمارے نزدیک ’’علم‘‘ اس کا نام ہے کہ ایک ثقہ شخص جس کے علم وتقوی پر بھروسہ کیا جاسکتا ہو، وہ لوگوں کے لئے حتی الامکان سہولت کا راستہ نکالے۔ صرف اتنا کہہ دینا کہ یہ چیز حرام ہے، یہ کام تو ہر شخص کو آتا ہے‘‘۔

اور اس کے نقل کے بعد مولانا تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

> ’’لیکن امت کی نبض پر جس کا ہاتھ ہو، وہ ہر مسئلے کا حل گہرائی میں جا کر تلاش کرے گا اور حقیقت حال تک پہونچنے کی کوشش کرے گا، اور لوگوں کے لئے حتی الامکان دین کے حدود میں آسانی کا راستہ تلاش کر کے بتلائے گا۔‘‘ (ماہ نامہ راہ اعتدال، عمر آباد۔ ۱۸؍اگست ۲۰۱۰ء)

ایک فقیہ کا دل امت کی محبت وشفقت سے لبریز ہوتا ہے، اس لئے لوگوں کے لئے ہر ممکن سہولت فراہم کرتا ہے۔ وہ لوگوں کو دین سے متنفر اور دور ہونے سے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ حضرت والا لکھتے ہیں:

> ’’شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ میں ان سب مباحث سے قطع نظر ایک اور بات جو ہر دور اور ہر جگہ چل سکنے والی ہے، تحریر فرمائی ہے۔ اس پر موجودہ دور میں غور کرنا چاہئے، اور کسی بھی درجہ میں قابل عمل ہو تو امت کی سہولت کے واسطے اس پر فتوی دینا چاہئے۔ لکھتے ہیں کہ...... ’’رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جمعہ پچاس آدمی پر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ پچاس آدمی کے ہونے کی وجہ سے کسی آبادی کو قریہ کہا جاسکتا ہے، اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جمعہ ہر قریہ پر واجب ہے۔‘‘
>
> اگر فی زمانہ اس پر فتوی دیا جائے تو بڑی سہولت ہو جائے۔‘‘ (۱۳۱)

اور اس مضمون کے آخر میں لکھتے ہیں:

> ’’پس جب مسئلہ مختلف فیہ ہے، تو ان مصالح وضروریات پر نظر کر کے حضرات اہل فتوی اس مسئلہ میں تسہیل کی راہ اختیار فرمائیں تو کیا عجب کہ خیر کی بعض صورتیں پیدا ہوں، گو کہ مسلمانوں کے عام مزاج کے پیش نظر ہم یہ بات پورے یقین اور وثوق سے نہیں کہہ سکتے، کیونکہ طبائع نزاع وشقاق پر اس درجہ مستعد ہیں کہ ذرا سا بہانہ بڑی لڑائی کے لئے کافی ہوتا ہے، تاہم ایک بڑا جھگڑا جو وجہِ انتشار بنا رہتا ہے، کم سے کم ہو جائے گا۔‘‘ (علوم ونکات: ج ا ص ۱۳۴)

حالات وزمانہ کا لحاظ:

کہا جاتا ہے ایک مرتبہ دوران سفر امام ابو یوسف نے امامت کرتے ہوئے فجر کی نماز میں ”**قل اعوذ برب الفلق**“ اور ”**قل اعوذ برب الناس**“ پڑھی، سلام پھیرنے کے بعد امام ابوحنیفہ نے اس مختصر نماز پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ”**یعقوب صار فقیهاً**“. (ابو یوسف تو فقیہ بن گئے)

یعنی سب کو ایک ہی ڈنڈے سے ہانکنے کا نام فقہ نہیں ہے بلکہ حالات اور زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر امت کی رہنمائی کا نام فقہ ہے۔ چنانچہ حضرت والا کے مضامین میں بھی اس کی واضح طور پر رعایت ملتی ہے۔ ’’نوٹوں کی شرعی حیثیت‘‘ نامی مقالہ میں لکھتے ہیں:

> ’’بلاشبہہ نوٹ وثیقہ قرض ہیں، اور باہمی معاملات میں سند حوالہ ہیں، لیکن بحالات موجودہ اگر ان پر احکام صرف اسی ایک حیثیت سے نافذ کئے جائیں تو لوگوں کے تمام دینی معاملات اور دنیاوی کاروبار درہم برہم ہو کر رہ جائیں گے۔ جب چاندی کے سکے رائج تھے اور ثانوی حیثیت سے نوٹ چل رہے تھے، تب تو خیر گنجائش تھی، لیکن اب صورت حال نے کچھ ایسا رخ اختیار کر لیا ہے کہ اولاً چاندی کے سکے کالعدم ہو گئے، اور جو روپیہ سکہ کی صورت میں رائج ہے، وہ گلٹ وغیرہ معمولی دھاتوں کا مرکب ہوتا ہے، جس کی مالیت خود مفروض اور اصطلاحی ہے، چاندی کی حیثیت اسے قطعاً حاصل نہیں ہے۔ دوسرے اس کا رواج نوٹ کے مقابلے میں اتنا قلیل ہے کہ اسے کالعدم ہی سمجھنا چاہئے۔ اب تو مدت العمر چاندی کے سکے دیکھنے کو نہیں ملتے۔ مذکورہ بالا احکام کا اگر موجودہ وقت میں نفاذ کرنا چاہیں تو نہ صرف یہ کہ حرجِ شدید پیش آئے گا، بلکہ بیشتر کاروبار معطل ہو جائیں گے۔ ایسی صورت میں ناگزیر تھا کہ نوٹ پر سابقہ

حیثیت کے علاوہ دوسری حیثیت سے بھی غور کیا جائے، گو کہ احتیاط اسی پہلو میں تھا، مگر مجبوری اور ضرورت کے پیش نظر سہولت کی تلاش بھی شریعت کی منشا کی تکمیل ہے۔'' (علوم ونکات: ج ا ص ۸۹)

تفردات سے گریز:

حضرت والا سے بارہا سنا کہ امام مالک نے جب مؤطا لکھنا شروع کیا تو ہارون رشید نے ان سے کہا کہ ''حضرت عبداللہ بن مسعود کی سختیوں، حضرت عبداللہ بن عباس کی سہولت و رخصت اور حضرت عبداللہ ابن عمر کے تفردات سے اجتناب کیجئے گا۔'' جب صحابہ کرام کے تفردات کا اعتبار نہیں ہے تو ہما شما کس قطار و شمار میں ہیں۔

اس لئے وہ شاذ رایوں سے شدت سے اجتناب کیا کرتے تھے۔ منصوص اور اجماعی طریقے سے انحراف انہیں گوارا نہیں تھا۔ گاؤں میں جمعہ کے جواز کا مسئلہ بظاہر ان کا تفرد ہے لیکن درحقیقت ان کی پوری تحریر حضرت مولانا قاسم نانوتوی کی ترجمانی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> ''راقم الحروف اس خیال یا نظریہ کا موجد نہیں ہے، اکابر دیوبند میں حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتوی کی ذات محتاجِ تعارف نہیں...... یہ خیال انہیں کے ایک مکتوب سے ماخوذ ہے۔'' (علوم ونکات: ا ص ۱۲۷)

مصرف زکوۃ فی سبیل اللہ میں عموم کے نظریہ کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''یاد رکھنا چاہئے کہ زکوۃ محض رفاہِ عام کی چیز نہیں ہے، یہ ایک عبادت ہے، اس کے حدود حق تعالی کی طرف سے متعین ہیں، ان حدود کی رعایت بطور عبادت کے کرنا چاہئے، اگر رفاہِ عام کی چیز ہوتی تو اس کے لئے اتنے اہتمام سے مصارف بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اگر شاذ رایوں کا اعتبار کرلیا جائے تو غربا و مساکین کو زکوۃ ملنی مشکل ہوجائے گی۔ یہ تنظیمیں، یہ اکادمیاں اور یہ رفاہی ادارے جو اپنی پشت پر مؤثر افراد کی طاقت رکھتے ہیں اور انہیں سرمایہ بھی زیادہ درکار ہوتا ہے، سب زکوۃ لے اڑیں گے، اور غربا و مساکین بلکہ مدرسے بھی منھ دیکھتے رہ جائیں گے۔

تفردات کو پڑھ لیجئے، مگر نہ انہیں استدلال میں پیش کیجئے اور نہ امت کے سامنے لایئے

کہ اس سے عجیب فکری انتشار رہوتا ہے۔ ’’ (علوم ونکات: ج ا ص ۱۸۳)

وہ کہا کرتے تھے کہ تفردات ذہانت کے کرشمے ہیں، اور ذہین لوگوں کی مثال ٹرک کے لائٹ جیسی ہے کہ اس کی روشنی میں سامنے کی سمت میں بہت دور تک دیکھا جاسکتا ہے لیکن آس پاس اندھیرا ہوتا ہے، اور لالٹین کی روشنی اس کے مقابلے میں کچھ نہیں ہے لیکن وہ چہارسو پھیلی ہوتی ہے۔ اسی طرح ذہانت زدہ لوگ صرف سامنے کی چیز دیکھتے ہیں اور آس پاس پر نظر نہیں ڈالتے، جس کی وجہ سے تفردات وجود میں آتے ہیں اور امت ایک آزمائش اور کشمکش میں مبتلا ہوجاتی ہے۔ حضرت عمر نے حضرت زہاد کو گورنری سے معزول کردیا، انہوں نے دریافت کیا کہ معزولی کی وجہ کیا ہے؟ کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے؟ یا کسی نے میری شکایت کی ہے؟ حضرت عمر نے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں مگر مجھے تمہاری ذہانت سے ڈر ہے کہ اس کی وجہ سے امت کسی آزمائش کا شکار نہ ہوجائے۔

یہی وجہ ہے کہ جب ان کے سامنے فکری فساد یا فقہی انحراف کی کوئی مثال آتی تو تردید اپنی ذمہ داری محسوس کرتے، اور تردیدی تحریروں میں یک گونہ شدت اور تلخی آجاتی، جو ایک مومنانہ شان ہے۔ اگر اس طرح کی تحریر کو پڑھنا ہو تو ’’محکمہ شرعیہ، جمعیۃ العلما مئوناتھ بھنجن کا ایک اہم فیصلہ فسخ نکاح کا تحقیقی وتفصیلی جائزہ‘‘ اور ’’رجم‘‘ سے متعلق مضمون کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

❑❑❑

لیکن اللہ والے خسارے میں ہیں؟ یہ کامیاب نہیں ہیں؟ نہیں ان کے خسارے میں ہونے کا سوال ہی نہیں، جتنا صدمہ بڑھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عنایتیں دم بہ دم بڑھتی ہیں، دنیا ان کی قدر نہ کرے، آسمان کی مخلوق ان کی قدر کرتی ہے، آسمان وزمین کا خالق ان کی قدر کرتا ہے، زمین پر سناٹا ہے مگر آسمانوں میں ان کی گونج سنائی دیتی ہے، آدمی ان سے انحراف کرتا ہے، لیکن فرشتے مسلسل متوجہ ہیں۔ (حدیث دوستاں)

حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی
اور تصوف وسلوک

مفتی شرف الدین عظیم قاسمی اعظمی
مقیم حال انوار مسجد شیواجی نگر گوونڈی ممبئی ۴۳

آفتاب مشرق سے مغرب کی مسافت طے کر چکا تھا، اور اس کی سرخ کرنیں افق کی سیاہی میں پھیل چکی تھیں، چرخ نیلی فام کی وسیع پیشانی پر ستاروں کی کہکشاں آباد ہو چکی تھی، رب العالمین کی بارگاہ میں جبین نیاز خم کرنے والے عبادت گزار نماز مغرب کا فریضہ بجالانے کے بعد مکانوں کی طرف واپس ہو چکے تھے۔ سکون وخاموشی کی خنک فضاؤں میں خلاق عالم کے روح پرور کلام مقدس میں محو عندلیبان گلشن نبوت کے سحر انگیز نغمے ارتعاش پیدا کر رہے تھے۔ چند ثانئے کے بعد جب کاروان شب ایک منزل عبور کر چکا ہے، آبادی سے بالکل باہر قلعے کے مانند مسجد کی بلند وبالا عمارت میں اب ان نونہالان امت مسلمہ کی وہ آوازیں بھی خاموش ہو گئیں جو خالق ارض و سما کے کلام کو اپنے پاکیزہ سینوں میں محفوظ کرنے کے لئے وارفتگی کے عالم میں زبانوں پر جاری ہوتیں اور مہیب سناٹے کو چیرتی کہیں دور نکل جاتیں۔ لیکن دبیز تاریکیوں کے اس وحشت زدہ ماحول میں ایک وجود ایسا بھی ہے جو آغاز شب سے معبود حقیقی کے سامنے عجز ونیاز کی تصویر اور پیکر عبادت وبندگی بن کر دنیا مافیہا سے بے خبر عالم بے خودی وسرشاری میں ایستادہ ہے۔ رب دو جہاں کے سامنے گریہ وزاری کی حالت میں، عاجزی ودرماندگی، شیفتگی وبے خودی کی کیفیت، قیام میں تلاوت قرآن پر رقت انگیزی، سجدہائے دراز میں آنسوؤں کی برسات، بارگاہ حمدیت میں اٹھی ہوئی

ہتھیلیوں پر خشیت الٰہی کا ارتعاش، نور سنت سے مزین وشاداب اور شگفتہ چہرے پر بکھری ہوئی محبت رسول ﷺ کی روشنی صاف کہے دیتی تھی کہ شمع ایمان اور نور یقین سے منور اور سجدۂ عبودیت سے سرشار اس ہستیٔ پاک طینت کی رگوں میں عشق الٰہی اور حب رسول کی آگ خون بن کر گردش کر رہی ہے۔ شوق وتڑپ، اضطراب وبے قراری کا ایک سمندر ہے جو اس کے نہاں خانہ دل میں موجزن ہے۔ جسم کا ایک اک عضو خالق دو جہاں اور محبوب دو عالم ﷺ کی دیوانگی وسرمستی کی خوشبوئے جاں فزا سے مشکبار اور خداوند عالم کی محبت والفت اور اخلاص وللّٰہیت کی حرارت سے تحلیل شدہ جام طہور سے سرشار ہے۔ یقیناً اب آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ مذکورۃ الصدر صفات کی حامل وہ ذات کون ہے؟ جی ہاں، وہ مجسم عبادت وریاضت، زہد واستغنا اور خوف آخرت وخشیت الٰہی کا پیکر، صلاح وتقوی کا ماہتاب، سلوک ومعرفت کی راہ کا روشن مینار، اسلاف کی پاکیزہ روایتوں کا امین، جادہ عشق ووفا کا بے باک پاسبان، سرمایہ تعلیم وتربیت کا مخلص نگہبان اور ہمہ گیر شخصیت حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی کی ذات گرامی ہے۔

مبدأ فیاض نے ممدوح محترم کو بے شمار کمالات وخوبیوں سے نوازا تھا، وہ جہاں ایک متبحر صاحب نظر عالم، دیدہ ور فقیہ، عظیم محدث ومفسر، بے نظیر سوانح نگار، صاحب طرز ادیب، بے مثال معلم ومدرس، سحر انگیز خطیب اور بلند پایہ مصنف تھے، وہیں عملی دنیا میں زہد وتقوی، رجوع وانابت الی اللہ، تواضع وانکساری، حلم وبردباری، بے نفسی وخدا ترسی، رحم دلی وہمدردی جیسی عظیم ملکوتی صفات ان کی ذات میں اس طرح پیوست تھی جیسے گلوں میں خوشبو، اور آفتاب میں روشنی۔ بندگان خدا سے محبت والفت، ہمدردی وکرم گستری آں محترم کی طبیعت اور دونوں جہانوں میں ان کی کامیابی وسرخ روئی کی فکر وتڑپ، بے تابی وبے قراری فطرت بن گئی تھی۔

انسانی خصائل اور ملکوتی صفات میں ’’عشق ومحبت‘‘ ایک ایسا عنصر اور ایسی خصلت ہے جو انسانیت کو کمالات کی دنیا میں اور محبوبیت ومقبولیت کی کائنات میں اوج ثریا پر پہونچا دیتی ہے۔ دلوں میں اخلاص وبرکات کے انوار، عشق رسول میں دیوانگی اور عبادت وبندگی میں سرشاری در حقیقت اسی کی حرارت کا کرشمہ اور لذت سحر خیزی اور یاد الٰہی میں جذب وفنائیت اسی کی گرمی کا اثر ہے۔ اگر دل کی دنیا اس عنصر سے خالی ہوجائے تو عبادتیں بے روح وبے جان اور اعمال واذکار

بے نور و بے کیف ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت حقہ میں اس صفت کو درجۂ اساسی حاصل ہے اور اسی کو اسلام نے ''تزکیہ و احسان'' سے تعبیر کیا ہے۔

تصوف و احسان اس کے سوا کیا ہے کہ بندہ صدق دل سے معبود حقیقی کا مطیع و فرماں بردار ہو جائے اور سنت نبوی کی روشنی میں احکام الٰہیہ مزاج و عادت بن جائیں۔ یقین راسخ، ایمان محکم، زہد و تقوی، صبر و شکر، سادگی و قناعت، خوف و رجا، توکل و رضا اور خشوع و خضوع اس کی حیات کا لازمی حصہ بن جائیں جو شریعت کی نگاہ میں اول درجہ میں مطلوب و مقصود ہیں۔ اخلاص و للّٰہیت کے ہفت آسمان پر نہیں بلکہ اس سے بھی ماورا مقام پر فائز ہونے کے باوجود محسن انسانیت سرکار دو عالم ﷺ انہیں صفات کی دعائیں رب دو جہاں سے مانگا کرتے تھے۔ ''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا ''اے اللہ! مجھ کو ایسا یقین نصیب فرما کہ دنیا کی مصیبتیں مجھ پر آسان ہو جائیں۔'' (الحدیث) حضرت مولانا اسماعیل شہید علیہ الرحمہ فرماتے ہیں ''جب دل حرارت عشق کے باعث رذائل سے صاف ہو جاتا ہے، فضائل مثلاً قناعت، سخاوت عفت، صبر و شکر، رضا و توکل خود بخود حاصل ہو جاتے ہیں''۔ (صراط مستقیم بحوالہ ''تصوف کیا ہے؟'' مولانا منظور نعمانی)

استاذ محترم حضرت مولانا کی ذات میں قسام ازل نے محبت و ہمدردی کا یہ عنصر خاص وافر مقدار میں ودیعت کیا تھا، اس احسان کا اظہار خود آپ نے ایک جگہ کیا ہے: ''ایک بات جسے آغاز شعور سے محسوس کرتا ہوں اور جس کے محور پر میری زندگی عمر کے ہر ہر مرحلے میں گردش کرتی رہی، وہ جذبہ محبت کی فراوانی ہے۔ مجھے بارہا محسوس ہوا کہ میرا دل صرف محبت کے لئے وضع ہوا ہے''۔ (حکایت ہستی ۱۵۲) تاہم آپ نے کبھی اس لطیف و قیمتی جوہر کو دنیا و حصول دنیا کے جذبات سے آلودہ نہیں کیا بلکہ جادہ معرفت حق میں مجاہدات و ریاضات سے اس طرح اس کو آراستہ کیا کہ قلب و روح سے لے کر پورا سراپا عشق خدا و محبت رسول میں ڈوب گیا۔ عبادت جو سن شعور کا شوق تھا، اب غذا بن گئی، اوراد و اذکار جو بچپن کا ذوق تھا، اب تسکین روح کا سامان بن گیا۔ حق یہ ہے کہ جو اپنے آپ کو مکمل طور پر خدائے قادر و وہاب کے سپرد کر دیتا ہے خدا تعالیٰ بھی اپنی محبتوں، رحمتوں عنایتوں کے دروازے اس پیکر عبدیت پر کھول دیتا ہے۔ حضرت والا کے شب و روز کے اعمال و

اشغال کو دیکھنے کے بعد اس فرمان صادق پر ایمان مزید پختہ ہوجاتا ہے ”من کان للہ کان اللہ لـــــہ“. اس لئے کہ آفتاب کی شعاؤں کے زمین کی سطح پر بکھرتے ہی تعلیم وتدریس کی مشغولیت، ارادت مندوں کی دل جوئی، حاجت مندوں کی اشک شوئی، سرشام وعظ وارشاد کی مجلس، کتابوں کے مطالعے، علمی وتحقیقی نگارشات، متوسلین ومنتسبین کے خطوط کے جوابات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ اور پھر فرائض وواجبات، سنن ونوافل، چاشت واوابین وقیام اللیل اور دیگر اوراد ووظائف کے معمولات میں حد درجہ اہتمام وانہماک اور اس قدر بے خودی وسرمستی کہ دل بے ساختہ یہ کہنے پر مجبور ہوجائے کہ آپ کی ذات میں متقدمین صلحائے امت، جنید وشبلی وعطار رومی کی روح اتر آئی ہے۔ یقیناً اعمال صالحہ کی یہ صورتیں رب کریم کی مخصوص توجہات وبرکات کے بغیر بظاہر ممکن نہیں ہیں۔

اسلاف سے انسیت ومحبت:

آپ نے ایسے دیندار گھرانے میں آنکھیں کھولیں جہاں صلحائے امت کی لازوال قربانیوں کی ایمان افروز حکایات اور بزرگان دین سے وابستگی کو قیمتی متاع سمجھا جاتا تھا، باضابطہ عالم دین سے اگرچہ گھر خالی تھا، تاہم تقوی وپرہیزگاری عبادت وریاضت اور ذکر وتلاوت کے زمزموں سے گھر کی فضائیں روشن اور منور تھیں۔ بڑوں کی مجلسوں میں سیرت نبوی اور دیگر دینی و اصلاحی موضوعات پر مشتمل کتابیں کم سنی کے عہد میں آپ سے پڑھائی جاتیں، خداداد ذہانت و ذکاوت اور کثرت مطالعہ کے باعث اردو زبان عمر کے لحاظ سے کہیں زیادہ معیاری تھی، سو روانی سے بآواز بلند حضرت والا پڑھتے جاتے اور بزرگ حضرات ہمہ تن گوش ہوتے، یہاں تک چند دنوں میں کتاب ختم ہوجاتی اور اس کی جگہ پر پھر دوسری کتاب آجاتی اور یہ سلسلہ چلتا رہتا۔

عہد طفولیت میں جب طغرائے قلب بالکل سادہ اور شفاف ہوتا ہے، کتابوں کی تلاوت اور گرد وپیش کے دینی واصلاحی ماحول کا لازمی اثر یہ ہوا کہ لوح قلب پر محبت وعقیدت نقش کالحجر ہوگئی۔ حکایت دلنواز کا یہ منظر آیئے خود ممدوح محترم کی شگفتہ تحریروں کے آئینے میں دیکھتے ہیں:

> ”اس مجلس بزرگاں میں جب ”مقامع الحدید“ پوری ہوگئی تو خیال آتا ہے دوبارہ پھر پڑھی گئی۔ اب لوگوں کو کتاب سننے کا ایک چسکا لگ گیا۔ ان لوگوں نے حاجی صاحب سے

> فرمائش کی کہ کوئی اور کتاب لایئے، وہ ایک پرانی کتاب کہیں سے لائے جس کا اول وآخر غائب تھا، اس لئے مصنف کا نام معلوم نہ ہوسکا۔ اوپر صفحہ پر جیسا کہ کتاب کا نام اوپر لکھا ہوا ہوتا ہے، وہ بھی نہ تھا، حاجی صاحب نے اس کا نام ’’مقدس اسلام‘‘ بتایا تھا۔ غالبًا اندر کہیں یہ نام آیا بھی تھا۔ کتاب مشہور آریہ سماج کے بانی دیانند سرسوتی کی کتاب ستیارتھ پرکاش کے جواب میں لکھی گئی تھی، بہت دلچسپ اور ایمان افروز اور ضخیم بھی تھی۔ اس کے پڑھنے کا سلسلہ بہت دنوں تک جاری رہا، اور غالبًا وہ بھی دو مرتبہ پڑھی گئی۔ یہ کتاب بھی میں نے ہی پڑھی تھی، اس کتاب کے پڑھنے سے رسول اللہ ﷺ کی محبت اور شریعت کی عظمت وحقانیت کا نقش دل پر خوب جما، اس وقت تک سیرت کے موضوع پر بچوں کے مناسب چھوٹے چھوٹے رسائل اور کتابچے بہت سے پڑھ چکا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت وعقیدت سے خوب بہرہ ور ہو چکا تھا۔‘‘
>
> (حکایت ہستی: ص٥٦)

طہارت وپاکیزگی کی اس فرحت بخش فضا میں ایمان وایقان اور محبت وعقیدت کی جو شمع نہاں خانہ دل میں فروزاں تھی، وقت کے ساتھ فزوں تر ہوتی گئی اور اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ نتیجۃً فخر دوعالم ﷺ اور آپ کے اصحاب وتابعین نیز ائمہ ہدی اور متقدمین ومتأخرین اولیائے عظام وبزرگان دین کی عظمت وعقیدت سے حضرت الاستاذ کا قلب وذہن ہی نہیں بلکہ پورا وجود معمور ہوگیا، جو زندگی کے ہر حرکت وعمل میں اتباع اسلاف کی شکل میں عیاں ہوتا۔ سلف صالحین کی تعریف وتوصیف آپ کا شیوہ اوران کے روشن کارناموں کے تذکرے آپ کی حیات کی واضح شناخت بن گئے۔ سو متعلقین ومتعارفین کی کوئی نسبت کوئی مجلس ایسی نہیں ہوتی جو بزرگان دین کے والہانہ وعاشقانہ تذکرے سے خالی ہو۔ اسلاف کی زندگیوں سے رغبت وشغف اور عشق کا یہ عالم تھا کہ ان کے معاملات وواقعات ان کی ایک ایک ادا، ان کا طرز زندگی، ان کے مجاہدانہ کارنامے، ان کے عشق ووفا کی داستانیں، عبادات وریاضات میں ان کی کیفیات مع اسناد اس طرح بیان کرتے کہ سننے والا حیرت واستعجاب میں ڈوب جاتا اور یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتا کہ آپ کو خدائے قادر ووہاب نے دنیا میں صرف اسی مقصد کے لئے بھیجا ہے کہ رجال صالحین کے تمام نقوش حیات اپنے سینے میں محفوظ کرنے کے بعد راہ سلوک ومعرفت کے مسافران تشنہ کام کو

سیرابی سے ہم کنار کریں۔ اصلاح وارشاد کی مخصوص مجلس ہو، عوامی سطح کے اجلاس عام ہوں، لازمی طور پر علما ربانیین اور بزرگان دین کے حالات وکرامات اور ان کی مساعی جمیلہ کا تذکرہ بڑے اہتمام سے کرتے اور اس قدر شرح وبسط کے ساتھ وجد کے عالم میں بیان کرتے کہ سامعین دم بخود اور مسحور ہو جاتے۔ ایک مقام پر اپنی طبیعت کی شیفتگی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ’’مجھے بچپن سے بزرگوں کے تذکروں اور سوانح عمریوں سے شغف ہے، بلکہ عشق ہے۔ اس موضوع پر لکھا ہوا ایک ایک حرف پڑھتا ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ مکتب کے دوسرے یا تیسرے درجہ میں تھا، تو میرے استاذ حضرت مولوی محمد یوسف صاحب علیہ الرحمہ نے ’’سیرۃ الصدیق‘‘ نامی ایک چھوٹا سا رسالہ پڑھایا تھا۔ اس سے مجھے اتنی دلچسپی ہوئی کہ بار بار پڑھ کر بھی سیری نہیں ہوتی تھی، پھر اس کے بعد سلسلہ چل پڑا۔ رسول اللہ ﷺ کی سیرت پر بہت سی چھوٹی بڑی کتابیں پڑھ ڈالیں، اسی وقت میں نے علامہ شبلی کی ’’الفاروق‘‘ اتنی مرتبہ پڑھی کہ اس کے مضامین اور اس کے جملے حفظ ہو گئے، پھر اللہ ہی جانتا ہے کہ اس وقت سے اب تک کتنے تذکرے، سوانح عمریاں پڑھ چکا ہوں۔ اس راستے سے بزرگوں سے محبت پیدا ہوئی، قلب میں اس محبت کا رسوخ ہوا۔ پھر گفتگو میں، وعظ وتقریر میں، درس وتدریس میں، بکثرت ان حضرات کا تذکرہ ہوتا رہتا ہے۔‘‘ (مقدمہ کھوئے ہوؤں کی جستجو: ص۱۷)

عہد حاضر کے مشائخ سے تعلق:

حضرت والا کے دل دردمند میں جہاں اسلاف واکابر کی عقیدتوں کا دریا موجزن تھا وہیں دور حاضر کے علما ومشائخ، عارفین کاملین کی بھی محبتوں اور الفتوں سے معمور تھا۔ ان سے نیاز مندی کا اظہار، ربط وضبط اور تعلق میں پیش قدمی، ان کے در دولت پر حاضری کا اہتمام، وقتاً فوقتاً طلبائے کرام کی تربیتی واصلاحی وعظ وارشاد کے ذریعے ذہن سازی اور حصول برکت وسعادت کی غرض سے مدرسہ میں ان سے تشریف آوری کی درخواست ودعوت اور ان کے قدم رنجہ فرمانے پر آپ کے چہرہ پر خوشی ومسرت کے خوشگوار آثار اور ان کے استقبال وضیافت میں حد درجہ اہتمام آپ کی زندگی کا نمایاں وصف تھا، جس کا اعتراف ہر وہ شخص کرے گا جس نے کچھ وقت آپ کے قریب گزارا ہوگا۔

ماضی قریب کے دو اہم عالم اور عظیم شخصیات سے حضرت بہت متأثر تھے اور عشق و دیوانگی کی حد تک ان سے الفت و محبت تھی۔ ایک زبدۃ الاولیا حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڑھی خلیفہ حضرت شاہ بدرعلی صاحب رائے بریلوی نور اللہ مرقدہ، دوسری شخصیت نمونہ اسلاف حضرت مولانا قاری صدیق صاحب باندوی خلیفہ حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب قدس سرہ۔ مذکورہ دونوں حضرات کا بڑے والہانہ انداز میں آپ تذکرہ کرتے تھے، اور یہ دونوں نجوم ہدایت بھی حضرت والا سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے۔ یہ تعلق و مراسم یہ ربطِ الفت و عنایت تحریر و ملاقات کی صورت میں ہر دو بزرگوں سے تا حیات قائم رہا۔ ان دونوں شخصیات کی علمی و عملی زندگی کی تصویر کشی تفصیل کے ساتھ حضرت نے بڑے جذب و کیف کے عالم میں کئی مضامین میں کی ہے، جس کے لفظ لفظ اور سطر سطر میں محبتوں و عقیدتوں کی خوشگوار و دلکش لہریں صاف محسوس ہوتی ہیں۔

طالبانِ علوم نبویہ کی اصلاح و تربیت آپ کا محبوب مشن:

انسان کی تخلیق کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک اور معبود حقیقی کی معرفت حاصل کرلے اور اپنی زندگی اخلاص کے ساتھ اس کی اطاعت میں گزار دے۔ اگر کسی فرد کو یہ معرفت و مقصود بغیر علم کے حاصل ہو جائے تو بھی یہ شخص نقصان میں نہیں بلکہ کامیاب و فائز المرام ہے۔ اس کے برخلاف علوم و فنون کے تمام دفاتر ذہن و دل میں سمو لینے کے بعد معرفت کی اس دولت سے تہی دامن ہے تو کوئی شک نہیں ہے کہ ایسا شخص بہت بڑے خسارے اور نقصان میں ہے۔ حضرت الاستاذ کو بتوفیق الٰہی آغاز شعور میں ہی علوم و فنون کی دلچسپیوں کے ساتھ ساتھ صلاح و تقوی و پرہیزگاری کا دیندارانہ ماحول بھی میسر تھا، جس کی وجہ سے انسانی وجود کے نصب العین، اس کے تخلیق کے مقاصد کا ادراک ذہن و دماغ نے عمر کی پہلی منزل میں ہی کرلیا تھا، پھر سرعت مطالعہ کے باعث علوم کی گرہیں جیسے جیسے کھلتی گئیں، اس نصب العین کی اہمیت و حیثیت کے ایمان و ایقان میں استحکام پیدا ہوتا گیا۔ نتیجۃً آپ کی زندگی کے تمام حرکات و اعمال شعوری و لاشعوری طور پر اسی محور کے گرد گردش کرنے لگے، اس کا نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ وعظ و ارشاد اور تحریر و تقریر کے میدان کے علاوہ درس و تدریس کی علمی و تحقیقی فضائیں، رجوع الی اللہ تقوی و خشیت الٰہی کے روحانی نصائح سے معمور ہوتی تھیں۔ طلبہ کے درمیان محض رسمی طور سے حرف شناسی کی استعداد پیدا کرنے کے

آپ قطعی قائل نہیں تھے بلکہ حصول علم کا مقصود یعنی اخلاص کے ساتھ اعمال صالحہ پر دوام ہمیشہ آپ کے پیش نظر رہتا۔ یہی وجہ تھی آپ کی درس گاہیں اکثر وبیشتر وعظ ونصیحت اور سلوک ومعرفت کی مجلس بن جایا کرتی تھیں۔ درسگاہوں کے علاوہ اصلاح وتربیت اور ذہن سازی کی غرض سے جمعرات کو خاص طور سے طلبہ کو خطاب کرتے، تقریباً گھنٹہ بھر کے اس وعظ وارشاد میں، تعلیم میں انہماک، حسن اخلاق، حسن معاملات کی تلقین، اکابرین امت اور اولیائے عظام کے حوصلہ وہمت بخش ظاہری وباطنی حالات وکوائف اور بہت کچھ جو انسانی خصائل کی تزئین وآرایش کے لئے لازم وضروری ہے، بیان کرتے۔ یہاں تک کہ جب مجلس اختتام پذیر ہوتی تو اس حال میں کہ سامعین کے قلوب میں اسلاف واکابر کے نقش قدم پر چلنے کا عزم وحوصلہ اور جوش وجذبہ کا دریا موجزن ہوجاتا۔

ظاہر ہے کہ ان مجالس کا مقصد اس کے سوا کیا ہوسکتا تھا کہ بلبلان چمن کی زندگی شریعت کے سانچے میں اس قدر ڈھل جائے کہ جب عملی دنیا میں قدم رکھیں تو علوم وفنون کی شناوری کے ساتھ ساتھ جام معرفت الٰہی سے بھی بامراد وشادکام ہوں۔ حضرت والا کے اس جذبہ فراواں اور تڑپ وبے تابی کے عکس کو ذیل کے الفاظ میں دیکھا جاسکتا ہے جو ان کے قلب سے ظاہر ہوکر قلم کے واسطے سے صفحہ قرطاس پر بکھرے ہوئے ہیں:

> ’’میں زمانۂ طالب علمی کے بعد سے مسلسل مدرسوں میں معلّمی کررہا ہوں۔ معلم کے سامنے بچے اپنے دل ودماغ کی سادہ تختیاں لے کر آتے ہیں اور معلم ان میں علم وفن کے نقش ونگار کندہ کرتا ہے۔ میں بھی جب معلم کی جگہ بیٹھا اور طلبہ سادہ تختیاں لے کر میرے سامنے آئے تو مجھے بہت سوچنا پڑا۔ کتاب میں جو کچھ لکھا ہے، اسے پڑھا دینا آسان معلوم ہوا، مگر ان کا مزاج بنانا، ان کے قلوب اور اذہان کو علم کی اہمیت پر مرکوز کرنا، ایک مشکل کام دکھائی دیا۔ میں صرف کتاب پڑھاؤں، یہ بات مجھے گوارا نہ ہوئی، مجھے ان کے مزاج وطبیعت اور قلوب واذہان کی ایک خاص نہج پر تشکیل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، تاکہ یہ ایسے عالم دین بنیں، جو اپنے دین، اپنے رسول اور اپنے اللہ کے وفادار ہوں۔ یہ دنیا کی عام فضا اور عام ہوا کے خلاف دین کو اور آخرت کو مقصد زندگی اور مطمح نظر بنائیں۔ اس کے لئے میں نے سبق کے اندر تھوڑے سے

> وقت کی گنجائش نکالی، سبق کی تکمیل کے بعد کچھ ایسی باتیں ضرور کرتا جس سے ان کے مزاج و طبیعت کی دینی تربیت ہو۔ جمعرات کے دن خصوصیت سے اس کا اہتمام کرتا، پھر وقتاً فوقتاً الگ سے وقت نکال کر اجتماعی طور پر تمام طلبا سے تربیتی خطاب کرتا، ان خطابات میں قرآن وحدیث، سیرت نبوی، حالات صحابہ، تذکرۂ علماء ومشائخ اور ذکر اہل اللہ وخاصان خدا سے میں کام لیتا، کہیں کہیں ان ریشمی ومخملی چادروں میں اپنے کسی کسی واقعہ سے ٹاٹ کا پیوند بھی لگا دیتا، اور محسوس کرتا کہ بچے ٹاٹ کے ان پیوندوں کا اثر زیادہ لیتے ہیں۔ بڑے لوگ تو بڑے تھے، چھوٹے بچے یہ سوچ کر کہ یہ حضرات تو کچھ مافوق العادت لوگ تھے، عظمت کے کان سے سن لیتے، لیکن ان کے حالات وواقعات کے تقاضوں پر چل پڑنے کی ہمت نہ کرتے، اس کے برخلاف جب اپنے ہی جیسے ایک چھوٹے کے متعلق کچھ سنتے، تو یہ سوچ کر کہ ہمارے ہی جیسا ایک کمترین شخص کچھ کر سکتا ہے، تو ہم بھی کر سکتے ہیں۔'' (حکایت ہستی: ص۱۱)

راہ سلوک وعرفان سے باضابطہ وابستگی:

گذشتہ سطور میں یہ بات ذکر کی جا چکی ہے کہ حضرت الاستاذ کے خانوادے کی فضا روحانیت خیز اور زہد واتقا سے لبریز تھی۔ آپ کے جد امجد اور بڑے والد محترم سلسلہ نقشبندیہ کے بزرگ حضرت حافظ حامد حسن صاحب علیہ الرحمہ کہنڈہ اعظم گڑھ سے بیعت تھے، پھر شیخ ومرشد کی وفات کے بعد اپنے خواجہ تاش صوفی عبدالرؤف مئوی کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے۔ پس اس دینی وروحانی ماحول سے آپ کے شفاف قلب کا متاثر ہونا اور عشق خدا ورسول نیز صحابہ کرام و اسلاف عظام کی عظمتوں کا نقش دل کی سادہ تختی پر قائم ہو جانا لازمی امر تھا۔ مزید طبیعت میں سنجیدگی ویکسوئی اور خلوت گزینی کا میلان اور دنیاوی ہنگاموں سے وحشت کی وجہ سے اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو اس بات کو سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی کہ تزکیہ واحسان اور ایقان وعرفان درحقیقت روز اول سے آپ کی طبیعت، فطرت اور مزاج میں پیوست ہے، اور عمر کی رفتار کے ساتھ اس روحانی کیفیت میں مزید اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ رب کریم نے زمانہ تعلیم کے آخری سال میں دنیا کی انتہائی قیمتی متاع سرور کائنات محمد عربی ﷺ کے دیدار سے سرفراز فرمایا۔ اس خوشگوار وجان نواز واقعہ کا ذکر خود حضرت کی زبانی سنئے:

> ''ایک روز حضرت مولانا عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں، میں ابوداؤد شریف کی عبارت پڑھ رہا تھا، مولانا نہایت پاک باطن اور صاف دل بزرگ ولی تھے، سادات میں تھے۔ میں حدیث نبوی کی مسلسل قرأت کر رہا تھا، اسی دوران مجھ پر ایک ربودگی کی سی کیفیت طاری ہوئی، اسی حالت میں پڑھتے پڑھتے میری نگاہ باہر کی طرف اٹھ گئی، میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ چند اصحاب کے ساتھ ایک طرف جا رہے ہیں، احرام جیسا لباس زیب تن فرمائے ہوئے، چہرۂ اقدس دوسری طرف تھا، میں نے پیچھے سے دیکھا خوبصورت زلفیں تھیں۔ چندے زیارت ہوئی پھر وہ منظر نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔'' (حکایت ہستی ۲۶۱)

مولانا منیر الدین صاحب کے در اقدس پر حاضری:

مشرقی یوپی کے مشہور ومعروف ادارہ جامعہ احیاء العلوم مبارک پور میں حصول تعلیم کے دوران جب کہ عمر کا یہ حصہ عموماً تمام فکروں سے آزاد ولاپرواہی کے عالم میں گزرتا ہے، لیکن حضرت چونکہ اس چشمہ صافی سے پہلے ہی سے آشنا تھے، اس لئے ایام تعطیل کی تمام ساعتوں کی حفاظت کرتے ہوئے جہانا گنج اعظم گڑھ کے ایک صاحب نسبت بزرگ حضرت میاں جی کی خدمت میں حاضری دیا کرتے تھے۔ بیعت کے متعلق ارادہ تھا کہ رسمی تعلیم سے فراغت کے بعد ان سے اصلاحی تعلق قائم کریں گے، لیکن اس عزم وارادہ کی تکمیل نہ ہوسکی، کیوں کہ تکمیل تعلیم کے بعد موصوف جوار رحمت میں پہونچ چکے تھے۔ طبیعت میں ایک طرح کی شوریدگی وبے قراری رہتی تھی جو امام غزالی کی ''کیمیائے سعادت''، حضرت مجدد الف ثانی کے مکاتیب اور شیخ عبدالقادر جیلانی کی ''فتوح الغیب'' کی ورق گردانی کے بعد دوآتشہ ہوگئی، اور شیخ الحدیث مولانا زکریا مہاجر مدنی اور بقیۃ السلف حضرت مولانا عبدالحی صاحب نوراللہ مرقدہ انجان شہید اعظم گڑھ خلیفہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی صاحب قدس سرہ کے دربار تک لے گئی، لیکن طبعی حجاب اور دیگر وجوہ کی بنیاد پر بارآور نہ ہوسکی۔ مہینوں حالات کی بادیہ پیمائی کے بعد سورش دل کا سیل رواں شہر مئو کی ایک صاحب نسبت اور شفقت ریز شخصیت حضرت مولانا منیر الدین صاحب نوراللہ مرقدہ کی ذات گرامی کے در اقدس پر آکر ٹھہر گیا، اور باضابطہ آپ کی ذات مذکورہ مرد صالح کے حلقہ ارادت میں شامل ہوگئی، لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد یہ تعلق ان کی وفات کی وجہ سے منقطع ہوگیا، تاہم شیخ کی

طرف سے مفوضہ اوراد وظائف اور عبادات واشغال کا سلسلہ کتابوں کی ورق گردانی اور بحر علوم میں غواصی کے ساتھ ساتھ بدستور جاری رہا، یہاں تک مدرسہ دینیہ غازی پور کی طرف سے تدریسی خدمت کے لئے ایک قاصد عرض نامہ لے کر حاضر ہوا۔

بزم مصلح الامت سے وابستگی:

مذکورہ ادارہ کے ذمہ داروں کے مسلسل اصرار کے باعث حضرت مولانا نے اس خدمت کو منظور کرلیا اور ۱۰؍شوال ۱۳۹۳ھ میں غازی پور میں قیام پذیر ہوگئے۔ مدرسہ میں عربی درجات کے شعبہ میں طلبہ کی مختصر تعداد کے باعث یہاں کی خاموش فضا میں کافی حد تک سکون وطمانینت محسوس ہوئی۔ طبیعت تو پہلے ہی سے تصوف واحسان کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی اور جب ہنگامہ دنیا سے تھوڑی سی یکسوئی میسر ہوئی تو وظیفہ تدریس وتعلیم اور بقدر ضرورت واجبی مطالعہ سے فراغت کے بعد سارا وقت نوافل اور ذکر وشغل کی صورت میں یاد الٰہی کی نذر ہوگیا۔ اسی اثنا میں مشیت ایزدی مزید متوجہ ہوئی اور کتب خانہ میں سید العارفین مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب الٰہ آبادی کی خانقاہ سے نکلنے والے رسالے ''معرفت حق'' کی چند فائلیں ہاتھ لگ گئیں۔ وادیٔ تصوف وسلوک کے روحانی وعرفانی ولایات ومقامات کے اسرار رموز سے پردہ اٹھانے والی تحریروں کا نگاہوں کے سامنے آنا تھا کہ طبیعت میں ایک ہلچل سی پیدا ہوگئی۔ شرارہ عشق جو قلب وروح میں ابھی تک حد اعتدال پر قائم تھا، بے قابو ہوکر شعلہ جوالہ بن گیا۔ جذب وسرمستی اور بے خودی کے عالم میں تمام تحریروں کو دل ودماغ میں اتارتے چلے گئے، لیکن تسکین وسیرابی کہاں؟ بے تابی وشوریدگی میں مزید اضافہ ہوگیا۔ ایک عالم بے خودی ہے جسے الفاظ کا جامہ نہیں پہنایا جاسکتا۔ دل کے نہاں خانے میں آرزوئے دیدار کی ایک دنیا ہے جسے منظر عام پر لانا محال ہے، عشق الٰہی کی گرمی بے تاب ہے جس کی ترجمانی از حد مشکل ہے۔ حق یہ ہے کہ قلب پر وارد ہونے والے احساسات وجذبات کی عکاسی اور اس کی ترجمانی وہی کرسکتا ہے جو اس راہ کا مسافر ہو، اور جس کا قلب ان حالات وکیفیات سے آشنا ہوا ہو۔ پس بہتر اور مناسب یہی ہے کہ قلبی واردات کی یہ داستان خود مولانائے محترم کی زبانی سنی جائے:

''غازی پور میں جب یکسوئی نصیب ہوئی، تو طبیعت ان اعمال ووظائف کی طرف مائل

> ہوئی جن میں مَیں گھر پر رہ کر مشغول رہا کرتا تھا، یعنی تلاوت، طول طویل نوافل، اوراد و وظائف اور ان سب کے ساتھ شوق مطالعہ، تہجد کی پابندی بحمد اللہ ہر جگہ رہی۔ میسور میں، بنارس میں، یہاں بھی وہ سلسلہ قائم رہا۔ یہاں اوراد و وظائف میں اضافہ بھی ہوا اور پابندی بھی بڑھی۔ ایک روز مدرسہ کے کتب خانہ میں مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب علیہ الرحمہ کی خانقاہ الہ آباد سے نکلنے والے رسالہ ''معرفت حق'' کے چند شمارے ہاتھ آئے، میں انھیں پڑھنے لگا، ان کے پڑھنے سے دل پر عجیب وغریب اثر ہوا، ایسا محسوس ہوا جیسے پیاسے کو آب زُلال مل گیا ہو، دلچسپی بڑھی اور اتنی بڑھی کہ میں ان مضامین ومواعظ میں جذب ہوکر رہ گیا، وہاں جتنے رسائل مل سکے، میں سب اٹھالایا اور بار بار پڑھتا رہا، اور جتنا پڑھتا دلچسپی بڑھتی رہی۔ طبیعت دنیا سے پہلے ہی سرد ہوچکی تھی، دل نے ''معرفت حق'' کے مضامین سے محبت ومعرفت کی گرمی پائی، پھر آنکھوں نے آنسوؤں کی جھڑی لگادی۔ میں شاہ صاحب کے نام سے واقف تھا، ان کی تاثیر بھی قدرے جانتا تھا، مگر ان کے مواعظ وملفوظات پڑھنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا، اب جو پڑھنے کی توفیق ہوئی تو دل کی دنیا زیروزبر ہوکر رہ گئی۔ میں بار باران مضامین کو پڑھتا اور قلب کو گرماتا رہتا، لیکن یہ چند ہی پرچے تھے، وہ بھی متفرق!
>
> عزیز الحسن صاحب صدیقی کے یہاں ہمدرد دواخانہ کی ایجنسی تھی، اس میں کوپا گنج کے ایک بزرگ عالم دین، صاحب تقویٰ بطور حکیم کے مریضوں کی خدمت کرتے تھے۔ یہ تھے مولانا حکیم بشیر الدین صاحب علیہ الرحمہ، معلوم ہوا کہ یہ بزرگ حضرت شاہ صاحب کے اخص الخواص لوگوں میں تھے، میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، اور معرفت حق کا تذکرہ کیا، تو انھوں نے بہت سے شمارے مجھے دئے، میں انھیں لاکر انھیں میں جذب ہوگیا، اسباق، اوراد و وظائف اور تلاوت کے علاوہ سارا وقت معرفت حق کے لئے وقف ہوگیا۔ رات کو بستر پر پہونچتا تو اس کے مطالعے میں نیند غائب ہوجاتی۔ حکیم صاحب کا عطا کیا ہوا سرمایہ چند دنوں میں پورا ہوگیا۔'' (حکایت ہستی: ص۲۶۳)

بالآخر یہ تڑپ یہ بے چینی اور عشق وارفتگی جس میں شب روز اضافہ ہوتا جاتا اور آپ اس آتش سوزاں میں جلتے رہتے، یہ کیفیت آپ کے لئے دنیا ومافیہا سے قیمتی متاع ہوگئی۔ عارف

خدائے تعالی مولانا رومی نے شاید اسی جذب وحال کی تصویر کشی اس شعر میں کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ سلوک کے اس مرحلہ کی تصریح حروف والفاظ کے ذریعے ممکن نہیں ہے۔

عشق دریا ہست قعرش ناپدید — در نگنجد عشق در گفت وشنید
هفت دریا پیش آں بحرست خورد — قطرہ ہائے بحر را نتواں شمرد

عشق اپنی وسعت و گہرائی کی وجہ سے گفت وشنید کے پیمانوں میں نہیں آ سکتا۔ سمندر کے قطرے کون گن سکتا ہے؟ پھر عشق کا سمندر کہ دنیا کے ساتوں سمندر مل کر بھی اس کی برابری نہیں کر سکتے۔

روزہا باسوزہا ہمراہ شد — درغم ما روزہا بے گانہ شد
تو بماں اے آنکہ چوں تو پاک نیست — روزہا گررفت، گو، رو باک نیست

عاشق کی زندگی یہ ہے کہ دن ورات غم عشق میں گھلتا ہے، دن رات ختم ہو جاتے ہیں اور یہ آگ ختم نہیں ہوتی۔ عاشق کو اسی زندگی میں لطف آتا ہے اگر یہ سوز ہے تو سب کچھ ہے۔

بالآخر یہ سوز دروں اور آتش عشق آپ کو مصلح الامت کے دربار میں لے گئی اور جانشین مصلح الامت حضرت مولانا قاری مبین صاحب کے دامن سلوک واحسان سے آپ وابستہ ہو گئے۔ یہی زمانہ وصیۃ العلوم الٰہ آباد میں تدریس کا بھی تھا، یہیں خالق ارض وسما نے آپ سے اہم اور عظیم کام لیا کہ آپ نے حضرت مصلح الامت کے بکھرے ہوئے کارناموں کو جن سے خلق خدا عام طور سے ناواقف تھی، یکجا کر کے اپنی شستہ وشگفتہ اور دل نشیں تحریروں کے قالب میں ڈھال کر اہل دل اور اہل علم کی دنیا میں اجاگر کیا۔ چنانچہ آپ نے بڑی عرق ریزی اور دریائے عشق میں ڈوب کر اس انداز سے ''حیات مصلح الامت'' لکھی کہ پڑھنے والا بے خود ہو جاتا ہے۔ اس کتاب کی مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ انفرادی مطالعہ کے علاوہ حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب نوراللہ مرقدہ بانی مدرسہ ریاض العلوم گورینی کی مجلس میں مسلسل پڑھی گئی۔ یہ سوانح قاری کے دلوں پر کس طرح اثر چھوڑتی تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے جو مشہور حکیم ماہر لسانیات وادبیات حضرت مولانا حکیم عزیزالرحمان صاحب برادر اکبر حضرت مولانا ڈاکٹر سعیدالرحمان اعظمی مہتمم ندوۃ العلما لکھنو کی ملاقات کے دوران پیش آیا:

> ۱۹۸۲ء میں اس خاکسار نے حضرت شاہ وصی اللہ صاحب کے حالات ”حیات مصلح الامت“ کے نام مرتب کئے، اس کا علم جب حکیم صاحب کو ہوا تو ان کی عنایتوں اور نوازشوں کا مورد بن گیا، اور جب کتاب شائع ہوئی اس کے چند ماہ کے بعد میں دارالعلوم دیوبند حاضر ہوا، اور ان کی قیام گاہ پر حاضر ہوا تو وہ بے ساختہ اٹھے اور لپٹ کر اس طرح رونے لگے جیسے ان کی کوئی بیش قیمت متاع گم گشتہ اچانک مل گئی ہو۔ یہ حضرت شاہ صاحب کی محبت تھی جس نے انہیں بے قرار کر دیا تھا اور کتاب حیات مصلح الامت نے ان کے جذبہ میں اشتعال پیدا کر دیا تھا، وہ لپٹ کر بہت روئے، ہچکیاں بندھ گئیں، پھر دیر تک سسکیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ میں بہت متاثر ہوا کہ فتح پور کے پیر مغاں کی محبت نے دل میں کیا آگ لگائی ہے کہ آنکھیں پانی بن کر بہہ رہی ہیں، اور آواز ہچکیوں اور سسکیوں میں تبدیل ہوگئی ہے۔“

قاری صاحب سے اصلاحی تعلق زیادہ دنوں تک تو باقی نہیں رہا تاہم الفت وعقیدت میں بظاہر کسی قسم کی کوئی کمی نہیں آئی۔ انقطاع تعلق کے بعد متعدد بار آپ نے قاری صاحب کی خدمت میں حاضری دی اور ہمیشہ عقیدت واحترام کے ساتھ ان کا تذکرہ بھی کرتے تھے۔ (مسموع یکے از صاحبزادگان حضرت مولانا)

بعدازاں سلسلہ قادریہ سندھ کے مشہور ومعروف شیخ طریقت حضرت مولانا حماداللہ صاحب ہالیجوی کے خلیفہ وجانشین بقیۃ السلف حضرت مولانا عبدالواحد صاحب برداللہ مضجعہ، شاگرد رشید شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی صاحب نوراللہ مرقدہ کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے اور تادم آخر آپ کے دامن عاطفت سے وابستہ رہے۔ شیخ کی محبت والفت سے حضرت الاستاذ کا قلب وذہن جہاں معمور ولبریز تھا، وہیں مرشد کی نگاہ میں بھی آں محترم کی بڑی قدر ومنزلت تھی۔ اس بےلوث ووالہانہ رشتہ وتعلق اور پیرومرشد کا آپ کے علم وفضل پر اعتماد ویقین کا یہ عالم تھا کہ حضرت شیخ نے آپ سے اپنے پیرومرشد حضرت مولانا حماداللہ صاحب ہالیجوی کے حالات کو قلم بند کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ آپ نے مرشد کے حکم پر مفصل سوانح عمری بنام ”تذکرہ شیخ ہالیجوی“ تحریر فرمائی، جو حسن ترتیب، حسن تعبیر اور حسن تحریر کا شاہکار ہے۔ شیخ سے ملاقات و زیارت کی غرض سے کئی بار آپ نے پاکستان کا سفر بھی کیا ہے۔ حکومت ہند کی پالیسیوں کی وجہ سے

اہل پاکستان کے لئے ہند کا سفر دشوار ترین مرحلہ ہے، اس لئے مرشد و شیخ مدرسہ شیخ الاسلام میں تشریف نہ لا سکے، تاہم تحریر و کتابت کے واسطے سے طرفین کے مابین زندگی کے ہر موڑ پر واقفیت و تبادلہ خیال کا سلسلہ جاری رہا۔ حضرت الاستاذ کو خلعت خلافت اور اجازت بیعت اسی بارگاہ سے عطا ہوئی۔ حاصل یہ ہے کہ آپ کے دل میں جہاں شیخ کی عظمت و محبت کی ایک دنیا آباد تھی وہیں مرشد کے لئے آپ کی ذات مایہ ناز اور سرمایہ افتخار تھی۔

عکس مولانا عبدالواحد صاحب نور اللہ مرقدہ:

اس عالم ارضی سے ہر لمحہ کوئی نہ کوئی موت کی آغوش میں گم ہو جاتا ہے، انسان دنیا میں آیا ہی اس لئے ہے کہ مقرر وقت گزار کر رخصت ہو جائے۔ اس نظام کے تحت حضرت الاستاذ کے مرشد و مربی حضرت مولانا عبدالواحد صاحب نور اللہ مرقدہ نے بھی ۲۴؍ اکتوبر ۲۰۱۵ء بروز سنیچر داعی اجل کو لبیک کہا اور خالق حقیقی کی بارگاہ میں ہمیشہ کے لئے حاضر ہو گئے۔ اس سے قبل کہ ہم اپنے قلم کے سفر کے رہوار کو منزل کی سمت آگے بڑھائیں، کچھ تذکرہ حضرت کے پیر و مرشد مولانا عبدالواحد صاحب برد اللہ مضجعہ کا:

> ''حضرت مولانا ۱۳۴۶ھ میں غازی پور کے ایک گاؤں شیخ پورہ میں پیدا ہوئے، حفظ قرآن مدرسہ دینیہ غازی پور میں مکمل کیا، اور وہیں مولانا عبیداللہ صاحب الہ آبادی سے عربی کی تعلیم مشکوۃ شریف تک حاصل کی، اس کے بعد دورہ حدیث شریف کے لئے دارالعلوم دیوبند گئے جہاں حضرت مدنی سے بخاری شریف پڑھی، اور ۱۳۶۹ھ میں فارغ ہوئے۔ آپ کا امتحان میں کامیابی کا اوسط ۶۔۴۹ تھا۔ ابوداؤد شریف میں ۴۶ نمبر تھا بقیہ ساری کتابوں میں مکمل پچاس نمبر تھے۔ ۱۹۵۴ء میں آپ نے ہندوستان سے ہجرت کی اور پاکستان میں سکونت اختیار کر لی۔ آپ کو اجازتِ بیعت حضرت مولانا حماد اللہ صاحب ہالیجوی سے تھی جو کہ مولانا تاج محمود امروٹی کے اجل خلفا میں سے تھے۔ حضرت مولانا مرحوم نے ایک ادارہ جامعہ حمادیہ کے نام سے کراچی میں قائم کیا جو ایک مکتب کی شکل میں قائم ہوا، اور آج پاکستان کے نمایاں اداروں میں سے ہے۔'' (منقول از تحریر مولانا ضیاء الحق صاحب)

اصلاح و تربیت کا منفرد انداز:

جب دلوں میں ورع و تقوی اخلاق و کردار اور ایمانی صلابت و استقامت کا گلشن آباد

ہوجاتا ہے تو جذبہ خودنمائی وخودستائی، کبروتعلّی، خواہشات نفس وہواوہوس جیسی انسانیت سوز مذموم صفتیں خود بخود دفنا کے گھاٹ اتر جایا کرتی ہیں۔ استاذ محترم حضرت مولانا کا حال ومزاج احسان و عرفان کی راہ میں مکمل طور پر ایسا ہی تھا۔ آپ کی بارگاہ میں متوسلین وطالبین کا ہر روز ایک سلسلہ جاری رہتا جن کی اصلاح وتربیت اور وعظ وتلقین کے ذریعے آپ صیقل گری کرتے رہتے مگر باضابطہ رسمی طور پر بیعت کرنے سے عموماً احتراز کرتے تھے، جیسا کہ آج کل اس راہ میں خاص طور پر لوگوں کو حلقہ ارادات میں شامل کرنے کے لئے ترغیب ہی نہیں عمل تسخیر سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طریقہ کار میں جذبہ اصلاح وتربیت سے کہیں زیادہ خودنمائی کے جذبات کی کار فرمائی ہوتی ہے، جو سراسر تصوف واحسان کی روح ومزاج کے خلاف اوراس کے طریق سے متصادم ہے، اور یہ چیز حضرت والا کی طبیعت ومزاج سے قطعاً ہم آہنگ نہیں ہوسکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ولایت کے مقام پر فائز ہونے کے باوجود بھی آپ کے خلفاومجاز بیعت کی تعداد صرف دو ہے جن میں حضرت مولانا مفتی تبارک حسین صاحب دامت برکاتہم پورنیہ بہاراور دوسرے حضرت مولانا قاری عبدالحسیب صاحب دامت برکاتہم انجان شہید اعظم گڑھ ہیں۔

روحانیت کی اس نازک وادی میں حضرت الاستاذ نے جس قدر حزم واحتیاط سے کام لیا ہے اور جس قدر اپنی خودی کو مٹا کر دیانت داری کا چراغ روشن کیا ہے، اس کا اندازہ اجازت و بیعت سے بے نیازی کو دیکھ کر لگایا جاسکتا ہے، حالانکہ اگر آپ چاہتے تو متوسلین ومسترشدین کے ساتھ ساتھ جانشینوں کی تعداد بھی بے شمار ہوتی اور دیگر کمالات کی طرح آسمان تصوف پر بھی آپ کی ذات آفتاب وماہتاب کے مانند ہوتی مگر کسرنفسی گوشہ نشینی اور شہرتوں سے وحشت کے باعث آپ کے لئے ایسا کرنا ممکن نہیں تھا، تاہم اپنے شاگردوں کی اصلاح وتربیت کے لئے ہر وقت کمربستہ رہتے تھے، ہر وقت ایک تڑپ اور دھن رہتی تھی کہ کس طرح طالب علموں کی زندگی اسلاف کے نقش قدم پر گامزن ہوجائے اور سنت وشریعت کے سانچے میں ڈھل جائے۔

جب مدرسہ کے طلبہ فارغ ہوکر فضیلت کے لئے دیوبند جانے لگتے تو ان کو اسلاف کی پیروی، سنت کا اتباع، خاص طور سے نماز کی پابندی کی تاکید وتلقین فرماتے، ان باتوں پر عمل کرنے کا عہد وپیمان لیتے۔ اچھی طرح یاد ہے کہ راقم آثم جب عربی کی پانچویں اور آخری جماعت میں

تھا، عید کے بعد دیوبند کا سفر تھا، تو ۲۷ ویں شب کے آخری حصہ میں بعد نماز تہجد جب دنیا نیند کی آغوش میں تھی، بہت دیر تک حضرت نے پوری جماعت کو علم میں انہماک، اصلاح حال، اخلاق عالیہ اور اتباع شریعت کی تاکید نیز تمام اعمال صالحہ کو زندگی میں داخل کرنے اور تمام برائیوں سے معصیتوں سے اجتناب کا عہد لیا اور انہیں باتوں پر پوری جماعت کو فرداً فرداً بیعت کیا۔ اصلاح حال اور تزکیہ نفس کے حوالے سے طالبان علوم نبویہ کے متعلق آپ کا قلب جس آتش سوزاں میں جل رہا تھا، اسے احاطہ تحریر میں کیوں کر لایا جائے؟ اس کی ترجمانی تو بس وہی الفاظ کر سکتے ہیں جو آپ کے گہربار قلم سے کاغذ کے سینے پر رخشندہ ہیں، سو آپ بھی ملاحظہ کریں اور ایک ولی کامل کے زخم زخم احساسات کو دیکھیں:

> ”میری عین خواہش اور دعا یہی رہی ہے کہ تم لوگ سچے طالب علم بن کر حصول علم میں کوشاں رہو، علم صرف ذہانت و ذکاوت ہی سے نہیں ملتا، ممکن ہے دنیا کا علم اسی طرح حاصل ہوتا ہو لیکن جس کو میں علم کہتا ہوں اس کا حساب و کتاب اور ہے، یہ ضرور ہے کہ ذہانت مدد و معاون ہے، اس سے راہِ علم میں سلوک کی سہولت ہوتی ہے، تاہم اس کی حیثیت اَساسی اور بنیادی نہیں ہے........۔
>
> میرے عزیزو! مجھے اس وقت سخت تکلیف ہوتی ہے جب میں سنتا ہوں کہ عربی پڑھنے والا طالب علم کسی سرکاری ملازمت کے لئے جد و جہد کر رہا ہے، یا وہاں چلا گیا ہے، میرے نزدیک یہ چیز غلط نہیں ہے، بلکہ میں اس کو محمود سمجھوں اگر یہ اس نیت سے کیا جائے کہ سرکاری اداروں میں ہمیں دین کی خدمت کے جو مواقع میسر ہوں گے ان سے دریغ نہ کریں گے، بلکہ سچے دین کی سچی خدمت میں مصروفِ کار رہیں گے۔ پھر یہی کام ذخیرۂ آخرت بن جائے گا.....۔
>
> کہنے کا مقصد یہ ہے کہ حصول علم سے نیت و عزم محض خدمت دین ہونی چاہئے۔ یقین کا سرمایہ ساتھ رکھو، حطامِ دنیا تو جوتیوں میں آکر پڑی رہے گی۔ تم لوگ جس علاقے کے رہنے والے ہو، جہاں تک میرا اندازہ ہے اس میں خالص مجاہد قسم کے علماء کی حاجت ہے اور تم لوگ ایک بہت بڑی ذمہ داری اپنے سر لے رہے ہو، اس لئے ہر قسم کی دنیاوی آلائش سے پاک ہو کر تحصیل علم کی ضرورت ہے۔ میری بڑی تمنا یہ ہے کہ میں اپنے شاگردوں کو دین پر قربان ہوتا ہوا دیکھوں، اس سلسلے میں ہر طرح کی مدد و تعاون کے لئے تیار ہوں، ان شاء اللہ آخر دم تک تم لوگ

مجھے اپنا رفیق پاؤ گے۔'' (مکتوب بنام شاگردان رشید۔ حدیث دوستاں: ص۲۴۴)

دور حاضر میں تزکیہ واحسان کی ضرورت، آپ کی تحریروں کے آئینے میں:

مادہ پرستی کے اس دور میں جہاں انسان نفس کا غلام بن کر رہ گیا ہے، اس کی سوچ کا زاویہ اور اس کی فکر کا دائرہ اس کے ذاتی مفادات اور نفسانی خواہشات میں محصور ہو کر رہ گیا ہے، اسلامی تعلیمات سے بیزاری اور لذات دنیا کے حصول کی تگ و دو اس کا مقصود بن گئی۔ تعلیمات نبوی سے وابستگی کو پسماندگی و پستی کی علامت اور مغرب کی آزادانہ روش کی تقلید کو ترقی کی معراج سمجھ لیا گیا ہے، علمائے صالحین واولیائے کاملین سے بے نیاز ہو کر ظاہری اعمال پر قناعت کو کافی سمجھ لیا گیا ہے۔ یہ صورت حال جہاں انسانیت کے لئے شرم ناک والم ناک ہے وہیں اہل دل واہل معرفت کے لئے جانکاہ اور سوہان روح ہے۔ معاشرہ کی مذکورہ روش دیکھ کر آں محترم کے دل میں رنج والم اور قلق واضطراب کے کتنے طوفان اٹھتے اور بیدار ہوتے تھے، اس کی ایک جھلک ذیل کے اقتباس میں دیکھی جا سکتی ہے:

> '' دنیا میں آخرت کی صلاحیت بہت کم رہ گئی ہے، زمانۂ نبوت کے بعد کی وجہ سے نور استعداد کم ہے، **قال اللہ قال الرسول** کی آواز بہت ہے، مگر اس کے کہنے والوں کا حال اور عمل کچھ اور ہے، اور قول بلا عمل اثر سے خالی ہے، نورانیت سے تہی مایہ ہے۔ اللہ والوں کے قلب میں وہ نور بھی ہے، ان کے پاس وہ طریقۂ عمل بھی ہے، اسے عطا کرنے اور بانٹنے کا جذبۂ بے تاب بھی ہے، مگر دیکھنے والے اسے اجنبی سمجھ کر گذر جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہمارے کام کی یہ چیز نہیں ہے انہیں کچھ اور چاہئے۔'' (مکتوب بنام حضرت ماسٹر قاسم صاحب مدظلہ۔ حدیث دوستاں: ص۵۸)

سکون وعافیت کا راز رجوع الی اللہ۔ آپ کی دعوت کا مرکزی عنوان:

زندگی دھوپ چھاؤں سے عبارت ہے، یہاں فرحت وشادمانی اور آلام ومصائب ساتھ ساتھ چلتے ہیں، پس بلاشبہ فوز وفلاح سے ہم کنار وہی زندگی ہے جو مثبت ومنفی دونوں حالتوں میں حد اعتدال پر قائم رہے، اور ہر مرحلے میں اس کا رشتہ مالک وخالق سے جڑا رہے۔ خوش حالی میں رب کا شاکر وحامد ہو اور ایام مصائب میں صابر وبردبار ہو، لیکن نفس پرست انسان

نعمتوں میں منعم حقیقی سے بے پرواہ اور غافل اور ابتلا و آزمائش کی حالت میں تقدیر و قضا کا شکوہ کرنے لگتا ہے۔ سکون و عافیت کی تلاش میں روحانیت کے بجائے مادیت کی طرف بے تحاشا دوڑنے لگتا ہے، بالآخر ناکامیوں اور مایوسیوں کی حوصلہ شکن خوفناک لہروں میں گم ہو جاتا ہے۔ آپ نے اپنی تحریروں میں خاص طور سے لوگوں کو انابت الی اللہ کی راہ دکھائی ہے اور یہ بتایا ہے کہ راحت و سکون کے حصول کی تلاش دنیا کے اس مادی خزانہ میں آرزوئے خام اور کار عبث ہے، اس دولت و سرمایہ کے لئے اس ذات عالی کی بارگاہ کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جس نے اس کی تخلیق کی ہے۔ “ایک خدا کی یاد، اس کی جناب میں حضوری، اسی کا نام اور اسی کے حضور گریہ وزاری ہر ایک کے درد کا مداوا اور ہر ایک کے غم کا علاج ہے۔ وہی ایک پناہ گاہ ہے، اس کے علاوہ اور کوئی جائے پناہ نہیں، وہی فریاد رس ہے، ان کے ماسوا کسی کے بس میں کچھ نہیں، وہی قلوب کو قوت بخشتے ہیں، وہی صدمہ بھی دیتے ہیں اور وہی برداشت بھی عنایت فرماتے ہیں۔ یہ سب ان کی شاخیں ہیں، کون جانے کہ اس میں کیا کیا حکمتیں ہیں؟ بس وہی جانتے ہیں اور انہیں کا جاننا ہمارے لئے کافی ہے، ہم تو بس آنکھ بند کر کے ان کے حکم پر چلتے رہیں، ان کے یہاں دھوکہ نہیں ہے، اندیشہ نہیں ہے، خطرہ نہیں ہے۔ ہمارے آقا و مولی حضور سرور کائنات ﷺ نے رضا بالقضا کا سبق اتنی تکرار سے پڑھایا ہے کہ ہر ایمان والے کا دل مضبوط ہو گیا ہے۔” (حدیث دوستاں)

تصوف و احسان کی اہمیت سے روشناس کرانے والی اثر انگیز تحریریں:

نفس انسانی میں خیر و شر کی آویزش ایک مسلم امر ہے، خیر کی استعداد جب غالب ہوتی ہے تو احکام الٰہیہ پر عمل کرنا انتہائی آسان ہو جاتا ہے، اخلاق و کردار سنت نبوی کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ رب کریم کی مناجات میں لذت و سرور محسوس ہونے لگتا ہے لیکن علمائے سلف اور ابرار و صالحین کے طویل تجربہ و مشاہدہ کے باعث اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تقوی و اخلاص کی ان صفات عظیمہ کا حصول اس ایمان کش دور میں نفس پر بندش کے بغیر بظاہر محال ہے۔ پس رب کریم کی رضا و خوشنودی کے لئے اخلاص کے ساتھ احکام شریعت کی پاسداری کے لئے راہ احسانی و عرفانی کو اختیار کرنا از بس ضروری ہے، لیکن المیہ یہ ہے کہ شرعی احکام کو عقل و خرد کے پیمانے سے ناپ کر صحت و سقم کا فیصلہ کرنے والی، صراط مستقیم سے منحرف آزاد خیال ایک جماعت، جس کا

مشن ائمہ مجتہدین وعلمائے راسخین کی دینی تشریحات وتوضیحات پر قائم سواد اعظم کے اعتماد ویقین میں تزلزل پیدا کرنا ہے، نے عرفان واحسان کی صاف ستھری راہ کو شریعت کے متوازی ایک علیحدہ راہ قرار دیا اور اپنی وسعت کے بقدر اس کا اتنا پروپیگنڈہ کیا کہ فکری واعتقادی لحاظ سے بیمار ذہنیت کے ساتھ ساتھ صحیح عقیدہ کے حاملین بھی متأثر ہو گئے، اور تصوف وسلوک کو اجنبی نگاہوں سے دیکھنے لگے، اور دین کے اس اہم شعبہ پر طرح طرح کے اعتراضات واشکال کرنے لگے۔ استاذ محترم نے اس نازک صورت حال کے تقاضے کو درد دل سے محسوس کیا اور اپنی مفصل تحریروں کے ذریعے اس کی اہمیت وحقیقت سے لوگوں کو روشناس کرایا۔ اعتراضات کے مسکت ومدلل جوابات لکھے، مجلّہ المآثر، ماہنامہ ضیاء الاسلام اور ماہنامہ دار العلوم کے معیاری رسالوں میں اس موضوع پر تحقیقی مقالات تحریر کئے۔ رب کائنات نے جو علمی، فنی اور ادبی استعداد اور افہام وتفہیم کی بے پناہ صلاحیت کے ساتھ تحریری ملکہ عطا فرمایا تھا اس کو بروئے کار لاتے ہوئے آپ نے اس انداز میں تصوف کی عقدہ کشائی کی ہے اور اس طرح اس فن کی حیثیت کو اجاگر کیا ہے کہ اگر معترضین انصاف کی نگاہوں سے اس کا مطالعہ کرلیں تو اس حقیقت کا اعتراف کرنے میں انہیں دیر نہیں لگے گی کہ تصوف انسان کو قرب خداوندی عطا کرتا ہے، تصوف آداب عبدیت وبندگی سکھاتا ہے، تصوف انسانی زندگی میں ایسے توحیدی رنگ بھرتا ہے کہ ان سے سالک تقوی وطہارت کا چلتا پھرتا نمونہ بن جاتا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون میں ایک اقتباس بطور نمونہ پیش کردوں تاکہ حضرت کی دلکش تحریر کو پڑھنے کے بعد میرے مدعا کی خود ناظرین تائید کردیں:

> ''تصوف وسلوک کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ شریعت کے احکام جن کے سامنے سر جھکانے کا نام اسلام ہے، اور ان کی تصدیق کرنے کا نام ایمان ہے۔ اسی اسلام اور ایمان میں قلبی محبت اور ہمہ دم استحضار شامل ہوجائے اور شرعی احکام جنہیں احکام تکلیفیہ کے عنوان سے فقہاء وعلماء تعبیر کرتے ہیں۔ ان سے تکلیف کا مادہ ختم ہوکر انسان کا طبعی اور دلی تقاضا اور حال بن جائے۔ جب یہ کیفیت انسان کے دل میں پیدا ہوجاتی ہے تو اس کی تمام عبادات واعمال صالحہ بلکہ اس کی پوری زندگی اسی کیفیت کے زیر اثر آجاتی ہے، اسی کیفیت قلبی کا نام رسول اللہ ﷺ نے حدیث جبریل میں احسان رکھا ہے۔

یہی احسان پورے دین کا مغز اور خلاصہ ہے۔ اس کے حاصل ہونے کے بعد انسان کو خدا کا خصوصی قرب نصیب ہو جاتا ہے۔ یہ ولایت خاصہ مخصوص لوگوں کا نصیب ہے۔ شریعت اور طریقت کے اس اعتباری فرق کو اکبرؔ مرحوم نے اپنے مخصوص انداز میں بہت خوب ظاہر کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

”شریعت سر جھکانا ہے اور طریقت دل لگانا ہے“

سر تو نہ جانے کتنوں کا جھکا رہتا ہے لیکن دل بھی لگا ہو، یہ خال خال ہوتا ہے۔ جھکا ہوا سر کبھی خارجی ترغیب وتحریض کے باعث اٹھ بھی جاتا ہے، بغاوت بھی کر بیٹھتا ہے، پابندی احکام میں کلفت بھی محسوس کرتا ہے، راہ فرار بھی سوچنے لگتا ہے لیکن جب دل لگ جاتا ہے تو کلفت کیسی؟ ہر ہر حکم میں لذت وحلاوت کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ راہ فرار سوچنا کیسا؟ اب تو اس کا یہ حال ہوتا ہے کہ: ع

”اسیرت نخواہد رہائی زبند“
تیرے گرفتار کو رہائی کی کوئی تمنا نہیں۔

غرض احکام الٰہیہ کی پابندی اور ان کی ادائیگی دل کی دوا اور روح کی غذا بن جاتی ہے۔

پہلے جس کام کو آدمی بجبر وتکلف انجام دیتا تھا، اب اس کو کئے بغیر چین نہیں پڑتا۔ اس کی محسوس مثال یہ ہے کہ طفل گریز پا کو اولاً زبردستی مکتب میں لاتے ہیں، وہ بھاگتا ہے، روتا چلاتا ہے، پاؤں پٹختا ہے، مگر جب اس کو علم کی حلاوت سے آشنائی ہوتی ہے تو علم اس کا اوڑھنا بچھونا بن جاتا ہے۔ علم اس کے رگ وریشہ میں سما جاتا ہے۔ اگر اسے کوئی علم سے اور علمی مشاغل سے الگ کرنا چاہے تو اسے موت نظر آنے لگتی ہے، کیونکہ علم کی لذت اس کے قلب وروح میں اتر گئی ہے۔ یہ مرتبۂ احسان کی مثال ہے۔

اسی احسان کو حاصل کرنے کی کوشش اور اس کی جستجو کا نام تصوف ہے۔“

دوسرے مقام پر اس کی تشریح اس انداز سے کی ہے:

”مبدأ اس طرح ہے کہ ابتداءً تکلف کر کے طبیعت پر علم اور عقل کا دباؤ ڈال کر آدمی اپنے کو اور اپنے اعمال کو حکم خداوندی کا پابند بنائے، بغایت احتیاط رکھے کہ کوئی کام بجز تعمیل ارشاد خداوندی اور بجز جذبۂ رضاء الٰہی کے صادر نہ ہو، نہ عمل، نہ قول، نہ حال، نہ عادت، نہ عبادت، نہ

> حرکت، نہ سکون، نہ محبت، نہ بغض، نہ خرچ، نہ امساک، نہ تکلم، نہ سکوت۔ غرض تفصیلاً زندگی کے ہر لمحہ کو ہر جذبہ سے برطرف کرکے اللہ ہی کے ساتھ وابستہ کرے۔ شروع میں قدم قدم پر پاؤں ڈگمگائیں گے، خیالات بہکیں گے، جذبات غلط روی اختیار کریں گے، نیت ادھر ادھر منتشر ہوگی، ذہن کی آوارگی پریشان کرے گی، لیکن آدمی جب مسلسل اس کی مشق استقامت کے ساتھ جاری رکھتا ہے، اور کسی رہبر و رہنما کی سرپرستی میں لگا رہتا ہے، تو آہستہ آہستہ اس کیفیت کا رسوخ ہوتا جاتا ہے، پھر ایسا ہوجاتا ہے کہ یہی کیفیت ایک دائمی حال بن جاتی ہے، پھر مزید رسوخ کے بعد فطرت ثانیہ بن جاتی ہے، اب اس کا نام حدیث کی اصطلاح کے مطابق ’احسان‘ ہوجاتا ہے۔‘‘ (تصوف ایک تعارف: ص۹۶)

حرف آخر:

حاصل کلام یہ ہے کہ حضرت والا نے علوم وفنون کی دنیا میں اپنے روشن کارناموں کے ذریعہ ہمہ گیر سطح پر جہاں علمی وعملی تابندہ نقوش ثبت کئے ہیں، وہیں سلوک وتصوف کی شاہراہ پر آپ کی ذات گرامی یقین محکم، عمل پیہم کی صفات عظیمہ سے آراستہ اس مسافر کے مانند ہے جس کے سفر میں منزلیں خود بخود قدم بوسی کو مایہ افتخار سمجھتی ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ حضرت والا کی روح کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے مشہور اہل قلم مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب مدظلہ کے وہ جملے نقل کردوں جو انہوں نے حضرت کی محبوب شخصیت حضرت قاری صدیق احمد صاحب باندوی نوراللہ مرقدہ کے لئے ’’پس مرگ زندہ‘‘ میں تحریر کئے ہیں:

’’حضرت والا کی ذات آفتاب عالم تاب تھی، جس کی قوت بخش کرنیں فقیروں کی جھونپڑیوں اور اپرول کی کوٹھیوں پر برابر پڑتی ہیں، جس کی حیات افزا شعائیں میدانوں اور پہاڑوں سب کو یکساں طور پر روشن کرتی ہیں۔ آپ کی فیض رساں ذات پانی اور ہوا کی طرح انسانوں کی ضرورت تھی کہ ہر کوئی اس کا محتاج ہوتا اور کسی تکلیف وہچکچاہٹ کے بغیر اسے حاصل کرتا ہے۔ بقول غالب:

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

* * *

حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ
بخش دی روشنی زمانہ کو..
تعلیم وتربیت کے چند یادگار نمونے

مولانا مفتی اختر امام عادل صاحب قاسمی
مہتمم جامعہ ربانی منوروا شریف

مولانا سے میرا تعلق بہت قدیم ہے، میں مولانا کے اس دور کے شاگردوں میں ہوں جب ان پر گوشہ نشینی اور خلوت پسندی کا غلبہ تھا، لوگوں سے بہت زیادہ ملنا جلنا ان کو پسند نہیں تھا، نہ کہیں آنا نہ جانا، نہ کسی جلسہ ودینی تقریب میں شرکت، کسی شدید ضرورت ہی کے لئے باہر جانا ہوتا تھا، جیسے کوئی شکستہ دل حکمراں ساری دنیا سے بیزار ہوکر کسی ویران مقبرہ کے کھنڈر میں جا بسا ہو۔ اتفاق سے ان کو جگہ بھی حضرت شاہ وصی اللہؒ فتح پوری ثم الہ آبادی کی حویلی کے اس حصہ میں ملی تھی جہاں خانقاہ کے نام پر ایک کھپڑاپوش خام عمارت تھی، اس کے بازو میں چھوٹے چھوٹے چند کمرے تھے، انہی میں سے ایک کمرہ مولانا کو ملا ہوا تھا۔ دوسری طرف ایک حصہ میں مولانا کے اہل وعیال رہتے تھے۔ وہیں ایک طرف مدرسہ کا مطبخ تھا، جہاں دوپہر اور شام میں طلبہ کھانا لینے کے لئے آتے تھے اور تھوڑی دیر کے لئے چہل پہل ہوجاتی تھی، پھر وہی سناٹا......

ابتدا میں مجھے مدرسہ والی مسجد (جس کو ڈھال والی مسجد کہتے تھے) کے ایک کمرہ میں جگہ ملی تھی، بعد میں اسی کھپڑاپوش خانقاہ میں ٹھکانہ ملا اور چونکہ فرش کچا تھا اس لئے چارپائی خریدنی پڑی میرے ساتھ میرا بھائی رضوان احمد بھی تھا اس لئے دو چارپائیاں خریدی گئیں، میری عمر اس وقت

بمشکل دس سال کی ہوگی، لیکن مجھے خوب یاد ہے کہ یہ ساری کاروائی ہمارے مولانا ہی نے انجام دی تھی۔ اس واقعہ کو چونتیس (۳۴) سال کا عرصہ بیت گیا، بچے جوان اور جوان بوڑھے ہو گئے، مگر آئینۂ خیال پر یہ اس قدر تازہ ہے جیسے آج بھی میں اسی عہد طفولیت میں ہوں اور مولانا کی شفقت اسی طرح سایہ فگن ہو، کاش کہ ایسا ہی ہوتا......

ع لوٹ ماضی کی طرف اے گردش ایام تو

غالباً ۱۹۷۹ء کی بات ہے، جب میں تحصیل علم کے لئے مدرسہ وصیۃ العلوم الٰہ آباد میں داخل ہوا۔

اگلے تعلیمی سال (۱۹۸۰ء) میں ہمارے درجہ (عربی اول) کی ایک کتاب (نحو میر) مولانا کے زیر درس آئی اور اس طرح پہلی باران کے حلقۂ تلمذ میں داخلہ کی سعادت ملی، مگران کے رعب کی وجہ سے بہت زیادہ قربت وانس پیدا نہیں ہوا، دوسرے وہاں کے ماحول میں مولانا تنہا محسوس کئے جاتے تھے اور بہت سے طلبہ چاہنے کے باوجود بھی ان سے قریب نہیں ہو پاتے تھے، مولانا درس اور صحبت شیخ کے علاوہ باقی تمام اوقات اپنے کمرہ کے اندر لکھنے پڑھنے میں گذارتے، میں اس وقت لکھنے پڑھنے کے مفہوم سے ناآشنا تھا، بلکہ مدرسہ میں عام طور پر اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی تھی، اسی لئے وہاں اکثر طلبہ علمی قابلیت کے باوجود میدان قلم کے شہسوار نہیں تھے اور نہ مولانا کی اس صلاحیت کی کوئی خاص پذیرائی حاصل تھی۔ وہ تو ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ مولانا نے وہاں رہ کر کیسی کیسی قلمی کاوشیں کیں۔ غازی پور میں عنین کے مسئلہ پر اپنی ایک کتاب مجھے دیتے ہوئے فرمایا "کہ تم دونوں بھائی الٰہ آباد میں باہم لڑنے بھڑنے میں لگے رہتے تھے اور ہم یہ کتاب لکھا کرتے تھے۔"

قلم وکتاب مولانا کی تنہائی کے رفیق تھے، اہل وعیال سے جو وقت بچ جاتا وہ لکھنے پڑھنے میں صرف کرتے، کبھی ان کو مجلس بازی، سیر وتفریح اور لایعنی مشاغل میں نہیں دیکھا گیا، وہاں کے جوان اساتذہ میں ایسی پابند اور محتاط زندگی گذارنے والا کوئی نہیں تھا۔ کئی لوگ اس کو زاہدانہ تقشّف گردانتے تھے، مگر حقیقت یہ تھی کہ یہ صرف اپنا تحفظ تھا۔ مولانا کے لئے وہاں کوئی محرم اسرار ہی نہیں تھا جو ان کا ہم رشتۂ درد ہوتا:

اقبالؔ اپنا محرم کوئی نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

ان کی یہ تنہائی صرف اس وقت ٹوٹتی تھی جب مدرسہ یا خانقاہ میں کوئی صاحب علم یا صاحب دل آجاتا تھا، پھر وہ اپنی خلوت سے نکل آتے تھے اور ایک مجلسی شخص کی طرح ان کے ساتھ بیٹھتے، علم وحکمت اور اسرار ورموز کی باتیں کرتے......مثلاً:

مولانا فاروق صاحب الہ آبادیؒ:

☆الہ آباد کے ایک گاؤں (غالباً اتراؤں) سے حضرت مولانا محمد فاروق صاحبؒ خانقاہ میں تشریف لاتے تھے، ان کا علم وفضل زبان زد تھا، بڑے محقق اور صاحب تصنیف عالم تھے، حضرت شاہ وصی اللہ صاحبؒ کے متوسلین میں تھے بلکہ غالباً اجازت یافتہ تھے، ہمارے مولانا کو ان سے بڑی مناسبت تھی، ان کے ساتھ اکثر بیٹھا کرتے تھے۔

میرے والد ماجد کی الہ آباد آمد:

☆اسی اثنا کا ذکر ہے کہ میرے والد ماجد اپنے ایک رفیق سفر جناب عبدالرؤف صاحب مرحوم (لوٹیا باری ضلع پورنیہ) کے ہمراہ اچانک الہ آباد وارد ہوئے، وہ دہلی اور سرہند کے ارادہ سے نکلے تھے، درمیان میں ہم بھائیوں کی محبت میں الہ آباد اتر گئے، پہلے سے ہمیں اس کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ میں اس زمانے میں حضرت قاری مبین صاحب کے گھر کا خادم تھا، کمسنی کی وجہ سے میرا انتخاب اس کے لئے کیا گیا تھا اور اپنی بے شعوری کے باوجود میں اس کو اپنی سعادت بلکہ عبادت سمجھ کر انجام دیتا تھا۔

والد صاحب کی آمد کی خبر ملی تو میں اس وقت قاری صاحب کی حویلی میں تھا، میں بھاگا ہوا حاضر ہوا، والد صاحب مدرسہ والی مسجد میں تھے، ملاقات ہوئی۔ کچھ دیر کے بعد والد صاحب قاری مبین صاحب دامت برکاتہم سے ملنے کی غرض سے خانقاہ تشریف لے گئے، وہاں مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ اپنی درسگاہ میں پڑھا رہے تھے، ہم لوگوں کا سبق اس کے بعد ہی تھا۔ قاری صاحب سے ملاقات کے بعد والد صاحب کے قدم ناگاہ ان کی درسگاہ کی طرف مڑ گئے، مولانا سے کوئی شناسائی نہیں تھی۔ ہم دونوں بھائی بھی مولانا کے لئے ایک طرح سے اجنبی ہی تھے، لیکن نہ معلوم

مولانا پر کس کیفیت کا غلبہ ہوا کہ انہوں نے سبق بند کردیا اور طلبہ کو رخصت کردیا، دیر تک دونوں حضرات طریقت وتصوف کے موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ حکیم یعقوب صاحب جو اس مدرسہ کے ابنائے قدیم رہے ہیں اور اس وقت کسی گورنمنٹ لائبریری میں ملازم تھے، والد صاحب کے ہمراہ تھے، ان کا بیان ہے کہ کسی شخص کے لئے انہوں نے پہلی بار اپنے معمولات ترک کئے۔ پھر والد صاحب کو ہمراہ اپنے کمرہ لے گئے اور دو دنوں تک کی پوری ضیافت اپنے گھر میں انجام دی۔ اس دوران اکثر ان دونوں بزرگوں کو باہم محو گفتگو دیکھا گیا، بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ مولانا اکثر سراپا گوش نظر آئے۔

مولانا اعجاز احمد اعظمی ہمارے جد اکبر حضرت مولانا عبدالشکور آہ مظفر پوریؒ کے نام سے واقف تھے، انہوں نے ان کا نام دارالعلوم مئو کے مشائخ حدیث کی فہرست میں دیکھا تھا، مگر اس نسبت سے وہ ہمیں نہیں جانتے تھے۔ والد صاحب سے پہلی ملاقات میں بھی اس کا ذکر نہیں آیا۔ غرض تاریخی مکمل اجنبیت کے باوجود مولانا قیام الہ آباد کے دوران والد صاحب سے اس قدر متأثر ہوئے کہ نہ صرف یہ کہ دو دنوں کی پوری خدمت وضیافت اپنے ذمہ لی، بلکہ ریلوے اسٹیشن تک خود رخصت کرنے گئے، ٹرین لیٹ تھی تو ڈیرھ دو گھنٹے اسٹیشن پر ساتھ رہے اور اس دوران بھی مسائل طریقت ہی پر بات کرتے رہے۔

منوروا تشریف آوری اور مکاتبت:

ہم تو اس وقت نادان تھے، لیکن بعد میں والد صاحب اور کچھ مولانا کے خطوط کے ذریعہ اس کی تھوڑی تفصیل معلوم ہوئی۔ مولانا کے اس دور کے کچھ خطوط آج بھی ہمارے پاس محفوظ ہیں، جب مولانا جستجوئے معرفت میں کافی حیران وسرگرداں نظر آتے تھے۔

اسی سال مولانا نے رجب المرجب کے آخری ہفتہ میں بہار کا سفر اختیار کیا اور ہمارے یہاں ۲۸/ رجب ۱۴۰۱ھ کو احباب طریق کی چند مجالس میں شرکت فرمائی، مولانا نے یہاں دو شب قیام کیا۔ ہم لوگ تو خدام تھے، ہمیں ہم نشینی کا شرف کم ہی ملا، لیکن مولانا کے جذبہ وشوق کی وارفتگی ہم نادانوں سے بھی مخفی نہیں رہ پائی، مولانا نے یہاں سے واپسی پر والد محترم کو اپنے پورے سفر کی تفصیل لکھی اور غالبًا یہ پہلا خط ہے جو مولانا نے الہ آباد سے والد صاحب کو تحریر فرمایا ہے۔ خط

ڈیڑھ صفحہ پر مشتمل ہے، اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ’’مخدومی ومکرمی! یہ تو سفر کی روداد تھی جو میں نے اپنی طبیعت کے خلاف اتنی تفصیل سے لکھ دیا تاکہ آپ کو پورا اطمینان حاصل رہے، لیکن حاصل سفر وہی چند لمحات تھے، جو آپ کی صحبت میں بسر ہوئے، میں تو اندھا ہوں اور بے حس بھی، کسی طرح کا ادراک واحساس قطعاً کچھ نہیں ہوا، لیکن مجھے امید ہے کہ نیکوں کی صحبت رنگ ضرور لائے گی۔ میرے ساتھ تو سنگ بے نمک لیسیدن والا مضمون ہے، اکثر مجھے اپنی حالت پر افسوس ہوتا ہے کہ ہائے عمر کا کچھ حاصل نہیں، جس قدر عمر میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، گناہ بڑھتے ہی جاتے ہیں، کمیت میں بھی اور کیفیت میں بھی۔ آپ جیسے حضرات کی صحبت میں رہ کر یہ احساس اور بڑھ جاتا ہے کہ نیکوں کی پرواز کتنی اونچی ہے، میں غریب اندھا، لنگڑا، اپاہج، بے ہمت، کام چور دن بدن خراب وبدحال ہی ہوتا جارہا ہوں، پرواز ہے مگر معکوس ومنکوس، معلوم نہیں میرے بارے میں خدا کو کیا منظور ہے، اگر میری رسوائی وعذاب ہی منظور ہے- خدا کرے ایسا نہ ہو- تو میرا بند بند کانپ جاتا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ مجھے اپنے اوپر سب سے زیادہ اندیشہ مردودیت ومطرودیت ہی کا ہے، کیونکہ میری معصیتیں حد سے فزوں تر ہیں، اور گستاخی وبے ادبی مزید، لیکن پھر غور کرتا ہوں تو خدا کی شان رحمت وعنایت ہاتھ پکڑتی ہے، کہ بندے مایوس نہ ہو- اب اللہ والوں سے بجز اس کے کیا عرض کروں کہ وہ خدا کے حضور اس بندہ کے متعلق یہی درخواست پیش کریں کہ مردودیت سے بچایا جاؤں۔ آپ حضرات کی محبت دیکھتا ہوں تو ڈھارس ہوتی ہے کہ دنیا میں آپ نے محبت کی نظروں سے دیکھا ہے، تو امید ہے کہ آخرت میں بھی آنکھیں نہ پھیریں گے- اے کاش میں کوئی جانور ہوتا جسے جنون محبت کی گرانباریوں سے نجات ہوتی، ہائے ہائے دل بیٹھا جاتا ہے، طبیعت گھبرانے لگتی ہے، آپ میرے لئے صدق دل سے دعا تو کرتے ہی ہیں مگر مکرر درخواست کرتا ہوں کہ للہ اور توجہ کیجئے، اس غریق بحر ظلمات کو ہاتھ پکڑ کر نکالئے۔ حضرات نقشبندیہ تو غائبانہ توجہ کے ذریعے بھی سالک کو چلاتے رہتے ہیں۔ (۴/شعبان ۱۴۰۱ھ)

مولانا کی یہ اضطرابی کیفیت ایک دن کی نہیں تھی، بلکہ برسوں مولانا اس میں مبتلا رہے۔ ۱۴۰۵ھ کے ایک خط میں جب میں دیوبند جاچکا تھا والد صاحب کو تحریر فرماتے ہیں:

''مظہر صاحب (والد صاحب کے ایک قدیم مسترشد اور محرم راز، مقام بڑہروا ضلع سیتامڑھی بہار) نے میرے بارے میں جو کچھ کہا ہے، اس پر ضرور توجہ فرمائیں، آپ صاحب کشف ہیں، کاش کسی ذریعہ سے مجھے یہی معلوم ہوجاتا نسبت مع اللہ حاصل کرنے کے لئے کس آستانہ پر مجھے جانا چاہئے۔ طبیعت گو اندر سے پرسکون ہے، مگر ایک تشنگی اور پیاس معلوم ہوتی ہے، اب کے بہار کا سفر ہوگا تو گڑھول شریف جانے کی نیت ہے اور منوروا شریف بھی۔ آپ حضرات سے مل کر ایمان میں تازگی آجاتی ہے۔ حق تعالیٰ آپ کو سلامت با کرامت رکھے۔''
(مکتوب ۱۵/ ذی قعدہ ۱۴۰۵ھ)

۱۴۰۶ھ کے ایک خط میں اپنی بے قراری کا حال ان الفاظ میں تحریر فرمایا:

''ملاقات ہوئے بہت عرصہ ہوگیا، آپ ہی کھینچئے، تاکہ ملاقات ہو، میرا تو پروگرام بن بن کر فیل ہوجاتا ہے، آج کل تو کوئی پروگرام بھی نہیں ہے، آپ کے وجود سے بڑی ڈھارس ہے، طبیعت کو قوت رہتی ہے۔'' (مکتوب ۱۵/ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۶ھ)

یہ خطوط جو سر دست مجھے ہاتھ آگئے، مولانا کے اس عہد کے کیف دروں کے عکاس اور ان کے اضطراب و بے قراری کے غماز ہیں۔ ان کا سکوت ان کے اندر کے طوفان کا پیش خیمہ تھا، جسے اپنی منزل گم شدہ کی تلاش ہو اسے اپنے گردوپیش کی کیا خبر؟ لوگ اس خاموش مزاجی اور جنون محبت کی گرانباری کو جو نام دینا چاہیں دیں، مگر جس پر گذرتی ہے وہی اس کو بہتر طور پر جانتا ہے، مولانا، ڈاکٹر کلیم عاجزؔ کا یہ شعر اکثر پڑھا کرتے تھے، جو ان کے کرب دروں کا آئینہ دار تھا:

تم تو جوانی کی مستی میں کھیل کے پتھر پھینک گئے
جس کو چوٹ لگی ہے پیارے اس کا ہی دل جانے ہے

اب یہ یاد نہیں کہ کیا بات ہوئی جو ہم لوگ اپنا یہ تعلیمی سال پورا ہونے سے پہلے ہی واپس وطن آگئے، (شاید کوئی فرقہ وارانہ فساد ہوا تھا) رجب کے اواخر میں مولانا منوروا تشریف لائے۔ والد صاحب کو انھوں نے اپنے پروگرام کی اطلاع دی اور اگلے تعلیمی سال (۲-۱۴۰۱ھ م ۸۲-۱۹۸۱ء) کے لئے میرا قرعۂ فال مدرسہ دینیہ غازی پور کے لئے نکل گیا۔

۲۴/ رمضان المبارک ۱۴۰۱ھ کو والد صاحب کے نام مولانا کا خط آیا جس میں الٰہ آباد

سے اپنی علحدگی واستعفا اور مدرسہ دینیہ غازی پور پہونچنے کی اطلاع دی گئی تھی اور والد صاحب مدظلہ سے غازی پور آنے کی خواہش کا بھی اظہار کیا گیا تھا۔ غالباً سب کچھ پہلے منوروا میں طے ہو چکا تھا، خط میں اسی کی یاددہانی کرائی گئی تھی اور یہ بھی درخواست کی گئی تھی کہ کم ازکم دو تین دن کا وقت یہاں دیں۔

غازی پور میں ہمارے قافلہ کی آمد:

چنانچہ عید کے بعد ۱۵/ شوال سے قبل ہی ہمارا قافلہ والد ماجد کی قیادت میں غازی پور کے لئے روانہ ہوگیا، جس میں والد صاحب کے چار احباب جناب حاجی مظہر الحق صاحب اوڈیٹر (سیتامڑھی)، جناب حاجی محفوظ الرؤف صاحب (رئیس کملپوراتر دیناجپور بنگال)، جناب ضیاء الحق صاحب (سورجاپور بنگال)، جناب اکرم صاحب (سیوان) اور میرے علاوہ دو اور طلبہ مفتی انعام الحق (مقیم حال گجرات) اور مولوی شرافت ابرار (مقیم حال کلکتہ) شامل تھے۔ سب سے پہلے ہمارے سات رکنی قافلہ نے شوکت منزل میں پڑاؤ ڈالا۔ اسی سال اس کا افتتاح بھی ہوا جس میں حضرت والد صاحب کی دعا پر مجلس اختتام پذیر ہوئی اور عربی درجات کو مرکز کی قدیم عمارت سے یہاں منتقل کیا گیا۔ عربی ہفتم کا اجراء بھی اسی سال ہوا، اور ظاہر ہے کہ اس ترقی میں حضرت مہتمم صاحب (مولانا عزیز الحسن صدیقی) دامت برکاتہم کی دلچسپی کے علاوہ بڑا دخل مولانا اعجاز صاحب کی آمد کا تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اس افتتاحی نشست میں حکیم یوسف صاحب مرحوم (جو مہتمم صاحب کے ہمدرد دواخانہ میں بیٹھتے تھے) نے ایک طویل تہنیتی نظم پڑھی تھی، جس کا ہر بند اس مصرعہ پر پورا ہوتا تھا: ع

مولوی اعجاز جب آئے الہ آباد سے

غازی پور کا یادگار سرمایہ- مدرسہ دینیہ:

ہم جس دور میں وہاں پہونچے تھے اس وقت نہ صرف غازی پور ضلع میں بلکہ کئی اضلاع میں اس معیار اور شہرت کا کوئی مدرسہ نہ تھا۔ معیار تعلیم تو درجہ عربی ششم تک ہی تھا، لیکن لائق وفائق اساتذہ، بکثرت ذہین طلبہ کے رجوع اور وہاں کے خاص تعلیمی وتربیتی ماحول نے اس کو ایک آئیڈیل مدرسہ بنادیا تھا۔ اتنا خوبصورت تعلیمی ماحول اور طلبہ میں پڑھنے لکھنے کا ذوق فراواں کم ازکم

میں نے اس سے پہلے کہیں نہیں دیکھا بلکہ اس کے بعد بھی آج تک کسی تعلیمی ادارہ میں وہ دیکھنے کی حسرت باقی رہی۔ اساتذہ تو شب زندہ دار ہوتے ہی تھے میں نے رات رات بھر وہاں طلبہ کو بھی کتابوں سے چپکا ہوا دیکھا ہے، جبکہ مدرسہ کے پاس تعلیمی وسائل کی فراوانی نہیں تھی، نہ روشنی کا خاص نظم تھا اور نہ بیٹھنے کے لئے خاطر خواہ فرش میسر تھے، لیکن موم بتی (جو طلبہ اپنے طور پر خریدتے تھے) کی روشنی میں طلبہ اپنی آنکھیں کتابوں میں گاڑے رہتے تھے، نہ ان کو گرمی کی پرواہ تھی اور نہ ٹھنڈی کا احساس۔ دو سال کے بعد ہمارے دوست مولانا محمد ابوذر قاسمی (مقیم حال پانڈر کوڑہ مہاراشٹر) جو اس وقت وہاں پڑھتے تھے کلکتہ سے مٹی تیل والا دو عدد پیٹرومیکس لے آئے، اس دن ہماری خوشیوں کی انتہا نہ تھی کہ اب ہم کم از کم مغرب سے عشا تک کا تعلیمی سفر پیٹرومیکس کی تیز روشنی میں طے کرسکیں گے، عشا کے بعد کا اللہ مالک ونگہبان ہے۔

مدرسہ دینیہ کا خوبصورت تعلیمی ماحول:

طلبہ میں پڑھنے کی ایسی لگن تھی کہ ان کو اساتذہ کی نگرانی کی بھی حاجت نہ تھی، وہ اپنے ذوق وشوق سے رات رات بھر پڑھتے تھے اور ایک استاذ بھی ان کی نگرانی کے لئے موجود نہیں ہوتا تھا۔

مجھے آج بھی یاد ہے، میرے وہاں قیام کا غالباً دوسرا یا تیسرا سال ہوگا، مدرسہ وصیۃ العلوم الہ آباد سے حضرت مولانا محمد نعمان صاحب معروفیؒ مدرسہ دینیہ غازی پور تشریف لائے۔ شب کا قیام ان کا حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ کے اس کمرہ میں ہوا جو فوقانی منزل پر گنگا کی طرف منہ کئے ہر سرد وگرم کا سامنا کرنے کے لئے تنہا کھڑا تھا، گرمی کا موسم، مولانا کی چارپائی کمرہ کے باہری حصے میں ڈال دی گئی تھی، عشاء کی نماز کے بعد وقفہ بڑھا، شب کا سکوت گہرا ہوتا چلا گیا، گنگا کی موجیں بھی محوخواب ہونے لگیں، رات کے دس بجے، گیارہ بجے، بارہ سے کانٹا آگے چلا گیا، مولانا کروٹ پہ کروٹ بدل رہے ہیں، گرمی کی چھوٹی رات، مولانا چاہتے تھے کہ کم سے کم ایک بجے تہجد کی نماز سے فارغ ہوجائیں مگر طلبہ کے قال یقول کی صدائیں تھمنے کا نام نہیں لیتی تھیں، ان کو کیا خبر کہ کسی کو ان کی خاموشی کا انتظار بھی ہے؟ رات کے دو بج گئے، میں گذرتا ہوا ادھر چلا گیا، مولانا بے چین تھے، میں نے تھوڑی خدمت کی، مولانا نے پوچھا، یہ طلبہ کب سوئیں گے؟ میں نے

کہا کہ حضرت ان کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے، جب ان کے پڑھنے کا جنون کمزور ہوگا نیند ان کو دبوچ لے گی۔ مولانا نے بے ساختہ کہا کہ:

’’سبحان اللہ! پڑھنے کا یہ خوبصورت ماحول اور طلبہ کا یہ ذوق وشوق عہد ماضی کی یاد دلاتا ہے، ہمارے یہاں الہ آباد میں یہ ماحول نہیں ہے اور میں نے آج تک کسی جگہ یہ ماحول نہیں دیکھا مجھے امید ہے کہ یہ بچے آفتاب وماہتاب بن کر چمکیں گے۔‘‘

مدرسہ دینیہ کے اساتذۂ باکمال:

اور ظاہر ہے کہ اس ماحول کو بنانے میں انتظامیہ کے خلوص کے علاوہ ہمارے اساتذہ کا بڑا حصہ تھا، اس وقت کے اساتذہ میں ناظم تعلیمات حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ کے علاوہ حضرت مولانا عبدالرب صاحب جہانا گنجی حال ناظم مدرسہ انوارالعلوم جہانا گنج، حضرت مولانا صفی الرحمٰن صاحب دربھنگوی حال صدرالمدرسین مدرسہ اسلامیہ شکر پور بھروارہ دربھنگہ، حضرت مولانا انوار احمد صاحب خیرآبادی صاحب تصانیف کثیرہ حال استاذ حدیث وتفسیر جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم گڑھ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن معروفی حال استاذ مدرسہ کوپا گنج، حضرت مولانا رفیع الدین صاحب قاسمی حال صدرالمدرسین مدرسہ اسلامیہ شاہ جنگی بھاگلپور، اور حضرت مولانا مختار احمد خیرآبادی موجودہ صدرالمدرسین مدرسہ دینیہ غازی پور سب کی محنت ولگن اور آہ سحرگاہی کے نتیجے میں یہ ماحول وجود میں آیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک انجمن تھا، جس کا ظہور وہاں سے نکلنے کے بعد زیادہ ہوا۔ بڑی ناسپاسی ہوگی اگر اس وقت کے صدرالمدرسین حضرت مولانا مشتاق احمد غازی پوریؒ کا ذکر نہ کیا جائے، ظاہر ہے کہ صدرالمدرسین کا کردار سب سے کلیدی ہوتا ہے، وہ مرکز کی عمارت میں رہتے تھے، شوکت منزل کبھی کبھی تشریف لاتے تھے، ان سے مجھے تلمذ کا شرف حاصل نہیں ہوا، لیکن ان کی للّٰہیت وبے نفسی اور مدرسہ کے تعلق سے ان کی فکرمندی بے نظیر تھی، اکثر کسی مہمان زائر کے ساتھ ہی وہ آتے تھے، وہ مدرسہ کی ہر ترقی سے خوش ہوتے تھے اور اونچے الفاظ میں اس کا ذکر کرتے تھے۔

ان کے علاوہ جناب مولانا جلال الدین صاحبؒ اور جناب قاری شبیر احمد صاحب دربھنگوی (حال ناظم مدرسہ اسلامیہ شکر پور بھروارہ ضلع دربھنگہ) بھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں یہ

حضرات بھی مرکز کی عمارت میں رہتے تھے، اس لئے ہمارا ان سے کوئی خاص واسطہ نہیں پڑتا تھا، مگر یہ دونوں شخصیتیں بھی گوناگوں کمالات کی مالک تھیں اور مدرسہ میں ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتی تھیں۔

مولانا اعجاز احمد صاحب کی مردم ساز شخصیت:

مگر ان سب میں ماحول ساز شخصیت مولانا اعجاز احمد اعظمی کی تھی، وہ ناظم تعلیمات تھے، تمام اساتذہ ان کا احترام کرتے، ان کا مشورہ مانتے تھے اور ان کے علمی تفوق کے قائل تھے۔ وہ انسانوں کے نبض شناس اور ماہر نفسیات تھے، وقت کی نزاکتوں کو خوب سمجھتے تھے، ہر طرح کے علوم و فنون پر بھی دستگاہ رکھتے تھے، تقریر و تحریر دونوں پر ان کو یکساں قدرت تھی۔ ان کے مواعظ سیدھے دل میں اترتے محسوس ہوتے تھے، ہر جمعہ کو بعد نماز فجر طلبہ میں وعظ فرماتے، جس میں تعلیم و تعلم، شخصیت سازی، اور علماء وطلبہ کی ذمہ داریاں جیسے حساس موضوعات پر مؤثر گفتگو فرماتے تھے، بزرگوں کے واقعات تو ان کے نوک زبان تھے، ہر موقعہ کی رہنمائی کے لئے حکایات و واقعات کا بڑا ذخیرہ ان کے حافظہ میں موجود تھا، اس پر انداز بیان کی چاشنی سونے پر سہاگہ کا کام کرتی تھی، اسی سے ماحول بنتا تھا۔ اس پر مزید ان کی وجاہت، خداترسی، قوت انجذاب، اور اضطراب و بے قراری مہمیز کا کام کرتی تھیں۔ وہ خود بھی اپنے خطابات کا بہترین عملی نمونہ تھے، کتابوں اور اصحاب علم سے بڑھ کر ان کا کوئی دوست نہیں تھا، ان کا پورا وقت پڑھنے پڑھانے، مطالعہ و تحقیق، اور تحریر و تصنیف میں گذرتا تھا۔ اس وقت ان کے عوامی خطابات کا سلسلہ شروع نہ ہوا تھا، جلسوں میں بہت کم شرکت کرتے تھے، بعد میں جب ان کے شاگردوں کا حلقہ وسیع ہوا تو مختلف علاقوں میں شاگردوں سے تعلق اور وہاں کی دینی ضروریات کی بنا پر ان کو سفر کرنا پڑا، اور پھر اسفار کا مستقل سلسلہ شروع ہو گیا، لیکن ہمارے زمانۂ طالب علمی میں ان کی ساری توجہات کا محور طلبہ ہوتے تھے۔ اپنی صلاحیتیں طلبہ میں منتقل کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا، اور ان کو اپنے سے بہتر دیکھنا ان کی دلی تمنا ہوتی تھی۔ ان کے اسی جذب اور کرب کا اثر تھا کہ ان کے بے پناہ علمی اشتغال اور رکھ رکھاؤ اور جاہ وجلال کے باوجود طلبہ ان سے مربوط رہتے تھے۔ طلبہ کے ہر مسئلہ کے لئے ان کے وقت میں گنجائش ہوتی تھی، وہ ہر طالب علم کے لئے اپنے دل میں درد رکھتے تھے، ہر طالب علم کے مسئلہ کو اپنا مسئلہ سمجھتے، طلبہ کے گھریلو معاملات سے بھی واقفیت رکھتے اور مناسب مشورے دیا کرتے تھے۔

ان کی خوشی اور غم میں برابر شریک رہتے۔ حافظہ اتنا غضب کا تھا کہ نہ صرف کتابی عبارتیں بلکہ طلبہ کی صورتیں اور ان سے متعلق باتیں بھی ہر وقت ان کے ذہن میں مستحضر رہتی تھیں، خواہ کتنے ہی عرصہ کے بعد ملاقات ہو فوراً پہچان لیتے تھے۔ یہ آسان بات نہیں ہے، آدمی برسوں ساتھ رہنے کے بعد بھی لمبے عرصے کے لئے بچھڑ جاتا ہے تو صورتیں ذہن سے محو ہو جاتی ہیں۔

مولانا کی یہی وہ خصوصیات تھیں جن کی بدولت وہ دلوں پر حکمرانی کرتے تھے، ان کے اشاروں پر طلبہ جان دیتے تھے، جب تک کسی استاذ کو اس درجہ محبوبیت حاصل نہ ہو وہ طلبہ میں انقلابی تعمیر کا کام انجام نہیں دے سکتا۔ وہ مرد آہن اور مرد انقلاب تھے، جن کے یہاں کوئی گھن گرج نہیں، کوئی شور ہنگامہ، کوئی طوفان نہیں، کوئی نعرۂ انقلاب نہیں، مگر دل ودماغ کی کایا پلٹ جاتی تھی۔ گردوپیش میں طلب وجستجو کی ایسی خوشبو پھیل جاتی کہ ہر شخص علم کا دیوانہ ہو جاتا تھا، ایسا ماحول بن جاتا کہ بدشوق بھی پڑھنے پر مجبور ہوتا، نہ چاہنے والے دلوں میں بھی چاہت کی لہریں اٹھتیں۔ ہر انسان اپنی صلاحیتوں اور اپنے ذوق وشوق سے آگے بڑھتا ہے۔ علم محنت سے حاصل کیا جاتا ہے، اس کو گھول کر پلایا نہیں جا سکتا، لیکن مولانا کی استاذی کا کمال یہ تھا طالب علم اتنی تیزی سے بدلتا اور ترقی کرتا کہ تھوڑی دیر کے لئے یہ گمان ہوتا کہ شاید علم کا محلول اسے پلا دیا گیا ہو۔ علم تو عطیۂ الٰہی ہے، یہ مولانا کے اختیار میں نہیں تھا، لیکن وہ علم کا نشہ چڑھانا ضرور جانتے تھے، وہ اپنے زور بیان اور قوت کردار سے طلبہ پر ایسی بے خودی طاری کر دیتے تھے کہ طلبہ اپنی منزل کی طرف بے تکان دوڑ پڑتے تھے۔ بگڑے سے بگڑے ماحول کو بنانا اور مردہ دلوں میں زندگی کی روح پیدا کر دینا ان کے خم وابرو کا کھیل تھا۔ وہ مسلمانوں کے اس طبقۂ شباب میں جس سے پوری ملت اسلامیہ کی امیدیں وابستہ ہیں ایسا جوش عمل بھر دیتے تھے کہ ان کی منزل سات ثریا کی بلندی پر بھی ہو تو اس کو پانے کی وہ کوشش کرتے تھے اور اس کے لئے جسم وجان کی ساری راحتیں قربان کرنے اور بڑی سے بڑی مشکلات کا سامنا کرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ میں نے ڈاکٹر اقبالؔ کا یہ شعر پہلی بار مولانا کے طریقۂ کار سے ہی سمجھا:

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

استاذ کامل کی صفات:

میں پورے برصغیر کی بات نہیں کرتا لیکن جہاں تک میرا مشاہدہ وتجربہ ہے، ملک وبیرون ملک کے سفر میں مختلف مدارس وشخصیات کی زیارت کا موقعہ ملا ہے، اس کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں کہ استاذ کامل کی جو صفات مولانا کی شخصیت میں دیکھیں وہ کہیں نظر نہ آئی، معاملہ قابلیت و صلاحیت کا نہیں اور نہ شب بیداری وزہد وتقویٰ کا، نہ شاہکار تحریروں اور دھواں دھار تقریروں کا، معاملہ استاذی اور مردم سازی کا ہے۔

ایک استاذ کا اصل کمال یہ ہے کہ وہ اپنا فن اپنے شاگردوں میں اپنے سے بہتر طور پر منتقل کردے، یعنی علم وکمال کو نقطۂ جامد کی طرح نہیں بلکہ شعلۂ جوالہ کی صورت میں منتقل کرے، جس کی بلندیٔ پرواز صرف اس کی عظمت کی دلیل نہ ہو بلکہ ایک پوری نسل اور جماعت اس پرواز میں شریک ہو، جس کی نگاہ طلبہ کی ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ ان کی اخلاقی اقدار پر بھی ہو، ان کے خاندانی پس منظر اور اقتصادی حالات سے بھی واقف ہو۔ تعلیم وتربیت کے لئے خون جگر صرف کرنے کا جذبہ بھی رکھتا ہو اور سلیقہ بھی۔ طلبہ کے ساتھ انفرادی طور پر فکرمندی بھی ہو اور دردمندی بھی، ساز دل بھی رکھتا ہو اور سوز جگر بھی۔ ذاتی زندگی بھی اس کی مثالی ہو اور اجتماعی زندگی بھی۔ اس کی زندگی نور ایمانی اور خوف خدا کی آئینہ دار ہو، اس کا طرز عمل پیغام عمل دینے والا ہو، وقتی ہیجان پیدا کرنے والا نہیں۔ اس کو دیکھنے سے زندگی کا حوصلہ ملتا ہو مایوسی نہیں، جس کے شاگرد اس کے اشاروں پر ہفت خواں طے کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں، جو گر گر کر بھی اٹھ جانے کی ہمت رکھتے ہوں۔ بقول شاعر:

اس طرح طے کی ہیں ہم نے منزلیں
گر پڑے، گر کر اٹھے، اٹھ کر چلے

کسی شخص میں ان میں سے کوئی ایک بات بھی پیدا ہو جائے، تو اس کی استاذی کے لئے کافی ہے، لیکن اگر یہ تمام باتیں کسی ایک فرد میں جمع ہو جائیں تو وہ استاذ کامل بن جاتا ہے اور وہ فرد

نہیں، انجمن اور اس کا لمحہ لمحہ ایک صدی کے برابر ہوتا ہے۔ ہمارے مولانا اعجاز صاحب بھی انہی خوش نصیب افراد میں تھے، جن کو قدرت کی طرف سے استاذی کے یہ تمام کمالات ودیعت کر دیئے گئے تھے، اسی لئے ان کی شخصیت ایک جماعت اور ان کی حیات ایک عہد کے برابر تھی:

بہت لگتا تھا جی صحبت میں ان کی
وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے

دوسری جانب شاگردوں اور اصحاب تلمذ کی طرف سے جو محبت و گرویدگی ان کو ملی اور ان کے شاگردوں نے ان کے نظریۂ تعلیم و تربیت کے تعلق سے جس عملی صداقت کا مظاہرہ کیا کہ شاید ایسے خوش نصیبوں کو آج ہندوستان میں انگلیوں پر گنا جا سکے۔ عہد قدیم میں اس کی مثالیں بہت ملتی ہیں، مولانا اِس دور میں اُسی قافلۂ قدس کے بچھڑے ہوئے شہسوار تھے جو آخر اپنے کارواں سے جا ملے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

مدرسہ دینیہ کا علمی مقام:

میرا علم اور میری صلاحیت کیا، مولانا کے بلند پرواز شاگردوں میں میری حیثیت ہی کیا، لیکن بطور اعتراف اور جذبۂ تشکر کے کہتا ہوں کہ مطالعہ وتحقیق اور تحریر وتقریر کا جو بھی ٹوٹا پھوٹا سلیقہ مجھے حاصل ہوا، اس میں مدرسہ دینیہ کے اس چار سالہ قیام کا بنیادی حصہ ہے، بعد کے تمام ادوار تکمیلات وتحسینات کے ہیں۔ بنیادیں اسی شوکت منزل کی چہار دیواریوں میں قائم ہوئیں جو آج بھی میرے خوابوں اور خیالوں کی منزل اور میری تمناؤں اور آرزوؤں کا مسکن ہے۔ میری زندگی کے قیمتی ماہ وسال وہاں گذرے ہیں، وہاں میرا بچپن عہد شباب سے ہم آغوش ہوا، اسی آب وہوا نے مجھے قوت پرواز بخشی، اسی دریا کی موجوں نے مجھے تیرنا سکھایا، خود کلامی اور خدا کلامی میں نے وہیں کے ذرات سے سیکھی، وہیں کے بام ودر اور شام وسحر میرے چوبیس گھنٹوں کے رفیق رہے، جو میرے غمگسار بھی تھے اور شریک درد بھی، مجھے جو بھی دیا اسی ماحول نے دیا۔

میں نے مدرسہ دینیہ کا وہ دور عروج پایا ہے، جس کو تاریخی تسلسل نہیں تاریخی ارتعاش کہنا زیادہ بجا ہوگا، جس کی تعمیر ایک مرد درویش کی نگاہ مؤمنانہ اور ایک مرد غیور کے عزم قلندرانہ کا نتیجہ تھی، جو وہاں کے باغباں کے خوابوں کی تعبیر تھی، جس میں اس کا اور اس کے رفقاء کار کا خون جگر

پیوست ہوا تھا۔ میں مدرسہ دینیہ کے اس نقطۂ ارتقاء کا ساتھی ہوں جہاں ایک جنبش قدم صدیوں کے سفر کے لئے کافی ہوتی تھی، جس کے لمحوں میں وہ برکت تھی جو آج برسوں کو حاصل نہیں ہے، جہاں مسافروں کی نقل وحرکت کے آگے ماہ وسال کی گردشیں تھم جاتی تھیں۔ یہ مدرسہ دینیہ کا وہ عہد زریں تھا جب نہ ساقی کو کوئی بخل تھا اور نہ رند میں تکان، نہ جام وجم کی گردشیں رکتی تھیں اور نہ میخواروں کا جمگھٹا کم ہوتا تھا، جب میخانہ لبریز تھا، بادہ خواروں کی بھیڑ تھی، جب طلبہ میں یہ جذبہ موجزن ہوا کرتا تھا:

ہمیں گھر سے کیا مطلب، مدرسہ ہے وطن اپنا
مریں گے ہم کتابوں پر، ورق ہوگا کفن اپنا

میخانہ آج بھی اسی طرح قائم ہے، مگر وہ بادہ خوار نہیں، ساقی ایک ایک کر کے رخصت ہوتے جا رہے ہیں، جیسے موتی کا پرویا ہوا ہار ٹوٹ گیا ہو۔ اب نہ وہ اہل ہنر ہیں نہ وہ اہل طلب۔

مولاناؒ کی زندگی کا عہد زریں:

مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ اسی سلسلۂ زریں کی شاندار کڑی تھے، مولانا کی زندگی کا بھی یہ عہد زریں تھا۔ ان کی مردم ساز شخصیت کے جو کمالات اس دور میں ظاہر ہوئے وہ پھر دیکھنے میں نہیں آئے۔ یہاں مولانا نے جو افراد تیار کئے وہ ان کی پوری زندگی کا حاصل ہیں، یہاں سے نکلنے کے بعد مولانا کی شخصیت میں وسعت پیدا ہوئی، عوامی خدمات کا دائرہ بڑھا، درسیات کی اونچی کتابیں پڑھانے کو ملیں، ایک محقق ومصنف کی حیثیت سے ان کا تعارف عام ہوا۔ ان کی چھپنے والی تحریروں پر بڑے بڑے ادیبوں نے سر دھنے، شاندار تبصرے لکھے گئے، ان کی کتابوں نے اہل علم وتحقیق سے قیمتی خراج تحسین وصول کئے، شخصیت کے وقار میں اضافہ ہوا، اور ان کی عظمت میں چار چاند لگے، لیکن پھر.......... مصروفیات اتنی بڑھیں کہ افراد سازی کا وہ سلسلۂ زریں مدھم پڑ گیا جو ان کا خاص امتیاز تھا اور جس کی وجہ سے وہ جہاں بھی جاتے ان کے گرد طلبہ کا ہجوم ہو جاتا تھا۔ طلبگاروں کو ان کے اندر اسی استاذ کی تلاش تھی جو غازی پور میں نظر آئے تھے۔ ارباب جستجو ان کی اسی شخصیت کی کھوج میں رہے، جو غازی پور کے افق پر چمکتی ہوئی دکھائی دی تھی۔ بادہ خوار اپنے اسی ساقی کی طلب میں بھٹکتے رہے جو رسم میکشی سے بالاتر ہو کر دل ونگاہ کو مخمور کرنے کا فن جانتا تھا، لیکن

مولانا کا دائرۂ عمل اتنا وسیع ہو گیا تھا، ان کے کاندھوں پر اتنی ذمہ داریاں آ گئی تھیں اور وہ آفاق کی ان وسعتوں میں جا پہونچے تھے جہاں ہر طلبگار کی رسائی ممکن نہ تھی۔ اب ان سے فیض وہی لوگ پا سکتے تھے جو اس ظرف کے حامل ہوں اور اتنی قوت پرواز بھی رکھتے ہوں۔

مولانا کا طریقۂ تعلیم وتربیت:

یوں تو میں مولانا کے ہر طرح کے کمالات کا مداح ومعتقد ہوں لیکن ان کے جس وصف نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ ہے طریقۂ تربیت اور مردم سازی کی صلاحیت۔ میرے نزدیک یہ وصف بیش بہا آج دنیا سے عنقا ہوتا جا رہا ہے، اس وصف میں مولانا کو جو کمال واختصاص حاصل تھا وہ سراسر انعام الٰہی تھا۔ وہ نرم دم گفتگو اور گرم دم جستجو کے قائل تھے، افہام وتفہیم بھی جانتے تھے اور تنبیہ وسرزنش بھی، اس ضمن میں ان کی تعلیم وتربیت کے چند نمونے پیش کرتا ہوں:

پورا مدرسہ رویا:

☆ایک بار ایک طالب علم کو اتنا مارا کہ اس کے سر سے خون بہنے لگا، یہ دیکھ کر مولانا خود بھی روئے، وہ طالب علم بھی رویا اور سارا مدرسہ رویا، رونے رلانے کا یہ دورانیہ قریب ایک گھنٹہ کا رہا۔ آج بھی اس منظر کو سوچتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ایک شخص کے جذبۂ انفعال نے سارے ماحول کو سوگوار کر دیا۔ مولانا کا یہی امتیاز تھا، انتہائی جذبات میں بھی وہ خوف خدا سے غافل نہیں ہوتے تھے۔ بہادر شاہ ظفر کے اس شعر کے مصداق:

ظفرؔ اس کو نہ آدمی جانئے گا، چاہے وہ ہو کتنا ہی صاحب فہم وذکا
جسے طیش میں خوف خدا نہ رہے، جسے عیش میں یاد خدا نہ رہے

میرے قطبی پڑھنے کا قصہ:

☆میں درجہ عربی چہارم کا طالب علم تھا، منطق کی مشہور کتاب قطبی داخل درس تھی، جو مولانا سے متعلق تھی، کچھ اسباق پڑھانے کے بعد ان کو احساس ہوا کہ یا تو اس کتاب سے طلبہ کی دلچسپی کم ہے یا یہ ان کی ذہنی سطح سے بالاتر ہے۔ مولانا نے کہا اس طرح پڑھانے سے کیا فائدہ؟ انہوں نے اسباق بند کر دیئے۔ مجھے بڑا احساس ہوا کہ ایک اہم معقولی کتاب کے درس سے میں محروم ہو گیا۔ ابتدا میں مجھے منطق سے بڑی دلچسپی تھی، میرا خیال تھا کہ یہ فن ذہین ترین لوگوں کا ہے

اور جو منطق کی کتابیں نہیں پڑھتا اس کی ذکاوت کی ضمانت نہیں ہے۔

میں نے اپنے جد اکبر حضرت مولانا عبدالشکور آہ مظفر پوریؒ کے بارے میں اپنے بزرگوں سے سنا تھا کہ کئی سال تک انہوں نے منطق وفلسفہ کی کتابیں پڑھیں، جس کی وجہ سے ان میں وہ خود اعتمادی پیدا ہوئی کہ دارالعلوم دیو بند کے داخلہ امتحان میں اپنے ممتحن (حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیو بندیؒ، اور تاج المحدثین حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ) کے سامنے ذرا مرعوب نہ ہوئے، بلکہ اپنی حاضر جوابی اور ذہانت وذکاوت سے ممتحنین کو متاثر کر دیا۔

میں نے سوچا یہ تو میرا خاندانی فن ہے اس سے دستبردار ہونا مناسب نہیں، میں نے مولانا سے دوبارہ اسباق شروع کرانے کی درخواست کی، لیکن مولانا نے توجہ نہ دی، جب میں نے اصرار کیا تو انہوں نے کہا کہ اب تو سبق بند کر چکا ہوں اس لئے دوبارہ شروع نہیں کر سکتا، البتہ اگر تم پڑھنا چاہتے ہو تو عشا کی اذان سے آدھ گھنٹہ قبل وقت دے سکتا ہوں، البتہ یہ میرے لکھنے پڑھنے کا وقت ہے، اس لئے میں باقاعدہ پڑھاؤں گا نہیں، البتہ مطالعہ کر کے آؤ اور اپنا حاصل مطالعہ سناؤ، میں اس کی تصحیح وتصویب کر دوں گا اور کہیں ضرورت ہوگی تو سمجھا بھی دوں گا۔ چنانچہ اسی طرح ہوا، تصورات کا پورا حصہ میں نے پندرہ دنوں میں پڑھ لیا جس میں مولانا کو بہت کم بولنے اور سمجھانے کی نوبت آئی، جب تصدیقات کی بحث شروع ہوئی تو مولانا نے یہ کہہ کر سبق بند کر دیا کہ ''اب پڑھانے کی ضرورت نہیں ہے خود ہی مطالعہ کر ڈالو'' اللہ کی قدرت، جب میں دارالعلوم دیو بند میں معین مدرس ہوا، اور مجھ سے قطبی کے اسباق متعلق ہوئے تو وہاں تصدیقات ہی کا حصہ داخل نصاب تھا، جو اس حقیر طالب علم نے خود مطالعہ کر کے پڑھا ڈالا اور مولانا کے یہ الفاظ ہر روز میرے سامعہ سے ٹکراتے رہے کہ ''تمہیں پڑھانے کی ضرورت نہیں ہے خود ہی مطالعہ کر ڈالو۔'' اللہ پاک نے مولانا کے ان لفظوں کی لاج رکھ لی۔ ع

وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

علوم قاسمی کی طرف توجہ:

☆ ایک بار میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ مسلمان اپنے آپ کو خدا پرست کہتے ہیں جبکہ ان کا رخ بھی اپنی نمازوں میں خانہ کعبہ کی طرف ہوتا ہے اور کعبہ پتھر کے بنے اس گھر کا

نام ہے جسے اسی دنیا کے انسانوں نے بنایا ہے، اگر نماز میں قبلہ درست نہ ہوتو نماز نہیں ہوتی، حالانکہ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ خدا زمان ومکان کی قید سے ماوراء ہے۔ قرآن کہتا ہے **اینما تولوا فثم وجه الله** (جدھر بھی رخ کرو اللہ ہی ہے) پھر نماز میں قبلہ کی قید کیوں ہے؟ کہیں یہ بت پرستی کی مشابہت تو نہیں؟۔

اس زمانے میں اس طرح کے اوٹ پٹانگ سوالات میرے ذہن میں بکثرت پیدا ہوتے تھے، جو مطالعہ سے نہیں بلکہ سوچ سے پیدا ہوتے تھے۔ میں نے ایک دن درس کے اختتام پر مولانا کے سامنے یہ سوال رکھا، مولانا نے میرا سوال بڑی توجہ کے ساتھ سنا اور اس کا جواب دینے کے بجائے الماری میں رکھی ایک کتاب میری طرف بڑھائی اور کہا تمہارے سوال کا جواب اس کتاب میں ہے۔ وہ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی کتاب ’’قبلہ نما‘‘ تھی۔ ارشاد ہوا کہ اس کتاب کو غور سے پڑھو اور جو سمجھ میں آئے وہ مجھے بھی آ کر بتاؤ۔

اس طرح مولانا کی عنایت سے پہلی بار مجھے علوم قاسمی کی طرف توجہ ہوئی، میں نے عربی چہارم ہی کے سال حضرت نانوتویؒ کی یکے بعد دیگرے مدرسہ کی لائبریری میں موجود تمام کتابیں پڑھ ڈالیں، جو رہ گئیں ان کے پڑھنے کا شوق دل میں موجزن رہا، میری دلی خواہش تھی کہ دیوبند جانے سے پہلے بانی دیوبند سے علمی مناسبت پیدا کر لی جائے۔ دیوبند داخلہ کے بعد سب سے پہلے میں نے حضرت نانوتویؒ کی بقیہ کتابیں تلاش کیں، اسی ضمن میں حضرتؒ کی فارسی کتاب ’’مصابیح التراویح‘‘ کا میں نے اردو ترجمہ کیا۔

’’آب حیات‘‘ دیوبند کی مارکیٹ میں دستیاب نہیں تھی، میں نے ایک صاحب کے ذریعہ پاکستان سے منگوائی۔ مولانا کو میری اس دلچسپی کا علم ہوا تو بلا طلب ازراہ عنایت کچھ پیسے بھی بھیج دیئے اور لکھا یہ تمہارے لئے ہدیہ ہے۔ آب حیات کو سمجھنے میں بڑی دقت پیش آئی، میں نے مولانا کو لکھا تو انہوں نے تحریر فرمایا:

’’رمضان کی چھٹی میں بھیرہ (مولانا کا آبائی گاؤں) چلے آؤ، میں نے بھی وہ کتاب صرف آدھی پڑھی ہے، آدھی کے بعد سر چکرانے لگا تو چھوڑ دیا تھا۔ آ جاؤ اس بہانے ہم بھی وہ کتاب پڑھ لیں گے۔‘‘

لیکن ایک گھریلو ضرورت پیش آجانے کی وجہ سے رمضان میں وقت نہ نکل سکا۔

اسی زمانہ میں میں نے حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوری کی کتاب ''البراہین القاطعہ'' پڑھی اور امکان کذب باری کے مسئلہ پر مجھے بہت سی تشویشات پیش آئیں۔ اسی سلسلے میں وہ علمی مراسلت ہوئی جس کا ایک حصہ مولانا نے ''حدیث دوستاں'' میں محفوظ کردیا ہے۔

اسی دور میں دیہات میں نماز جمعہ کے مسئلہ پر حضرت نانوتویؒ کے ایک فارسی مکتوب کا میں نے ترجمہ کیا، جس میں حضرتؒ نے دلائل کے ساتھ جمعہ کے بارے میں حنفیہ کے موقف کو واضح کیا ہے اور بحالات موجودہ دیہاتوں میں جمعہ کے جواز بلکہ وجوب کا رجحان پیش فرمایا ہے۔

مجھے خوب یاد ہے کہ ایک بار مولانا دیوبند تشریف لائے، علوم قاسمیہ سے میری مناسبت اور میری بعض تحریروں کو دیکھ کر انہوں نے رسالہ ''دارالعلوم'' دیوبند میں ان کی اشاعت کی ترغیب دی اور خود مدیر رسالہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی دامت برکاتہم سے اپنے قدیم تعلق کی بنا پر میرے مضامین شائع کرنے کی سفارش بھی فرمائی۔ چنانچہ اس کے بعد عرصہ تک رسالہ دارالعلوم میں میرے مضامین کا سلسلہ ''معارف قاسمیہ'' کے نام سے جاری رہا۔ مضامین چھپتے رہے اور میں خوش ہوتا رہا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سب پودا نہی کی لگائی ہوئی تھی۔

بہار اب جو گلشن میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پودا نہی کی لگائی ہوئی ہے

میرا شوق مطالعہ:

☆ میرا شوق مطالعہ بھی مولانا ہی کی دین ہے۔ غازی پور میں میرے قیام کا دوسرا سال تھا، میں عربی سوم میں آچکا تھا لیکن سوائے اپنے پڑھے ہوئے اسباق کے اگلے اسباق یا خارجی مطالعہ کی توفیق نہیں ہوتی تھی۔ اسی طرح میں عشاء کی نماز کے بعد پڑھنے اور جاگنے کا قائل نہیں تھا، میں مدرسہ کے ذہین ترین لڑکوں میں شمار کیا جاتا تھا، اس لئے مغرب کے بعد ساتھیوں کو پڑھے ہوئے اسباق کی تکرار میں ہی کراتا تھا، عشا تک ساری کتابوں کے تکرار سے فارغ ہوجاتا تھا۔ میرا اپنا حال یہ تھا کہ بوقت درس ہی سارے اسباق یاد ہوجاتے تھے، اس لئے بھی عشا کے بعد جاگنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ مدرسہ کے تمام طلبہ پابندی کے ساتھ عشاء کے بعد پڑھتے تھے، لیکن

میں فوراً بستر پر دراز ہو جاتا اور طلبہ کے ہنگاموں میں بھی مجھے نیند آ جاتی تھی۔

ایک دن کافیہ کے درس میں مولانا سے میں نے ایک سوال کیا، اس کا جواب حاشیہ میں موجود تھا، مولانا نے کہا تمہارا جواب حاشیہ میں موجود ہے۔ حاشیہ فارسی میں تھا، سمجھ میں نہیں آیا، مولانا نے کہا جاؤ کل اس کو سمجھ کر آنا۔ میرے ذہن پر مولانا کا رعب اتنا تھا کہ ان کا کوئی حکم میرے لئے ٹالنا آسان نہیں تھا۔ میں نے مغرب کے بعد تکرار سے بچے ہوئے وقت کو اس کے لئے استعمال کیا لیکن وہ ناکافی ثابت ہوا، بالآخر زندگی میں پہلی بار عشا کے بعد کتاب لے کر بیٹھنے کی خفت گوارا کی اور قریب ڈیڑھ گھنٹہ کی دماغ سوزی کے بعد چار سطری حاشیہ کسی حد تک سمجھ میں آیا۔ اس دن سے عشا کے بعد اگلے سبق کی تیاری کا معمول بن گیا، پھر شاید ہی کبھی ایسا ہوا کہ اگلا سبق سمجھنے کے لئے مجھے استاذ کی تقریر کی ضرورت رہی ہو، بنیادی مضامین میرے ذہن میں ہوتے تھے استاذ سے ان کی تعبیرات وتشریحات حاصل کرتا تھا، نیز اپنے فہم کی توثیق بھی ہوتی تھی۔ پھر تو مجھے ایسی مشاقی ہوگئی کہ عبارت کی خواندگی سے ہی استاذ کو اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ طالب علم عبارت سمجھ کر پڑھ رہا ہے۔

میری قلمی زندگی کا آغاز:

☆ یہ قلم جو آج چل رہا ہے یہ بھی ہاتھ میں مولاناؒ کا پکڑایا ہوا ہے، طلبہ کی تحریر وتقریر کی مشق کے لئے مدرسہ دینیہ میں ''تہذیب البیان'' کے نام سے انجمن قائم تھی۔ ہر جمعرات کو اس کے ماتحت مغرب کے بعد پروگرام ہوتے تھے، طلبہ کے دو گروپ تھے، دونوں کے ذمہ داران طلبہ سے منتخب کئے جاتے تھے، مولانا انجمن کے نگران اعلی تھے۔ ذمہ دار طالب علم کو ''معلن'' کہا جاتا تھا اور یہ ساری ذمہ داریاں خود مولانا کی نگرانی میں تقسیم کی جاتی تھی۔ میں عربی سوم میں تھا، طلبہ کے ایک گروپ کا معلن حافظ عبداللہ صاحب کو بنایا گیا جو عربی پنجم کے طالب علم تھے اور ان کا نائب مولانا نے مجھے نامزد فرمایا، ساتھ ہی مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ ہر ہفتہ طلبہ کی ترغیب وتحریص کے لئے تحریر و تقریر کی افادیت پر جو چند سطری اعلان نکلتا ہے، وہ لکھنا بھی تمہاری ذمہ داری ہوگی، میں کانپ کر رہ گیا، ایک تو میری عمر بہت کم تھی، بمشکل بارہ یا تیرہ سال، دوسرے میری طبیعت کم آمیزی کی طرف مائل تھی، مگر مولانا کے حکم کے سامنے کون پر مار سکتا تھا؟ اس طرح بالجبر میرے ہاتھ میں قلم

پکڑایا گیا۔

یہ سال میرے لئے بڑی آزمائشوں کا رہا، ایک ہی موضوع پر ہر ہفتہ نئی تعبیرات و عنوانات کے ساتھ مضمون تیار کرنا آسان بات نہ تھی اور سب سے مشکل مرحلہ اس کو مولانا کی نگاہ سے گذارنے کا تھا۔ مولانا کی تصحیح ومنظوری کے بغیر کوئی مضمون آویزاں نہیں کیا جاسکتا تھا اور اس پر تاکید یہ کہ اتوار تک اعلان آویزاں ہوجانا چاہئے، تاکہ طلبہ کو تیاریوں کا موقعہ مل سکے۔ میں ہی جانتا ہوں کہ ہر ہفتہ اس مضمون کو تیار کرنے میں کتنے ہفت خواں مجھے طے کرنے پڑتے تھے، اور وہ گھڑی شاید میرے لئے قیامت کی ہوتی تھی، جب ٹوٹی پھوٹی بچکانہ تحریر لے کر میرے قدم مولانا کے حجرہ کی طرف بڑھتے۔ اگر وہ مضمون کاٹ چھانٹ کے بعد بھی پاس ہوجاتا تو میں اپنے لئے نئی زندگی محسوس کرتا تھا۔ نہ معلوم مجھے اس کے لئے کتنی ریاضتیں اور کتنی کتابوں کی ورق گردانیاں کرنی پڑی، کس کس وادی کی خاک چھاننی پڑی، لیکن کبھی ہمت نہیں ہاری اور نہ اپنی پونجی کے بارے میں خوش فہمی پیدا ہوئی، ہمیشہ اپنا سکہ کھوٹا محسوس ہوا۔

آزمائشوں بھرا یہ سال میری قلمی زندگی میں شاہ کلید کی حیثیت رکھتا ہے، لمحہ لمحہ کرب میں مجھے علم وادب کی کیسی کیسی فتوحات حاصل ہوئیں، فکر ونظر کے کتنے دریچے وا ہوئے، ذہن وتخیل کو کیا کیا بلند پروازیاں نصیب ہوئیں؟ ہاتھ میں دیئے گئے قلم پر میری گرفت کیسی مضبوط ہوئی؟ اور ایک مفلس بےنوا کو لوح وقلم کی کتنی مملکتیں عطا کی گئیں؟ میرے پاس جذبۂ تشکر اور احساس ممنونیت کے اظہار کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔ اس میں رب العالمین کے فضل وکرم کے ساتھ میر کارواں کی نظر کرم بھی شامل رہی، اللہ پاک ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، ہم جیسے کتنے ہی مس خام کو کندن اور ناکندہ تراشوں کو پیکر حسن ومعنیٰ بنادیا:

ننگ میخانہ تھا میں ساقی نے یہ کیا کردیا
پینے والے کہہ اٹھے یا پیر میخانہ مجھے

مولانا کی وسیع النظری:

☆ مولانا کا ایک بڑا امتیاز ان کی وسیع النظری ہے، علاقائی عصبیت کے بالکل قائل نہ تھے، ان کے روابط ہر علاقہ کے لوگوں سے تھے، ہندوستان میں مشرق ومغرب اور شمال وجنوب ان

کے لئے برابر تھے، خاص طور پر اہل بہار سے ان کو بڑا تعلق تھا، ان کا اصل حلقۂ علمی بھی یہی تھا۔ جن ممتاز اصحاب علم ورشد سے ان کو گہری وابستگی تھی ان میں بھی اکثریت اہل بہار کی تھی۔ بہار کے لوگوں نے بھی ان کی جوقدر ومنزلت پہچانی شاید اتنی بڑی سطح پر کسی اور علاقہ کو یہ خصوصیت حاصل نہ ہوئی۔

بہار اپنی پچھلی تاریخ سے سبق حاصل کرے:

بہار کے موجودہ علمی زوال، دینی کمزوری اور جہل وظلمت کے عموم وشیوع پر وہ بہت رنجیدہ تھے، ان کی خواہش تھی کہ بہار پھر اپنی پہلی تاریخ پر واپس آ جائے، اس گلشن میں پھر وہی بادنو بہار چلے جو صدیوں قبل اس سرزمین کی پہچان مانی جاتی تھی، جہاں ہر رنگ ونور کے پھول کھلتے تھے۔ ہر طرف قمریوں اور بلبلوں کی صدائے دلنواز گونجتی تھی، ہر علم وفن کا درس یہاں ہوتا تھا۔ ملک و بیرون ملک کے تشنگان علم یہاں آتے تھے اور اسلامی ہندوستان کو جب کبھی کوئی علمی مشکل درپیش ہوتی تو علماء بہار اس کو حل کرنے کے لئے آگے بڑھتے تھے۔

قدیم ہندوستان کی علمی تاریخ میں بہار ایک مرکز علم کی حیثیت سے معروف تھا اور پورے ہندوستان کے لئے سرمایۂ افتخار تھا۔ حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ نے مولانا غلام علی آزاد بلگرامیؒ کی ''مآثر الکرام'' اور حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی ''اخبار الاخیار'' کے حوالوں سے لکھا ہے کہ:

> ''حضرت شاہ ولی اللہؒ کے دودمان عالی کے مشہور بزرگ شیخ عبدالعزیز شکر بارؒ کے دادا شیخ طاہرؒ نے تحصیل علم کے لئے ملتان سے بہار کا سفر کیا اور شیخ بدھ (یا بودھن) حقانیؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔'' (اخبار الاخیار ص ۱۹۵، مآثر الکرام ص ۴۳)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم ہندوستان میں بہار علم کا بڑا مرکز تھا، اور دور دراز سے لوگ تحصیل علم کے لئے یہاں آتے تھے، اور خاص بات یہ تھی کہ ابتدا سے لے کر انتہائی درجات تک کی مکمل تعلیم کا یہاں معقول انتظام تھا۔ اسی لئے یہاں کے طلبہ کو تحصیل علم کے لئے بہار سے باہر جانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ ملا موہن بہاریؒ جو بعد میں شہزادہ اورنگ زیبؒ کے استاذ ہوئے آزاد بلگرامیؒ کے بقول ان کی اول سے آخر تک تعلیم بہار ہی میں ہوئی، اور یہاں ان کے علم

کی شہرت ہی سے متاثر ہوکر بادشاہ شاہجہاں کی توجہ ان کی جانب ہوئی۔ (دیکھئے مآثر الکرام ص ۴۳)

ملا احمد سعید مفتی عساکر شاہجہانی کے بارے میں معروف ہے کہ وہ بہار کے تھے اور ان کی پوری تعلیم بہار ہی میں ہوئی تھی، اپنے والد ملا سعدؒ سے تعلیم حاصل کی۔ (بادشاہ نامہ ج ۲) بہار کی اس علمی خودمختاری کا اعتراف حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی ؒ نے بھی کیا ہے، لکھا ہے کہ: ''بہار مجمع علماء بود''۔ بہار سربرآوردہ علماء کا مرکز تھا۔ (نظام تعلیم و تربیت ص ۴۸)

علامہ مناظر احسن گیلانیؒ علامہ شوق نیمویؒ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''آپ کا اسم گرامی مولانا ظہیر احسن اور تخلص شوقؔ تھا، حدیث خصوصاً نقد رجال میں ان کا جو پایہ تھا اس کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ ان کی دقت نظر کے مداحوں میں تھے۔ آپ ''نیمی'' بہار میں پیدا ہوئے، اور مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ سے درس نظامیہ کی تکمیل کر کے پٹنہ میں مطب کے ساتھ ساتھ تالیف وتصنیف کا کاروبار شروع کیا۔ آثار السنن کے چند ابتدائی حصے ملک میں شائع ہوئے کہ سارے ہندوستان میں دھوم مچ گئی، لیکن افسوس عمر کم پائی، کتاب ناتمام رہی، پھر بھی جتنا حصہ شائع ہو چکا ہے، حنفی مدارس میں بعضوں نے اس کو نصاب کا جزو قرار دیا ہے۔ یہ کتاب حنفی مکتب خیال کی تائید میں محدثانہ اصول پر مرتب کی گئی ہے۔ علامہ تھانویؒ نے اس کا تکملہ بھی کرایا ہے۔ مولانا شوقؔ اردو زبان کے بڑے نامور شعراء میں تھے، جلال لکھنویؒ سے زبان کے مسئلے میں تحریری مناظرہ بھی کیا تھا، جس میں مولانا ہی کی جیت ہوئی تھی۔ ایک بڑی دردناک مثنوی اردو میں لکھی ہے، اور بھی بیسیوں کتابوں کے مصنف ہیں۔'' (ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، حاشیہ ص ۳۵۳)

خود میں نے حضرت مولانا عبدالرحمٰن دربھنگویؒ امیر شریعت خامس بہار واڑیسہ کو دیکھا ہے، علم وفضل میں یکتائے روزگار اور وسعت مطالعہ واستحضار علمی میں بے نظیر تھے۔ ان کی پوری تعلیم اسی بہار میں مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں ہوئی، جب حضرت مولانا عبدالشکور آہ مظفر پوری ؒ (حقیر کے جد اکبر) جیسے عباقرۂ روزگار وہاں تدریسی خدمات انجام دیتے تھے، مولانا ان کے خادم خاص تھے اور سفر وحضر میں ساتھ رہتے تھے، ان کی علمی گفتگو سے اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ مولانا نے

دیوبند وغیرہ کا منہ نہیں دیکھا ہے۔

تاریخ کا یہ تسلسل بعد کے ادوار میں بھی جاری رہا لیکن ہندوستان سے اسلامی حکومت کے سقوط کے بعد بہار کی مرکزیت بھی جاتی رہی۔ افراد پیدا ہوتے رہے، لیکن خود بہار کو براہ راست کم ہی لوگوں سے فائدہ ملا، زیادہ تر لوگوں نے باہر کی دنیا کو اپنا میدان عمل بنایا اور ان کے ذریعہ جو بھی علمی مراکز قائم ہوئے وہ اسی علاقہ کی طرف منسوب ہوئے۔

مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ گو بہار کے نہیں تھے مگر اس معاملے میں ان کی حساسیت علماء بہار سے کم نہیں تھی، وہ چاہتے تھے کہ بہار کے فضلاء خود بہار کو مرکز عمل بنائیں اور ان کے ذریعہ بہار میں خوش گوار تبدیلیاں پیدا ہوں، مگر لمبے عرصے کے تعطل کی وجہ سے یہاں کے عام لوگوں میں ایسا جمود پیدا ہو چکا ہے کہ ان کی حالت کو دیکھ کر دل روتا ہے، جگر پارہ ہوتا ہے، آنکھیں خون کے آنسو بہاتی ہیں۔ کبھی ڈر لگتا ہے کہ شاید کوئی معجزہ ہی ان کی حالت کو بدل سکے۔ بہر حال اہل درد اپنے افسانے جاری رکھے ہوئے ہیں اور یہ داستانیں ان شاء اللہ اس وقت تک جاری رہیں گی جب تک کہ جسم و جان میں آخری قطرۂ لہو باقی ہے۔

علمی اختلاف واتفاق:

☆ مولانا کی وسیع النظری کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ باوجود اس علم وفضل کے قبول حق کے باب میں کافی فراخ دل تھے، اپنے کئی معاصرین سے ان کو علمی اختلاف تھا، مگر اس کی بنیاد ان کے خلوص پر تھی، وہ کسی بات کو دلائل کی بنا پر صحیح یا غلط سمجھتے تھے، کسی دباؤ یا تعلق کی بنا پر نہیں۔ جس بات کو وہ غلط سمجھتے تھے، خواہ وہ کتنی ہی بڑی شخصیت کی طرف سے پیش کی جائے، یا ان کی کوئی محبوب ترین شخصیت بھی اس کی قائل ہو، وہ قبول نہیں کر سکتے تھے، بلکہ برملا اس سے اختلاف کرتے تھے۔ اس معاملے میں ان کے یہاں مصلحت کا کوئی خانہ نہیں تھا۔ میرے سامنے اس کی کئی مثالیں ہیں، ان میں سے ایک دو مثال پیش کرتا ہوں:

☆ عنین (نامرد) کا ایک مقدمہ دار القضاء امارت شرعیہ پٹنہ میں پیش ہوا، دار القضاء نے جو فیصلہ کیا دار العلوم دیوبند نے بھی اس کی توثیق کی، مگر مولانا کو ذاتی طور پر کچھ ایسے حقائق کا علم ہوا جس کی وجہ سے انہوں نے اس فیصلہ سے اختلاف کیا، اور پوری ایک کتاب اس کے خلاف

لکھ ڈالی، جو ''نعیم اختر'' ان کے تاریخی نام سے شائع ہوئی۔

☆اسی طرح انشورنس کے مسئلے پر مولانا کا اختلاف کافی مشہور ہوا، یہ فیصلہ پہلے مجلس تحقیقات شرعیہ لکھنؤ نے کیا تھا، اس کی تائید بعد میں دارالعلوم دیوبند کے مفتیان اور اساتذۂ کرام نے کی۔ سب سے آخر میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے اس فیصلہ کی توثیق وتصویب کی۔ مولانا کو اس سے اختلاف تھا، انہوں نے برملا اس کا اظہار کیا۔ المآثر کے (جس کے وہ ایڈیٹر تھے) کئی شماروں میں اس تعلق سے مضامین شائع کئے۔

ایک بار اسی موضوع پر میرا ایک تحقیقی مضمون ماہنامہ ''حسامی'' حیدرآباد میں شائع ہوا، جس کا میں مدیر تحریر تھا۔ مضمون میں مسئلہ کا علمی تجزیہ پیش کیا گیا تھا، کسی رجحان کی وکالت مقصود نہیں تھی۔ المآثر کے صفحات پر مولانا نے اس کا جواب شائع کیا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس بات کو مولانا حق سمجھتے تھے اس کے اظہار میں ان کو کوئی تامل نہیں ہوتا تھا، وہ ایک بے باک اور بے لوث عالم دین تھے۔ مولانا کا ردعمل خواہ کتنے ہی سخت لب ولہجہ میں آیا ہو، وہ ان کے اخلاص پر مبنی ہوتا تھا، اس میں کسی تعصب وتنگ نظری یا جانبداری کو دخل نہیں تھا۔

میں مولانا کا شاگرد تھا، بہت سے دقیق علمی مسائل میں ان سے رجوع کرتا تھا، لیکن اگر کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آتی تو وہ اس کو منوانے پر اصرار بھی نہیں کرتے تھے۔ وہ دلیلوں سے بات ماننے کے قائل تھے، زبردستی نہیں۔ میرے سامنے اس کے کئی شواہد ہیں، تفصیل کا موقعہ نہیں صرف ایک دو چیز بطور مثال پیش کرتا ہوں:

پیر طریق کی موجودگی میں دوسرے پیر کی طرف رجوع:

☆تصوف کے مسائل میں ایک اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی شیخ سے بیعت ہوجائے اور کچھ عرصہ گذر جانے کے باوجود اسے خاطر خواہ فائدہ کا احساس نہ ہو تو کیا شیخ کی حیات میں اس کی اجازت ورضا کے بغیر دوسرے شیخ سے تجدید بیعت کرسکتا ہے؟۔

اس معاملہ میں مولانا کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ تجدید بیعت کرسکتا ہے، بیعت کرنے سے بیعت لازم نہیں ہوتی بلکہ اصل مقصود فائدہ ہے، فائدہ محسوس نہ ہو تو دوسرے شیخ سے بیعت کرسکتا

ہے۔ مولانا نے اپنے اس نقطۂ نظر کا اظہار اپنے مضمون ''تصوف ایک تعارف'' میں کیا ہے، جو پہلی بار رسالہ ''دارالعلوم'' دیوبند کے ''الاحسان نمبر'' میں شائع ہوا، بعد میں اس کو الگ کتابی صورت میں بھی چھاپ دیا گیا ہے۔ میں اسی الاحسان نمبر سے مولانا کی عبارت نقل کرتا ہوں:

> ''اگر کوئی شخص ایک شیخ کی خدمت میں خوش اعتقادی کے ساتھ ایک معتد بہ مدت تک رہے، مگر اس کی صحبت میں کچھ تاثیر نہ پائے تو دوسری جگہ اپنا مقصود تلاش کرے، کیونکہ مقصود خدا تعالیٰ ہے نہ کہ شیخ، لیکن شیخ اول سے بد اعتقاد نہ ہو، ممکن ہے کہ وہ کامل و مکمل ہو مگر اس کا حصہ وہاں نہ تھا۔ البتہ بلاضرورت محض ہوسنا کی سے کئی کئی جگہ بیعت کرنا بہت برا ہے، اس سے بیعت کی برکت جاتی رہتی ہے، اور شیخ کا قلب مکدر ہو جاتا ہے اور نسبت قطع ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اور ہرجائی مشہور ہو جاتا ہے۔'' (رسالہ دارالعلوم الاحسان نمبر اپریل تا جون ۱۹۹۳ء، ص ۳۹)

اسی الاحسان نمبر میں میرا بھی ایک مضمون ''صوفیت ایک تعارف'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ میں نے اس تعلق سے مولانا کو خط لکھا، مولانا نے جواب دیا مگر کئی بار کی مراسلت کے بعد بھی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ مولانا نے بھی اپنے خطوط میں زیادہ تفصیل سے کام نہیں لیا اور دلائل کے بارے میں مجھ پر ذمہ داری ڈال دی کہ دلائل خود تلاش کر لو۔

اس طرح مولانا اپنے نظریہ پر قائم رہے اور مجھے علم و تحقیق کے حوالہ کر دیا، اور اپنا نظریہ مجھ پر مسلط کرنے کی کوشش نہی کی۔ میری رائے اخیر تک یہ رہی اور آج بھی یہی ہے کہ انسان ارادت قائم کرنے میں جلدی نہ کرے، بلکہ شیخ کامل کی تلاش و جستجو میں وقت صرف کرے اور جب کوئی شخص ہر طرح اس کے عقیدہ و نظریہ اور شریعت کی کسوٹی پر کھرا اترے تو اس سے بیعت ہو جائے۔

حضرت مجدد صاحبؒ نے شیخ کامل کی تلاش پر اپنے مکتوبات میں بہت زور دیا ہے، اس کا مطلب ہے کہ مرد متقی کی تلاش پہلے ہونی چاہیے۔ بیعت ہونے کے بعد اس کے زہد و تقویٰ کو اپنے معیار پر نہیں تولنا چاہئے اور نہ ظاہری فائدہ اس باب میں کوئی معیار ہے، اس لئے کہ کبھی فوری فائدہ محسوس نہیں ہوتا یا فائدہ ہوتا ہے لیکن بسا اوقات طالب کو اس کا احساس نہیں ہوتا۔ اس لئے

شروع کی بے کیفی، اضمحلال یا نفع کے عدم احساس سے انسان کو بددل نہیں ہونا چاہئے۔

دوسرے صوفیاء کرام کے یہاں بھی یہ مضمون آیا ہے، تحقیق پر بہت سے حوالے جمع کئے جاسکتے ہیں۔

بہر حال مولانا کو کسی بات کا قائل کرنا آسان نہیں تھا لیکن ایسا بھی نہ تھا کہ حق واضح ہونے کے بعد بھی وہ اپنی رائے پر خواہ مخواہ قائم رہے ہوں، بلکہ قبول حق کے لئے بھی وہ بہت فراخ دل واقع ہوئے تھے، اپنے ذاتی تجربات سے اس کی ایک مثال پیش کرتا ہوں:

قبول حق میں فراخ دلی:

☆غالباً دارالعلوم دیوبند میں میرا ہفتم عربی کا سال تھا، حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی معرکۃ الآراء کتاب ''تحذیر الناس'' میرے مطالعہ میں آئی۔ حضرت نانا توی نے ختم نبوت کی جو دل نشیں تشریح فرمائی ہے، مجھے بہت پسند آئی۔ ابتدا میں مولانا کو بکثرت اپنی زیر مطالعہ کتابوں کا حاصل مطالعہ بھی لکھ کر میں بھیجا کرتا تھا اور مولانا اس کی تصویب وتصحیح فرمایا کرتے تھے، میں نے تحذیر الناس کی روشنی میں اپنی کچھ گذارشات مولانا کی خدمت میں بھیجیں، اس میں ایک مسئلہ اشیاء کی صفات ذاتیہ اور عرضیہ کا تھا۔ میں نے لکھا کہ اشیاء کی صفات ذاتیہ کبھی زائل نہیں ہوتیں اور نہ ان کو لانے کے لئے کسی خارجی تدبیر یا عرض عارض کی ضرورت ہوتی ہے۔ البتہ صفات عرضیہ زائل ہوسکتی ہیں، اسی طرح ان کو لانے کے لئے بھی کسی تدبیر کی ضرورت پڑتی ہے، میں نے پانی کی مثال دی کہ اس کی صفات ذاتیہ میں رقت وسیلان کے علاوہ برودت بھی ہے، وہ اس سے کبھی زائل نہیں ہوسکتی۔ عام طور پر کتب فقہیہ میں پانی کی صفات ذاتیہ میں صرف رقت و سیلان کا ذکر کیا گیا ہے، برودت کا ذکر نہیں آیا ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ فقہاء نے یہ بات ازالۂ نجاست کے ضمن میں لکھی ہے اور اس میں برودت وحرارت سے فرق نہیں پڑتا، بلکہ رقت وسیلان سے فرق پڑتا ہے۔ فقہاء حقائق اشیاء بیان کرنے کے لئے نہیں بیٹھے ہیں بلکہ وہ اغراض ومقاصد کو ہدف بناتے ہیں۔ بہر حال مولانا کو میرا یہ خط ملا تو پہلی فرصت میں اس کا جواب دیا اور میری اس بات پر نکیر بھی فرمائی، مولانا نے تحریر کیا کہ برودت پانی کی صفات ذاتیہ میں نہیں ہے، اس پر تم غور کرو۔ اتفاق سے حضرت نانوتویؒ ہی کی ایک کتاب میں مجھے یہ بحث مل گئی اور میں نے اس کو

مستدل بنا کر برودت کے صفت ذاتی ہونے پر اصرار کیا، میں نے عرض کیا کہ برودت پانی سے کبھی زائل نہیں ہوتی، انتہائی گرم پانی میں بھی برودت باقی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر جلتی ہوئی آگ پر کھولتا ہوا پانی ڈال دیں تو آگ بجھ جاتی ہے، اگر برودت زائل ہوگئی ہوتی اور حرارت اصلیہ پیدا ہوچکی ہوتی تو اس سے آگ کی حرارت دوچند ہونی چاہئے۔ اس لئے کہ حرارت، حرارت سے بڑھتی ہے، ختم نہیں ہوتی، نیز حرارت کو لانے کے لئے تدبیر کرنی پڑتی ہے، زائل کرنے کے لئے نہیں۔ پانی کو چھوڑ دیجئے خود بخود اس کی حرارت ختم ہوجائے گی اور برودت اصلیہ ظاہر ہوجائے گی برودت کو واپس لانے کے لئے کسی عمل کی حاجت نہیں ہے۔ یہ واضح دلیل ہے کہ برودت پانی کی صفات اصلیہ میں سے ہے۔

مولانا کو میری بات میں وزن محسوس ہوا اور اس کو قبول کیا اور لکھا کہ میرے خط سے اس حصہ کو قلم زد کردو۔ یہ واقعہ اس بات کی دلیل ہے کہ مولانا قبول حق کے باب میں تنگ نظر نہیں تھے، وہ بڑے اور معاصرین تو کجا اپنے چھوٹوں کی بات کا بھی لحاظ کرتے تھے اور جب بھی انہوں نے اصرار کیا تو حق سمجھ کر کیا، تعند وتعصب کی بنا پر نہیں۔ اگر اس بات میں وہ خطا پر بھی ہوں تو ایک اجر کے بہر حال مستحق ہیں۔

مولانا سے میری مراسلت:

جب میں دیوبند پہونچا، مولانا سے دوری ہوئی، کتابوں کا مطالعہ بڑھا، کچھ الجھنیں پیدا ہوئیں تو مولانا سے مراسلت کا سلسلہ شروع ہوا۔ میں خواہ مخواہ خط لکھنے کا قائل نہیں تھا، اپنی خبر خیریت کو میں اتنی اہمیت نہیں دیتا تھا کہ اس کیلئے استاذ محترم کے قیمتی اوقات کا کچھ حصہ ضائع کیا جائے، میرا خیال تھا کہ استاذ کے پاس جائیں یا ان سے مراسلت کریں تو کسی علمی مسئلہ کی تحقیق و تشریح کے لئے جائیں، اسی لئے میری مکاتبت چند اساتذہ تک محدود رہی، مجھے بعد میں اپنی اس کمی کا احساس ہوا لیکن وقت گذر چکا تھا۔

بہر کیف مختلف علمی مسائل پر مولانا سے مراسلت کا سلسلہ عربی ہفتم کے سال شروع ہوا، دارالعلوم دیوبند کا ماحول میرے لئے نیا تھا اور اساتذۂ دارالعلوم سے تعارف نہ ہونے کی بنا پر ان کی خدمت میں حاضری اور اپنی علمی مشکلات کی گرہ کشائی کی درخواست کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی

اس لئے مولانا سے تعلق اوران کی دریا دلی کو دیکھتے ہوئے آسان یہی محسوس ہوتا کہ مولانا سے ہی مراجعت کی جائے۔

نیز یہ احساس بھی ہمہ وقت دامن گیر رہتا تھا، کہ مولانا کی نگاہ سے اوجھل ہونے کے بعد ان کو ہمارے علمی اشتغال کا پتہ چلتا رہے، اوران سے اظہار تعلق بھی رہے، اس لئے کہ ہماری علمی ترقی سے جو خوشی مولانا کو ہوسکتی تھی، وہ اس وقت دنیا میں شاید کسی کو نہ ہوسکتی تھی۔ انہوں نے ہمیں اپنے بچوں کی طرح پالا تھا، اور دیوبند کے وسیع علمی ماحول میں اس لئے بھیجا تھا کہ علم وفن کا جو تخم انہوں نے ہمارے قلب ودماغ کی زمین پر بویا ہے وہ کس حد تک برگ وبار لاتا ہے؟ اور ہمارے خرمن جستجو کو جس خون جگر سے انہوں نے سینچا ہے، دیوبند کی آب وہوا میں وہ کس حد تک بہار آشنا ہوتا ہے؟ اس لئے مولانا کو ہمیشہ ہمارے خطوط اور علمی روداد سفر کا انتظار رہتا تھا، کبھی دیر ہوتی تو اس کا شکوہ فرماتے۔ مولانا اس باب میں بہت حساس تھے، اور شدت تعلق کی بنا پر کبھی بہت چھوٹی چھوٹی باتوں پر گرفت فرماتے تھے، مولانا خود فرماتے تھے کہ میں محبت کا مریض ہوں، اس لئے محبت کا گھاؤ ان کے لئے بہت گہرا ہوتا تھا۔ ہمیں اس وقت مولانا کے اس درد وغم کا پورا احساس نہ تھا، لیکن بعد میں جب ہم نے عملی زندگی میں قدم رکھا اور کبھی اسی قسم کے صبر آزما حالات سے دوچار ہونا پڑا تو مولانا کا رنج وغم یاد آیا اور پورا وجود ندامت سے عرق عرق ہوگیا کہ ہم نے اپنی بے حسی سے مولانا کو کتنی تکلیفیں پہونچائیں، پھر مولانا کے وہ جملے یاد آئے جو انہوں نے انتہائی رنجیدگی کے عالم میں کئی بار مجھے لکھے تھے، لیکن میں اپنی نادانی یا ناپختگی کی وجہ سے ان کے اندر چھپے ہوئے اس کرب کو نہ جان سکا اور ناز پروردہ صاحبزادوں کی طرح ان کے احوال دل سے غافل رہا۔ اللہ پاک مجھ پر رحم فرمائے اور مولانا کی روح پر بھی رحمتوں کی بارش فرمائے، ان کو سکون ابدی نصیب فرمائے آمین۔ سوچتا ہوں، کسی نے کسی سے اسی عالم میں یہ شعر کہا ہوگا:

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

میری بعض نادانیوں سے مولانا کو تکلیف بھی پہونچی، لیکن اس کے باوجود وہ مجھ سے بے پناہ محبت اور حسن ظن رکھتے تھے، ان کو مجھ سے قطع تعلق گوارا نہیں تھا اور نہ میرا علمی وفکری معیار

فروتر دیکھنا منظور تھا۔ پتہ نہیں میں مولانا کی امیدوں پر اتر سکا یا نہیں؟ لیکن بہرحال اپنے آخری دور میں وہ اپنے جذبۂ شفقت ومحبت سے مجبور ہوکر جیسا بھی میں تھا انہوں نے مجھے گلے لگالیا، کئی علمی مسائل میں مولانا نے پوری کوشش فرمائی کہ اپنے نقطۂ نظر سے مجھے مطمئن فرمائیں، لیکن اپنی علمی بے بضاعتی کی وجہ سے مجھے شرح صدر نہیں ہوسکا، مولانا کچھ جھنجھلائے بھی، لیکن پھر مجبوراً مجھے برباد ہونے سے بچانے کے لئے خود ہی محبت سے ہار گئے اور ایک نیازمندی نے میرا سارا قصور دھو ڈالا۔ آخر مولانا فرشتۂ محبت تھے، ان کی کتاب زندگی میں وصل کے علاوہ فصل کا کوئی عنوان ہی نہیں تھا، (الا یہ کہ دینی الحاد وزندقہ کا معاملہ ہو)

دیوبند کے پانچ سالہ قیام کے دوران مولانا سے میری جو مراسلت ہوئی اس کا بڑا حصہ ضائع ہوگیا، وہ اس طرح کہ دارالعلوم کی معین مدرسی کے اختتام پر جب میں پورے ساز وسامان کے ساتھ اپنے گھر واپس آرہا تھا، تو سامان کا وزن زیادہ ہونے کی بنا پر میں نے اپنی کتابوں اور کاغذات کا ایک بڑا کارٹون ریلوے ڈاک کے حوالہ کردیا، جو مہینوں نہیں ملا، سعی بسیار کے بعد مجھے سمستی پور ریلوے اسٹیشن کے پارسل گودام میں وہ کارٹون کھلی ہوئی حالت میں ملا، دیکھا تو اس کا سب کچھ نکل چکا ہے اور کچرا بھرا پڑا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہندوستان کی ریلوے ڈاک سے اس دن جو وحشت قائم ہوئی آج تک ختم نہ ہوسکی۔ مولانا کے خطوط بھی ریلوے ڈاک کے اسی مقبرہ میں دفن ہوگئے، آج جب مولانا نہیں ہیں تو اس درد میں اور بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ دوچار خطوط باقی رہ گئے ہیں، اپنے سینہ کے داغوں کو تازہ کرنا ہوتا ہے تو انہی کو نکال کر دیر تک الٹ پلٹ کرتا ہوں اور تھوڑی دیر کے لئے آج کی مصروف دنیا سے نکل کر اپنے ماضی کے بچپن میں پہونچ جاتا ہوں، مولانا اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

آج مولانا ہمارے درمیان نہیں ہیں، تو ان کی ایک ایک بات یاد آرہی ہے۔ ایک بار جب میں مدرسہ دینیہ کا طالب علم تھا، میرے والد ماجد کو مولانا نے تحریر فرمایا:

''ماشاء اللہ اختر سلمہٗ مدرسہ کا سب سے ممتاز طالب علم ہے، اللہ تعالیٰ آپ کی اور میری

آرزو پوری کرے کہ وہ ایک جامع علم وعمل عالم بنے اور وہ خود بھی اپنے علم سے نفع اندوز ہو اور دوسرے بھی اس سے فیضیاب ہوں‘‘ (اعجاز احمد اعظمی مکتوب ۲۷/ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۴ھ)

میرے ایک خط کے جواب میں تحریر فرمایا:

’’واپسی پر تمہارا خط ملا، پڑھا اور دل میں غیر معمولی مسرت محسوس ہوئی، بحمد اللہ میری آرزوؤں کی تکمیل حق تعالیٰ تمہاری ذات سے کرارہے ہیں، میں نے اول بھی یہی چاہا اور آخر بھی یہی تمنا ہے کہ میرے دوستوں کی زندگی خدمت دین کے لئے وقف رہے، بحمد اللہ تمہارے اندر استعداد ہے اور حق تعالیٰ نے مواقع بھی عنایت فرمائے ہیں۔ میں دن رات تمہارے لئے دعا کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ حیات طیبہ عنایت فرمائیں، علم وعمل کی حرص نصیب فرمائیں، اخلاص ومحبت ارزانی فرمائیں، قبولیت ومحبوبیت سے نوازیں، دنیا وآخرت میں سرخرو وشادکام بنائیں۔

این دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

(مکتوب یکم جمادی الاولیٰ ۱۴۰۹ھ)

قصہ میری پہلی تالیف کا:

☆ قیام دیوبند کے آخری سالوں میں میری پہلی کتاب ’’منصب صحابہ‘‘ شائع ہوئی اور اس کی اشاعت بھی ایک ڈرامائی صورت اختیار کرگئی۔ اس کتاب کی اشاعت نہ ہوتی تو شاید مجھ سے کوئی ناراض نہ ہوتا، صرف ناشر کتاب جواب سعودی میں رہتے ہیں، مجھ سے ناراض ہوجاتے، اس لئے کہ کتاب کی اشاعت کا معاملہ ان سے طے ہو چکا تھا، لیکن کتاب کی اشاعت سے جماعت اسلامی کے احباب کو کوئی غصہ آیا یا نہیں؟ اس لئے کہ اس مسئلہ کا براہ راست تعلق انہی سے تھا۔ اس کا پتہ نہیں چل سکا، لیکن میرے اپنے ہی کئی بزرگ مجھ سے ضرور ناراض ہوگئے اور ہر ایک کی ناراضگی محبت واخلاص ہی کی وجہ سے تھی اور سب کے پیش نظر میری ہی فلاح وترقی تھی۔

واقعہ یہ ہوا کہ کتابت کا مرحلہ مکمل ہونے کے بعد ناشر کتاب نے اپنے طور پر حضرت اقدس، محدث اکبر، جامع المعقول والمنقول حضرت علامہ محمد حسین بہاریؒ محدث دار العلوم دیوبند اور فقیہ ملت، مفتی کبیر حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحیؒ مفتی دار العلوم دیوبند سے کتاب دکھلا کر تقریظات لکھوالیں، علامہ بہاریؒ تقریظ کے معاملہ میں سخت مشہور تھے، لیکن ازراہ عنایت

مولانا مرحوم نے بھی تقریظ لکھی اور عادت کے خلاف زوردار لکھی۔ ان دو بزرگوں کی تقریظات کے حصول میں ہمارے ناشر کتاب صاحب کی سعی و محنت کا براہ راست دخل تھا، ان دونوں بزرگوں کی تحریرات حاصل ہونے کے بعد ناشر صاحب نے بعجلت اس کتاب کو پریس کے حوالہ کرنا چاہتے تھے اور اس میں کسی تاخیر کے روادار نہ تھے، لیکن میں نے اصرار کے ساتھ ایک دو بزرگوں سے اور ملنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اسی ضمن میں میں نے موجودہ صدر المدرسین و شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالنپوری دامت برکاتہم اور معروف ادیب و محدث حضرت مولانا ریاست علی بجنوری دامت برکاتہم سے ملاقات کی۔ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کو اولاً اس رسالہ کے بنیادی تصورات و مضمرات سے اختلاف ہوا، لیکن پھر جلد ہی ان کو شرح صدر ہوگیا اور اس پر ایک زوردار علمی مبسوط مقدمہ لکھا، حضرت مولانا ریاست علی صاحب دامت برکاتہم نے اس کو حلقۂ دیوبند کی طرف سے مسئلہ معیار حق کی پہلی مستند تشریح قرار دیا، اور اسی لئے ان دونوں بزرگوں کی متفقہ رائے ہوئی کہ یہ علماء دیوبند کا ایک نظریاتی مسئلہ ہے، جس کی اس کتاب میں معتبر انداز میں وکالت کی گئی ہے، اس لئے اس کی اشاعت دارالعلوم دیوبند کی شیخ الہند اکیڈمی کی طرف سے کی جانی چاہئے۔ میرے لئے یہ ایک انتہائی سعادت کا مقام تھا، جس کا میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا، لیکن یہ بات جب ہمارے ناشر صاحب کو معلوم ہوئی تو گویا ان کے پاؤں تلے زمین نکل گئی، سخت چراغ پا ہوئے اور اس کو انہوں نے معاملہ کی خلاف ورزی اور بدعہدی قرار دیا، اور آخر وہ جنگ جیت گئے۔ انہوں نے ہمارے دونوں بزرگ حضرت علامہ بہاریؒ اور حضرت مفتی محمد ظفیر الدین صاحبؒ کو اعتماد میں لے کر کتاب کا مسودہ اپنے قبضہ میں لے لیا، دیوبند کے در و دیوار پر اس کے اشتہاری پمفلٹ شائع کئے اور اس کے کچھ دنوں کے اندر ہی کتاب منظر عام پر آ گئی۔ اس طرح میری زندگی کی پہلی کتاب میرے آرزوؤں کے خون سے تیار ہوئی اور میری تمناؤں کے کھنڈرات پر میری شہرت کی پہلی عمارت تعمیر ہوئی۔ اب میں نہ حضرت مفتی سعید صاحب پالنپوری کو منہ دکھانے کے لائق تھا اور نہ حضرت مولانا ریاست صاحب کو، جو اس وقت شیخ الہند اکیڈمی کے مختار کل (ڈائریکٹر) تھے۔

ایک مدت کے بعد اپنی کتاب لے کر ان دونوں بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوا تو

حضرت مولانا ریاست صاحب نے تو بزرگانہ تحمل سے کام لیا، لیکن حضرت مفتی سعید صاحب مجھ سے بہت محبت فرماتے تھے اور میرے بہتر مستقبل کے آرزومند تھے، مجھ پہ سخت ناراض ہوئے اور بہت زجر و توبیخ فرمائی، ان کو اس خوبصورت موقعہ کے ضائع ہوجانے کا بے حد افسوس تھا۔ افسوس تو مجھے بھی تھا، لیکن معاملہ پہلے طے ہوچکا تھا اس لئے ازروئے شرع مجبور تھا۔

دوسری طرف میری دلی خواہش تھی کہ یہ کتاب چھپنے سے قبل مولانا اعجاز احمد صاحب کی خدمت میں پیش کروں، اس لئے کہ میرے سلیقۂ تحریر میں سب سے پہلا اور سب سے زیادہ حصہ انہی کا ہے۔ یہ قلم میرے ہاتھوں میں انہی کا پکڑایا ہوا ہے، اس لئے اپنی اس پہلی کتاب میں اپنے پہلے محسن کو میں کیسے فراموش کرسکتا تھا، یہ کتاب میری نہیں ان کی تھی، یہ اسی تخم اولین کا برگ و بار ہے جو مولانا نے غازی پور میں ڈالا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ وہ اپنے اس نیازمند کی پہلی کتاب اور اپنی محنت کا پہلا پھل دیکھ کر اتنا خوش ہوں گے جس کا میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا، لیکن بدقسمتی سے ایسی ڈرامائی صورت پیدا ہوئی کہ اس کے لئے موقعہ نہیں نکل سکا، کتاب چھپنے کے بعد مارے شرم کے میں چھپتا رہا، نہ ملنے کی طاقت، نہ خط لکھنے کا یارا۔ میں نے خوف سے ایک عرصہ تک کتاب نہیں بھیجی کہ مولانا کو تکلیف ہوگی اور ان کو خدانخواستہ نظرانداز کئے جانے کا احساس ابھرے گا۔ اسی بیچ غازی پور کا میرا ایک ناگہانی سفر بھی پیش آیا، جی چاہا کہ اپنے مرکز محبت کا سامنا کروں مگر میرے اندر اس کی ہمت نہیں تھی، لیکن کب تک؟ ایک نہ ایک دن مولانا کو خبر ہونی ہی تھی، آخر ہوئی اور کچھ دوستوں کی کرم فرمائی بھی شامل رہی، مولانا نے اس پر انتہائی رنج کا اظہار فرمایا اور اپنے ایک خط میں دل کا درد کھول کر رکھ دیا، خوب زجر و توبیخ فرمائی۔ میں نے ساری زندگی اپنا قصۂ عذر بیان نہیں کیا اور نہ کبھی صفائی پیش کی، ایک مجرم کی طرح سب کچھ میں نے خاموشی کے ساتھ سن لیا، اس پس منظر میں مولانا کا یہ مکتوب رنج پڑھئے، جس کے حرف حرف سے محبت ٹپکتی ہے:

> ’’دوسری چیز جو میرے لئے باعث تکلیف بنی وہ یہ کہ تمہاری پہلی تالیف آئی، مگر تم نے مجھے اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دی، بہت عرصہ کے بعد جبکہ وہ کتاب دوسرے ذرائع سے مجھے حاصل ہوچکی تھی، تب تم نے بھیجی، جبکہ میرے خیال میں تمہارے سلیقۂ تحریر و تقریر میں سب سے پہلا اور سب سے زیادہ دخل میرا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ تم مجھ سے دوری اختیار کررہے ہو،

> اسی احساس نے الجھن پیدا کی اور یہ احساس اس وقت اور زیادہ ہوا، جب تم نے غازی پور، مئو اور جہانا گنج کا سفر کیا، اور اگر کوئی شخص لائق التفات نہیں تھا وہ میں تھا، تم سوچو کہ اگر میری جگہ تم ہوتے اور تمہارا کوئی عزیز ترین شاگرد جس کی تربیت و پرداخت میں تم نے اپنے ذہن وقلب کو مصروف رکھا ہو اور اس کے لئے خون جگر جلایا ہو، ایسی ہی بے التفاتی کر کے گذر جائے تو تم پر کیا گذرے گی؟ کیا یہ بات تمہارے سوچنے کی نہیں ہے''۔ (مکتوب ۱۶/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۱ھ)

ظاہر ہے کہ مولانا کو جو بھی رنج پہونچا وہ صورت حال سے بے خبر ہونے کی بنا پر، میرے بعض بہی خواہوں نے اسے خوامخواہ ہوا دی اور اس کی خبر میرے والد ماجد کو بھی ہوگئی، مولانا کی رنجیدگی سے والد صاحب کو دکھ ہوا، انہوں نے کسی واقف کار کے ذریعہ صورت حال سے باخبر کرایا اور اپنے طور پر ایک سفارشی خط بھی لکھا۔ مولانا نے والد صاحب دامت برکاتہم کے جواب میں تحریر فرمایا:

> ''آپ کی یاد آوری کو اپنی خوش بختی اور سعادت تصور کرتا ہوں۔ عزیزم مولوی اختر امام عادل سلمہٗ کو ہرگز بھولا نہیں ہوں، بھلا ایسے عزیز دوست کو کون بھلا سکتا ہے، مگر عزیز موصوف سے کچھ نادانی ہوگئی، ان کے ہر خط کا میں نے جواب بھی دیا ہے، شاید میرا آخری خط انہیں نہیں ملا، یا ان کا کوئی ایک خط مجھے نہیں ملا، اسی میں مراسلت کا انقطاع ہوگیا۔ ان کے بعض کاموں کی وجہ سے مجھے کبیدگی ہوگئی تھی، میں نے اس پر تنبیہ بھی کی۔ کل پرسوں ان کا خط آیا جس میں انہوں نے تواضع اور خاکساری کا حق ادا کر دیا ہے، طبیعت بہت متأثر ہوئی، اب بحمد اللہ کسی طرح کا تکدر باقی نہیں رہا۔ یہ پورا واقعہ میں نے اس لئے لکھ دیا تاکہ آپ کو کسی طرح کا خلجان نہ رہے۔ امید ہے کہ میری طرف سے جس تساہل اور فراموشی کا آپ کو احساس ہوا اس سے درگذر فرمائیں''۔ (مکتوب ۲۴/ جمادی الاخریٰ ۱۴۱۱ھ)

بہرحال میری تو کوئی لیاقت نہیں لیکن جو کچھ بھی الٹا سیدھا لکھنا پڑھنا آیا وہ سب مولانا ہی کی محنت اولین کا نتیجہ ہے، میں نے ہمیشہ مولانا کے سامنے سلسلۂ نیاز قائم رکھا، مولانا نے بھی ہمیشہ مجھے یہی احساس دلایا، ایک خط میں تحریر فرمایا:

> ''اس کا تصور تک مت کرنا کہ تم اونچی کتابیں پڑھاتے ہو، مضامین لکھتے ہو، لمبی تقریر کرتے ہو، تو میرے سامنے کچھ بڑے ہوگئے ہو، اپنے کو میرے سامنے وہی بچہ سمجھو جو ۸۰ء

میں تھا''۔ (مکتوب ۲/ رجب ۱۴۱۶ھ)

درمیان میں کچھ نظری مسائل کو لے کر مولانا کو مجھ سے اختلاف رہا، مجھ کو نہیں۔ اس لئے کہ میں نے کبھی ایک لفظ بھی مولانا کی ذات یا ان کی کسی تحریر کے حوالہ سے لکھنے کی جرأت نہیں کی، ہمیشہ ادب میرے لئے مانع رہا، البتہ بعض مواقع پر مولانا نے حق استاذی ادا فرمایا اور میری تنبیہ کے لئے بعض چیزیں شائع فرمائیں۔ مجھے اس سے کبھی تکدر نہیں ہوا، علمی مسائل میں استاذ اور شاگرد کے مابین مکمل ہم آہنگی ضروری نہیں ہے اور نہ اس سے شاگردی کا رشتہ متاثر ہوتا ہے۔ دینی شخصیات کے بارے میں بھی مطالعہ وتجربہ میں فرق ہوسکتا ہے اور اس کی وجہ سے اختلاف رائے بھی ممکن ہے۔ بہرحال مولانا نے انتہائی خلوص کے ساتھ بعض علمی نظریات کو انتہائی تصلب کے ساتھ اختیار فرمایا اور میری رائے بصد ادب واحترام ان سے الگ رہی اور عجب نہیں کہ مولانا کی رائے ہی درست ہو لیکن میرے لئے وہ ناقابل فہم رہی۔

ذوق مناظرہ:

☆ مولانا کو ابتداء میں مناظرہ سے بڑی دلچسپی تھی، جیسا کہ انہوں نے اپنی خودنوشت میں بھی اس کا اظہار کیا ہے۔ ہم لوگوں نے جس دور میں ان کو دیکھا ان پر تصوف واحسان کا غلبہ تھا اور زیادہ تر ان کی توجہ علمی، فنی اور تحقیقی امور کی طرف رہتی تھی، ذوق مناظرہ میں اضمحلال آ گیا تھا لیکن ختم نہیں ہوا تھا، البتہ اب اس کا رخ تقریر کے بجائے تحریر کی طرف ہوگیا تھا۔ اسی زمانہ میں انہوں نے مسئلہ عنین پر تردیدی علمی مقالہ لکھا، جو ''نعیم اختر'' کے فرضی نام سے شائع ہوا۔ ''بودم بے دال'' رازداں کے نام سے لکھا، ''ایک ذہنی طغیان کا احتساب'' کے نام سے مسئلہ ایصال ثواب پر اپنے نام سے ایک کتاب تحریر فرمائی وغیرہ۔

مولانا ہم لوگوں میں بھی مناظرہ کا ذوق پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ایک بار اس کی تربیت دینے کے لئے باقاعدہ مجلس مناظرہ منعقد فرمائی جس میں تمام اساتذہ وذمہ داران کے علاوہ کچھ معززین شہر نے بھی شرکت کی، طلبہ کی دو ٹیم بنائی گئی، دیوبندی اور بریلوی۔ دیوبندیوں کے ترجمان مولوی انعام غازی پوری مقرر ہوئے اور بریلویوں کے ترجمان مفتی نسیم احمد مظفر پوری مرحوم بنے۔ میں عربی سوم میں تھا اور مفتی نسیم کا نائب تھا، مناظرہ زوردار اور دلچسپ رہا، تمام شرکاء

نے اس کی داد دی۔ دارالعلوم دیوبند کو چھوڑ کر ہندوستانی مدارس میں یہ اپنی نوعیت کا منفرد مناظرہ تھا۔

شاید مدرسہ دینیہ کی تاریخ میں اتنا خوبصورت دور پھر نہیں آیا، مولانا کا یہ رنگ ان کے بہت سے تلامذہ میں منتقل ہوا، مجھ پر بھی اس ذوق کا عرصہ تک غلبہ رہا اور تقریری وتحریری دونوں طرح کے مناظروں کا بارہا تجربہ ہوا۔

منورواشریف کی آخری آمد:

مولانا کو منورواشریف اور میرے والد صاحب دامت برکاتہم سے ہمیشہ تعلق رہا، شروع میں آمد ورفت زیادہ تھی، بعد میں کم ہوگئی تھی۔ عمر کا بھی تقاضا تھا، کچھ عوارض کے بھی شکار ہوگئے تھے، مگر والد ماجد کے دل میں ہمیشہ ان کی قدر رہی، مولانا بھی والد صاحب کی محبت کے آخر تک اسیر رہے اور جہاں بھی ملاقات ہوتی، یا تذکرہ ہوتا ان کا والہانہ پن محسوس ہوتا تھا۔ آخری بار جامعہ ربانی کے قیام کے بہت بعد آئے، ساتھ میں ان کے مخدوم دوست جناب قاری شبیر احمد صاحب مدظلہٗ ناظم مدرسہ اسلامیہ شکرپور بھروارہ ضلع دربھنگہ اور مولوی وصی احمد صاحب صدیقی دربھنگہ اور مولانا کے صاحبزادہ مولانا راشد صاحب بھی تھے۔ مولانا دربھنگہ آئے ہوئے تھے، میری دعوت پر یہاں تشریف لائے۔ وہی تنہائی وگوشہ نشینی جو مجھے روز اول نظر آئی تھی۔ مدرسہ میں ان کے استقبال میں ایک جلسہ رکھا گیا جس میں طلبہ واساتذہ کے علاوہ عام لوگ بھی شریک ہوئے، عشاء کے بعد ایک گھنٹہ تنہا تقریر فرمائی، نہ کسی تعارفی گفتگو کی گنجائش چھوڑی اور نہ کسی دوسرے کو تقریر کی اجازت دی۔ ہم لوگ قاری صاحب سے بھی سننا چاہتے تھے، وہ پہلی بار آئے تھے، لیکن مولانا نے کسی کو اجازت نہ دی، مولانا ہی کی دعا پر اجلاس اختتام پذیر ہوا۔

دوران قیام کئی اہل محبت نے اپنے یہاں لے جانے کی کوشش کی، لیکن کہیں جانے کو آمادہ نہ ہوئے، دن رات مدرسہ ہی میں قیام رہا، صرف کھانے کے وقت میرے گھر تشریف لے جاتے اور والد ماجد کے ہمراہ کھانا تناول فرماتے۔ یہ ۱۷/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ مطابق ۲۴/ مئی ۲۰۰۸ء کی بات ہے۔ اس وقت تک وہ اپنے شیخ طریق حضرت مولانا عبدالواحد صاحب دامت برکاتہم سے اجازت یافتہ ہوچکے تھے، لیکن والد صاحب کے ساتھ وہی تواضع ومسکنت جو

کبھی ان آنکھوں نے پہلے پہل دیکھی تھی۔

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں سے عقیدت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں
تمنا درد دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتی یہ دولت بادشاہوں کے خزینوں میں

مدرسہ کے معائنہ رجسٹر پر ان دونوں بزرگوں کی روشن تحریریں آج بھی ثبت ہیں، جو آئندہ بھی ہمیں روشنی دیتی رہیں گی ان شاء اللہ:

قاری شبیر صاحب مدظلہ نے حوصلہ افزائی کے کلمات لکھے، ایک سطر آپ بھی پڑھئے:

”پچھلے چند برسوں میں اس مدرسہ نے تعلیمی وانتظامی لحاظ سے ترقی کی جو منزلیں طے کی ہیں، وہ لائق ستائش اور قابل تعریف ہے۔ توقع ہے کہ مستقبل میں علم کا یہ جوئے رواں بحر ذخار بن کر گلشن اسلام کی شادابی وسیرابی کا زبردست ذریعہ بن سکے گا۔“

اس پر مولانا اعجاز احمد اعظمی نے اپنی ان دعاؤں کے ساتھ دستخط ثبت فرمائے:

”اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس ادارہ کو دین اور دینی تعلیم وتربیت کا مرکز بنائیں، اس پورے علاقہ میں اس کی وجہ سے علم وعرفان کی روشنی پھیلے اور کردار وعمل کی پختگی عام ہو، اخلاص وللّٰہیت کا سرمایہ حاصل ہو، اور طریقۂ شریعت وسنت پر علم وعمل کا کارواں رواں دواں رہے، اور اللہ تعالیٰ اسے حسن قبول سے نوازیں۔ **آمین یا رب العالمین بحرمة سید المرسلین صلی الله علیه وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ اجمعین**

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد“ (اعجاز احمد اعظمی)

پھونک کر اپنے آشیانہ کو:

غرض خودغرضی ومادیت کے اس دور میں تدریس فن اور تربیت ذات کے لئے زندگی کا ایک ایک لمحہ لگا دینے والا اور اپنے لئے کچھ نہ بچا رکھنے والا استاذ کمیاب نہیں، نایاب ہے۔ اس معاملہ میں ان کی شخصیت خود اپنی جگہ اعجاز تھی۔

پھونک کر اپنے آشیانہ کو
بخش دی روشنی زمانہ کو

حالانکہ ایسا نہیں تھا کہ وہ اپنے لئے کچھ کرنے کی قدرت نہ رکھتے تھے، ان کے دم سے کتنے ہی اداروں کا وقار قائم تھا، ان کی آمد سے بڑے بڑے مدرسوں اور جامعات کی عظمتوں میں چار چاند لگ جاتے تھے، ان کی برکت قدم سے معمولی مکاتب علم وفن کی بڑی درسگاہوں میں تبدیل ہوجاتے تھے۔ ان کے پاس نہ افراد کی کمی تھی اور نہ وسائل کی، وہ چاہتے تو خود اپنا ایک بڑا دارالعلوم بنا سکتے تھے، لیکن اس فقر اختیاری کو کیا کہئے کہ ساری زندگی اپنا ذاتی آشیانہ بھی نہ بنا سکے کہ شاہین کسی بسیرے کا پابند نہیں ہوتا، ان کی نگاہ ہمیشہ اپنے پروردگار کی مرضی پر ٹکی رہی۔

حیات مستعار کو الوداع کہنے سے تھوڑے دنوں قبل اپنے بچوں کے لئے وادیٔ غربت میں ایک اجڑے ہوئے تالاب کے کنارے ایک مکان کی شروعات کی مگر اس کی تکمیل وتزئین سے قبل ہی شہر خموشاں کے مکین ہوگئے اور اپنے مکان ناتمام کے بازو میں اپنی آخری منزل بنائی انا للہ وانا الیہ راجعون ...... جانب مشرق مدرسہ کی مسجد ہے، مسجد سے شرق میں اس مدرسہ کی ناپختہ عمارات ہیں جس کو حضرت مولاناؒ کی آخری آرام گاہ بننے کا شرف حاصل ہوا، مکان سے متصل مسجد کے جنوب میں وہ خالی زمین ہے جہاں مولانا روحانیت کی درسگاہ (خانقاہ) کھولنا چاہتے تھے لیکن عمر نے وفا نہ کی اور ان کو اس کا موقعہ نہ مل سکا۔ کاش اگر ایسا ہوجاتا تو مولانا کا جو سوز جگر اور انداز تربیت تھا، دنیا دیکھ لیتی کہ اس میدان میں بھی کیسے کیسے لعل وگہر نکلتے۔ آج اس ویرانے میں مولانا مرحوم کا مرقد روحانیت کا مسکن اور محبت وسکینت کا مینار معلوم ہوتا ہے۔ فرحمۂ اللہ

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

❑❑❑

(معذرت من جانب مرتب) مولانا اختر امام عادل صاحب کا مضمون آپ نے پڑھا، یہ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس سے بہت زیادہ ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ صفحات کی تنگی داماں کی وجہ سے ہم اس کو من وعن نہیں شائع کر سکے۔ ہم مولانا سے معذرت خواہ ہیں اور اس جسارت پر خواستگار عفو ہیں۔

حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی کی شخصیت
''حدیث دوستاں'' کے آئینے میں

مفتی روح اللہ قاسمی صاحب
استاذ: مدرسہ فلاح المسلمین گواپوکھر مدھوبنی

''قدر جوہر شاہ داند یا بداند جوہری'' حضرت مولانا مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ کے خطوط کا مجموعہ ''حدیث دوستاں'' کے تعلق سے وقت کے عارف باللہ، اسلاف کی یادگار، حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب دامت برکاتہم مہتمم دارالعلوم دیوبند نے اپنے گراں قدر تأثر کا اظہار ان الفاظ سے فرمایا ہے: '' مجھے اس مجموعہ کی اشاعت کا انتظار رہا اور اشاعت کی اطلاع ملنے سے بے حد مسرت ہوئی۔ ضیاء الاسلام کے شماروں میں میری نگاہیں سب سے پہلے اسی صفحہ کی تلاش میں رہتی ہیں، جس پر ''حدیث دوستاں'' کا عنوانِ جلی رقم ہوتا ہے۔ بڑے ذوق وشوق کے ساتھ ان صفحات کو پڑھتا ہوں اور ان کے سحر میں گم ہو جاتا ہوں۔'' (حدیث دوستاں: ص ۱۸)

یہ مجموعہ کیا ہے؟ محبتوں کا مجموعہ، شفقتوں کا سمندر، ٹوٹے دلوں کی آس، پریشان حالوں کی تسلی کا زبردست سامان، درد کے ماروں کا شافی علاج۔ ایک ایک خط پڑھتے جایئے اور زندگی کے پر پیچ راہوں کے مسائل حل کرتے جایئے، ساتھ ہی اپنے بنانے والے پر یقین واعتماد کی دولت کو بڑھاتے جایئے۔ لفظ لفظ سے خدا پر بھروسہ کرنے کی تلقین، سطر سطر سے خزانۂ خدا پر نگاہ رکھنے کی نصیحت۔ غم کے ماروں کو کسی طرح تسلی ہو جائے اور تسکین مل جائے۔ اسے تھپکی دینے لئے کبھی قرآن وحدیث کا حوالہ، کبھی اکابرین کے واقعات، کبھی جگ بیتی کی زریں کڑیاں، کبھی آپ

بیتی کی داستان، گویا کوئی بچہ درد وتکلیف سے کراہ رہاہواور ماں کی ماممتا اسے چپ کرنے اور آرام پہونچانے کے لئے بے کل وبے چین ہو۔ کوئی اپنی پریشانی کا تذکرہ کررہا ہے، کوئی درد والم کی داستان حیات سنارہا ہے، کوئی علم کے پرخار وادیوں کا مسافر ہے جسے بروقت راہنمائی اور دستگیری کی ضرورت ہے، تو کوئی اشکالات اور علمی مسائل کے حل کے لئے دست بستہ کھڑا ہے اور حضرت مولانا اپنی مومنانہ فراست سے ہرایک کی صحیح بھرپور راہنمائی فرمارہے ہیں۔

تسلی دینے اور پریشانیوں کا حل بتانے کا وہ کون سا طریقہ ہے جسے آپ نے اپنایا نہ ہو۔ اور یہ ایسے مؤثر اور شفقت بھرے انداز میں کہ مخاطب اس کے سحر میں گم ہوجائے۔ پڑھنے والے کو یہ احساس نہ ہو کہ وہ تحریر پڑھ رہا ہے؟ یا اپنے بے مثال وعظیم مربی کے سامنے بیٹھا اس کی اپنائیت و شفقت میں نہار رہا ہے؟ بقول حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب دامت برکاتہم کے کہ: ’’خط پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مخاطب سراپا گوش بن کر مولانا کے سامنے بیٹھا ہے اور مولانا اپنے مخصوص انداز میں اس سے گفتگو فرمارہے ہیں۔ کبھی ڈانٹ رہے ہیں، کبھی محبت کے ساتھ دھول جمارہے ہیں اور خط مکمل ہونے کے بعد چشم تصور یہ منظر دکھلاتی ہے کہ سائل مطمئن ومسرور ہوکر مولانا سے رخصتی مصافحہ کررہا ہے۔‘‘ (ص:۱۹)

لگے ہاتھوں حضرت مولانا کے شاگرد خاص اور علمی وراثت کے امین ومحافظ مولانا ضیاء الحق خیرآبادی (حاجی بابو) کا یہ تأثر بھی ملاحظہ کرلیجئے: ’’ان خطوط میں آپ جگہ جگہ محبت وشفقت اور ہمدردی وغمخواری کے نمونے دیکھ سکتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ایک مصلح ومربی کا صاف وشفاف دل ہے جو اپنے متعلقین کے لئے بے چین ومضطرب اور بے قرار رہتا ہے اور چاہتا ہے کہ میرے یہ اہل تعلق کبھی جادۂ مستقیم سے منحرف نہ ہوں۔ ہمیشہ خالق ومالک سے جڑے رہیں اور اپنے مقصد حیات کو کبھی فراموش نہ کریں اور اپنے خالق کی منشا ومرضی کے مطابق اپنی زندگی گذاریں۔‘‘ (ص:۱۰)

واقعہ یہ ہے کہ حضرت مولانا کا دل ’’سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے‘‘ کا مصداق تھا۔ خنجر کہیں چلے، آپ بے چین ہوجاتے تھے۔ اور اگر یہ درد وغم اہل تعلق کا ہوتب تو پوچھئے مت! حضرت ماسٹر قاسم صاحب دامت برکاتہم کے گاؤں کے قریب ایک بستی میں آگ

لگی، بے شمار مکانات جل گئے۔ اس کی اطلاع ملی تو آپ نے حضرت ماسٹر صاحب کو خط لکھا:

''ایسا لرزہ خیز حادثہ ہے کہ بے اختیار آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس وقت سے اب تک دل کو کسی طرح قرار نہیں ہے، ہر وقت امنڈتا رہتا ہے۔ یہ سب اہل محبت تھے۔ ان کی فدائیت و محبت کو سوچ سوچ کے اور زیادہ بے قراری ہوتی ہے۔ بے اختیار جی چاہتا ہے کہ فوراً ان لوگوں تک پہونچوں اور جس طرح بن پڑے صبر وسکون کا سبب بنوں۔'' (ص ۳۹)

۱۹۸۴ء میں مئو کے ہولناک فساد سے متأثر ہو کر حضرت مولانا کا اپنے دوست حاجی عبد الرحمٰن صاحب سے درد کا اظہار کچھ یوں ہوتا ہے:

''جب کہیں خونریزی اور درندگی کا ننگا ناچ ہوتا ہے، تو میرا دل تڑپنے لگتا ہے۔ جلوتوں میں ہنستا، بولتا اور مسکراتا ہوں، لیکن خلوتیں بڑی کربناک اور تکلیف دہ ہو جاتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمام زخم میرے ہی دل وجگر پر لگ رہے ہیں۔ روتا ہوں، کراہتا ہوں، آنسو بہاتا ہوں تڑپتا ہوں، کڑھتا ہوں، خدا کو لپٹتا ہوں، لیکن تسکین وتسلی نہیں ہوتی۔'' (ص ۱۴۱)

انسانی زندگی کے ساتھ اچھے برے حالات لگے ہوئے ہیں۔ آدمی کبھی راحت وسکون کی زندگی پاتا ہے تو کبھی ایسے مواقع بھی آتے ہیں کہ درد وغم سے گذرنا پڑتا ہے۔ یہ دنیا انہیں تضادات کا مجموعہ ہے۔ کبھی خوشی تو کبھی غم۔ کسی کے گھر میں شادیانے بج رہے ہیں تو کہیں سے جنازہ نکل رہا ہے۔ مگر نادان انسان راحت وسکون میں اپنے بنانے والے کو بھلائے رکھتا ہے اور پریشانیوں میں گھبراتا ہے، بلبلاتا ہے۔ مگر کر بھی کیا سکتا ہے؟ اس کے پاس ہے کیا؟ جس سے اپنے حالات کو بدلنے کی طاقت رکھتا ہو؟ ہاں بس ایک ہی چارہ ہے کہ جہاں سے حالات بنتے بگڑتے ہیں، بس اسی کے در کو تھام لیا جائے اور اسی کی منت سماجت کی جائے۔ کیونکہ حالات سے لڑ کر اور اس کا مقابلہ کر کے ہلکان تو ہوگا، مگر اسے موافق نہیں بنا سکتا ہے۔ درد والم میں ڈوبا ایک خط آیا۔ ناموافق حالات سے کاتب رقعہ کا پیمانۂ صبر چھلک پڑا تھا۔ مرشد گرامی نے آنسو پونچھے:

''تم حالات سے بہت لڑ لئے، اپنا سارا دم خم صرف کر دیا۔ لیکن بات وہیں کی وہیں رہی، جہاں پہلے تھی۔ معلوم ہوا کہ کوئی اور غیبی طاقت ہے جو تم کو وہیں رہنے پر مجبور کر رہی ہے، جہاں تم ہو۔ اس لئے اب میری قطعی رائے یہ ہے کہ تم لڑائی سے دستبردار ہو جاؤ، صلح کر لو اور غیبی طاقت

> نے جہاں تم کو پہونچا دیا ہے اس پر دل سے راضی ہو جاؤ۔ ...... نہ حالات سے لڑو نہ خالقِ حالات سے ناراض ہو۔ بس ان کی خوشامد کرو۔ غیب کی کنجیاں انہیں کے ہاتھوں میں ہیں۔ جو بھی حال ہو خندہ پیشانی سے اس کو قبول کر لو۔ اگر پسند نہ ہو تو انہیں سے فریاد کرو۔ آخر صبر اور رضا بالقضاء کی تعلیم کس کے لئے ہے؟۔‘‘

کتنے پتے کی بات کہی ہے:

> ’’تنخواہ کی کمی کو دیکھتے ہو اور اللہ کی رزاقیت کو نہیں دیکھتے؟ جن کی تنخواہیں زیادہ ہیں وہ صرف گننے کے لئے زیادہ ہیں، کام ان سے اتنا بھی نہیں ہوتا جتنا مدرسے کی قلیل تنخواہ سے ہو جاتا ہے۔‘‘ (ص ۴۲۳)

حضرت مولانا کے نزدیک تو زندگی میں پریشانیوں کا آنا زندگی کی علامت ہے۔ فرماتے ہیں: ’’جس کی زندگی غم واندوہ سے خالی دیکھتا ہوں تو مجھے شبہ ہوتا ہے کہ یہ زندہ بھی ہے یا موت کی گہرائیوں میں فنا ہو چکا ہے۔ اور جسے تڑپتا، روتا اور فریاد کرتا پاتا ہوں، سمجھ جاتا ہوں کہ پہلو میں کچھ ہے جو چین لینے نہیں دیتا۔‘‘ (۹۲)

اپنے والد گرامی کو تحریر فرماتے ہیں:

> ’’کٹھن اوقات اور شدید حالت کی بھٹی ایسی ہے کہ اس میں جہاں ایک طرف گناہوں اور معصیتوں کے انبار جل کر راکھ اور سیاہ ہو جاتے ہیں، وہیں گریہ وزاری، تضرع وفریاد اور نالہ وفغاں کی وہ دولت بے بہا بھی حاصل ہو جاتی ہے جو اللہ کو بے حد محبوب ہے اور اس سے مقبولیت کے بے انتہا درجات سے آدمی سرفراز ہو جاتا ہے۔ لیکن کیا کیجیے کہ یہ عظیم دولت راحت وآرام اور مسرت وخوشی کے ایام میں میسر نہیں آتی۔ اس لئے بلاؤں کا نزول وہجوم ہوتا ہے کہ انسان اس سے محروم نہ رہ جائے۔‘‘ (ص ۱۱۰)

درحقیقت یہ پریشانیاں اس خالق دو جہاں کی طرف سے نوازنے کے بہانے ہیں۔ ’’ان کی ہر نگاہ، نگاہ کرم ہے۔ ہر التفات، التفاتِ عنایت ہے۔ وہ اگر کسی کو موافق بنا دیں تو انعام و بخشش ہے۔ کسی کو مخالف بنا دیں تو توجہ خاص کی نشانی ہے کہ ہر طرف سے کاٹ کر اپنے دروازہ پر رکھنا چاہتے ہیں۔‘‘ (ص ۹۱)

حضرت ماسٹر قاسم صاحب کی ہمشیرہ کا انتقال ہوا، جس سے ان کی طبیعت حد درجہ متأثر ہوگئی۔ محبت والفت کے علاوہ یہ وجہ بھی تھی کہ وہ حضرت ماسٹر صاحب کی اکیلی ہمشیرہ تھیں۔ آپ انہیں بے پناہ عزیز رکھتے تھے اوران کی جدائیگی کا غم ناقابل برداشت ہوکر صحت کو متأثر کر رہا تھا۔ حضرت مولانا کو حالات کا علم ہوا تو دل بھر آیا، بے کلی بڑھ گئی، طبیعت بے قرار ہواٹھی، پرانے زخم تازہ ہواٹھے۔ بات آپ بیتی سے شروع ہوئی اور یوں گویا ہوئے:

> ’’مجھے اکثر یہ خیال آتا ہے کہ حق تعالی اپنے بندوں کی ساری توجہ اپنی طرف دیکھنا چاہتے ہیں، اس کے لئے عالم غیب سے تدبیریں نازل فرماتے ہیں اور تدبیریں عموماً انسان کے مزاج و خواہش کے خلاف اور تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ یہ تدابیر کبھی مال پر بجلی بن کر گرتی ہیں، کبھی اپنے گھر والوں اور عزیزوں کی جان کی آفت بنتی ہیں، کبھی بیوی ناموافق ہوتی ہے، کبھی اولاد نالائق ہوتی ہے۔ ایسے حالات میں آدمی خدا کا نیاز مند ہوتا ہے تو سب سے دل توڑ کر اسی پروردگار کے دروازے پر دھونی رما کر بیٹھ جاتا ہے۔ اب اس کا دل مضبوط ہوتا ہے، وہ سوچ لیتا ہے کہ یہ سب اشخاص واشیاء فانی ہیں۔ ان کے ساتھ ہر قسم کا تعلق بھی فانی ہے۔ باقی تو بس خدا کی ذات ہے اوراس کا تعلق ہے۔ بس اسی سے لگنا لپٹنا چاہئے۔‘‘ (ص۴۲)

قلم ہو حضرت مولانا کا، تذکرہ چل رہا ہو عشق حقیقی کا اور مخاطب حضرت ماسٹر صاحب جیسی صاحب نسبت شخصیت ہو، پھر دیوانوں کا تذکرہ نہ آئے، کیسے ممکن ہے؟ سنیے:

> ’’اک لمبے عرصے کے بعد حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے بیٹے کی ملاقات ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیم بن ادہمؒ ساری دنیا کو لات مار کر خدا کے ہو رہے تھے۔ ایک زمانے کے بعد ان کے صاحبزادے کو باپ کی اطلاع ملی۔ صاحبزادے کو باپ کی تلاش تھی ہی، انہوں نے بالآخر باپ کو پالیا، جب ہر ایک نے دوسرے کو پہچان لیا تو محبت کا شعلہ اتنے زور سے لپکا کہ دونوں ایک دوسرے سے بے اختیار لپٹ گئے، پھر جب جدا ہوئے تو صاحبزادے کی روح بھی جدا ہوچکی تھی۔ عجیب منظر تھا۔ یہ ملنا تھا، یا بچھڑنے کی تمہید تھی؟‘‘ (ص۴۳)

پھر سید العارفین حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ کے حوالے سے اس نکتہ کو حل کرتے ہوئے آپ نے ٹوٹے دل کو تسکین دینے کی کوشش کی ہے۔ جنہیں تسلی دی جارہی ہے وہ

کوئی اور نہیں، خود صاحب معرفت بزرگ ہیں اور موقعہ ہے جان سے عزیز بہن کی وفات کا، جس کی جدائیگی کے صدمے نے غموں سے نڈھال کر دیا ہے۔ آپ نے تحریر فرمایا:

> ’’حضرت ابراہیم بن ادہم کا دل بجز ایک پروردگار کی محبت کے ہر ایک تعلق سے خالی تھا، مگر جب بیٹے سے ملاقات ہوئی تو اچانک نہایت جوش وخروش سے اس کی محبت کا طوفان اٹھا۔ حق تعالیٰ کی غیرت کو یہ کب گوارا تھا کہ جو دل حبِّ الٰہی کا آشیانہ بن چکا ہے، اس میں کوئی غیر اتنی قوت سے داخل ہو کہ اس میں بھی مقصودیت کی شان پیدا ہوجائے۔ بس یہ غیرتِ الٰہی تھی کہ بیٹا رخصت ہوگیا اور اس باپ کا دل (غیر خدا سے) پھر خالی ہوگیا۔‘‘ (ص:۴۳)

کلکتہ کے حاجی ایوب صاحب کو حضرت مولانا سے بڑی مناسبت تھی۔ اپنی بعض پریشانیوں کی وجہ سے محبت بھرا شکایتی خط لکھا (جس میں غالبًا یہ مضمون رہا ہو کہ دعائیں اپنا اثر کھو چکی ہیں۔ اور یہ عام شکایت ہے) دیکھئے معارف کے کیسے کیسے دریا بہائے گئے ہیں:

> ’’آپ روتے رہئے، وہ ہنستے رہیں۔ اگر یہی ہوتا رہے تو کیا حرج ہے؟ ہمارا رونا اگر کسی کو مسکرانے پر مجبور کردے تو ہم اور روئیں گے، کسی کا کیا؟ ان کا ایک تبسم ہمارے تمام آنسوؤں کی بیش قرار قیمت ہے‘‘۔ (ص ۸۵)

بندہ جب بندہ ہے خدا نہیں ہے تو اسے بندہ ہی رہنا چاہئے۔ اگر اس کی ہر مراد پوری ہوجایا کرے، جو مانگے مل جائے تو پھر بندگی کی شان کیا باقی رہی؟۔

> ’’آخر جو خدا ہے اسی کو آپ خدائی کے درجہ سے اتار کر بندگی کی جانب کیوں لانا چاہتے ہیں؟ بتایئے اگر وہ آپ کی اطاعت کو اپنے لئے ضروری کرلیں تو کون خدا رہا اور کون بندہ؟‘‘

دیکھئے اپنی زبان اعجاز سے حضرت کیا سمجھا گئے:

> ’’آپ کو اور ہم کو جو شکایت ہے وہ یہی تو ہے کہ ہم جو جاہل ہیں، آگے کی کچھ خبر نہیں رکھتے، پیچھے کو بھلا بیٹھے ہیں...... ہم جو اول وآخر جاہل ہیں...... اس ’’ہم‘‘ کی اطاعت وہ کرے جو آگے کی بھی خبر رکھتا ہے اور پچھلا نامۂ اعمال بھی اس کے حفاظت خانہ میں محفوظ ہے۔...... یعنی کہ علم تابع ہوجائے جہل کے، قوت سپر ڈال دے ضعف کے سامنے، طاقت شکست کھا جائے کمزوری کے سامنے۔ سوچئے اگر حکمت ومصلحت نے ناعاقبت اندیشی سے ہار مان لی تو وہ کیسی

حکمت و مصلحت ہے۔‘‘(ص۸۷)

بات آب زر سے لکھے جانے کے قابل۔ معارف کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے جو اپنے اندر اتاہ گہرائی رکھتا ہے، مگر ایک پریشاں حال سادہ ذہن کا آدمی کہیں غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائے، معاً اس کی سطح پر آکر بات کی گئی:

’’آپ کہتے ہیں دعاء کا اثر دنیا میں کیوں نہیں ہوتا؟ میں پوچھتا ہوں کہ کب نہیں ہوتا اور کہاں نہیں ہوتا؟ ہوتا ہے اور خوب ہوتا ہے۔ آپ کو بھی تجربہ ہے اور مجھے بھی تجربہ ہے۔‘‘ (ایضاً)

پھر جو اس مضمون کو سمجھایا تو آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ آدمی یہ سوچ کر بھی حیران رہ جائے گا کہ اتنے الطاف وعنایات کے بعد بھی کہنا کہ دعاء قبول نہیں ہوتی، بڑی ناشکری ہوگی۔ پھر یہ بھی غور کیجیے کہ دل شکستہ ہوکر رب ذوالجلال کے دربار میں رونے گڑگڑانے میں جو مزہ ولذت ہے، کیا وہ دنیا کے کسی اور شئی میں نصیب ہوسکتی ہے؟۔ یقین وایمان کی کیفیت آپ بھی محسوس کرسکتے ہیں۔ اپنی زندگیوں میں اس کا تجربہ کرکے دیکھئے۔ جن دنوں ’’ایک بے چارگی اور مجبوری کے عالم میں ان کا نام پاک (آپ کی) زبان پر رواں ہوتا ہے (اور) اس میں لذت وحلاوت کی جو کیفیت محسوس ہوتی ہے، دوسرے احوال میں کبھی (آپ کو) محسوس ہوئی؟‘‘(ص:۹۱)

موضوع کوئی بھی ہو، بات کہیں سے چلے، حضرت مولانا کی ہر گفتگو کی تان یہیں آکر ٹوٹتی ہے کہ:

> ’’عزیز من! انسان کی خلقت کا مقصد بجز یاد الٰہی اور معرفت خداوندی کے کچھ نہیں۔ اگر کسی کو یہ دولت نہ ملی تو اسے کچھ نہیں ملا۔ زندگی وبال اور وقت ضائع۔ کیا بتاؤں یہ کیسا قیمتی سرمایہ ہے؟ اگر بڑی سے بڑی قربانی دے کر یہ دولت بیدار حاصل ہو جائے تو سستا سودا ہے۔‘‘ (ص:۱۶۲)

وہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے جس میں بندہ کا اپنے معبود سے رابطہ نہ ہو۔ دنیا کے جہاں اور جھمیلے اور ہزاروں کام ہیں وہیں ’’ایک دو گھنٹہ ایسا بھی ہونا ضروری ہے جس میں صرف بندہ ہو اور اس کا خدا ہو، درمیان میں کوئی حجاب نہ ہو۔ کہاں کی مصروفیت اور کہاں کی مشغولیت؟ سب کو

ٹھکرا کر خلوتِ محبوب میں جا حاضر ہوں، سب کاروبار دنیا سے کہہ دیں کہ اب ٹھہرو۔ ہم کاسۂ گدائی لے کر ''درِ کریم'' پر حاضری دینے جا رہے ہیں۔ اب تمام مشاغل ہمارا انتظار کریں۔ خدا کی قسم جب تک ایسا نہ ہو، جینے کا لطف نہیں۔'' (ص ۲۰۷)

اس دنیا کو دھوکا لگ گیا ہے۔ مختلف عنوانوں اور مختلف ناموں سے دنیا جہاں کے ہزار مشغولیتوں کو اپنے سر پال رکھا ہے اور جو کرنے کی چیز ہے اس سے نظریں چرا لیتے ہیں۔ آنکھ اٹھا کر گرد و پیش کا جائزہ لیجیے۔ نظر آئے گا کہ لوگ امت کے غم میں دبلے ہوئے جا رہے ہیں اور جب خدا کا منادی انہیں اپنی طرف بلاتا ہے تو کانوں میں آواز نہیں جاتی۔ اور آپ بھی اپنے کو تسلی دے لیتے ہیں کہ یہ بے چارے بڑا کام کر رہے ہیں کہ خدا کی مخلوق کو فائدہ پہونچانے کے لئے اپنی نیند اور اپنا آرام قربان کر رکھا ہے۔ یاد رکھیے کہ:

> ''خدمت خلق وہی معتبر ہے جس کا رشتہ خدمت خالق سے استوار ہو، ورنہ خدمت خلق محض فریب نفس اور کید شیطان ہے۔'' (ص:۲۰۸)

حضرت مولانا کے بچپن کے بے تکلف دوست اور رفیق درس، انتہائی نیک، حد درجہ متواضع اور نام الٰہی کا ذوق رکھنے والے، انہوں نے فرائض وواجبات میں کوتاہی کی نہیں، بلکہ ذکر و اذکار میں استقامت کے لئے خصوصی دعاؤں کی فرمائش کی اور یہ حالِ دل بیان کیا کہ مدرسہ کے کاموں کی بھیڑ کی وجہ سے ذکر وغیرہ چھوٹ جایا کرتے ہیں۔ مدرسہ کے کام، طالبان علوم نبوت کی خدمت گذاریاں، کسی کو اس پر خیال بھی آسکتا ہے کہ یہ دنیا کے کام ہیں؟ دین کا بڑا کام ہو رہا ہے۔ شوق سے کرتے جائیے اور کچھ فکر نہ کیجیے۔ کیوں کہ آپ دین کی نشر واشاعت میں لگے ہوئے ہیں۔ اسے کم نہیں اور بڑھانے کی ضرورت ہے۔ نہیں، مگر سنئے مرشد گرامی کی زبان سے۔ آپ فرماتے ہیں:

> ''مخلوقات کے ان بکھیروں میں پڑ کر خالق سے بے توجہی کیوں کر روا ہوگی؟ آپ کہیں گے کہ طلبہ کی تربیت کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے۔ میں عرض کروں گا کہ ایسی تربیت میں آگ لگا دیجیے جو اپنے محبوب سے مانع بن جائے۔ پھر تربیت کون کرتا ہے؟ ہم اور آپ؟ کلا وحاشا، ہم سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ خالق عز وجل ہی مربی ہیں۔ ہم صرف راستہ بتا دیں، باقی ذمہ داری

اپنے سر کیوں اوڑھیں۔'' (ایضاً)

متاعِ درد و غم ڈاکٹر کلیم عاجز صاحب نے ایک بار عصر حاضر کے دانش وروں کی طرف سے ناقدری کا شکوہ کیا تھا۔ دیکھئے کیا انداز ہے تسلی کا! کیا اس کے بعد بھی کسی کو شکایت کا موقعہ باقی رہے گا؟ آپ تحریر فرماتے ہیں:

> ''موتی تو موتی ہے، اس کی آب و تاب ہر حال میں باقی رہتی ہے۔ اس کی قدر وہی کرے گا جو اس کی پہچان رکھتا ہے اور اگر ناقدروں نے اس کی قدر نہیں کی تو قصور موتی کا نہیں، ناقدروں کی کورنگاہی کا ہے۔''

دو دیوانے کی گفتگو میں تذکرہ چھڑ گیا اس دیوانے کا بھی جس کی تلاش حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تھی۔ وہ دوران طواف مل گیا:

> ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمائش کی، اویس! کچھ نصیحت کرو، عرض کیا آپ صحابی رسول ہیں، میں آپ کے پاؤں کی دھول، میں کیا نصیحت کروں؟ فرمایا: ''نہیں، کچھ تو کہو...... حضرت! آپ خدا کو جانتے ہیں؟ ہاں کیوں نہیں، ...... پھر آپ خدا کے علاوہ کسی اور کو نہ جانیں تو اچھا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر سکتہ طاری ہونے لگا۔ اور حضرت! اللہ تعالیٰ آپ کو جانتے ہیں؟ ہاں کیوں نہیں؟...... تو اگر آپ کو خدائے تعالیٰ کے علاوہ کوئی اور نہ جانے تو اچھا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رو پڑے اور دیوانہ اپنی شوریدگی میں کسی طرف نکل گیا۔'' (ص ۹۸)

حضرت مولانا عبد الرب صاحب اعظمی کے فرزند اکبر کا ایک حادثہ میں انتقال ہو گیا۔ قدرتی طور پر اس کا گہرا اثر والدین پر ہوا۔ جانے والا خود حضرت مولانا سے حد درجہ قریب تھا اور آپ نے بھی اسے بڑے ابا کا پیار دے رکھا تھا۔ اس کے جانے سے آپ بھی ٹوٹ گئے۔ حضرت مولانا نے اس شہید ناز سے عالم تصور میں گفتگو فرمائی ہے اور اس سے اپنے درد کا اظہار یوں فرمایا ہے:

> ''ایسا معلوم ہوا کہ میری بھی جان نکل جائے گی۔ مجھے تو کئی طرح صدمہ پہونچا ہے۔ ایک صدمہ تمہارے زخمی ہونے کا، دوسرا صدمہ تمہارے مرنے کا اور اس سے بڑھ کر یہ صدمہ کہ تمہارے ابا پر کیا گذر رہی ہوگی؟...... میرا دل اتنے زور سے دھڑک رہا تھا کہ سینے کی ہڈیوں میں

درد ہوگیا، پورا جسم سنسنا رہا تھا۔‘‘ (ص ۱۷۷)

قرآن وحدیث کی روشنی میں کی گئی یہ پوری گفتگو شہید کے مقام و مرتبہ اور بعد والوں کی تسلی اور صبر و رضاء بالقضاء کے مضامین پر مشتمل ہے، جسے پڑھ کر بے چین دل کو قرار آجاتا ہے، غموں کے بادل چھٹ جاتے ہیں اور دل پر ایمان کی باد بہاری چل پڑتی ہے۔ آپ بھی پڑھئے اور دیکھئے کہ کیسے اچھوتے انداز میں اپنے دوست کو تسلی دے رہے ہیں؟ اور ذیل میں مذکور خط سے ان کی دل بستگی کا سامان کر رہے ہیں؟:

’’بڑے ابا! شہادت کا درجہ تو اللہ تعالیٰ کے یہاں جو ہے وہ تو ہے ہی، میں نے دیکھا کہ صبر کا درجہ بھی بہت اونچا ہے، اور وہ بھی صدمہ کے عین وقت پر! اس کا تو کوئی حد و حساب نہیں ہے۔ اِس دنیا (عالم آخرت) میں اس کا بہت چرچا رہتا ہے، صبر کا حساب ہر ناپ تول سے آگے ہوتا ہے۔

بیٹا! یہ بات تم بالکل صحیح کہہ رہے ہو، ہم ابھی اس غیب کے پیچھے ہیں، لیکن ہم کو قرآن و حدیث کے فرمان پر قطعی یقین ہے، اور تم تو مشاہدہ کر رہے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں خبر دی ہے کہ: ’’**اِنَّمَا یُوَفَّی الصَّابِرُوْنَ أَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ**‘‘

صبر کرنے والوں کا اجر بے حساب ہے۔

صبر کرنے پر اللہ تعالیٰ نے تین نعمتوں کا وعدہ قرآن میں فرمایا ہے، یہ بات کسی اور چیز اور عمل کو حاصل نہیں ہے۔ فرماتے ہیں: **أُولٰئِکَ عَلَیْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَّأُولٰئِکَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ**، یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کے رب کی جانب سے مہربانیاں ہیں اور رحمت ہے، اور یہ لوگ ہدایت یاب ہیں۔

بڑے ابا! مجھ کو تو اللہ تعالیٰ نے مقام صبر سے بہت آسانی گزار دیا، اور ان کی مہربانیاں دم بدم دیکھ رہا ہوں، میرے گھر والوں کو بھی بتا دیجئے کہ صبر کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ اور وہ کیوں کر حاصل ہوتا ہے؟۔

بیٹا! صبر کے معنی روکنا ہے، صبر کا مدار تین باتوں پر ہے، اللہ کے فیصلے پر ناگواری اور ناراضگی سے اپنے نفس کو روکنا، ناروا اور غلط باتوں کے بولنے سے اپنی زبان کو روکنا، اور باقی

> اعضاءِ بدن کو گناہ کے کام سے روکنا، مثلاً رُخساروں پر طمانچہ مارنا، ران پیٹنا، سیاہی لیپنا، جب ان باتوں کو مصیبت کے وقت انسان عمل میں لاتا ہے، تو اسے صبر کی فضیلت حاصل ہوتی ہے، جسے حدیث میں ''نصف ایمان'' فرمایا ہے۔ پھر اس کی مصیبت ایک عظیم نعمت سے بدل جاتی ہے، اس کی بلا ایک زبردست بخشش اور انعام بن جاتی ہے، اور جو چیز اس کی ناپسندیدہ تھی، وہ مرغوب اور پسندیدہ بن جاتی ہے، یہ بات ہے تو مشکل، مگر اللہ تعالیٰ آسان فرما دیتے ہیں۔''

ایمان والے کو کبھی اس طرح کے حالات سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے جب وہ رب بے نیاز سے تعلق وحضوری میں اپنے کو کوتاہ پاتا ہے، پھر وہ ناامیدی کا شکار ہونے لگتا ہے کہ یہ بے کیفی کہیں اس کی شامت اعمال کا نتیجہ تو نہیں؟ دیار قدس میں حاضری ہو جائے، یہ کسی بھی مومن کی بڑی تمنا ہوتی ہے، اس کے لئے تڑپتا ہے، روتا ہے، بلکتا ہے، آہیں بھرتا ہے۔ اتنی تمناؤں کے بعد اگر کسی بندۂ خدا کی قسمت نے یاوری کی اور وہ اس سعادت سے بہرہ ور ہو گیا تو اس کی خوش بختی کے کیا کہنے۔ مگر ایسے پر بہار موقع پر اس کی طبیعت اچاٹ ہونے لگے اور وہاں جانے کے بعد دل کی وہ کیفیت باقی نہ رہے جو مہجوری میں تھی، تو اس پر کیا بیتے گی؟ کچھ وہی لوگ بتا سکتے ہیں جو اپنے پہلو میں زندہ دل رکھتے ہوں۔ ایسے ہی حالات کے شکار ''ایک پاک طینت بزرگ'' نے حضرت مولانا کو خط لکھا کہ ''وہاں جو بے کیفی اس بے نصیب پر ہر اعمال میں طاری رہی، مجھے بار بار خیال ہوتا رہا کہ میں......مردود تو نہیں ہوں۔''

حضرت کا جواب سنئے اور اگر ایسے حالات سے آپ دوچار ہوں تو ناامیدی کے گرداب سے باہر آیئے۔ کوئی وجہ نہیں ناامیدی کی، بلکہ یہ مقام شکر ہے۔ ذرا سوچئے کہ کیا یہ حقیقت واقعہ نہیں ہے کہ:

''محبوب اپنے محبّ سے جس قدر دور ہوتا ہے اور اس کے وصل کے اسباب جتنے مستور ہوتے ہیں اسی قدر اس کا عشق شور انگیز ہوتا ہے۔ حالتِ فرقت میں روتا بھی ہے، بلکتا بھی ہے، تڑپتا بھی ہے اور پھڑکتا بھی ہے۔'' اور اس میں اسے وہ لذت ملتی ہے کہ اس کے سامنے ساری لذتیں ہیچ ہیں۔ لیکن کیا یہ دوری ومہجوری مطلوب ہے؟ ''اصل مقصود تو وصال محبوب ہے۔...... جب آپ اس دیار پاک میں پہونچ گئے تو ایک طرح کا وصال نصیب ہو گیا۔ اب اس کے بعد شوق کی

گرمی کہاں؟ فراق کی بے تابی کہاں؟ ایک طرح کا سکون پیدا ہو جانا لازمی تھا۔ یہ سکون کی حالت چونکہ یکا یک پیدا ہو جاتی ہے، اس لئے عاشق گھبرا جاتا ہے اور خود کو خالی اور بے رنگ محسوس کرنے لگتا ہے، حالانکہ یہی رنگ اصلی اور پختہ ہے''۔

آپ فرماتے ہیں کہ:

''یہ مقام عبدیت ہے (اور) خدا کا شکر ہے کہ آپ کو یہ دولت حاصل ہوئی۔ عبدیت کے مقام پر قدم جمانا مبارک۔'' (ص: ٦٧)

کہا جاتا ہے کہ جب تک آدمی حالات کا خود شکار نہ ہو، اسے ایسے ہی لن ترانیاں سوجھتی ہیں اور جب وہ خود حالات کی چکی میں پستا ہے تو سارے وعظ و نصیحت ہوا ہو جاتے ہیں، پھر وہ بھی وہی کرنے لگتا ہے جو دوسرے لوگ کرتے ہیں۔ حضرت مولانا کو جاننے والے خوب جانتے ہیں کہ ان کا ظاہر و باطن یکساں تھا۔ وہ صرف گفتار کے غازی نہیں، کردار کے مجاہد تھے۔ دوسروں کے لئے جو نصیحتیں تھیں، اس کا پہلا مخاطب خود ان کی ذات تھی۔ زندگی میں انہوں نے شریعت کے مقابلہ میں کسی چیز سے سمجھوتہ کرنا نہیں جانا۔ بڑے سے بڑا نقصان گوارہ کیا مگر اپنے اصول سے سر مو انحراف پسند نہیں کیا۔ حضرت مولانا کے قریب و پاس رہنے والے اگر اپنے ذہن کے دریچے میں جھانکیں گے تو بے شمار واقعات اس کی شہادت میں موجود پائیں گے، اور یقیناً یہ بھی ایک بڑا کام ہوگا اگر اسے قلم و قرطاس کے حوالہ کر دیا جائے۔ یہ جہاں بعد والوں کے لئے نمونہ بنے گا، وہیں یہ سبق دے جائے گا کہ اصول شریعت پر عمل کرنے والا کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کرتا۔ تاہم مجھے اس وقت یہ بتانا ہے کہ دوسروں کی پریشانیوں پر جس نے ہمیشہ شریعت کا ہی سبق دیا، جب اس کے گھر میں ایسے حالات پیش آئے تو انہوں نے اپنا سبق یاد رکھا یا نہیں؟ معذرت! کہ اس کے لئے ہمیں ''حدیث درد دل'' کا سہارا لینا پڑ رہا ہے۔

امراض کا آشیانہ بنے ناتواں بوڑھے دادا کو پے بہ پے تین پوتوں کی وفات کا زخم سہنا پڑا ''ایسا لگتا تھا کہ متاع صبر و قرار لٹ کر رہے گی اور خرمن سکون و اطمینان جل کر رہے گا، مگر اللہ کی مہربانی رہی جس نے سہارا دیدیا۔'' (حدیث درد دل: ص ٥٧٥)

''بندہ کو بجز تسلیم و رضاء کے کوئی چارہ نہیں...... حق تعالی کی رحمت و مہربانی کی یہ بڑی جلوہ

> گاہ تھی۔ تین پوتے گئے، صحت کو نقصان پہونچا، لیکن بے شمار اہل محبت ملے، ان کی ہمدردیاں ملیں، ان کی دعائیں ملیں، ان کی طرف سے تسلیاں ملیں، وہ وہ انعامات ملے جن کا تصور بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ تین معصوم جانیں پاک صاف خدا کے حضور پہونچ کر اپنے ماں باپ کے لئے سفارش کرنے والی ہوگئیں۔‘‘ (ایضاً: ص۵۷۹)

اپنے بیٹے کو سمجھاتے ہوئے سراپا درد وغم بنے ہوئے ہیں۔ ایک طرف ’’**انا بفراقک یا ابراهیم لمحزونون**‘‘ کا نظارہ ہے، تو دوسری طرف زبان سے وہی نکل رہا ہے جو خدا اور اس کے سچے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم تھی۔ ’’**ان لله ما اخذ و له ما اعطی**‘‘۔ اپنے بیٹے کا آنسو پونچھتے ہوئے کہہ رہے ہیں:

> ’’میرے بیٹے! صدمہ بڑا ہے، مگر یہ سوچو کہ جس پاک پروردگار نے یہ امانت تمہیں سپرد کی تھی، اسی نے یہ امانت جیسی سونپی تھی ویسی ہی واپس لے لی۔ اس پر کسی طرح کے گناہ کا دھبہ نہیں لگا۔ اب یہ تمہاری امانت ہے جو سب سے بڑے امانت دار کے پاس پہونچ گئی ہے......
> جب سب سے زیادہ ضرورت کا وقت ہوگا اس وقت یہ امانت تمہیں اس درجہ کام آئے گی جس کی کوئی حد وانتہا نہیں۔‘‘ (ایضاً: ص۵۸۰)

بیٹے کا دل پھٹا جا رہا ہے، رنجور باپ اسے سہارا دے رہا ہے:

> ’’اس خلا کو اللہ کی محبت سے، اللہ کی یاد سے، اللہ سے امید رکھنے سے، اللہ کی مہربانی سے پر کرلو۔ دنیا کی ہر چیز فانی ہے۔ ہر تعلق کے لئے زوال ہے۔ سب کچھ مٹ جانے والا ہے۔ ایک اللہ کا تعلق ہے جو لازوال ہے، یہ ہمہ دم کا رفیق ہے۔ دنیا کی ہر دولت فنا ہونے والی ہے، ایک تعلق مع اللہ جس کے لئے فنا نہیں ہے۔ دل جتنا زخمی ہو چکا، ہو چکا۔ اب اس پر صبر و رضا کا مرہم لگادو۔‘‘ (ایضاً: ص۵۸۱)

> میرے بیٹے! تمہارے اس حادثے نے سب کو ہلا ڈالا...... یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور میرا دل رحمت خداوندی کے دریا میں ڈوب رہا ہے۔ ہاتھ تھرتھرا رہا ہے، دل ہل رہا ہے۔ میں تمہیں یقین دلا رہا ہوں کہ حق تعالیٰ کی رحمت نے تمہارا احاطہ کرلیا ہے۔‘‘ (ایضاً: ص۵۸۲)

اگر انہیں ’’اہل محبت سے گفتگو طویل کرنے کو جی چاہا کرتا ہے‘‘ تو ہمیں محبوب کی ادائے

دلبرانہ سے سیری کیوں کر ہوگی کہ تحریر کی طوالت کا شکوہ زیرلب آئے۔ سرسری طور کچھ ایسے خطوط پر بھی نظر ڈال لی جائے جس میں تحصیل علم کے تعلق سے رہنمائی کی گئی۔ دو چار منٹ اگر اور مرشد گرامی کی مجلس میں گذر جائیں تو کیا مضائقہ ہے۔

علم کی حقیقت، اغراض ومقاصد اور اس میں پختگی پیدا کرنے کے طریقہ کار پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے:

> ’’علم نام ہے اس نور کا جو اللہ رب العزت اسلام پر پختگی اور اخلاص کے ساتھ عمل کرنے سے مومن کے قلب میں پیدا کرتا ہے۔ جو کتابوں سے حاصل کیا جاتا ہے، یہ معلومات ہیں۔‘‘ (ص:۲۵۵)
>
> ’’علم صرف ذہانت وذکاوت ہی سے نہیں ملتا۔ ممکن ہے دنیا کا علم اسی طرح حاصل ہوتا ہو، لیکن جس کو میں علم کہتا ہوں اس کا حساب وکتاب اور ہے...... دین کا علم زیادہ تر خلوص نیت، عزم وعمل اور مسلسل محنت وکاوش سے حاصل ہوتا ہے۔ ہم نے بہت ذہین دیکھے ہیں جو درمیان میں گر پڑ کر ختم ہو گئے۔‘‘ (ص:۲۴۵)

کتاب حل کرنے اور اس پر قابو پانے کا موثر ومجرب طریقہ بتاتے ہوئے ارشاد ہے:

> ’’اساتذہ کا لفظ لفظ سننے اور سمجھنے کی کوشش کرو۔ سبق کے بعد پھر اس پر ایک نگاہ ڈالو، یہاں تک کہ مسئلہ ہضم ہو جائے اور بغیر کتاب دیکھے اس کے بیان پر قدرت ہو جائے۔‘‘ (ص: ۳۰۰)

مخصوص طریقہ سے کتاب حل کرنے کی جانب رہنمائی کرتے ہوئے فرمایا:

> ’’ہر روز ایک ہی سطر حل کرو، لیکن ضرور حل کرو، ہمت ہار کر ہرگز نہ بیٹھو۔ کسی فن کی کتاب ہو، اتنا ضرور کرو۔ کیونکہ اس کے بغیر پڑھائی لکھائی کا نام تو ہوگا، کام نہ ہوگا۔‘‘ (ص:۲۵۴)
>
> ’’حدیث شریف کا مطالعہ کرتے وقت دل ودماغ میں یہ تصور مسلسل قائم رکھو کہ تم جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس مبارک میں حاضر ہو اور آپ کا کلام آپ ہی سے اخذ کر رہے ہو اور اسے سمجھنے کی کوشش کر رہے ہو۔‘‘ (ص:۳۸۵)
>
> ’’زیادہ اختلاط وتعلقات سے پرہیز ضروری ہے۔ دیکھو جس کے پاس جو چیز ہوگی اس

کے اثرات سے تم محفوظ نہیں رہ سکتے۔ اگر عالم کی صحبت میں علم حاصل ہوتا ہے تو کیا جاہل کی صحبت میں اس کے جہل کے اثر بد سے محفوظ رہ سکتے ہو؟‘‘ (ص: ۲۹۲)

علم کا مقصود کیا ہے؟۔

’’یہ سارے علوم مقصود بذاتہا نہیں ہیں کہ ساری عمر انہیں کے پڑھنے پڑھانے میں صرف کردی جائے، بلکہ یہ وسائل ہیں۔ اصل مقصود شریعت مطہرہ پر صحیح ڈھنگ سے عمل اور مولیٰ کو راضی کرنا ہے۔ یہ سارا کاروبار کتابوں کا، مدرسوں کا، اساتذہ وطلباء کا اسی لئے پھیلایا گیا ہے کہ اسلام پر صحت کے ساتھ عمل کرنے والے پیدا ہوتے رہیں۔ اگر یہ نہیں ہوا تو کچھ بھی نہیں ہوا۔‘‘ (ص ۲۵۵)

’’میرے عزیزو! مجھے اس وقت سخت تکلیف ہوتی ہے جب میں سنتا ہوں کہ عربی پڑھنے والا طالب علم کسی سرکاری ملازمت کے لئے جد جہد کررہا ہے، یا وہاں چلا گیا۔ میرے نزدیک یہ چیز غلط نہیں ہے۔ بلکہ میں اس کو محمود سمجھوں اگر یہ اس نیت سے کیا جائے کہ سرکاری اداروں میں ہمیں دین کی خدمت کے جو مواقع میسر ہوں گے ان سے دریغ نہ کریں گے...... مگر کتنوں کی نیت یہ رہتی ہے؟ اور کتنے اس قسم کا اقدام کرتے ہیں؟ تو کیا ایک مسلمان ذی علم کے سامنے حصولِ زر کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں ہے؟‘‘ (ص: ۲۴۶)

استاذ گرامی حضرت مولانا قاضی محمد حبیب اللہ صاحب قاسمی دامت برکاتہم جو حضرت مولانا کے بالکل ابتدائی دنوں کے نمایاں شاگردوں میں ہیں، انہیں سمجھا رہے ہیں:

’’اور میاں! آج کل جن کو پڑھا لکھا خیال کیا جاتا ہے، وہ بیشتر جاہل ہوتے ہیں۔ سمجھے کیا کہہ رہا ہوں؟ پڑھا لکھا وہ ہے جس کے قلب و جوارح میں خوف و خشیت الٰہی کا اثر ہو۔ اللہ کی محبت اس کے دل میں ہو۔ دنیاوی جاہ وجلال سے اس کا دل سرد ہو۔ ایسے آدمی کتنے ملتے ہیں؟ اس کے علاوہ ہدایہ ومشکوۃ پڑھ لینے سے عالم کا نام تو لگ جاتا ہے، باقی حقیقت کہاں؟‘‘ (ص: ۲۹۲)

اور دیکھو، یہ بھی یاد رکھنا کہ:

’’میرے لوگوں کے سامنے ایک عظیم مقصد ہے، وہ ہے دین اور دین کے مالک کو پالینے

> کی لگن اور جنون و آرزو۔ حطام دنیا تمہارا مقصد نہیں، عزت و جاہ تمہارا مطمح نظر نہیں، تمہیں عشق و دیوانگی ہی زیب دیتی ہے۔ دنیا میں عاقلوں اور فرزانوں کی کمی نہیں ہے، دیوانوں کی کمی ہے۔ ......(اور) دین صرف یہ ہے کہ حصول علم کے راستے میں نظر خالق عالم کے سوا کسی پر نہ ہو۔ اور یہ اتنا بڑا مقصد ہے کہ اس کے سامنے اور چیزوں کو مقصد کہنا ہی مہمل ہے۔ بھائی! تم نے اچھی تقریر کر لی تو ایک اچھے مقرر ہو جاو گے......تم نے بہت عمدہ لکھنا سیکھ لیا تو مانا کہ اچھے مصنف بن جاؤ گے، لیکن کیا حاصل؟ یہ سب ہیچ ہے۔ ایک خدا کے ہو جاؤ۔ پھر وہ جو کام لینا چاہیں گے اس کا راستہ آسان کر دیں گے......(اور ہاں) خوب سمجھ لو! آج کل یہ راستہ بالکل متروک ہے۔ اکیلے چلنا پڑے گا۔ لوگ بہت ڈرائیں گے کہ میاں کہاں جا رہے ہو؟ اس راستے میں فقر ہے، غربت ہے، ذلت ہے، ناکامی ہے۔ آہ! کہ وہ غافل ہیں۔ محبوب کے راستے کی فقیری عین امیری ہے۔ غربت ہی دولت ہے۔ ذلت کا نام عزت ہے۔ ناکامی ہی کامیابی سے عبارت ہے۔ کچھ ڈرو نہیں، گھبراؤ نہیں۔ اوروں کا جہاں اور ہے تیرا جہاں اور۔'' (ص ۲۹۶)

کسے چھوڑا جائے اور کسے پڑھ کر سنایا جائے۔ کتاب کا ایک ایک لفظ پڑھنے اور بار بار پڑھنے کے قابل ہے۔ میری بساط کہاں کہ اس کے مضامین آپ کے دماغ میں اتار دوں۔ پھر اگر سب میں ہی سنانے لگا تو آپ اس کا مطالعہ کب کریں گے؟ بعض علمی خطوط بھی ہیں جن میں سب سے تفصیلی مراسلت مولانا اختر امام عادل صاحب سے ہوئی ہے۔ یہ بڑے دقیق مسائل کو حاوی ہیں۔ ہاں ایک اور خط کے بعض حصہ سنائے بغیر ختم کرنے کو جی نہیں چاہ رہا ہے۔

جب حالات انفرادی نوعیت کے ہوں تو آدمی کو تنبہ ہونے بعد سنبھلتے دیر نہیں لگتی۔ لیکن مسلمانوں پر اجتماعی نوعیت کی جو پریشانیاں ہیں اور اس کے باوجود مسلمانوں کی عمومی بے حسی اور دین سے دوری کی جو صورت حال ہے اس پر حضرت مولانا کی کڑھن ملاحظہ ہو کہ یہ کتنا دردناک منظر اور کیسا المیہ ہے کہ جس قوم سے ربِ دوجہاں کے وعدے ہیں کہ حیات طیبہ انہیں کو ملے گی ''جن کے اسلاف نے اسی ملک پر شان و شوکت کے ساتھ حکمرانی کی، آج ان کے اخلاف کی حالت یہ ہے کہ اپنی حفاظت سے بھی بے بس اور مجبور ہیں! جو درندے منہ کھول کر ہماری ہڈیاں نوچتے ہیں، ہماری پونجی لوٹتے کھسوٹتے ہیں، جن کے مونہوں کو ہمارے خون کی چاٹ لگ گئی ہے،

جن کا پیٹ صرف ہمارے بدن کی بوٹیوں سے بھرتا ہے، جب وہی درندے اچھی طرح ہماری ہڈیاں توڑ چکے ہوتے ہیں، ہماری کھالیں ادھیڑ لیتے ہیں اور شکم بھر کر ڈکاریں لینے کی تیاریاں کرنے لگتے ہیں تو ہم اپنی عرضیاں، اپنی درخواستیں لے لے کر ان کے پاس دوڑتے ہیں اور پھر وہ فریبانہ ہمارے زخموں پر مرہم رکھتے ہیں اور جلے ہوئے کو بجھانے کے لئے ہاتھوں میں دوا اور پانی لے کر آتے ہیں اور ہم پر احسان کرتے ہیں۔‘‘ (ص۱۴۲)

اس صورت حال سے مسلمان دوچار کیوں ہے؟ آخر کیوں اس طرح کے خوفناک نظارے دیکھنے کو ملتے ہیں؟ یہ بھی بڑا دردناک قصہ ہے۔ اسی صاحب دل کی زبانی سنئے:

> ’’ایک صدمہ اور اس سے بڑھ کر ہے اور وہ ایسا صدمہ اور غم ہے جو ہڈیوں میں آگ بن کر گھسا ہوا ہے۔ کہتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں اور نہ کہوں تو بھی چین نہیں ملتا۔ ایک ایسی کشمکش، ایک ایسا تحیر، ایک ایسی انتشاری کیفیت ہے کہ نہ یارائے گفتار اور نہ طاقت خموشی! کبھی بولتا ہوں، کبھی چپ رہتا ہوں، کبھی جی چاہتا ہے کہ مدرسہ چھوڑ کر قریہ قریہ گھوموں اور لوگوں کو پکارتا پھروں اور کبھی سوچنے لگتا ہوں کہ مجذوب کی بڑ کون سنے گا؟ چپ چاپ گوشۂ عافیت میں سر دئے پڑے رہو۔ سنئے وہ کیا بات ہے؟ وہ محض اتنی بات ہے کہ ’’ہم سچے مومن نہ رہے۔‘‘ بظاہر کتنا چھوٹا سا جملہ ہے، لیکن سوچئے، اسی ایک جملہ میں درد کی پوری داستان سمٹی ہوئی ہے۔‘‘ (ص: ۱۴۳)

مسلمانوں نے خدا کی وحدانیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار کر کے عہدِ وفا باندھا ہے، اس لئے اب ’’مسلمانوں کا قصہ کافروں کے مثل نہیں ہے۔ وہ اول سے باغی ہیں۔ ان کی سزا متعین ہے۔ ممکن ہے دنیا میں ان پر مصائب و بلایا کا نزول نہ ہو، لیکن مسلمان اول سے اطاعت گزار ہے۔ یہ اگر منہ موڑے گا تو ضرور طمانچہ پڑے گا، لیکن وائے برما! کہ یہ بھی سمجھنے سے قاصر ہیں کہ یہ طمانچے پر طمانچے کیوں پڑ رہے ہیں؟ ایک طمانچہ لگا، ذرا تلملائے اور سہلایا اور کام ختم۔‘‘ (ص: ۱۴۴)

دل دردمند کی داستان یہیں ختم کرتے ہوئے حضرت مولانا کے دیرینہ رفیق، مخلص دوست حضرت قاری شبیر احمد صاحب دربھنگوی کا یہ تأثر سنانا ضروری سمجھتے ہیں جو انہوں نے اپنے

خطوط میں پایا ہے۔ قاری صاحب دیگر خوبیوں کے حامل ہونے کے ساتھ زبان وادب کی سند بھی ہیں۔ ان کے اس تأثر میں حضرت مولانا کے خطوط میں پائی جانے والی بے شمار خوبیوں کا اشارہ ملتا ہے۔ وہ تحریر کرتے ہیں:

> ''ان خطوط میں خلوص تھا، محبت بے ریا تھی، شفقتوں کی عطر بیزی تھی، شرافت نفس کا والہانہ اظہار تھا، علم پروری تھی، زبان وادب کے چٹخارے تھے، اور ان سب سے بڑھ کر تعلق خاطر کی بے کراں نکہت وخوشبو تھی جس سے مشام جان معطر ہوا جاتا تھا''۔ (ص: ۳۰)

* * *

آپ کہتے ہیں کہ دعاء کا اثر دنیا میں کیوں نہیں ہوتا، میں پوچھتا ہوں کہ کب نہیں ہوتا اور کہاں نہیں ہوتا، ہوتا ہے اور خوب ہوتا ہے۔ آپ کو بھی تجربہ ہے اور مجھے بھی تجربہ ہے۔ بچے نے ابا سے ایک پیسہ مانگا، ابا نے اس کو اشرفی دیدی، بچہ ضد کرتا ہے کہ ابا نے میری مانگ ٹھکرادی۔ ارے ٹھکرائی کہاں؟ تمہاری نادانی میں کس درجہ دانائی کا اضافہ کردیا۔ یونہی سوچئے کہ آپ اپنی سوچ مانگ رہے ہیں اور وہ آپ کی مصلحت دے رہے ہیں، آج آپ کا مانگا ہوا مطالبہ مل جائے، اور کل آپ اسے بھول بیٹھیں، کون ضمانت لے سکتا ہے، نہیں دیتے جو کچھ آپ مانگ رہے ہیں تاکہ کل آپ مزید مانگیں، روئیں، گڑگڑائیں اور آنسو بہائیں۔ دیدیتے تو آپ یہ نعمتیں کہاں سے لاتے، ہاں دیا اور بہت کچھ دیا۔ اپنی یاد دی، اپنے سے دعا کرنا دیا، رونا دیا، آنسو دیا، اور نہ جانے کیا کیا دیا؟ شکر کیجئے، بہت کچھ اسی دنیا میں دیا، اور یہ چیزیں دی ہیں جو خود مزدوری اور اُجرت بھی ہیں اور خود عمل اور کوشش بھی، کہ پھر ان پر دوبارہ سہ بارہ اور تسلسل کے ساتھ ملنے اور ملتے رہنے کا سلسلہ شروع ہوجاتا۔ (حدیث دوستاں)

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ایمان سے نوازا ہے، یہ ایمان بھی عجیب چیز ہے، کوئی بات کتنی ہی مشکل کیوں نہ ہو، ایمان اسے آسان کردیتا ہے، کیونکہ یہ ایمان ہر آڑے وقت میں بندے کو خدا کے دروازے پر کھڑا کردیتا ہے، اور بندہ وہاں سے نئی قوت حاصل کرلیتا ہے۔ (حدیث دوستاں)

مولانا اعجاز احمد اعظمی کا نثری بیانیہ

مفتی ابرار احمد اجراوی مدھوبنی

مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ پابند شریعت عالم دین تھے، ماضی کی روایتوں کے امین تھے، بزرگی، تدین اور تقوی وطہارت کے اعلی ترین مقام پر فائز تھے، کام یاب مدرس تھے، نرم گو مقرر تھے، رشد و ہدایت کا پیکر تھے، اخلاق و تواضع کی متحرک تصویر تھے، علم و فن کا سنگم تھے، تعلیم و تربیت کا جہان ان کا محور پرواز تھا، مگر ان سب کے علاوہ بھی وہ بہت کچھ تھے، میری نظر میں تو وہ ایک مؤرخ، ایک سوانح نگار، ایک بہترین انشا پرداز اور ایک سحر طراز ادیب تھے۔ وہ حالات حاضرہ اور گرد و پیش پر گہری نظر رکھنے والے صحافی بھی تھے۔ چھوٹی بڑی دو درجن سے زائد کتابیں ان کے وسعت مطالعہ اور ان کی ادبی اور تخلیقی صلاحیت کا بین ثبوت ہیں۔ انھوں نے اپنی دلچسپ خودنوشت لکھی، عبرت انگیز سفرنامے لکھے، نصیحت آموز خطوط لکھے، تلاش و تحقیق کی وادی میں سر کھپایا، دوسروں کے سوانحی نقوش کو قلم و قرطاس کے حوالے کیا، کتابوں پر تنقید و تبصرہ کیا، یہ صرف روکھی پھیکی، خشک، سپاٹ اور بے مزہ تحریریں نہیں، بلکہ ان میں ادب و انشا کا جاہ و جلال موج زن ہے۔ ان کی تحریروں کو پڑھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ کسی گوشہ نشیں اور دنیا و مافیہا سے بے نیاز عالم دین کی تحریر ہے، بلکہ ان کے الفاظ، تعبیرات، تشبیہات، لفظیات اور جملوں کو پڑھ کر بے ساختہ یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ کسی منجھے ہوئے ادیب و انشا پرداز اور تجربہ کار تخلیق کار کے قلم سے نکلنے والے لعل و جواہر ہیں۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں سادگی، سلاست اور سہولت کا دامن پکڑے رکھا ہے کہ یہی وہ فطری انداز تحریر ہے جس سے تحریروں کو زندگی، درخشندگی اور تابندگی ملتی ہے، مگر ان سادہ تحریروں پر ہزاروں لاکھوں انشائے لطیف اور پر تکلف تحریروں کا انبوہ قربان کیا جا سکتا ہے۔

مجھے نہیں معلوم اور نہ میں نے یہ تحقیق کرنا ضروری خیال کیا کہ مولانا مرحوم نے آپ بیتی، سوانح، سفرنامے، خطوط اور تدوین وتحقیق وغیرہ کی سکہ بند اصطلاحی تعریفیں پڑھی تھیں، اس کے بنیادی ارکان کا مطالعہ کیا تھا کہ نہیں؟ مگر یہ دیکھ کر اور پڑھ کر یک گونہ حیرانی ہوگی کہ وہ ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت جیسی نام نہاد ادبی تحریکات سے گو ایک اعتبار سے بیزاری کی حد تک ناواقف رہے ہوں، مگر وہ ادبی تحریروں کے لوازم اور اس کے عناصر سے ناواقف نہ تھے۔ اردو کے محاوروں، مقولوں، ضرب الامثال اور روزمرہ پر ان کی نظر بڑی گہری تھی۔ کسی ازم اور تحریک سے متأثر ہوکر اور کسی ادیب سے شہ پا کر، سکہ بند تحریر لکھنا کمال نہیں، ایسی تحریر لکھنا کمال ہے جو ہر قسم کی تحریک کے اثر وتأثر اور زمان ومکان کی قیود وحدود سے بالاتر ہو۔ مولانا نے وہی کچھ لکھا ہے جس کا نہ صرف شرعی جواز تھا، بلکہ زبان وادب کی شرعی میزان پر بھی وہ کھری اترتی ہیں۔ کوئی ادیب وناقد چاہے تو مروجہ ادبی پیمانے پر ان کی تحریروں کو ناپ سکتا ہے، تنقید وتبصرے کی کڑی کسوٹی پر انھیں پرکھ سکتا ہے، نقادان ادب نے مختلف ادبی اصناف کی جو تعریف کی ہیں اور اس کے لیے جو لوازم وخصائص شمار کرائے ہیں، ان سے ان کی تحریریں معمور ہیں۔

وہ آج کل کے نام کے ادیب وانشا پرداز نہ تھے، وہ عصر حاضر کے ان ادیبوں، تخلیق کاروں، شاعروں اور انشا پردازوں سے بلند تھے، بہت زیادہ بلند۔ ان کا کوئی مخصوص اسلوب نگارش تو نہیں تھا، نہ انھوں نے کبھی اس کا دعوی کیا اور نہ ہی اس کی کوشش میں اپنی توانائی ضائع کی، وہی قدما، اکابر واسلاف اور پیش رووں کا اسلوب اور طرز نگارش، مگر انھوں نے جس موضوع پر جو کچھ بھی لکھا ہے وہ ادبیت اور تخلیقیت کی چاشنی سے مملو ہیں۔ وہ فکر اور علمیت کا آمیزہ ہیں۔ وہ ”از دل خیزد بر دل ریزد“ کا مصداق ہیں۔ ان میں سادگی ہے، مگر بلا کی پرکاری ہے۔ وہ اپنی اثر آفرینی اور معنی خیزی میں بے مثال ہیں۔ موضوع کتنا ہی مشکل اور سنگلاخ کیوں نہ ہو، وہ ان کے ہاتھوں میں کمہار کی مٹی کی طرح نرم بن جاتا ہے، وہ ہر بات کو کہنے کا ہنر جانتے ہیں اور وہی کچھ کہتے ہیں جو ان کے مخاطب کے علمی حدود پر منطبق ہوتا ہو۔ انھوں نے ایران توران کی نہیں ہانکی، مغرب کے مے خانوں کی طرف نہیں جھانکا، بلکہ اپنے مشاہدات وواردات کو لفظ وبیان کی حرمت برقرار رکھتے ہوئے سپرد قرطاس کردیا ہے۔ وہ شاعر نہیں تھے، نہ انھوں نے اس صنف میں دلچسپی لی، مگر ان کی

نثر میں جو شعریت، رمزیت اور سریت پنہاں ہے وہ قاری کو اپنا اسیر و گرویدہ کر لیتی ہے۔ ان کا اسلوب سادہ ہے، مگر اس میں شیرینی ہے، حلاوت ہے، پرکاری ہے، طنز کی کاٹ ہے، ہجو ملیح کا اثر ہے، ان کی نثر ترسیلی نثر ہے، انھوں نے وہی نثر لکھی ہے، جس کو لکھنا شعر کے مقابلے میں زیادہ مشکل امر ہے۔ آنند نارائن ملا نے ایسی نثر کے بارے میں ہی شاید یہ لکھا ہے:

> ''شاعری میں تو روایات کی بیساکھی مل جاتی ہے، آہنگ کے سہارے کام آتے ہیں، لیکن نثر لکھنے والوں کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا پڑتا ہے اور ساری مسافت اپنے ہی بل بوتے پر طے کرنا پڑتی ہے۔ نثر نگاری (سطحی افسانہ نویسی اور انشائے لطیف کی اور بات ہے) اچھی خاصی علمی واقفیت چاہتی ہے۔'' (کچھ نثر میں بھی: ص ۱۱۔ مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۵ء)

تو مولانا علیہ الرحمہ نے بھی ادب و انشا اور تحریر و تخلیق کی دنیا میں کسی ادیب و انشا پرداز اور ناول نگار و افسانہ نویس کا سہارا نہیں لیا، ساری منزل اور ساری مسافت خود طے کی ہے۔ راہ بھی خود بنائی اور راہ رو بھی خود رہے۔ حالاں کہ انھوں نے تعمیر و اصلاح پر مبنی تحریروں اور افادی ادب کے ایک بڑے حصے کا مطالعہ کیا۔ تعمیری قسم کے ناول اور رائج الوقت ادبی مواد کا مطالعہ کیا، وہ اردو کے ہی نہیں، عربی اور فارسی کے بھی ماہر و نکتہ شناس تھے، مجمع البحرین نہیں، مجمع الابحار تھے۔ انھوں نے عربی کے ممتاز ادیب طٰہٰ حسین کی البیلی تحریریں بھی پڑھیں اور اردو کے ممتاز نثر نگار اور رومانیت کے پیرو کار نیاز فتح پوری کی جادو بیانی کا بھی خوب لطف اٹھایا، صادق حسین سردھنوی کے ناول بھی نظریں چرا کر اور چوری چھپے پڑھے۔ ان کے پاس الفاظ اور تعبیرات کا اتنا بڑا ذخیرہ تھا اور حالات و واقعات کا اتنا بڑا سرمایہ تھا کہ وہ بہترین ناول، کام یاب تمثیلی ڈرامے اور معیاری افسانے لکھ سکتے تھے، مگر ایک تو یہ کہ انھیں لکھنے کے عمل سے بیر کا معاملہ تھا، لکھنے لکھانے کے پیچھے رہا، نام و نمود اور نام وری کا محرک نہ تھا، اور پھر یہ کہ وہ ایک الگ دنیا کے باسی تھے، ایسی دنیا جہاں نام نہاد واقعات کو مرچ مسالا لگا کر بیان کرنے کے لیے جو دروغ گوئی والا حوصلہ درکار تھا، اس سے وہ یکسر محروم تھے۔ اگر واقعات میں رومانیت اور نسوانیت و تانیثیت کی ملمع کاری نہ ہو تو اس کو نہ جانے کیوں ناول اور افسانے کے زمرہ سے باہر رکھا جاتا ہے؟ ہمیں ادیبوں، ناقدوں اور تخلیق کاروں کی ان بے جا قیود پر از سرِ نو غور کرنا چاہیے۔ منٹو حقیقت شناس نہیں، بلکہ بڑا فحش نگار تھا، اس لیے بڑا افسانہ نگار

کہلایا۔ پریم چند اوران کے ہم عصر دوسرے ادیبوں نے حقائق کے انکشاف میں کچھ رازداری اور پردہ پوشی سے کام لیا تو انھیں ادب کے تخت صدارت سے اتار دیا گیا۔ منٹو ادب کے عرش معلیٰ پر بٹھائے گئے اوران کے استاد مولانا تاجور نجیب آبادی منہ دیکھتے رہ گئے۔ حالاں کہ وہ ناقد و ادیب ہی نہیں، نظم معری وغیرہ کئی تاریخ ساز تحریکی اقدامات کے موجد و بانی تھے۔ جیسا کہ ذکر آیا کہ مولانا اعظمی نے ناول بھی پڑھے اور ادبی رسائل بھی، مگر اس میں سے انھوں نے کیا لیا؟ اور کیا اخذ کیا؟ اسلوب و ہیئت پر نظر رکھی یا مواد اور واقعات پر؟ مجھے اس کی تفصیل معلوم نہیں، اتنا معلوم ہے کہ انھوں نے علامہ شبلی اور سید سلیمان ندوی کی مشترکہ تصنیف ’’سیرۃ النبی‘‘ سے ادب کے اسرار و رموز سیکھے، اسی قسم کی تعمیری تحریروں سے انشا اور ادب کے ابعاد و جہات سے شناسائی حاصل کی۔ ان کے گھر پر اکا دکا ادبی رسالے آتے تھے کہ والد محترم خود بھی شاعر تھے اور بالیدہ ادبی ذوق بھی رکھتے تھے، مگر مولانا کو شعر سے خاص مناسبت نہ تھی، انھیں نثر میں جو مزہ اور جو لطف ملتا تھا وہ انھیں شعر میں میسر نہ تھا۔ وہ مسدس حالی اور شکوہ جواب شکوہ کے اشعار سے بھی بدکتے تھے اور دوران نثر آنے والے اشعار کو بھی گول کر جاتے تھے۔ وہ خود لکھتے ہیں:

> ’’مجھے اشعار سے مناسبت تھی نہ دلچسپی! پہلے سمجھ میں بھی کم ہی آتے تھے۔ نثری مضامین پڑھتے وقت درمیان میں کوئی شعر آجاتا تو اسے میں چھوڑ دیتا تھا۔‘‘ (حکایت ہستی: ص ۲۴۔ فرید بک ڈپو نئی دہلی، ۲۰۱۱ء)

وہ طبعاً مدرس تھے، مطالعۂ کتب ان کا شوق تھا، مگر لکھنے لکھانے کے عمل سے انھیں زیادہ مناسبت نہ تھی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ’’سچ پوچھیے تو تحریر و انشاء سے مجھے مناسبت کم ہے، یا شاید نہیں ہے، نہ لکھوں تو لکھنے کا کوئی تقاضا نہیں ہوتا۔ لکھتا ہوں تو طبیعت میں روانی نہیں ہوتی، بس وہ جذبۂ اطاعت ہے جس کے دباؤ میں کچھ لکھ لیتا ہوں، کوئی وقتی شدید تقاضا ہوا، یا دوستوں اور بزرگوں میں سے کسی کا حکم ہوا، یا کسی اپنے طالب علم کی فرمائش ہوئی، تو قلم کو جنبش ہوتی ہے۔‘‘ (حدیث درد دل: ص ۱۳ مکتبہ ضیاء الکتب اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء)

لکھنے لکھانے کے عمل سے عدم مناسبت کے باوجود، انھوں نے ہزاروں صفحات لکھے، مختلف

اور متنوع موضوعات کو مس کیا اور ہر موضوع کے مالہ وماعلیہ کے حساب سے انھوں نے اپنا ایک طرز تحریر ایجاد کیا۔ وہ صاحب اسلوب نثر نگار نہیں تھے، مگر ان کے اسلوب میں وہ ساری خصوصیات اور وہ سارے امتیازات جلوہ فگن ہیں، جنھیں اسلوب کے دائرے میں رکھا اور شمار کیا جاتا ہے۔ اردو کے ناقدین نے الفاظ ومعانی کے اعتبار سے اسلوب کو کئی خانوں میں منقسم کیا ہے، اور تقسیم در تقسیم کا یہ دائرہ اتنا لانبا ہے کہ ان سے بحث دماغ پیچی کے علاوہ کچھ نہیں۔ مولانا کے اسلوب کو کسی کتابی تعریف کی عینک سے دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ان کا اسلوب اور موضوع کلام کچھ بھی ہو، ترسیل وابلاغ کی اہمیت کو نظروں سے روپوش نہیں ہونے دیتے تھے۔ وہ موقع اور موضوع کے اعتبار سے کبھی سادہ اور کبھی رنگین وپرشکوہ اسلوب کا سہارا لیتے تھے۔ موضوع کے سروکاران کے انداز تحریر اور واسلوب نگارش کی تشکیل میں اہم رول ادا کرتے تھے۔ وہ ہر قسم کے موضوع کو ایک ہی اسلوب کے ڈنڈے سے ہانکنے کے عادی نہ تھے۔ خودنوشت کشف ذات کا نام ہے، تو وہ علم وادب اور دروں بینی کا آمیزہ ہے، سفرنامہ میں منظر نگاری کی حلاوت وچاشنی ہے۔ سوانح میں خاکہ نگاری اور چہرہ شناسی کے اسرار سے بغل گیر ہیں، تو مکاتیب وخطوط ''خوب جمے گی جب مل بیٹھیں گے دیوانے دو'' والی اپنی دنیا میں پرواز کرتے ہیں اور مکتوب نگار کے دل ودماغ کی دنیا میں سیر کرتے نظر آتے ہیں۔ ان تحریروں میں کہیں شگفتگی، تو کہیں محاوارتی انداز کا پرتو ملتا ہے۔ کہیں ہجو ملیح تو کہیں طنز کی کاٹ۔

مولانا عربی اور فارسی دونوں زبانوں کے ماہر تھے، مگر انھوں نے معرب اور مفرس زبان نہیں لکھی، بلکہ وہ زبان لکھی جس کو سبک ہندی کے زمرے میں رکھا جاتا ہے۔ خالص ہندی اور ہندستانی الفاظ۔ عربی فارسی دانی کا رعب نہیں جمایا۔ وہ تینوں زبانوں پر عبور رکھتے تھے اور تینوں زبانوں کا جانکار ہی اچھی اور تمام تر املائی اغلاط سے پاک اردو لکھنے پر قادر ہوسکتا ہے۔ اردو تنقید کے بانی مبانی مولانا الطاف حسین حالی نے بھی یہی لکھا ہے کہ اچھی اردو لکھنے کے لیے عربی اور فارسی سے بھی واقفیت مطلوب ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''اردو پر قدرت حاصل کرنے لیے صرف دلی اور لکھنؤ کی زبان کا تتبع ہی کافی نہیں، بلکہ یہ بھی ضرور ہے کہ عربی اور فارسی میں کم سے کم متوسط درجے کی لیاقت، اور نیز ہندی بھاشا میں

فی الجملہ دست گاہ بہم پہنچائی جائے۔ اردو زبان کی بنیاد، جیسا کہ معلوم ہے، ہندی بھاشا پر رکھی گئی ہے، اس کے تمام افعال اور تمام حروف اور غالب حصہ اسما کا، ہندی سے ماخود ہے۔ اور اردو شاعری کی بنا، فارسی شاعری پر، جو عربی شاعری سے مستفاد ہے، قائم ہوئی ہے۔ نیز اردو زبان میں بہت بڑا حصہ اسما کا، عربی اور فارسی سے ماخوذ ہے۔ پس اردو زبان کا شاعر جو ہندی بھاشا کو مطلق نہیں جانتا اور محض عربی و فارسی کے تان سے گاڑی چلاتا ہے، وہ گویا اپنی گاڑی بغیر پہیوں کے منزل مقصود تک پہنچانی چاہتا ہے۔ اور جو عربی و فارسی سے نابلد ہے اور صرف ہندی بھاشا یا محض مادری زبان کے بھروسے پر اس بوجھ کا متحمل ہوتا ہے، وہ ایک ایسی گاڑی ٹھیلتا ہے جس میں بیل نہیں جوتے گئے۔‘‘ (مقدمۂ شعر و شاعری: ص ۱۱۸۔ مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۲۰۰۳ء)

انھیں مشہور فارسی شاعر حافظ کے اشعار سے بڑی گہری مناسبت تھی، مگر انھوں نے فارسی اشعار سے استدلال نہیں کیا، بلکہ جہاں ضرورت پڑی، اساتذہ اردو کے کلام اور ان کے اشعار کو مطمح نظر بنایا۔ غالب اور اقبال اور اکبر الہ آبادی کے اشعار ان کی نوک زبان پر رہتے تھے اور جب بھی موقع و محل ہوتا، وہ ان کے دہان قلم سے ابل پڑتے تھے۔ کوئی شعر یا کوئی مصرع بے محل اور بے وقت کی راگنی معلوم نہیں ہوتا۔ انھوں نے عموما عام فہم اردو اشعار سے اپنی نثر کو رنگ و آہنگ عطا کیا ہے۔ شاید اس میں بھی ان کی سہولت پسند اور سادہ نگار طبیعت کا دخل ہو، ورنہ وہ عربی اور فارسی کے اشعار کی گل کاری بھی کر سکتے تھے، مگر ان کا اصل مقصد جو ابلاغ و ترسیل تھا، اس میں یہ خلل انداز ہوتا۔ سوانح نگاری اور خاکہ نویسی کرتے ہوئے، مختلف مضامین میں اس قسم کے عام فہم اشعار لکھے ہیں:

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے
وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل
نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھی کی بے قراری کو قرار آہی گیا

اور جب خطوط لکھتے ہیں تو مخاطب کے حسب حال اس قسم کے عام فہم اور حالات کی ترجمانی کرنے والے اشعار لکھتے ہیں، دیکھیے بے ترتیب طور پر مختلف خطوط میں وارد ہونے والے یہ اشعار اور مصرعے:

دل گیا رونق حیات گئی
غم گیا ساری کائنات گئی
وہ مزا دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یا رب
مرے دونوں پہلوؤں میں دل بے قرار ہوتا
ہر جگہ جوش محبت کا نیا عالم ہوا
آنکھ میں آنسو ، جگر میں داغ ، دل میں غم ہوا
سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے

مولانا چھوٹے چھوٹے جملے لکھنے کے عادی تھے۔ جملوں کے آغاز و اختتام اور مبتدا اور خبر کے درمیان وہ زیادہ فاصلہ نہیں رکھتے تھے۔ وہ اسم موصول اور صلہ کا زیادہ استعمال کرنا گوارا نہیں کرتے تھے کہ اس قسم کے جملوں میں طوالت خود بخود در آتی ہے۔ جملوں کی تان بھی وہ مترنم الفاظ پر توڑتے تھے۔ ان چھوٹے جملوں کی اثر انگیزی پر غور کیجیے۔ یہ خط انھوں نے اپنے ایک معتقد کو لکھا ہے:

> ’’یہ ایسا جذب ہے جس پر خدا کو بھی پیار آتا ہوگا، بچوں جیسی ضد، عورتوں جیسی ہٹ، بوڑھوں جیسی تکرار، آخر خدا کو بھی اپنے بندوں پر پیار آتا ہی ہے، جانتے ہیں کہ خواہ کتنا ہی روٹھے، کتنا ہی بگڑے، کچھ ہی کہے، کتنا ہی بھاگے، ان کا در چھوڑ کر، ان کی چوکھٹ سے ہٹ کر اور کہیں جانے کا سوال ہی نہیں۔ وہیں رہنا ہے، وہیں مرنا ہے اور وہیں سر دیے پڑے رہنا ہے، بھلا پھر اسی جگہ شور مچائے، چیخے، چلائے تو کیا مضائقہ ہے، آپ روتے رہیے، وہ ہنستے رہیں۔‘‘
> (حدیث دوستاں: ص ۸۵)

مرزا غالب کے خطوط کی یہ خصوصیت ادبی حلقوں میں دہرائی جاتی ہے کہ انھوں نے اپنے مراسلے کو مکالمہ بنادیا ہے۔ مولانا نے بھی اپنے خطوط کے ذریعے مراسلہ نگاری کو مکالمہ نگاری بنانے کا کام کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے دو آدمی یعنی مکتوب نگار اور مکتوب الیہ باہم محو کلام ہوں۔ کیا انھوں نے مرزا غالب کے خطوط کا مطالعہ کیا تھا؟ اس کے اسلوب کا تتبع کیا تھا؟ میری نظر سے یہ انکشاف نہیں گزرا، مگر غالب کے خطوط کی خصوصیات ان کے مراسلوں میں مجتمع ہیں۔ لگتا ہے، انھیں سادہ نویسی سے خاص الفت تھی، اس لیے انھوں نے مولانا آزاد کے علمیت و ادبیت، فکر و تخیل اور انشا سے مملو اسلوب سے اتنی وفاداری کا ثبوت نہیں دیا، جتنا کہ ایک عالم دین کے لیے دوسرے مولانا صفت کے حامل ادیب کی تحریر سے ہونا چاہیے تھا۔ یوں بھی مولانا آزاد کا اسلوب مدرسی حلقوں میں زیادہ مقبول و محبوب رہا ہے۔ آج بھی مدرسوں میں ان کے طرز نگارش اور ان کے اسلوب و انداز اور ان کی تعبیرات کو بڑا اونچا مقام حاصل ہے۔ مدرسوں کے طلبہ ان کی تحریروں کے سکر میں صبح و شام کھوئے رہتے ہیں اور ان کی تعبیروں اور تشبیہوں کو اپنی تحریروں میں برتتے رہتے ہیں۔ یہ کہنا کہ انھیں مولانا آزاد کے علمیت سے مملو اسلوب سے زیادہ لگاؤ نہ تھا، صحیح نہیں، بلکہ وہ اصل میں مخاطب سے باہمی گفتگو کے انداز میں ہم کلام ہونا چاہتے تھے۔ اور یہی ان کا خاص اسلوب قرار پایا۔ دوسرے مکتوب نگار عموماً ماضی کے واقعات سے خطوط میں اجتناب کرتے ہیں، اپنی آپ بیتی اور گرد و پیش کے احوال پر ہی نظریں مرکوز رکھتے ہیں، مگر مولانا اعظمی نے اپنے مکاتیب میں گل افشانی گفتار کا مظاہرہ کیا ہے اور اکابر و اسلاف کے واقعات کے علاوہ دقیق علمی نکتوں کو بھی موضوع تحریر بنایا ہے۔ مولانا آزاد نے تو خطوط کے پردے میں اپنی انشا پردازی کا نمونہ دکھلایا ہے، جب کہ مولانا اعظمی محض اظہار ما فی الضمیر کو ہی مطلوب و مقصد نہیں گردانتے تھے، بلکہ وہ معاشرے میں لگی فتنہ و فساد اور بدعات و خرافات کی آگ کو اپنے قلم کی روشنائی سے بجھانا چاہتے تھے۔ اس لیے نہ کوئی تکلف کیا، نہ عبارت آرائی کی، آورد کو خیر باد کہا، آمد سے کام لیا۔ ٹھیک سر سید کی طرح جنھوں نے تمثیل و تشبیہ اور استعارہ کا سہارا لیے بغیر، راست طور پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، مگر ان میں جو اثر آفرینی، بے ساختگی اور برجستگی ہے، تفہیم و تعبیر کا جو خزانہ ہے وہ اردو کی جدید نثر نگاری کی تاریخ میں ایک اہم اضافہ کہلاتا ہے۔

جس طرح غالب نے طویل القاب وآداب سے پہلوتہی کی ہے، مولانا نے بھی اپنے خطوط میں طویل القاب وآداب اور لمبے چوڑے رسمی الفاظ سے اجتناب کیا ہے کہ یہ تکلف وتصنع پر منتج ہوتے ہیں۔ بس ‘‘عزیز’’ اور ‘‘محترم’’ جیسے القاب کے بعد مقصد تحریر کی طرف اپنے رخش قلم کو موڑ دیا ہے۔ ان کے خطوط میں عبارت آرائی کو بالکل بھی دخل نہیں اور نہ ہی اپنے شاگردوں اور نیاز مندوں کے سامنے علمیت کا طومار باندھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ سارے خطوط برجستہ اور قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں۔ مفتی ابوالقاسم نعمانی نے ‘‘حدیث دوستاں’’ کی تقریظ لکھتے ہوئے بڑی معرکے کی بات کہی ہے:

> ‘‘خط پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مخاطب سراپا گوش بن کر مولانا کے سامنے بیٹھا ہے اور مولانا اپنے مخصوص انداز میں اس سے گفتگو فرما رہے ہیں، کبھی مسکرا رہے ہیں، کبھی ڈانٹ رہے ہیں اور کبھی محبت کے ساتھ دھول جما رہے ہیں۔ اور خط مکمل ہونے کے بعد چشم تصور یہ منظر دکھلاتی ہے کہ سائل مطمئن اور مسرور ہو کر مولانا سے رخصتی مصافحہ کر رہا ہے۔’’ (حدیث دوستاں: ص ۱۹۔ مکتبہ ضیاء الکتب، اعظم گڑھ یوپی، ۲۰۱۰ء)

دیکھیے ایک دو مثال جس سے اندازہ ہوگا کہ انھوں نے یہ جملے کتنے برجستہ اور مکالمت کے انداز میں لکھے ہیں اور کس طرح بغیر کسی لاگ لپیٹ کے خط کی آخری سطریں لکھی ہیں:

> ‘‘بس صاحب! کاغذ ختم ہوگیا، پھر کبھی باتیں ہوں گی۔ آپ کی آنکھیں دکھ جائیں گی۔ میرے لیے بھی ایک آدھ آنسو گرا دیجیے۔ والسلام’’ (ایضا: ص ۸۹)

> ‘‘بس بھائی! تم کو نصیحت کرنا میرے لیے داخل گستاخی ہے، لیکن کیا کروں، طبیعت نہیں مانتی، امید ہے کہ مجھے معاف کروگے۔ مولانا قمرالدین صاحب اگر ہوں تو ان سے ضرور سلام کہہ دو۔’’ (حدیث دوستاں: ص ۱۶۳)

اور یہ دیکھیے کہ کتنی سادگی کے ساتھ اپنی بات اپنے مکتوب الیہ سے کہہ ڈالی ہے۔ جملے نہایت مختصر، مگر اثر انگیزی میں بے نظیر، چند جملوں میں اپنے سارے احوال اور مستقبل کے پروگرام سے واقف کرا دیا ہے اور ایک ایک جزئیات کو سمیٹ لیا ہے، وہی غالب والا انداز:

> ‘‘موقع ملا، اور یاد رہا تو خط لکھوں گا۔ آج رات میں لوٹوں گا، امتحان آج سے شروع

ہے۔ تین دن مدرسے میں رہنے کا ارادہ ہے، دیکھو پورا ہوتا ہے یا نہیں؟ جمعہ کو گورکھ پور جانا ہے، پھر سوموار کو اپنی پرانی جگہ دیوگھر دمکا جانا ہے۔‘‘ (حدیث دوستاں: ص۴۷۹)

انھوں نے تشبیہ و تمثیل کا زیادہ سہارا نہیں لیا، دور دراز کی تشبیہات کو منہ تو نہیں لگایا، مگر انھوں نے بے ساختہ طور پر بھی جو تحریریں لکھی ہیں، وہ ادبیت، تخلیقیت اور فصاحت و سلاست کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ان کی نثر کے سامنے شعر ہیچ ہے۔ کہیں کہیں تو ترنم پیدا کرنے کے لیے ایک ہی حرف پر ختم ہونے والے الفاظ اس طرح استعمال کیے ہیں کہ ان پر شعر کا گمان گزرتا ہے۔ مولانا شاہ محمد احمد صاحب پرتاپ گڑھی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’آہ! کہ زمانے کا نور، عہد حاضر کی برکت، ہادئ راہ شریعت، امام جادۂ طریقت، رہبر سالکان، رہنمائے گمرہان، نسخۂ آدمیت، پیکر لطف و محبت، ابر گہربار رحمت، قدوۂ اصحاب شریعت، کاشف اسرار حقیقت، جانشین فضل رحماں، صاحب روح البیاں، عارف باللہ الصمد شاہ الشاہ مولانا محمد احمد قدس سرہ الاحد، نے..... عالم آخرت کی راہ لی۔‘‘ (کھوئے ہوؤں کی جستجو: ص۱۴۹)

ان کے خطوط میں ایک ہی وزن والے الفاظ کا کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ دیکھیے:

> ’’آخر دنیا نام ہی ہے رنج و راحت، خوشی و غم، مصیبت و نعمت، ذلت و عزت، فقر و غنا، ضعف و قوت اور حیات و ممات کا، اس سے کہاں مفر؟ ہاں انتظار کیجئے اس وقت اور اس جگہ کا جہاں راحت ہوگی، رنج نہیں، خوشی ہوگی غم نہیں، نعمت ہوگی مصیبت نہیں، عزت ہوگی ذلت نہیں، غنا ہوگا فقر نہیں، قوت ہوگی ضعف نہیں، حیات ہوگی ممات نہیں۔‘‘ (حدیث دوستاں: ص۸۶)

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کا سراپا کھینچتے ہوئے ابتدا میں جو جملے لکھے ہیں، یہاں بھی یکساں حروف کی تکرار سے غنائیت و موسیقیت نمو پذیر ہوتی ہے:

> ’’تاریخ ان (اسلاف و اکابر) کے حق میں گونگی ہو رہی تھی، قاضی جی نے اسے زبان عطا کی، ان میں صحابہ بھی ہیں، تابعین بھی ہیں، تبع تابعین بھی ہیں، امراء و سلاطین بھی ہیں، مشائخ و صالحین بھی ہیں، غزاۃ و مجاہدین بھی ہیں، فقہاء و محدثین بھی ہیں۔‘‘ (ایضا: ص۳۱۴)

مولانا اعظمی نے لفظوں کی تکرار سے بھی غنائیت اور ترنم کی فضا باندھی ہے۔ اس سے بات میں زور اور تسلسل بھی پیدا ہوتا ہے۔ دیکھیے:

> ”اب نہ گرد و پیش کی خبر ہے، نہ ماحول پر نظر ہے، عاشق جدھر گیا لبیک پکار آیا، دوستوں سے ملاقات ہوئی تو لبیک سے استقبال، مجمع سامنے پڑا تو لبیک کی صدا، نیچے آیا تو لبیک، اوپر چڑھا تو لبیک، سوار ہوا تو لبیک، سواری سے اترا تو لبیک۔“ (بطواف کعبہ رفتم: ص ۳۲)

مولانا سراپا نگاری میں اپنی مثال نہیں رکھتے۔ وہ ایک ایک جزئیات کو سمیٹتے اور اس کو موئے قلم سے ادا کرتے ہیں۔ اور اتنی روانی کے ساتھ کہ کہیں تکلف اور آورد کا احساس نہیں ہوتا۔ اپنے مربی و استاد مولانا وحید الزماں کیرانوی کا سراپا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”مولانا کے چلنے کا ایک خاص انداز تھا۔ سارا بدن سمٹا ہوا، پرسکون ہوتا لیکن رفتار ہوا جیسی ہوتی، دائیں بائیں کوئی جنبش نہ ہوتی حتی کہ ہاتھوں میں بھی حرکت نہ ہوتی، تیر کی طرح چلتے۔“ (کھوئے ہوؤں کی جستجو، ص: ۲۳۹)

مولانا محمد یحییٰ صاحب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”نکلتا ہوا قد، تیر کی طرح سیدھا، لمبوترا چہرہ، اس پر قدرے اونچی ناک، داڑھی سفید اور ہلکی، رنگ گہرا سانولا، آنکھیں نیم باز، ہونٹ پتلے، لیکن قدرے بڑے جن پر پان کی سرخی نمایاں، دانت موجود تھے، مگر سب پانوں کے رنگ سے رنگین، بدن پر چھینٹ کی شیروانی اور اسی کی ٹوپی، گردن پر چھوٹی سی چادر پڑی ہوئی جس کے کنارے دونوں طرف سینے پر لٹکتے ہوئے، پاؤں میں خالطہ پاجامہ جس کی مہری بہت زیادہ چوڑی نہ ہوتی، خوبصورت جوتا، چلنے میں قدم بالکل برابر رکھتے۔“ (کھوئے ہوؤں کی جستجو: ص ۳۷)

مولانا سادہ نگاری کو ترجیح دیتے تھے۔ وہ لفظوں کے طوطا مینا نہیں بناتے تھے۔ تشبیہ اور تمثیل کے لیے وہ ستر کنویں نہیں جھانکتے تھے۔ مگر پھر بھی انھوں نے جو تشبیہیں استعمال کی ہیں، ان میں جدت بھی ہے اور ندرت بھی اور وہ اظہار مدعا اور تعبیر مطلب میں بھی حارج نہیں ہوتیں۔ نہ اتنی ثقیل اور نامانوس ہوتی ہیں کہ اس کے لیے لغت کی طرف رجوع کرنا پڑے۔ تشبیہیں پرانی، مگر ان کے برتنے کا انداز الگ اور سب سے جدا۔ مولانا وحید الزماں کیرانوی کے جوش خطابت کو کس

طرح بیان کیا ہے:

”الفاظ کا زیر و بم، آواز کی گھن گرج، خطابت کا ایسا طوفانی جوش میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، ایسی معلوم ہو رہا تھا کہ پہاڑ کی بلندی پر سے پانی کا ریلا نہایت شدت کے ساتھ اتر رہا ہو اور اپنے ساتھ بڑی چٹانوں کو بہائے لئے جا رہا ہو۔“ (ایضا: ص۲۳۹)

غازی پور کے مولا بخش کا تعارف کراتے ہوئے یہ تشبیہ کتنی عمدہ ہے، جب وہ شاہ وصی اللہ صاحب کے ہاتھوں پر بیعت ہو کر واپس آ رہے ہوتے ہیں:

”دل دھل دھلا کر بے غبار ہو گیا۔ جیسے گرد آلود فضا میں موسلا دھار بارش ہوتی ہے، اور فضا بالکل صاف ہو جاتی ہے۔“ (ایضا: ص۳۱۰)

اور ایک خط میں اپنے ایک شاگرد کو فتنوں کی قیامت خیزی سے یوں آگاہ کرتے ہیں:

”آج کل فتنے آگ کی طرح ابلتے ہیں، فتنوں کی طرف جہاں کسی نے نگاہ اٹھائی، وہ گیا۔“ (حدیث دوستاں: ص۳۰۱)

مولانا اعظمی کو جذبات نگاری کا بھی بڑا ملکہ حاصل تھا۔ کردار و اشخاص کے داخلی جذبات اور اپنے من کی دنیا کو کاغذ کے سینے پر انڈیلنے اور اس سے اثر و تاثر کی فضا قائم کرنے میں ان کا ثانی نہ تھا۔ سفرنامہ حج میں جب کہ وہ حالت احرام میں ہوتے ہیں اور اندر عشق کی آگ لگتی اور پھیلتی جا رہی ہوتی ہے، اس وقت امڈنے والے جذبات و قلبی واردات کی کتنی عمدہ تصویر کھینچی ہے:

”میں نے عقل کی طرف اشکبار آنکھیں اٹھائیں، تو اس کا حال اور نزار تھا، اس کی زبان گنگ تھی، اس کے پاس بجز آنسوؤں کے کچھ نہ تھا، اس کی آنکھیں کھلی تھیں، مگر ٹکٹکی کہیں اور بندھی تھیں، نہ وہ سوال سن رہی تھی، نہ جواب کی تاب رکھتی تھی، دل کا جادو عقل پر چل چکا تھا، وہ حیران تھا تو یہ بے زبان تھی، وہ سمجھنے سے قاصر تھا، تو یہ حرکت سے بھی عاجز تھی، وہ درماندہ تھا، تو یہ بھی واماندہ تھی، میں نے سوال کیا تو لبیک پکار کر خاموش ہو گئی۔“ (بطواف کعبہ رفتم: ص۳۰ مکتبہ ضیاء الکتب، مئو یوپی، ۲۰۱۵، طبع سوم)

مولانا اعظمی منظر نگاری اور حالات کی تصویر کشی پر بھی ید طولی رکھتے تھے۔ جس موقع اور مکان کی منظر کشی کی ہے، اس کی تمام جزئیات اور ایک ایک چیز کا اس طرح احاطہ کیا ہے کہ قاری خود کو اسی

ماحول میں چلتا پھرتا، دیکھتا اور سنتا پاتا ہے۔ کبھی حیرانگی میں آنکھ کھلی رہ جاتی ہے تو کبھی انھی حالات کا لطف وتراوش محسوس کرتا ہے جو وہ سطریں لکھتے ہوئے مصنف کے قلب و دماغ پر حاوی رہی تھیں۔ سفر نامہ حج میں منظر نگاری پر مبنی یہ سطریں پڑھیے:

> ’’خانہ کعبہ ایک چوکور عمارت ہے، پورب کے دکھنی گوشہ میں حجر اسود نصب ہے، یہیں سے طواف شروع ہوتا ہے، اس کی طرف رخ کر کے کھڑے ہو جائیے، پھر بایاں ہاتھ خانۂ کعبہ کی سمت کر کے اتر جانب چلیے، جب پورب کے اتری کونہ پہنچیں گے تو داہنے ہاتھ کی جانب مقام ابراہیم ہے اور بائیں ہاتھ پر خانہ کعبہ کا رکن عراقی ہے۔‘‘ (بطواف کعبہ رفتم: ص ۴۹)

اور حج کے رکن اعظم میدان عرفات میں بپا ہونے والے محشر انسانی کا کتنا اچھوتا منظر کھینچا ہے، مصور برش سے تصویریں بناتا ہے، مولانا نے موئے قلم سے یہ تصویر بنائی ہے:

> ’’ہر طرف ہماہمی بپا ہے، کوئی نہا رہا ہے، کوئی وضو پر اکتفا کر رہا ہے، یہیں پروردگار نے بلایا ہے، ایک ریتیلا میدان! جس کی ریت سیاہ ہے، بے آب وگیاہ لمبا چوڑا میدان جیسے عرصۂ محشر! پہلے بے آب و گیاہ رہا ہوگا، اب تو لوگوں نے اتنے درخت نیم کے لگا دیے ہیں کہ باغ ہونے کا شبہ ہوتا ہے، درخت ابھی چھوٹے چھوٹے ہیں۔ معلوم ہوا کہ مٹی دوسرے ملکوں سے لائی جاتی ہے..... پانی بھی افراط سے دست یاب ہے۔ میں بار بار سوچتا تھا اور حیران ہوتا تھا کہ الٰہی! اس میدان میں کیا خاص بات ہے کہ آپ نے یہیں سب کو جمع ہونے کا حکم دیا ہے۔‘‘
> (ایضا: ص ۷۸)

ان سطروں سے معلوم ہو گیا کہ مولانا کی نثر ان کے انفرادی تجربوں اور ان کے مخصوص ذہنی رجحان کا ادبی اظہار ہے۔ ان کا کوئی مخصوص اسلوب تو نہیں، مگر ان کا مخصوص رنگ تحریر ضرور ہے۔ ان کا جولب ولہجہ اور اور مخصوص انداز فکر ہے، اس سے وہ بہت جلد شناخت کے دائرے میں جاتے ہیں۔ وہ تخیل اور ابہام سے زیادہ کام نہیں لیتے، بلکہ اپنی تحریروں میں شیرینی، حلاوت اور کیف و گھلاوٹ کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کی زبان شاعرانہ نہیں، بلکہ اس پر خطیبانہ اور عالمانہ رنگ غالب ہے۔ ان کی تحریریں خشک اور یبوست زدہ نہیں، بلکہ ان میں جمالیاتی عنصر کی بھی فراوانی ہے۔ مولانا کی تحریروں پر ان کے عہد اور ماحول کا اثر صاف نظر آتا ہے۔ اور یہی خصوصیت اسلوب کو

منفرد رنگ و آہنگ عطا کرتی ہے۔ گرچہ اصطلاحی معنوں میں ادیب کا انفرادی انداز بیان اور منفرد طرز اظہار مخصوص اسلوب کی تشکیل میں معاون ہوتا ہے، مگر دراصل مصنف کے اردگرد کے ماحول، اس کی تہذیب و معاشرت، اس کے ذہنی اور فکری رجحانات اور اس کا اثر اس کو انفرادیت عطا کرتا ہے۔ اگر ان شرائط کو مدنظر رکھا جائے تو مولانا اعظمی کی نثر کو منفرد اسلوب کی حامل تحریر کے خانے میں رکھنے میں مضائقہ نہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے بھی یہی لکھا ہے:

> ’’نثر لکھنے یا بولنے والا جس جگہ آنکھ کھولتا ہے جس ماحول میں اس کی نشو و نما ہوتی ہے جو تہذیبی اور معاشرتی اثرات اسے ورثے میں ملتے ہیں، جن حالات میں اس کی تعلیم و تربیت ہوتی ہے، جن لوگوں سے وہ متأثر ہوتا ہے، اس کی جو دلچسپیاں ہوتی ہیں، جو ذہنی رجحانات اس کے یہاں پیدا ہوتے ہیں، جن مصنفوں کا وہ مطالعہ کرتا ہے اور جو خیالات و نظریات اس کے یہاں تشکیل پاتے ہیں ان سب کے مجموعی اثرات سے اس کا مخصوص انداز و آہنگ اور لب و لہجہ وجود اختیار کرتا ہے اور اس سے اس کی وہ نثر پہچانی جاتی ہے جس کو وہ بولنے یا لکھنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔‘‘ (اردو کے نثری اسالیب: ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، ص:۲۶-۲۷، تخلیق کار پبلشرز نئی دہلی، ۱۹۹۹)

اسلوب کی تعریف اور تنقیدی اصطلاحوں سے قطع نظر مولانا اعظمی کی نثر کا ایک مخصوص رنگ و آہنگ ہے۔ اس میں حسن ہے، دل کشی ہے اور کشش ہے۔ نثر کے لیے سادگی، سلاست، اختصار و جامعیت، قطعیت، صراحت اور وضاحت کی جتنی شرطیں درکار ہیں، وہ بدرجۂ اتم ان کی تحریروں میں موجود ہیں۔ وہ کہیں سنجیدہ نظر آتے ہیں، تو کہیں شوخ، ان کی تحریروں میں کہیں شگفتگی اور شائستگی ہے تو کہیں آہستہ آہستہ قاری کے دماغ سے دل میں اترنے کا انداز۔ نہ روایت کے اسیر و پابند ہیں، نہ روایتوں کے باغی و منحرف۔ بس وہ اپنی تحریروں کو قاری کے دل میں اتار کر اس کا کتھارسس اور اس کا تزکیہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی نثر مخاطب کو متأثر کرتی اور اس کے دل کے تاروں کو چھیڑتی ہے۔ ان کے خطوط میں تو کہیں کہیں مولانا آزاد کا انشائی طرز بھی آ گیا ہے، جیسے ایک خط میں انھوں نے مرض کی جو پیکر تراشی کی ہے، وہ بڑا مؤثر اور دلچسپ ہے۔ اس میں ڈرامائیت ہے اور کرداروں کا باہمی مکالمہ بھی ہے۔ ان کی نثر میں نیا رنگ و آہنگ ہے، مگر اس میں تکلف اور تصنع

نہیں ہے، نہ سجع و قافیہ کا التزام کرتے ہیں، جو کچھ لکھا ہے بے تکلفی اور سادگی کے ساتھ لکھا ہے۔ ہر بات بالکل واضح اور صاف۔ جو تشبیہ، استعارہ، رمز و کنایہ اور تمثیل استعمال ہوئی ہے، اس کا منبع و ماخذ بے ساختگی اور آمد ہے۔ انھوں نے صنائع بدائع سے بہت اجتناب کیا۔ بس وہ نثر میں علمیت اور منطقیت سے عبارت کے استدلالی اسلوب کو مدنظر رکھتے ہیں۔ ان کی عبارتوں میں بے ترتیبی اور انتشار نہیں ہوتا، بلکہ ان میں تسلسل اور ہم آہنگی ہوتی ہے۔ ان کی زبان انگریزی اور عربی کے نامانوس الفاظ سے آلودہ نہیں، بلکہ بہت پاکیزہ اور ٹکسالی زبان لکھی ہے۔ وہ اپنی تحریروں سے بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سے سوئے حرم لے جانا چاہتے تھے۔ اسی لیے ان کے یہاں آمد ہے، آورد نہیں۔ انھوں نے کبھی ادیب و انشاپرداز ہونے کا دعوی نہیں کیا، مگر وہ اپنے عہد کے بہت بڑے ادیب و انشاپرداز تھے۔ پریم چند کو بھی اس بات کا اعتراف تھا کہ وہ ادیب و انشاپرداز نہیں، مگر زمانے نے ثابت کر دیا کہ وہ نثر کی دنیا میں کہاں کھڑے ہیں۔ پریم چند نے لکھا ہے:

> ’’میں نے ادیب ہونے کا دعوی نہیں کیا مجھے لوگ زبردستی انشاپرداز، سحر نگار اور الم غلم لکھ دیا کرتے ہیں۔ میں بات کو سیدھی زبان میں کہہ دیتا ہوں، رنگ آمیزی اور انشاپردازی میں قاصر ہوں۔‘‘

مولانا نے بھی اپنی خودنوشت اور ’’حدیث درد دل‘‘ کا مقدمہ لکھتے ہوئے اسی کسر نفسی کا مظاہرہ کیا ہے کہ میں انشاپرداز، ادیب اور نثر نگار نہیں ہوں، مگر جب ان کی مختلف النوع تحریروں کا قدر تعین کیا جائے گا، تو وہ اپنے ہم عصروں کی صف میں بہت سے نثر نگاروں میں اپنی امتیازی شناخت قائم کریں گے۔ بس ضرورت ہے کہ سوانح، خودنوشت، سفرنامہ اور مکاتیب پر مبنی ان کی تحریروں کا ناقدانہ جائزہ لیا جائے، انھیں مختلف نثری اصناف کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔ لیکن یہ بات پیش نظر رہے کہ مولانا کا مقصد اخلاق سازی تھا، اخلاق سوزی نہیں۔ تعمیر تھا تخریب نہیں۔ صلاح تھا، فساد نہیں۔ انھوں نے تخیل کے گھوڑے نہیں دوڑائے ہیں اور فرضی کہانیاں نہیں تراشی ہیں، بلکہ حقیقت نگاری کے شرائط و قواعد کو ملحوظ نظر رکھا ہے۔ سر سید علیہ الرحمہ نے اسی بات کی ایشیائی شاعروں سے بھی شکایت کی تھی:

> ’’ایشیا کے شاعروں میں ایک بڑا نقص یہی ہے کہ وہ اصل صورت یا اصلیت و حقیقت کا

خیال نہیں رکھتے بلکہ جس کی تعریف کرتے ہیں اس کے اوصاف ایسے جھوٹے اور ناممکن بنا کر بیان کرتے ہیں، جن کے سبب سے وہ تعریف تعریف نہیں رہتی بلکہ فرضی خیالات ہو جاتے ہیں۔‘‘ (اردو تنقید کی تاریخ: ڈاکٹر مسیح الرحمٰن، ص: ۱۹۷، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ)

امید ہے کہ علمی اور ادبی دنیا ان کے نثر پاروں کی تعیین قدر میں عدل و انصاف کا ثبوت دے گی۔ البتہ اتنی خبر رہے کہ اردو کے عناصر خمسہ: سرسید، شبلی، حالی، ڈپٹی نذیر احمد اور محمد حسین آزاد کا تعلق بھی مدارس سے تھا اور مولانا اعظمی نے بھی مدارس کی خاک سے ہی جنم لیا ہے۔

*ABRAR AHMAD
AT+POST IJRA,
VIA RAIYAM FACTORY, DISTT. MADHUBANI
PIN: 847237 BIHAR
MOB:8651708079

❑❑❑

دوری و مہجوری عاشق کے اندر ایک شورش کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ محبّ اپنے محبوب سے جس قدر دور ہوتا ہے اور اس کے وصل کے اسباب جتنے مستور ہوتے ہیں۔ اسی قدر اس کا عشق شور انگیز ہوتا ہے۔ حالتِ فرقت میں روتا بھی ہے، بلکتا بھی ہے، تڑپتا اور پھڑکتا بھی ہے، اور اس تڑپنے اور رونے بلبلانے میں وہ ایسا لطف ایسی لذت اور ایسی مستی و رُبودگی پاتا ہے کہ اس کی لذت کے سامنے تمام لذتیں ہیچ ہوتی ہیں لیکن ظاہر ہے کہ نہ یہ دوری و مہجوری مطلوب ہے اور نہ یہ لطف و لذت مقصود ہے۔ اصل مقصود تو وصالِ محبوب ہے۔ (حدیث دوستاں)

حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی کی اداریہ نویسی

مفتی شرف الدین عظیم قاسمی الاعظمی شیخوپور اعظم گڑھ
مقیم حال، انوار مسجد گوونڈی ممبئی

کسی کا نام آتے ہی مہک اٹھتے ہیں صحرا بھی
بہاریں مسکراتی ہیں نظارے جگمگاتے ہیں

عہد حاضر میں ہندوستان کے علمی وادبی منظر نامے پر جن مشاہیر اہل قلم کی تخلیقی نگارشات نے اپنی عظمت وانفرادیت کے سنہرے نقوش ثبت کئے ہیں اور صحرائے قرطاس پر سحر انگیز تعبیرات، تشبیہات، دل آویز استعارات اور عمدہ تراکیب کے ذریعے ادب کا ایک گلستاں آباد کیا ہے، ان میں ایک ممتاز اور نمایاں نام، شہرۂ آفاق اہل قلم، نامور ادیب وانشاپرداز، جامع المنقول والمعقول استاذ گرامی حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ کا بھی ہے۔ آپ کے شستہ وشگفتہ اور بے باک قلم سے وجود میں آنے والا جہان ادب، معاشرے کی تہذیب و ثقافت اور مشرقی اقدار وروایات کے ساتھ ساتھ اسلامی علوم وفنون کا ایک بحر بے کراں ہے، جس کے ساحل پر کھڑے ہوکر مطالعہ وقرأت کا پتھر پھینکتے ہی علم وادب کے نت نئے دائرے بنتے اور پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ ان تمام بنتے بکھرتے دائروں کا شمار تو چند صفحات پر ممکن نہیں لیکن چند دائرے کو اگر ذہن میں رکھ کر قلمی سفر شروع کیا جائے تو بھی یہ فیصلہ کرنا دشوار ہوجاتا ہے کہ اصناف ادب کی وسیع ولامحدود وادی میں سیاحت کہاں سے شروع ہو؟ اور اختتام کس پہلو پر ہو؟ محدود مطالعہ، ناقص فہم اور علمی کم مائیگی کے باعث مذکورہ دائرے یعنی تحقیق نگاری، تصنیف وتالیف، کالم نگاری، تاریخ نویسی سوانح نگاری، سیرت نگاری اور اداریہ نگاری میں سے مؤخر الذکر صنف کے

امتیازات وکمالات ہماری اس بے ربط تحریر کا موضوع ہے، کیوں کہ شاداب گلشنوں کی سیاحی زندگی کو کچھ دے یا نہ دے، تاہم وجود کو خوشبوؤں سے معطر ضرور کرتی ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ علمی وادبی تخلیقات جو تعمیری سمت میں اخبارات ورسائل کی زینت بنتی ہیں، قوم وملت کی تہذیب وثقافت اور اس کے اقدار وروایات کی عکاس اور ترجمان ہوتی ہیں، اور قوم کی زندہ دلی وبیداری کی علامت ہوتی ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا کہ رسائل وجرائد خواہ کسی بھی نظریہ وخیال کے ترجمان ہوں، معاشرے میں اہل علم وفن کے نزدیک ان کی عظمت ومقبولیت ’ادارتی تحریر‘ یا ’آغاز سخن‘ کے اسلوب نگارش کی انفرادیت و جامعیت اور طرز ادا کی دل آویزی ودلکشی سے وابستہ ہے۔ یہی وجہ ہے ملک کے طول وعرض میں ہزاروں کی تعداد میں منصۂ شہود پر آنے والے بیشتر رسالے شیدائیان ادب کی دلچسپیوں کا مرکز نہیں بن پاتے۔ اس لئے کہ رسالہ کی نمائندہ ادارتی تحریر فن کی ان خوبیوں اور کمالات نیز ملت کی تعمیر و ترقی کے پاکیزہ جذبات سے عموماً خالی ہوتی ہیں، جو قارئین کے دلوں میں عظمت وبلندی اور جامعیت وافادیت کا نقش قائم کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔

ادب وانشا کی دوسری تمام اصناف میں استاذ محترم کے علم زیر قلم سے نکلے ہوئے اعلی معیاری مضامین ومقالات کی صورت میں علمی وتحقیقی اور ادبی سرمایہ کی طرح اداریہ نویسی کے کینوس پر رونما ہونے والی تحریریں بھی موضوع کی معنویت کے ساتھ ساتھ فصاحت وبلاغت، سلاست و روانی، الفاظ کی ندرت، استعارات وتعبیرات کی انفرادیت، زبان وبیان کی سحر انگیزی کی وجہ سے ادب عالیہ کا قیمتی شہ پارہ ہیں۔ لاشعوری طور پر نفس کے بتوں کی اطاعت میں اسلامی مزاج اور روح کے خلاف حرکت وعمل پر گرفت اور مزاج وطبیعت کی کج روی کی نشان دہی جیسے خشک موضوع میں قلم کی طاقت اور زبان وبیان کے انوکھے اظہار کی زبردست قوت نے کس قدر جاذبیت اور دل آویزی بھر دی ہے، اس کا اندازہ تو مکمل تحریر کے مطالعہ کے بعد ہی لگایا جاسکتا، تاہم ذیل کا یہ اقتباس میرے نظریہ کی تائید ضرور کرے گا کہ ادبی ذوق واسلامی مزاج کا اگر ہلکا سا عنصر بھی کسی ذات میں موجود ہو تو اس کے لئے انتہائی دشوار ہے کہ آپ کی نگارشات میں اپنے مطالعہ کا سفر شروع کرے اور پھر درمیان میں ہی اس سفر کو منقطع کردے۔ اور یہی صفت اور خوبی کسی بھی اہل قلم

کے لئے خراج تحسین اور خراج عقیدت ومقبولیت ہے۔ پس شعور ووجدان کو وحدانیت کے انمول خزانوں سے آشنا کرنے والے اور ادبی محاسن کی تمام خوبیوں سے معمور آپ کے اداریہ کا ہلکا سا نمونہ آپ بھی ملاحظہ کریں اور زبان وبیان کے انوکھے رنگ وآہنگ اور اس کی اثر آفرینی سے لطف اندوز اور شادکام ہوں:

> انسان کے ذوق ووجدان پر جو بہت سی خواہشیں مسلط ہیں، جن میں اسے لذت کا احساس ہوتا ہے، ان میں ایک بڑی طاقتور خواہش اور لذت اپنی ذات، اپنے کام اور اپنے ماضی کے احوال کی یادگار کو باقی رکھنا ہے۔ پھر اس کے حصول کے لیے جہاں وہ بہت سے طریقوں کو کام میں لاتا ہے، ان طریقوں میں سے ایک طریقہ تصویر سازی کا بھی ہے، تصویروں کے ذریعے آدمی اپنی ذات اپنے کام، اپنے متعلقات اور اپنے ماضی کے حالات کی یادگار محفوظ کرنا چاہتا ہے۔ ہر آدمی کو اپنی چیزوں سے محبت ہوتی ہے، مگر زمانہ جوں جوں آگے بڑھتا جاتا ہے، اس سے تعلق رکھنے والی یہ چیزیں ماضی کے اندھیروں میں گم ہوتی چلی جاتی ہیں، حافظہ کسی قدر یاد رکھتا ہے، مگر اس کے نقوش بھی دھندلا جاتے ہیں۔ انسان چاہتا ہے کہ یہ چیزیں محفوظ رہیں، تاکہ جب چاہے وہ انھیں دیکھ سکے، دوسروں کو دکھا سکے، خود لذت یاب ہو اور دوسروں کو بھی اس میں شریک کرے۔ یہ سوچ کر اس نے ان چیزوں کو مجسّمے کی صورت میں، تصویری نقوش کی صورت میں محفوظ کرنے کی کوشش کی۔ قدیم زمانے سے ہم دیکھتے ہیں کہ انسان اپنی یادگاروں کو محسوس صورتوں میں باقی رکھنے کا اہتمام کرتا ہے۔
>
> تو کیا یہ جذبہ اور یہ ذوق جو انسان کے اندر رکھا گیا ہے، علی الاطلاق اس ذوق کی تسکین کا ہر سامان درست ہے؟ اس باب میں جب شریعت الٰہی سے فتوی لیا گیا، تو معلوم ہوا کہ اس ذوق کی تسکین کی اس حد تک اجازت ہے، جب تک انسان کو دنیا میں جس مقصد سے بھیجا اور پیدا کیا گیا ہے، اس مقصد کو کوئی نقصان نہ پہنچے، اور جہاں سے اس مقصد کو نقصان پہنچنا شروع ہو، وہاں سے ممانعت اور حرمت کی حد شروع ہو جاتی ہے۔
>
> انسان کی پیدائش کا مقصد خود پیدا کرنے والے نے بہت وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے کہ ”**وماخلقت الجن والانس الا لیعبدون**“ (سورہ ذاریات) میں نے جن اور

> انسان کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔ جب تک اس ذوق تصویر سازی اور جذبۂ یادگاری کا ٹکراؤ عبادت الٰہی سے نہیں ہوتا، اس کی اجازت دی جاسکتی ہے اور جہاں اس نے اس مقصد عبادت میں خلل ڈالا، وہیں اس پر حرمت کا حکم لگے گا، اور اس سے روک دیا جائے گا۔
>
> تاریخ انسانی پر غور کریں گے تو یہ عجیب وغریب انکشاف ہوگا کہ تصویر سازی کا ذوق توحید الٰہی اور عبادت الٰہی سے براہ راست متصادم ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تصویر سازی کا آغاز توحید الٰہی کے ٹھیک برعکس ہوا ہے، اس لیے بے تکلف یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ ذوق، اور اس ذوق کی تسکین کا سامان منشاء الٰہی کے عین خلاف ہے۔'' (مجلّہ الماٰثر مئو)

آپ کے اداریوں کی وہ خصوصیت جو معاصر اہل قلم کی نگارشات میں آپ کو ممتاز مقام عطا کرتی ہے وہ آپ کی تمام ادارتی تحریروں کا تکلف وتصنع اور آورد وابہام سے بالکل مبرا اور اغلاق وتعقید سے یکسر خالی ہونا ہے۔ روزمرہ استعمال ہونے والے عام فہم اور آسان الفاظ کا اس طرح منفردانہ انداز امیں ستعمال مافی الضمیر کے ابلاغ وترسیل کے لئے کرتے ہیں کہ نثر کی صورت میں نظم کا گمان ہونے لگتا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت الاستاذ کی تحریریں محض لفظوں کی بازیگری نہیں ہوتیں بلکہ فکر وتدبر اور علوم وفنون کا جہاں اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔

انسان کی تخلیق کا مقصد فکر آخرت، اخلاق وکردار کی درستگی، دنیا کی بے ثباتی اور اسلامی اقدار وروایات کی حقانیت آپ کے بے باک قلم کے مرکزی وکلیدی عناوین ہیں۔ مادی عہد کے انتشار وابتری اور انسانی زندگی کے داخلی وخارجی کشمکش کے اسباب اور اس کے سدباب کے طریقہ ہائے عمل بھی سطر سطر سے عیاں ہیں۔ اسلامی ثقافت وکلچر کو زبوں حالی سے نکال کر آفاقیت کے درجہ تک پہونچانے والے جذبات واحساسات کی کارفرمائی سے آپ کی نگارشات میں معنوی تأثراتی تہ داریاں اور جمالیاتی وسعتیں اس طرح پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں کہ وہ سلیم الطبع اور باذوق ذہن وقلب کی آواز اور ان کی تسکین کا سامان بن جاتی ہیں۔

زندگی کے گلستاں میں جب خزاں آتی ہے، مصائب وآلام کے طوفان آتے ہیں، نشیمن پر بجلیاں گرتی ہیں اور کشتیِ حیات مصیبتوں کے گرداب میں ہچکولے کھانے لگتی ہے تو اس دلخراش

موسم خزاں میں خالق کائنات کی بارگاہ کی طرف انسان کی بے بس نگاہیں اٹھتی ضرور ہیں مگر ان حوادثات کے حقیقی اسباب، اس موسم الم میں بھی انسان کی نگاہوں سے عموماً مستور ہی رہتے ہیں۔

تمام پیڑ جلاکے خود اپنے ہاتھوں سے
عجیب لوگ ہیں سایہ تلاش کرتے ہیں

آپ نے بے پناہ تخلیقیت اور قوت اظہار و بیان کی مدد سے اس لرزہ خیز حالات کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ فنی جمالیات کے ساتھ ساتھ صبر آزما مراحل کے تمام اسباب و علل روشن ہوتے چلے جاتے ہیں:

> نادرشاہ نے دلی میں قتل عام کا حکم دیدیا تھا، ہر گلی کوچے میں انسانی لاشیں بکھری پڑی تھیں، کسی کو پناہ نہ ملتی تھی، ہر ایک گردن پر خونخوار تلوار کھنچی ہوئی تھی، سب سراسیمہ تھے، سب حیران تھے کہ یہ کیا ہوا؟ اس سوال کا جواب ملنے سے پہلے گردن پر تلوار چل چکی ہوتی۔ جب نادرشاہ کی خون آشام تلوار آسودہ ہو چکی تو اس نے یہ سلسلہ بند کرایا، اب بچے کھچے لوگوں کے حواس بجا ہونے شروع ہوئے، تو کسی نے کسی بزرگ سے دریافت کیا کہ حضرت! یہ سب کیا ہوا؟ انھوں نے ایک جملے میں جواب دیا، وہ جملہ تاریخی جملہ بن گیا، واقعیت اور صداقت پر مبنی! اپنے اندر درس و موعظت کی ایک دنیا لئے ہوئے۔ انھوں نے کہا:
>
> ''شامتِ اعمالِ ما صورتِ نادر گرفت''
>
> نہ نادر کچھ ہے نہ نادر کا حکم کوئی چیز ہے، نادر کیا ہے؟ جیسے سب انسان ہیں قوانینِ قدرت میں جکڑا ہوا وہ بھی ایک انسان ہے، لیکن ہماری بداعمالیاں ہیں جنھوں نے پروردگار عالم کو ناراض کیا، وہی بداعمالیاں نادر کی صورت میں مجسم ہو کر ہم پر قہر و عذاب کا کوڑا بن کر برس گئی ہیں۔
>
> انسان آفات و مصائب کا سرچشمہ اپنی ذات سے، اپنے احوال و اعمال سے باہر تلاش کرتا ہے اور اسے اپنی ذات سے باہر مصائب کا چشمہ ابلتا ہوا دکھائی دے جاتا ہے، وہ اسی خارجی سرچشمہ پر، اس کے روکنے پر، اس کے پاٹنے پر اپنی کوشش صرف کرنے لگتا ہے، لیکن ایک سوراخ بند کرتا ہے تو دوسرے سوراخ سے دھواں نکلنے لگتا ہے، ایک طرف دباتا ہے تو دوسری

> طرف ابھار پیدا ہوتا ہے۔
>
> یہ ایک طرفہ محنت کامیاب نہیں ہوتی تو وہ مایوس ہونے لگتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نے جہاں اپنی ذات و معاشرہ سے باہر آفات و مشکلات کو ڈھونڈھا ہے، اس سے زیادہ خود اپنے اندر تلاش کرنا چاہئے، باہر کی دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ بہت کچھ اندر کی دنیا کا ایک پرتو اور ظہور ہے۔‘‘ (ماہنامہ ضیاء الاسلام شیخوپور جون ۲۰۰۰)

محبت واخلاص انسانیت کے وہ جوہر گرانمایہ ہیں جو بحر علم کی گہرائیوں میں اتر کر نسخہ کیمیا تلاش کرنے والے شناور کو عرفان حیات کی قیمتی سوغات عطا کرتے ہیں اور اس کے قلم سے نکلی ہوئی دل آویز تحریروں میں زندگی کی حقیقتوں، آفاقی اصولوں اور کائنات کے ادراک کا رنگ بھر دیتے ہیں۔ نتیجۃً انسانی فطرت اور اعلی اسلامی اقدار سے ہم آہنگ فصیح الفاظ اور بلیغ تعبیرات کے جامہ میں ملبوس یہ فن پارے جب ناظرین کے سامنے آتے ہیں تو ذہن و دل کے ساتھ روح میں اترتے چلے جاتے ہیں اور پھر ہمیشہ کے لئے اپنے پورے سیاق وسباق کے ساتھ نقش کالحجر ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس سینہ قرطاس پر بکھرے ہوئے مسجع و مقفع الفاظ کے چمکتے موتی اور ایک لمحہ کے لئے اذہان وقلوب کو مائل کرنے والی پرکشش تعبیرات ومحاورات سے آراستہ مضامین مذکورہ عناصر سے خالی ہوتے ہیں تو وہ محض اسرار یا غیر منظّم تجربات ومشاہدات کا ناقابل فہم چیستاں ہو جاتے ہیں جنہیں راہ علم وفن کا مسافر جو شعور وادراک کی دولت سے آراستہ ہو، لفظی بازیگری اور خیالی کرتب بازی کا نام دے کر آگے بڑھ جاتا ہے۔

حضرت الاستاذ کی تحریروں کی بہت ساری خوبیوں میں سے یہ خاصیت بھی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے، بلکہ انصاف یہ ہے کہ یہ صفت اور خاصیت ان کی ادائے سخن وری میں تمام خصوصیات و امتیازات سے کہیں برتر وبالا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے مضامین اور خاص طور سے ادارتی صفحات کو پڑھنے والا یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہتا کہ الفاظ وعبارات کے اس گلشن کا ہر شجر اور ہر شاخ اخلاص ووفا کے کوثر و تسنیم کی خوشگوار شبنم سے دھلی ہوئی ہے۔ اس لئے ان کے مطالعہ کی سیر میں قاری بالکل بے خود اور کھو جاتا ہے، اور یہی عالم بے خودی اور قارئین کا کھو جانا آپ کی نگارشات کی عظمت وبلندی کا بین ثبوت اور روشن دلیل ہے۔ ذیل کا یہ اقتباس یقیناً میرے اس دعوے کی

تصدیق کرے گا، جس میں دین اسلام کی ابدیت وصداقت کی والہانہ انداز میں منظر کشی کی گئی ہیں:

> دین اسلام کا رحمت ہونا، ایک ایسی صداقت ہے، جس کو دنیا کے کسی دور میں چیلنج نہیں کیا جاسکا ہے، اس کے ماننے والے کم ہوں، یا زیادہ، کمزور ہوں یا قوی! اسلامی احکام وتعلیمات، اسلامی تہذیب، اسلامی معاشرہ اور اسلام کے اختصاصات وامتیازات کچھ ڈھکی چھپی چیزیں نہیں ہیں، جن سے دنیا کا پڑھا لکھا طبقہ واقف نہ ہو۔
>
> ہاں! لیکن کبھی کبھی اس کے مخالفین، اس کے خلاف جہالت وتشکیک کی اتنی گرد اُڑاتے ہیں کہ اس کا حسن وجمال بظاہر مخفی ہونے لگتا ہے، اور گرد وغبار کا کرکرا پن نمایاں ہوجاتا ہے، اور ناواقف اسے اسلام کا کرکرا پن سمجھتا ہے۔
>
> دنیا کی زیب وزینت، دنیا کی مقصودیت اور دنیا کی شان وشوکت اسلام کا موضوع نہیں ہے۔ اسلام کا مقصود فکر آخرت رضاء الٰہی اور عدل وانصاف ہے۔ خواہ اس کی وجہ سے بظاہر دنیا کا نقصان نظر آئے۔
>
> لیکن دنیا نے ہمیشہ یہ گناہ کیا ہے کہ دنیا ہی کو مقصود ومعبود بنایا۔ اور آخرت سے غفلت اختیار کی، اور اس کی وجہ سے اسلام سے دوری بڑھتی رہی۔ غیروں سے شکایت نہیں ہے۔ غیروں سے متاثر ہوکر خود اپنوں نے بھی یہ گناہ کیا، دنیا کو اتنی اہمیت دی، جس کی وہ مستحق نہ تھی، اور دنیا کو جتنی جتنی اہمیت دی جاتی رہی، اسلام کا دامن ہاتھ سے چھوٹتا رہا، اور اب یہ حالت ہوگئی کہ اللہ کا یہ احسانِ عظیم اب دل ودماغ پر گراں گزر رہا ہے۔ کچھ لوگ اسلامی تعلیمات کو خیر باد کہہ رہے ہیں، انھوں نے اپنے آپ کو بدل ڈالا ہے۔ اور اپنے اندر اور باہر اسلام کی کوئی علامت بجز قومیت کے نہیں رہنے دی ہے۔ قومیت کا مطلب یہ ہے کہ اپنا شمار مسلمانوں میں کرتے ہیں، مسلمانوں جیسا نام رکھتے ہیں، اور کبھی کبھی کسی اسلامی شعار کو عارضی طور پر اختیار کرلیتے ہیں، اور کچھ لوگ ایسے ہیں کہ اسلامی تعلیمات کو توڑ پھوڑ رہے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ غیر اسلامی چیزوں کا جواز اسلام میں تلاش کرلیں۔'' (ضیاء الاسلام اکتوبر ۲۰۰۴ء)

نفس پرست انسان جس کے دل میں دنیا کی محبت واہمیت کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب وتمدن کا رعب ودبدبہ قائم ہی نہیں بلکہ راسخ اور جاگزیں ہے، اسلامی تعلیمات سے

ناآشنائی کی وجہ سے وہ مذہب، قومیت اور ثقافت کے سلسلے میں نہایت احساس کمتری کا شکار رہتا ہے، نتیجۃً زندگی کے تمام شعبوں میں بازار حیات کے تمام مراحل میں مغربی تہذیب وثقافت کی تقلید کا خواہاں رہتا ہے اور مغرب کے مادی فلسفہ کو زندگی کی معراج سمجھتا ہے، جس کے نتیجے میں اپنے ذاتی مفادات کے دائرے سے باہر آ کر دوسرے انسانوں کی ترقی وخوش حالی کے متعلق کچھ سوچنا بھی گوارا نہیں کرتا، باوجود اس کے ترقی یافتہ غیر قوموں کی اس غیر انسانی تہذیب سے متأثر ہو کر عصری علوم کے حاملین کا ایک طبقہ جو اسلامی تعلیمات سے بے بہرہ ہونے کے باوجود خود کو اسلامی علوم ومعارف کا دانشور تصور کرتا ہے، اس کی یہ آرزو اور کوشش ہوتی ہے کہ اسلامی تمدن وقوانین کو مخصوص فلسفہ کے سانچے میں ڈھال دے جس کا محور اور مرکز اور مقصود محض مادی اور فانی دنیا کا حصول ہے، اس آرزو کی تکمیل کے لئے یہ روشن خیال طبقہ اسلام کی تمام تعلیمات کی صحت اور عدم صحت کا فیصلہ اسی فلسفہ کے معیار و پیمانے کے مطابق کرتا ہے، دوسرے لفظوں میں شرعی احکام و اوامر اگر نفس کے مطابق ہیں تو وہ اسلام، بصورت دیگر انسان کو پستی وتنزلی کی طرف لے جانے والا راستہ۔

ایک ایسا اہل قلم جس کے رگوں میں ایمانی حرارت رواں دواں ہو، ادب وانشا کے گلستانوں کا سیاح ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی علوم وفنون کے سمندر کا شناور بھی ہو، اس کی نگاہ دور رس سے حالات کی یہ المنا کی کس طرح مستور رہ سکتی ہے؟ پس آپ کے فکر انگیز اور علوم اسلامی کے رمز شناش ذہن ودماغ نے ''ٹی وی'' کو زندگی کا لازمی حصہ بنا کر سند جواز عطا کرنے والے نظریات وخیالات کی تہوں میں پوشیدہ ایمان کش فتنہ کو محسوس کرلیا اور غیر متزلزل قوت ویقین محکم کے ذریعہ بے خوف وخطر اس کی تردید میں اسلامی تعلیمات کی اس طرح ترجمانی کی کہ تشریح وتوضیح کا جاں نواز وروح پرور گلشن آباد ہوگیا:

> ''ہمارے اس دور میں اسلامی تعلیمات واحکام اور اسلامی تہذیب کے خلاف گندگی کی وہ کثرت ہوگئی ہے کہ لوگوں کی نگاہ میں وہ گندی چیزیں بھلی معلوم ہونے لگی ہیں، لیکن قرآن کا فیصلہ ہے کہ جو چیز گندی ہے، وہ بظاہر کیسی ہی خوشنما اور مفید معلوم ہو، گندی ہی رہے گی۔
>
> آج کل ان فتنوں کی بارش بہت بڑھ گئی ہے، کوئی آنکھ، کوئی کان، کوئی دل ایسا نہ ملے گا،

> جس پر فتنوں کی برسات نہ ہو رہی ہو۔ جتنے ذرائع اِبلاغ بڑھتے جا رہے ہیں، اتنے ہی فتنے بڑھتے جا رہے ہیں۔ اور جتنی تیز رفتار سواریاں بڑھ رہی ہیں، اتنی ہی برق رفتاری سے فتنے ترقی کر رہے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ خاص خاص جگہوں میں ناچ گانے کی بزم سجائی جاتی تھی، ان میں خاص خاص لوگ شرکت کرتے تھے، پھر سنیما کی ایجاد نے اس میں عموم پیدا کیا، اب ناچ گانا عام ہو گیا، لیکن پھر بھی ایک مخصوص عمارت تک جانا پڑتا تھا۔ کتنے لوگ معاشرے کی شرم کی وجہ سے نہیں جا سکتے تھے۔ پھر ایجاد کرنے والوں نے ہاتھ میں ریڈیو تھما دئے کہ جب چاہو گانا سنو! مگر نگاہیں محروم تھیں، پھر ٹی، وی نے باقی کسر پوری کر دی۔ اب جہاں چاہئے سنیما ہال بنا لیجئے۔ اور اس طرح موجودہ معاشرہ کی بیشتر خرابیوں کا سرچشمہ یہی ٹی، وی ہے۔ گانے بجانے شراب و کباب، مار دھاڑ، قتل و خونریزی، چوری اور غارت گری کون سا ایسا جذبۂ فساد ہے، جو ٹی وی کے اسکرین سے دل و دماغ کی شریانوں میں پیوست نہیں ہوتا اور انسان کے رگ و ریشہ میں نہیں دوڑتا۔ بچوں سے لے کر جوان اور بوڑھے تک سب ٹی، وی کے اسکرینوں کی نقالی میں تھرکتے، ناچتے، کودتے اور عجیب و غریب حرکات میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے، جس کا انکار بجز ان لوگوں کے اور کوئی نہیں کر سکتا، جنھوں نے حقائق سے آنکھوں کو بند کرنا ہی اپنا شیوہ بنا رکھا ہو۔ یہ تسلیم کہ ٹی، وی اور ریڈیو پر خبریں نشر ہوتی ہیں، بجا کہ بعض اچھی معلومات بھی فراہم کی جاتی ہیں، مانا کہ اس کے ذریعے تجارت کا فروغ ہوتا ہے۔ مگر پوچھئے کہ یہ خبریں انسانیت کی کون سی خدمت انجام دیتی ہیں؟ کیا ان خبروں میں سیاسی بازی گری نہیں ہوتی؟ کیا یہ خبریں جھوٹ کو سچ نہیں بناتیں؟ کیا یہ خبریں سچائی کی آنکھ میں دھول نہیں جھونکتیں؟ کیا یہ خبریں سن سن کر انسان ''ٹینشن'' میں نہیں مبتلا ہوتا؟ کیا ان خبروں کے نتیجے میں معاشرہ بے تحاشا فسادات و خونریزی میں تہ و بالا نہیں ہوتا؟ پھر یہ بھی دریافت کیجئے کہ یہ اچھی معلومات جو ریڈیو اور ٹی، وی سے فراہم کی جاتی ہیں ان میں دینی معلومات، فکر آخرت اور دنیا کی بے حقیقتی کا کتنا عنصر ہوتا ہے؟ یہ معلومات انسان کو حُبِ دنیا میں مبتلا کرتی ہیں، یا فکر آخرت کا تحفہ عطا کرتی ہیں؟ ان معلومات سے سنجیدگی پیدا ہوتی ہے، یا لہو و لعب کی لت پڑتی ہے۔'' (ماہنامہ ضیاء الاسلام اکتوبر ۲۰۰۴)

اسلام کے صحیح و پاکیزہ مزاج و شفاف روح سے آشنا کرنے والی روح پرور اس ایمانی و

ایقانی تحریر کو ایک بار پھر پڑھیں، یقیناً آپ کے قلب وذہن میں اسلام کی اس سچی تصویر کا نقشہ پھر جائے گا جو صحابہ کرام کے عہد زریں میں آسمان کی نگاہوں نے دیکھا تھا اور اس فراست ایمانی سے بھی آپ آشنا ہو جائیں گی جو اسلام کے لباس میں در آنے والے خوشنما فتنوں سے عین وقت پر خبر دار کرتی ہے۔ نفس کی بے لگام خواہشات کی تکمیل کرنے والی اور روشن خیال طبقہ کو شادکامی سے ہم کنار کرنے والی ٹی وی کی مضرت وقباحت اور معاشرے کی تمام اکائیوں پر اس کے گہرے اخلاق سوز اثرات اور اسلامی شعائر واقدار کی بے حرمتی و بے وقعتی کی دل خراش داستان کی منظر کشی آپ نے کس قدر نفاست اور سلیقہ مندی سے کی ہے:

> ”دینی پروگراموں کو خواہ ٹی وی پر لائیں، ریڈیو پر لائیں، یا انٹرنیٹ پر لائیں، سب سے پہلے ان کا احترام وتقدس غائب ہوتا ہے۔ اور یہ بات ایسی نہیں ہے جس پر کسی دلیل کے قائم کرنے کی ضرورت ہو۔ ہاں اگر تقدس واحترام کا مفہوم ہی بدل دیا جائے، یا اس کو لغو وفضول چیز قرار دے دیا جائے تو بات دوسری ہے۔ اور دنیا داری کے غلبہ اور آخرت فراموشی کے اس دور میں یہ تماشا بھی بہت عام ہو چکا ہے۔ اکبر کے زمانے میں یہ صورت حال رہی ہو یا نہ رہی ہو، مگر اب تو کھلے بندوں یہ تماشا ہو رہا ہے کہ:
>
> رقیبوں نے رَپٹ لکھوائی ہے جاجا کے تھانے میں
> کہ اکبرؔ نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں
>
> خدا کا نام فیشن کے طور پر تو لیا جاتا ہے، مگر آخرت کا نام لینا، اور دنیا کو بے وقعت سمجھنا، تو واقعی جرم بن چکا ہے۔ میں یہ باتیں لکھ رہا ہوں اور سمجھ رہا ہوں کہ بہت سی پیشانیاں شکن آلود ہوں گی، بعض زبانیں یاوہ گوئی کریں گی، بعض قلم حرکت میں آئیں گے۔ لیکن جو حقیقت ہے اسے بیان کیا جائے گا۔
>
> مسلمانوں کو تو کفار اور یہود ونصاریٰ کے طریقوں سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔ جن چیزوں کی بنیاد خلاف شرع امور پر ہے، وہ یہود ونصاریٰ کا طریقہ تو ہو سکتا ہے۔ اہل اسلام کا نہیں۔ ٹی وی کی بنیادی چیز تصویریں ہیں اور وہی اسلام میں ناجائز ہیں۔ پھر دینی پروگرام کی گنجائش اس میں کیوں کر ہو گی؟۔
>
> جو لوگ کھینچ تان کر اسے جائز بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اسلام کی خدمت نہیں،

اسلام کو مذاق بنانا چاہتے ہیں۔ وہ خود ٹی وی دیکھتے ہوں تو دیکھیں، مگر اسے جائز بتا کر ساری امت کو جہنم میں ڈھکیلنے کی کوشش نہ کریں۔“ (حدیث درد دل: ۳۱۶)

فسادات شاید اب ہماری زندگی نہیں بلکہ ہندوستان کا مقدر بن چکے ہیں، ملک کی آزادی کے نصف صدی کے بعد بھی فسادات کی آگ رہ رہ کر بھڑکتی رہتی ہے۔ تقسیم ہند کے بعد سے اب تک فرقہ وارانہ فسادات کا ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ نظر آتا ہے، دو عالمی جنگوں نے ہماری زندگی پر شاید اتنے برے اثرات مرتب نہیں کئے، جتنے کہ فرقہ وارانہ فسادات اور قتل وغارت گری نے۔ ان فسادات نے جان ومال کا ناقابل تلافی نقصان تو پہونچایا ہی ہے، ستم یہ ہے کہ ساقیان میکدہ کی جانب دارانہ ومتعصّبانہ روش اور رویے نے ہماری اجتماعی زندگی کے تانے بانے بھی منتشر کردیئے۔ مذہب کے نام پر نفرتوں کا بیج بویا گیا۔ اسلام کو مختلف ومنصوبہ بند سازشوں کے ذریعہ بدنام کرنے کی کوششیں کی گئیں، اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔ آپسی اختلاف وانتشار اور ذہنی غلامی کے زیر اثر غیروں کے طرز زندگی اپنانے کے باعث قوم مسلم کا اتحاد بالکل بکھر چکا ہے، بے یقینی کی اس صورت حال سے دوچار معاشرے کے چاروں طرف خوف وہراس کا سایہ پھیل گیا، فرقہ پرستی کی آگ میں گاؤں کے گاؤں اور شہر کے شہر جل کر خاکستر ہوگئے، تباہی وبربادی کے یہ دل دوز اور روح فرسا مناظر سماج کے حساس افراد کے لئے نہایت صبر آزما ہوتے ہیں، خوف وہراس کے اس وحشت زدہ خونیں ماحول میں امت مسلمہ کے کتنے افراد ایسے بھی تھے کہ استقامت وعزیمت کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور جان کی حفاظت کے لئے ایمان ویقین کا سودا کرلیا۔ اسلامی شناخت کو پس پشت ڈال کر اپنی پیشانیوں کو غیروں کے شعار قشقہ سے آلودہ کرلیا، ہاتھوں میں غیر مذہب کی مخصوص علامت سرخ دھاگے پہن لئے۔ حالات کی یہ سنگینی جہاں متاع ایمان کو سرمایہ حیات کے مقابلے میں قربان کیا جانے لگے تو یہ ایک بے لوث اور مخلص، اسلام کے داعی اور دردمند وحساس اہل قلم کے لئے سخت ذہنی اذیت اور قلبی اضطراب کا باعث ہوتی ہے۔ پس موسم درد والم کی اس تیرہ وتاریک فضا میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے ایمانی رشتہ کا دعوی کرنے والے اور ایک خدائے قادر ووہاب کی قدرت ووحدانیت پر یقین رکھنے والے کا کیا طرز عمل ہونا چاہئے؟ سرمایہ زندگی اور متاع ایمان ویقین جب دونوں خطرات کے طوفان میں گھر

جائیں تو حفاظت کے لئے کس کو ترجیح دی جائے؟ اور کس کو قربان کیا جائے؟ یہ اور اس جیسی حوصلہ افزا اسلامی تعلیمات کو حضرت والا نے ایسے رنگ و آہنگ میں تحریر کیا کہ لفظ لفظ اظہار خیال کا سحر انگیز اسلوب اور نفس کی گرمی وشدتِ درد وکرب کا غماز وترجمان بن گیا۔ الفاظ وحروف کی ساحری میں اطمینان قلب کا نسخہ اکسیر اس انداز میں جلوہ آرا ہے:

> ”جب کہیں فساد ہوتا ہے یا کوئی مصیبت آتی ہے، تو عام طور پر مسلمانوں میں ایک طرح کی مایوسی اور بزدلی کا احساس پایا جانے لگتا ہے۔ اخبار اور ریڈیو افواہیں پھیلاتے ہیں، عوام کی زبانیں اس میں اضافہ کرتی ہیں، اور پھر ایسی بھیانک صورت حال لوگوں کے پیش نظر ہوجاتی ہے کہ خود بخود ہراس بڑھ جاتا ہے، مایوسی کا سایا گھنا ہوجاتا ہے اور مسلمان بے بس محسوس ہونے لگتا ہے، جیسے اس کا سہارا کوئی نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے عموماً بزدلی بڑھ جاتی ہے، کہیں آنے جانے میں اس طرح خوف محسوس ہونے لگتا ہے جیسے موت تعاقب میں ہے۔ اکا دُکا ایسے واقعات بھی سننے میں آجاتے ہیں کہ غیر مسلموں کے ہجوم میں یا محض کسی وہم میں مبتلا ہوکر مسلمان اپنے کو غیر مسلم ظاہر کرنے لگتا ہے۔ شکل وصورت تو مسلمانوں کی بکثرت ہندوؤں جیسی دکھائی دیتی ہی ہے، بعض کمزور افراد ہاتھ میں دھاگا باندھ کر خود کو چھپاتے ہیں۔ کوئی نام بدل دیتا ہے۔ اس طرح کی مثالیں بکثرت تو نہیں، لیکن سننے میں آتی ہی رہتی ہیں۔
>
> یہ سخت بزدلی اور نامردی ہے، مسلمانوں کو یہ کبھی نہیں بھولنا چاہئے کہ اس کے والی وولی اللہ تعالیٰ ہیں۔ مسلمان اگر اپنے دل میں اللہ کا ڈر رکھے، ان کے نبی کی پیروی دل سے کرے تو اس کا کوئی طاقت کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ ہر آن اسے اس کا دھیان رکھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ میرے ساتھ ہیں، تمام طاقت کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اس کی معیّت کے بعد کسی بھی مخلوق کا کچھ ڈر نہیں، مایوسی کی کوئی بات نہیں ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے سامنے غزوہ احد میں مسلمانوں کو ایک شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا، کیفیت مایوسی ہی کی تھی، کفار کا سالارِ لشکر نعرہ پر نعرہ لگا رہا تھا کہ **لَنا العُزیٰ ولاعُزیٰ لکم** (ہمارے لئے عزیٰ ہے اور تمہارے لئے عزیٰ نہیں) عزیٰ کفار کا ایک بت تھا، شاید عزت وغلبہ کا بت رہا ہو، اس کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم لوگ کہو: **اللہ مولانا ولا مولیٰ لکم** (اللہ ہمارا والی وکارساز ہے اور تمہارا کوئی والی وکارساز نہیں)

اللہ تعالیٰ مشکل سے مشکل حالات میں مدد فرماتے ہیں، مسلمانوں سے اللہ تعالیٰ نے یہ کہیں وعدہ نہیں کیا ہے کہ تم پر کوئی مشکل نہیں پڑے گی، مگر صبر وتقویٰ کے بعد نصرت وفتح کا وعدہ ہے۔ اور یہ کتنی بڑی سعادت ہے کہ اللہ ورسول کے نام پر کسی کو دکھ پہونچایا جائے، اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے نہ جانے کتنے عروج سے سرفراز فرمائیں گے۔ اس لئے خوف وہراس کو برطرف کرکے مردانہ وار صبر واستقلال سے اللہ تعالیٰ پر کامل بھروسہ کرکے دل کو مضبوط رکھنا چاہئے۔ کسی بے گناہ پر ظلم نہ کرے، افواہیں نہ پھیلائے، بے صبری کا کوئی کام نہ کرے، آپس کے انتشار و افتراق کو ختم کرے۔ پھر دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد کس طرح بڑھ بڑھ کر آتی ہے، ایسا تو نہ بن جائے جیسے اس کا خدا کوئی ہے ہی نہیں۔ مرحوم آغا حشر کاشمیری نے کہا تھا:

حق پرستوں کی اگر کی تو نے دل جوئی نہیں
طعنہ دیں گے بت کہ مسلم کا خدا کوئی نہیں

(ضیاء الاسلام فروری ۲۰۰۰)

حاصل یہ ہے کہ علمی وادبی دنیا کی تمام اصناف، تاریخ نگاری، سوانح نگاری، خطوط و واقعہ نگاری کی طرح حضرت الاستاذ کی اداریہ نگاری میں بھی جہاں عالمانہ، مفکرانہ، مدبرانہ، مؤرخانہ، محدثانہ اور بصیرت مندانہ شان وشوکت جھلکتی ہے، وہیں ادب کی اس مذکورہ صنف میں جمالیات کے تمام عناصر مثلاً فصاحت وبلاغت، جامعیت وجاذبیت، دلکشی ورعنائی، برجستگی وبے ساختگی، سلاست وروانی، اسلوب کا نرالا پن اور زبان کا بانکپن نجوم وکواکب کی طرح جگمگاتے نظر آتے ہیں۔

ادب وانشا کے کمالات میں سب سے اہم خوبی وخصوصیت جس نے آپ کے تمام مضامین ومقالات اور تصنیفی وتالیفی ذخیروں کو بے پناہ مقبولیت اور قابل رشک دوام جاودانی بخشی ہے اور قارئین کو آپ کی تحریوں کا اسیر بنایا ہے، وہ یہ ہے کہ عام فہم الفاظ کو چھوٹے چھوٹے جملوں میں نظم کرکے دل کش اسلوب میں روزمرہ پیش آنے والے عام مسائل ہی نہیں بلکہ راہ حیات کے پیچیدہ ولاینحل مسائل کو اس سلیقے اور اعتماد کے ساتھ آپ ادا کرتے ہیں کہ ان کی تاثیر براہ راست روح تک اترتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

معاشرہ کے بدلتے تیور، غیروں کے طرز زندگی کی طرف میلانات ورجحانات اور روبہ زوال انسانیت پر بہت گہری نظر تھی۔ سماج میں پھیلے ہوئے غیر اسلامی نظریات وخیالات کے وہ ناسور جس کے زیر اثر ظہور پذیر ہونے والے اخلاق سوز اور غیر شرعی حرکات واعمال کا نہایت باریک بینی سے مشاہدہ کیا اور کردار وعمل کی ان تلخ سچائیوں کو اخلاص ووفا کے قلم اور خون جگر کی روشنائی سے الفاظ کے قالب میں ڈھال کر ان اعلیٰ مقاصد واہداف کے تحت دنیا کے سامنے پیش کیا جو کارساز حقیقی کو زندگی کے تمام شعبوں میں نظر انداز کرنے والے غافلوں کو راہ مستقیم پر گامزن کرنے میں اور معاشرے کو اسلامی تہذیب وتمدن سے آشنا کرنے اور انسان کے بگڑے ہوئے اخلاق وکردار کو سنوارنے میں مرکزی کردار ادا کرتے ہیں، جو خالق ارض وسما کے بھیجے ہوئے نظام حیات کے مطابق اور نبی برحق ﷺ کے لائے ہوئے قانون فطرت سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہیں اور حصول زر، نام ونمود، شہرت وریا کے نفسانی جذبات سے یکسر پاک ومبرا ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ کے پاس وہ دل تھا جو ملت کے حال زار پر رویا کرتا تھا، آپ کے پاس وہ چشم بصیرت تھی جو معاشرہ وسماج کے زوال واضمحلال کے منفی اسباب کو دیکھ لیتی تھی، وہ ایسے طبیب حاذق تھے جو مرض کی تشخیص بھی کرتا ہے اور نسخہ شفا بھی عطا کرتا ہے۔ آپ کبھی مسلسل اسفار میں خطرات سے آگاہ کرنے والے سنگ میل کے مانند اپنی تحریروں کے ذریعہ قوم کو بیدار کرنے کی کوشش کرتے اور کبھی بانگ درا بن کر قوم کو جادہ وپیا کرنے میں مشغول نظر آتے۔ حق یہ ہے کہ اس زر پرست اور مفاد پرست عہد میں جہاں تحریریں جنس بازار بن گئی ہیں اور قرطاس وقلم شہرت کا ذریعہ۔ آپ کی علمی، فکری، ادبی، تعمیری اور اصلاحی نگارشات راہ حق کے مسافروں کے لئے کامیابی کی منزل سے ہم کنار کرنے والی روشن مشعل اور کوہ وبیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی سے کم نہیں ہے۔

وہ جو ہم نے لکھی تھی زندگی کے بارے میں
حرف حرف روشن ہیں آج بھی وہ تحریریں

* * *

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی

مفتی محمد روح اللہ قاسمی صاحب
مدرسہ فلاح المسلمین گواپوکھر بھوارہ مدھوبنی

انسانیت کی معراج یہ ہے کہ وہ اپنے نفع ونقصان سے قطع نظر اپنے کو مرضیٔ مولیٰ کے آگے جھکا دے۔ اس کی پسند وناپسند، اس کا جینا مرنا سب کچھ صرف اور صرف ایک ذات وحدہ لاشریک لہ کے لئے ہوجائے۔ یہی ایمان کامل کی علامت ہے۔ عارف باللہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے شب وروز کا مطالعہ کرنے والا یہ واضح طور پر محسوس کرتا ہے کہ انہوں نے ’’مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولیٰ‘‘ کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا تھا۔ رب کی مرضی اور اس کے بنائے ہوئے اصولِ زیست سے سرموانحراف نہ اپنے لئے جائز سمجھتے تھے، نہ دوسروں کے لئے پسند تھا۔ جاذبِ نظر اور دلکش نظریات وتصوارت اور پرکشش نعرے جو شریعت کے میزان میں پورا نہ اتر سکے، انہیں اپنی جانب مائل نہیں کرسکے۔ وہ صرف اسی کو قبول کرنا جانتے تھے جو شریعت کے پیمانے میں پورا فٹ ہوجائے۔

قانون شریعت پر ایسا پختہ ایمان ویقین تھا کہ آپ کو اپنا پرانا چراغ جلانے پر اصرار تھا۔ اس لئے ہر طرح کی تنظیموں اور جماعتوں سے خود کو یکسو اور علیحدہ کر رکھا تھا، کیونکہ آپ کو اپنے تجربات کی روشنی میں خدشہ تھا کہ اس سے صحیح ڈگر پر باقی رہنا مشکل ہوجاتا ہے۔ درحقیت دین و شریعت میں کسی بھی طرح کے آمیزہ کے لئے آپ تیار نہیں تھے۔ خود آپ کے الفاظ میں ’’میں ایک ٹھیٹھ ملا ہوں، ظاہر بھی میرا ملا ہے، باطن بھی میرا ملا ہے۔ ایک رنگ رکھتا ہوں، دوسرا رنگ میں نے قبول کرنا سیکھا ہی نہیں، اس لئے اجنبی اجنبی سا لگتا ہوں مگر مجھے یہ’’ **مخلصا لہ دینی**‘‘ کے

خلاف معلوم ہوتا ہے، اس لئے دو رنگ کا آمیزہ دیکھ کر مجھے وحشت ہوتی ہے‘‘۔ (حدیث دوستاں: ص ۴۸۷)

اس لئے حضرت مولانا نے جس چیز کو غلط جانا اس کا برملا اظہار کردیا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ حضرت مولانا کو مطالعہ سے ازحد دلچسپی تھی۔ جنون کی حد تک مطالعہ کا شوق تھا، لیکن جہاں تک لکھنے کا سوال ہے، تو اس کی طرف طبیعت بالکل راغب نہیں تھی۔ جو کچھ انہوں نے لکھا ہے وہ بدرجہ مجبوری اور دینی تقاضے سے لکھا۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ مولانا کا قلم سیال تھا۔ لکھتے تھے اور بے تکان لکھتے تھے۔ المآثر یا ضیاء الاسلام اور دیگر مجلّات کی ادارتی ذمہ داریوں نے آپ کے قلمی سفر کو مسلسل جاری رکھا۔ آپ کی تصنیفات وتالیفات اور ادارتی نگارشات پر سرسری نگاہ ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے نہی عن المنکر کا فریضہ نبھاتے ہوئے معاشرہ کی دکھتی رگوں پر انگلیاں رکھی ہیں اور رسومات وبدعات اور جدت طرازیوں کے ناسور پر مرہم لگانے کا فریضہ انجام دیا ہے۔ معاشرہ میں پائی جانے والی برائیوں کی ہلاکت خیزی بیان کرتے ہوئے اس سے دور رہنے کی تلقین کی ہے۔ مسلمانوں کو دوسروں پر الزام ڈال کر پلہ جھاڑنے کے بجائے اپنے گریبان میں جھانکنے اور خود احتسابی اور اپنی اصلاح کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ساتھ ہی آپ کے قلم گہربار نے ان مسائل کو بھی موضوع بنانے کی جرأت کی جن کا تعلق بعض جماعتوں اور مختلف افراد وشخصیات سے ہے۔ اور ایک دینی فریضہ سمجھ کر اس زہر کے گھونٹ کو بھی پینا گوارا کیا۔ اور اس میں آپ کے نزدیک اپنوں اور غیروں کی تمیز نہیں تھی۔ یہ نہیں کہ یہ اپنی جماعت یا اپنا ہم خیال وہم مسلک ہے تو ذرا نرمی اور رواداری سے کام لے لیا جائے اور یہ دوسری جماعت کا ہے تو سارا غصہ اتار دیا جائے۔ بلکہ کلمۂ حق کی ادائیگی میں جتنی کوشش ضروی سمجھتے تھے، اس سے دریغ نہیں فرماتے تھے۔ اس میں آپ نے تعلق اور شخصیت پرستی یا اور دوسری وجوہات کو آڑے نہیں آنے دیا۔ بھلا جس نے اپنی زندگی کا سودا کسی سے کر رکھا ہو وہ ان چیزوں پر کیوں دھیان دیتا؟ اور اسے کیا پرواہوتی تعلقات کے بننے اور بگڑنے کی؟ کوئی ناراض ہو تو ہوا کرے جس کی رضامندی کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ راضی رہے، بس کافی ہے۔

پھر ایسا بھی نہیں ہے کہ مولانا کو اپنی رایوں پر اصرار رہا ہو کہ چاہے اس کے خلاف حق ہو

مگر اپنی بات سے پھرنا گوارا نہ ہو۔ ایسا نہیں تھا، بلکہ مولانا دین و شریعت سے جس بات کو ثابت سمجھتے تھے اسی کا اظہار کرتے تھے۔ چنانچہ ایک رفیق درس سے ایک مسئلہ میں اختلاف کرتے ہوئے یہ تحریر فرمایا ہے ”مولانا! یہ ضد نہیں تحقیق ہے۔ اس کے خلاف کوئی تحقیق آئے گی، بشرطیکہ وہ صحیح ہو تو مجھ سے زیادہ تسلیم کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔“ (حدیث دوستاں: ص ۶۸۵)

اس وقت اس نوعیت سے حضرت مولانا کی تحریروں کا مختصر جائزہ پیش نظر ہے اور یہ دکھانا مقصود ہے کہ آپ نے ہاں میں ہاں ملانے کی پالیسی اور ہوا کا رخ دیکھ کر سمت سفر طے کرنے کے طریقہ سے اپنا دامن بچائے رکھا اور دین کے روشن اور صاف چہرہ پر لگنے والے گرد کو صاف کرنے میں پوری ایمانی غیرت کا ثبوت پیش فرمایا ہے۔

تاریخ کے صفحات بتاتے ہیں کہ اسلام کا نام لے کر، اعلائے کلمۃ اللہ کا نعرہ بلند کر کے، پورے لاؤ لشکر کے ساتھ ماضی میں کتنے ایسے فتنوں نے سر ابھارا ہے جو اسلام کی خدمت کیا انجام دیتا، دانستہ یا نادانستہ مار آستین بن کر اسلام کی بنیادیں کھوکھلی کرنے میں اس نے اپنی پوری طاقت لگا دی۔ ”یہ فتنے تحریکات کی صورت میں اٹھے، بڑے کروفر سے اٹھے۔ جب کوئی تحریک اٹھی، ایسا محسوس ہوا کہ اب تک کی تمام نظریاتی بنیادیں اور جماعتی عمارتیں منہدم ہو جائیں گی اور اب سکہ صرف اسی تحریک کا بساط کائنات پر رواں ہوگا۔ عقلیں متحیر ہوگئیں، تجربات نے دانتوں تلے انگلی دبائی، دانائیاں چکرا کر رہ گئیں، اب نظام قدیم درہم برہم ہوا، اب رسم کہن کی بنیادیں ہلیں، اب زمانے کی صفوں میں شگاف پڑا، اب نظام نو کی کارفرمائی ہوئی۔ مگر پھر ایسا معلوم ہوا جیسے بگولہ اٹھا تھا، بیٹھ گیا، پانی کا بلبلہ ابھرا تھا، ٹوٹ گیا، پھر وہی پرانی روایات، پھر وہی پرانی ڈگر۔ نہ جانے تحریکیں کہاں دفن ہوئیں اور اس کے بانیین کس غار میں جا چھپے؟“ (مودودی صاحب اپنے افکار و خیالات کے آئینے میں: ص ۴)

ایسی ہی ایک تحریک ماضی قریب میں کتابوں اور لٹریچروں سے لیس ہو کر تجدید دین کا نعرہ لگاتے ہوئے اٹھی:

> ”مسلمانوں کی نگاہیں اس پر جم گئیں۔ اب انقلاب آیا، تب انقلاب آیا۔ مگر؟؟ مگر اس کا تو عالم ہی الگ ہے۔ اس کا دھارا دیکھو کدھر مڑ رہا ہے۔ اس کا حملہ کس پر ہو رہا ہے؟ یہ نظام

> باطل کی توڑ پھوڑ کرنے والا خود اپنی ہی بنیادیں کھوکھلی کرنے لگا۔ اسلام کے حاملین پر تنقید، اسلام کے پاسبانوں پر ضرب، دینی عقائد پر تیشہ زنی، عبادات کی الٹی تعبیر، دین کی غلط تفسیر۔ علماء نے محسوس کیا، فراست والوں نے خطرہ دیکھا، کچھ لوگ اٹھے، اس طوفان کو روکنا چاہا، مگر وہ کہاں رکتا؟ یہی بے چارے مطعون کئے گئے، باطل کی خدمت گار کہے گئے، ان پر چھینٹے اڑائے گئے۔ تاہم ہمت والے کب ہمت ہارتے؟ آخر اس طوفان کی تیز رفتاری روک ہی دی، مگر فتنہ مٹا نہیں، اپنا کام اب تک کئے جا رہا ہے، روکنے والے بھی مصروف کار ہیں۔ آپ سمجھے کون سا طوفان؟ جماعت اسلامی کا طوفان، فتنۂ مودودیت کا طوفان۔'' (ایضاً: ص ۵)

اس فتنہ نے بیک جنبش قلم اسلام کی روشن تاریخ پر ایسا حملہ بولا کہ اس کی ''تیغ ودستہ'' کی مار سے کوئی بچ نہیں سکا۔ حضرت مولانا نے علامہ یوسف بنوری کی عربی تالیف ''الاستاذ المودودی'' کا اردو ترجمہ کیا ہے اور اس کے مقدمے میں اس فتنہ کے خدوخال اور اس کی ہیبت ناکیوں کو واضح کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ کس طرح کمال ہوشیاری سے مودودی صاحب نے صدیوں پر محیط اسلام کے خادموں اور دین کے داعیوں کے بارے میں یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ وہ اسلام کی خدمت کے بجائے نظام کفر کی خدمت، عین اسلام سمجھ کر رہے تھے اور کمال فنکاری دیکھئے کہ:

دامن پہ کہیں چھینٹ نہ خنجر پہ کہیں داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

اگر انہیں ٹوکیے تو ''معصومیت کی منہ بولتی تصویر! لفظ لفظ سے مظلومیت آشکارا! نہ جانے علماء کو کیا ہوا کہ وہ آپ کی مخالفت پر کمر باندھے ہوئے ہیں۔'' (ایضاً/ص ۶)

حقیقت یہ ہے کہ مودودی صاحب نے اپنی کتابوں اور لٹریچروں میں زہر کو ایسے داخل کیا ہے کہ:

> ''اس کا انتخاب بے حد دشوار، کیمیاوی تحلیل اور مشکل، بظاہر اس میں زہر معلوم نہیں ہوتا، مگر ہے پوری مقدار میں۔ یہ بے چارے علماء کہیں مقدار زیادہ پاتے ہیں تو اسے ہی نکال کر دکھاتے ہیں۔ وہاں سے الگ کر کے زہر صاف معلوم ہونے لگتا ہے۔ ہمارا بھائی اصرار کرتا ہے کہ اس کو کتاب میں لے جا کر دیکھو۔ وہاں شکر کی خول رکھی ہوئی ہے۔ درحقیقت بات وہاں بھی نہیں بدلتی ہے، بس ڈھک جاتی ہے۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ قصور کس کا ہے؟ زہر چھپانے پر

جو اصرار کرتا ہے اس کا، یا جو ظاہر کر دیتا ہے اس کا؟'' (ایضاً: ص ۲۵)

مودودی صاحب کو قدرت نے قلم و بیان کی ان گنت خوبیوں سے مالا مال کیا تھا۔ بہتر سے بہتر اسلوب اور خوبصورت سے خوبصورت تعبیر و تراکیب میں اپنی بات قاری کے ذہن و دماغ میں اتار دینے کا فن انہیں خوب آتا تھا اور اسی کمال نے وہ کمال دکھلایا ہے کہ ان کی غلطیوں کو نشان زد کرنا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں تھا۔ عام طور سے کسی لفظ اور کسی جملہ کو پکڑ کر آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ نے یہ غلط لکھا ہے، مگر ان کی تحریروں کو پڑھنے سے ایک عام قاری کا تأثر سلف کے بارے میں جو کچھ قائم ہوتا ہے، وہ انتہائی بھیانک ہے۔ یہی وہ خطرناکی ہے جس پر اکابر نے انہیں ٹوکا اور جادۂ حق سے ہٹ جانے پر انہیں توجہ دلائی۔ ہوسکتا ہے کہ لغات کا سہارا لے کر اپنی معصومیت کا وہ رونا رولیں مگر ''یاد رکھئے کہ ماحول کی طاقت کو کوئی ڈکشنری شکست نہیں دے سکتی۔'' (ایضاً: ص ۲۷)

یہ تو سفینہ کی باتیں ہیں۔ اس سلسلے میں مولانا کا اصل کارنامہ تو اب تک سینوں میں موجود ہے، جو پتہ نہیں کب زیبِ قرطاس ہو۔ بلریا گنج میں جماعت اسلامی کا مرکز ہونے کی وجہ سے اعظم گڑھ کے علاقوں پر اس جماعت کے اثرات نمایاں ہیں۔ جب حضرت مولانا نے مختلف مقامات پر اپنی شادابی بکھیرنے کے بعد اعظم گڑھ کی ایک چھوٹی بستی ''شیخوپور'' کو اپنی محنت کا میدان بنایا تو ساری بے سروسامانیوں کے باوجود بھی ایک معمولی مکتب دیکھتے ہی دیکھتے پورے ملک میں اپنی نمایاں شناخت بنا کر نگاہوں کو خیرہ کرنے لگا اور وہ مکتب اسبابِ راحت کی فراوانی اور بلند و بالا عمارتوں کی بنیاد پر نہیں، بلکہ ٹھوس تعلیم اور بے مثال تربیت کے باعث طالبان علوم نبوت کے لئے مقناطیس ثابت ہوا۔ سچ جانئے تو مولانا نے اس پلیٹ فارم ''مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور'' سے مودودیت کے بڑھتے اثرات پر لگام کسنے اور اس طوفان بلاخیز کے سامنے سدِ سکندری بن کر حائل ہونے کا جو قابل فخر کارنامہ انجام دیا ہے، وہ ردِ مودودیت کی تاریخ کا ایک زریں باب ہے۔ پورا کا پورا علاقہ اس زد میں آجاتا، اگر مولانا اپنی تربیتی، اصلاحی اور دعوتی جدوجہد سے کام نہیں لیتے۔ انہوں نے اس کی بزم میں جا کر اسے پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔

اہل تشیع کی دراز دستیاں اسلام کے مقدس و پاکیزہ گروہ کے جیب و گریبان کا تماشا کرنا

چاہتی تھیں۔ ''صحابہ کرام میں خاص طور سے دو بزرگ ان ناروا حملوں کے زیادہ تر ہدف بنائے گئے۔ اور یہ دونوں بزرگ وہ ہیں جو اہل سنت کے نزدیک فضل وکمال اور شرف وکرامت میں تمام امت سے بڑھ کر ہیں، یعنی حضرات شیخین سیدنا ابوبکر وسیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہما۔'' اس فرقہ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے لئے خلافت بلافصل کا منصب تجویز کیا'' اور اسی گمان باطل کے نتیجے میں اس گروہ کو حضرات شیخین سے سخت عناد ہوگیا۔ ان کے خیال میں یہ دونوں حضرات نعوذ باللہ غاصب خلافت تھے۔'' اور اسی لئے یہ قضیہ اٹھایا گیا کہ حضرات شیخین نعوذ باللہ حکومت و امارت کی فکر میں سرگرداں ہونے کی وجہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز وتکفین میں شریک نہیں ہوسکے

بظاہر تو یہ ایک چھوٹا سا سوال ہے، مگر یہ اپنے اندر جو زہرناکی رکھتا ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ گویا:

> ''ان حضرات کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا رنج نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ یہ حضرات خلافت وامارت کے آرزومند تھے۔ تیسرے یہ کہ اس اندیشے سے کہ کہیں خلافت دوسروں کے ہاتھ میں نہ چلی جائے، ضروری ہنگامی تقاضوں کو نظر انداز کر کے خلافت طلبی میں منہمک ہوگئے۔ چوتھے یہ کہ اسی انہماک کے باعث تجہیز وتکفین میں شریک نہ ہوسکے۔''

واقعہ یہ ہے کہ اس چھوٹے سے سوال کی بنیاد پر امت کی دو سب سے معتبر شخصیت داغدار ہوجاتی ہے۔ حضرت مولانا نے اس سوال کو حل کرنا ضروری سمجھا اور آپ نے صورت حال کی صحیح منظرکشی کرتے ہوئے اس وقت کے حالات کا جائزہ لیا اور اس نازک موڑ پر امت کو انتشار سے بچانے اور تمام امور کو انجام دینے میں حضرات شیخین اور بالخصوص حضرت صدیق اکبرؓ کے قائدانہ رول کو خود اہل تشیع کی کتابوں اور دیگر حوالہ جات سے ایسا واضح فرمایا ہے جس کے بعد حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کے بارے کوئی سرپھرا ہی اس طرح کی بکواس کرسکتا ہے۔ (دیکھئے: علوم ونکات: ج۲ص۹۷تا۱۰۷)

جماعت اہل حدیث کی کمزوریوں اور ان کی غلطیوں بھی پر مولانا نے انہیں ٹوکا ہے:

> '' یہ جماعت عمل بالحدیث کا دعوی کرتی ہے۔ دعوی تو بہت اچھا ہے...... لیکن اس جماعت کے تیور ایسے ہیں، جیسے دوسرے لوگ عمل بالحدیث سے تہی مایہ ہیں۔ چنانچہ ان کا یہ تیور

> ان کی تحریروں اور تقریروں سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ صراحۃً اپنے علاوہ دوسروں کو عمل بالحدیث سے منحرف قرار دیتے ہیں۔ عمل بالحدیث کے دعویٰ کا سہارا لے کر وہ جس پر چاہتے ہیں، تنقید کا تیشہ چلا دیتے ہیں۔'' (حدیث درد دل: ص ٥٠، ٥١)
>
> ''یہ وہ گروہ ہے جو اپنے کو حقانیت کا علمبردار قرار دیتا ہے، جو اپنے ٹولے کے علاوہ کسی فرد یا جماعت میں حقانیت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔...... بے جا ضد اور ہٹ دھرمی اس کا شعار ہے، ایسی جامد ذہنیت اس گروہ کی ہے کہ اسے ہر شخص اہل باطل ہی نظر آتا ہے۔'' (علوم ونکات: ج٢ص ٢٩٧)

حضرت مولانا نے بادل ناخواستہ اور بدرجۂ مجبوری اس جماعت کو سمجھانے کی کوشش کی ہے اور ان اسباب کی جانب اشارہ کیا ہے جن کی وجہ سے ''کسی قدر جوابی کاروائی پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔''

صورت حال یہ ہے کہ ''ان کی بے محابا تنقیدات سے فقہی احکام میں غلو اور تشدد پیدا ہوتا ہے'' کیونکہ جو ''مسائل کتاب وسنت کی قوی بنیادوں پر قائم ہیں، اب انہیں قطعی خلاف سنت قرار دے کر دوسرے کسی طرز عمل میں سنت وشریعت کو منحصر کر دینا، یہی تشدد اور غلو ہے''۔ نیز ''اس کی وجہ سے بہت سے لوگ تشکیک میں مبتلا ہوتے ہیں'' کیونکہ ''جو احناف ان سے ناواقف ہوتے ہیں وہ اپنے مسلک کی طرف سے شک وشبہ کے شکار ہونے لگتے ہیں'' اور انہیں یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ ان کی زندگی کے یہ شرعی اعمال جسے اب تک وہ کرتے آئے ہیں یا تو قرآن وسنت کے خلاف ہو کر بجائے اجر وثواب کے باعث گناہ ہو رہے ہیں، یا کم از کم اس کے پشت پر قرآن وسنت کے مضبوط دلائل موجود نہیں ہیں اور یہ تشکیک انہیں اپنے اعمال سے برگشتہ کرنے لگتی ہے۔ اور ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ''ان کی تنقیدوں کے ضربات سے بہت سے ائمہ متقدمین، مشائخ اور بزرگان دین کی آبرو مجروح ہوتی ہے اور اس کے نتیجے میں پچھلوں کا رشتہ اگلوں سے ٹوٹنے لگتا ہے، جو ان کے لئے خسارہ کا باعث ہے۔'' (حدیث درد دل: ص ٥٢)

جن مسائل کو لے کر اس جماعت نے احناف کے خلاف محاذ آرائی کی ہے، ان کے دلائل کتابوں میں تفصیل سے موجود ہیں۔ حضرت مولانا نے ان مسائل کو ہاتھ لگا کر دفاعی پوزیشن

نہیں اپنائی، بلکہ کبھی ڈانٹ کر، کبھی پیار سے، کبھی تھپکا کر اس جماعت کو سمجھانے کی خیر خواہانہ کوشش کی ہے۔

کبھی آپ نے اس جماعت کی خدمت دین کے اس نرالے انداز پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ ”حدیث پر عمل کرنا سر آنکھوں پر...... لیکن ان چیزوں کا نام لے کر مسلمانوں کے نہیں، بلکہ علما، فقہا، مشائخ وصوفیہ اور بزرگان دین کے سواد اعظم کو گمراہ و بدعتی و مشرک قرار دینا، یہ کس عمل بالحدیث کا کرشمہ ہے؟“ (علوم ونکات: ج۲ ص۳۰۱)

کہیں انہیں آئینہ دکھلایا ہے کہ تمہاری بے حجابانہ چلتی ہوئی تلواروں سے تمہارے ”صف اول کے ائمہ کی گردنیں کٹی پڑی دکھائی دیتی ہیں“۔ کہیں انہیں اپنا بھی دامن اور بندِ قبا دیکھنے کی تلقین کی ہے اور ان کے اس رویہ پر افسوس کا اظہار کیا کہ جرح وتنقید کا ”حق وہ دوسروں کو دینے کے لئے تیار نہیں ہیں، اور اگر کسی نے ان کے حق میں ذرا بھی زبانِ تنقید کھولی تو اس جماعت کے چھوٹے بڑے سب بوکھلا جاتے ہیں، پھر جواب بنے یا نہ بنے، بات معقول ہو یا نامعقول، جوابی کاروائی ضروری ہو جاتی ہے، گویا وہ زبان حال سے اعلان کرتے ہیں کہ ہم جس کی گردن پر چاہیں چھری رکھ دیں، لیکن ہمیں چاقو کی نوک بھی برداشت نہیں۔“

کبھی انہیں اپنا محاسبہ کرنے کی تلقین کرتے ہوئے سب سے بڑی غلطی پر انہیں متنبہ کیا ہے کہ:

> ”یہ لوگ اپنے خیالات کو معصوم نہ سمجھیں۔ اپنی عقل کو عقل کل قرار نہ دیں اور حق کو اپنے ہی محدود حلقے میں منحصر نہ کریں۔ اپنے حق میں بھی غلطی کا امکان باقی رکھیں۔ دوسروں کے اقوال واحوال و مقاصد کو سمجھیں۔ آیات الٰہی اور احادیث نبوی کو کھلونا نہ بنائیں اور بے محابا کفر کے فتوے نہ صادر کریں اور خدا کی گرفت سے ڈریں۔“

کہیں انہیں یہ سمجھانا چاہا ہے کہ ”غلط کار لوگ ہر جگہ داخل ہو جاتے ہیں، اور غلطی ہر جگہ رہ جاتی ہے، اور غلطیوں پر روک ٹوک کرنا عین تقاضائے ایمان ہے اور غلط کاروں کو متنبہ کر دینا، ان کی نشاندہی کرنا بالکل ضروری ہے“۔ لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ایک مسلمہ حقیقت اور ”اخلاص اور احسان کو حاصل کرنے کا طریقہ اور اس تک پہنچنے کے راستہ“ کو صرف اس بنیاد پر انکار

دیا جائے کہ اس میں کچھ غلط کار لوگ داخل ہو گئے ہیں؟ یہ تو ’’مسلمانوں کو ان کے تابناک ماضی سے کاٹ کر رکھ دینا ہے۔‘‘ کیا اسلام کو (خاکم بدہن) اس بنیاد پر چھوڑنے کا تصور بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے ماننے والے اچھے نہیں رہ گئے؟۔

ایک جگہ حضرت مولانا نے مسکراتے ہوئے اس جماعت کا بار بار شکریہ بھی ادا کیا ہے کیونکہ احناف ’’میں ایک طرح کا ٹھہراؤ محسوس ہونے لگا تھا، ایسا لگتا تھا جیسے ان پر جمود طاری ہو گیا ہو‘‘۔ مگر اس جماعت کی بے وقت کی راگنی سے ’’ان میں نئی حرکت پیدا ہوئی۔ انہوں نے دلائل (کے لئے) کتاب وسنت کے ذخیروں کو از سر نو کھنگالنا شروع کیا، انہیں محسوس ہوا کہ حنفی مسلک مضبوط بنیادوں پر کھڑا ہے۔‘‘ اور اس طرح ’’علوم ومعارف کا ایک نیا دبستان کھل گیا، محدثین کی ایک گراں فوج سامنے آ کھڑی ہوئی، اس سے دنیا کو زبردست علمی فائدہ پہونچا۔ گویا ’’اس سے بڑی خدمت اور کیا ہوگی‘‘ کہ اس جماعت نے دین کے ’’خدمتگاروں کو گھونسہ لگا کر جگاتے‘‘ رہنے کا فریضہ انجام دیا ہے۔ (دیکھئے: حدیث درد دل: ص ۳۵ تا ۶۳)

بعض نظریات کے پیش نظر ایک فضا بنانے کی کوشش ہوتی رہتی ہے کہ ’’کثرت عبادت‘‘ بدعت ہے۔ نصوص قطعی اس کی مؤید نہیں ہے اور جو واقعات اس سلسلے میں سلف سے منقول ہیں، وہ سب بے سرو پا باتیں ہیں یا مبالغہ پر مبنی ہیں۔ یہ رجحان اتنا خطرناک ہے جس کی زد میں بڑے بڑے اساطین علم وفن آ جاتے ہیں۔ صورت حال یہ ہے کہ جہاں نصوص سے اس کی تائید وترغیب ثابت ہوتی ہیں، وہیں صحابہ کرام اور اس کے بعد کے طبقات کی بڑی جماعت کا معمول کثرت عبادت کا رہا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جس چیز میں لذت ومزہ مل جائے اس میں تھکان کا احساس جاتا رہتا ہے۔ دور کیوں جاتے ہیں؟ نظر اٹھا کر گرد وپیش کا جائزہ لیجیے۔ جس بچہ کو کسی کھیل کی لت پڑ جائے، ہزار منع کرنے کے باوجود اس میں ایسا انہماک ہوتا ہے کہ نہ والدین کی ناراضگی اور ان کی تنبیہ کا خوف، نہ کھانے پینے کا خیال، نہ راحت وآرام کی فکر۔ بس اپنے مشغلہ سے دلچسپی ہوتی ہے اور گھنٹوں اس میں گذار کر بھی سیری نہیں ہوتی۔ بعض کھیل تماشوں پر نگاہ دوڑائیں کہ اس کے ناظرین پوری پوری رات آنکھوں میں گذار دیتے ہیں اور وقت گذر جانے کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ جب دنیا کے امور بلکہ گناہوں کی صورت حال یہ ہے تو اللہ عزوجل کے پاک نام لینے میں کیا

کچھ کیفیت بن سکتی ہے اور کیا مزہ مل سکتا ہے؟ سوچ سے بھی باہر ہے۔ اب لوگ دنیا میں انہماک کی وجہ سے عبادتوں کے عادی نہیں رہ گئے، اس لئے انہیں دو چار منٹ بھی نماز اور دوسری عبادتوں میں وقت گذارنا مشکل ہوجاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے کوتاہ ہمتوں کے سامنے جب عبادتوں میں سلف کے مجاہدات کا تذکرہ ہوگا تو سوائے انکار اور جھوٹ پر محمول کرنے اور اسطورہ سمجھنے کے ان سے کوئی بات نہیں بن پڑے گی۔ اگر کسی کو پھول کی خوشبو یا شہد کی مٹھاس کا احساس نہیں ہوتو اس میں قصور کس کا ہے؟۔

حضرت مولانا کی عرصہ سے خواہش تھی کہ اس حوالہ سے حاصل مطالعہ سپرد قلم کیا جائے۔ اسی دوران ختم بخاری کی ایک تقریب میں اس موضوع پر بات چل پڑی اور حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی کثرتِ عبادت کا تذکرہ آ گیا، بس کیا تھا، کسی بندۂ خدا کے پیٹ میں مڑور شروع ہوگیا۔ حضرت مولانا سے بحث پھر خط وکتابت کرنے لگا۔ آپ نے جواباً انہیں تحریر فرمایا:

> ”آخر بعض صحابہ اور تابعین سے رات رات بھر عبادات میں مشغول رہنا صحیح نقول سے ثابت ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ایک رات میں ایک رکعت میں پورا قرآن پڑھنا منقول ہے۔ اب یا تو آپ کی عقل کے مطابق ان سب کو خلافِ سنت اور غلط کار کہئے یا جو کچھ نقل کیا گیا ہے اس کو جھوٹ اور افتراء قرار دیجئے۔ یہ دونوں کام آپ تو بے تکلف کرلیں گے، کیوں کہ آپ کے نزدیک قابل اعتماد صرف آپ کی عقل ہے، یعنی آپ کی عقل معصوم ہے اور باقی سب غیر معصوم۔ مگر ہم لوگوں کے بس کی یہ بات نہیں ہے کہ اپنی ناتمام عقل کے بل بوتے پر اتنی بڑی جرأت کریں۔ اور ہم ایسی عقل اور ایسے علم کو دور سے سلام کرتے ہیں، جو اکابر امت اور سلف صالح کی پاکیزہ زندگیوں کو خلاف شریعت وسنت یا کذب وزور سے متہم سمجھے۔“

مزید تحریر فرماتے ہیں:

> ”اگر امام ابوحنیفہؒ پوری رات نماز پڑھتے ہیں، عشاء کا وضو ان کے لئے فجر میں کام آتا ہے یا اور بہت سے لوگوں کا یہی حال ہے تو اپنے ناتمام علم اور ادھوری عقل لے کر ان کی کھال نہ نوچیۓ، ان کا گوشت نہ کھائے۔ ایک عام مسلمان کا گوشت، کھانے والے کے حق میں بہت زہریلا ہوتا ہے اور یہ حضرات تو اکابر امت ہیں۔ ان کا گوشت اتنا زہریلا ہوگا کہ محتاج بیان

نہیں۔ ان کا گوشت اپنے کھانے والوں کو کھا جائے گا۔‘‘ (حدیث دوستاں: ص۲۳، ۲۲۔۷)

اس واقعہ سے اس خیال میں مزید پختگی آ گئی کہ اس موضوع پر کوئی وقیع تحریر آنی چاہئے۔ اسی دوران حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک عربی رسالہ ’’**اقامة الحجة علی ان الاکثار فی التعبد لیس ببدعة**‘‘ آپ کے ہاتھ آیا جو موضوع سے متعلق بڑا جامع رسالہ تھا۔ آپ کو منہ مانگی مراد مل گئی۔ اس کا ترجمہ اور تلخیص کر کے ’’کثرت عبادت عزیمت یا بدعت‘‘ کے نام سے شائع فرمایا جس میں دلائل سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ کثرت عبادت نہ صرف محمود ہے، بلکہ سلف سے خلف تک کا یہ معمول بھی رہا ہے۔

جادۂ حق سے انحراف کی ایک اور شکل ملاحظہ کیجیے۔ انفرادیت کی چاہ نے کیسے کیسے گل کھلائے ہیں۔ جب آدمی تربیت کی بھٹی سے گذرے بغیر نرا علم لے کر اٹھتا ہے تو خودنمائی کا جلوہ مختلف بہانوں سے جلوہ نما ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ اس فتنے کی طرف راہنمائی کرتے ہوئے سنن دارمی کے حوالہ سے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا ایک اثر آپ نے نقل فرمایا ہے اور اس کی وضاحت کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ:

> ’’بکثرت لوگوں میں بالخصوص وہ لوگ جن کو ذہانت وذکاوت اور ہمت وحوصلہ کی وافر مقدار قدرت کی جانب سے عطا ہوئی ہے، اور انہوں نے نفس کا تزکیہ نہیں کیا ہے، ایسے افراد میں خودنمائی اور عوام الناس میں مقتدائیت اور اپنی انفرادیت کے اظہار کا زبردست جذبہ ہوتا ہے، لیکن اس کا ظہور اس کے اصلی رنگ وروپ میں نہیں ہوتا، کیونکہ اس صورت میں ان کی کوئی حیثیت باقی نہ رہے گی اور مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ یہ کمزوری کبھی علم وفضل کے لباس میں نمایاں ہوتی ہے، کبھی تدین وتقوی کے رنگ میں ظہور کرتی ہے، کبھی اصلاح ورہبری کا لباس پہن کر آتی ہے۔ ایسے لوگ بظاہر نہایت دردمند، قوم کے بہی خواہ، دین وملت کے لئے مضطرب اور اسلام اور اہل اسلام کی ہمدردی میں بے قرار نظر آتے ہیں اور اس کے ساتھ اعلی درجہ کے اخلاص اور نیک نیتی کا راگ الاپتے ہیں، مگر یہ سب کچھ ظاہری نمائش سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ اندرون طبیعت میں صرف ایک جذبہ ہوتا ہے کہ کسی طرح لوگوں کی مقتدائیت حاصل ہو جائے، یا کم از کم لوگوں میں ان کی انفرادیت کا سکہ بیٹھ جائے۔ عوام خواص میں شہرت حاصل ہو جائے،

> تعریفیں ہوں، سب پر چھا جائیں، ہر ایک ان کے پیچھے چلنے پر مجبور ہو۔ باطن میں یہ نیت شعوری یا غیر شعوری طور پر تہ نشیں ہوتی ہے، لیکن اگر کوئی شخص اس نیت کا اعلان کر کے میدان میں اترے تو کون اس کی بات پوچھے گا؟'' (حدیث درد دل: ص ٢٨)

> ''ہم اس دور میں عرصہ سے یہ تماشہ دیکھ رہے ہیں کہ جو کوئی حوصلہ مند اور ذہین ہوا، اس کے پیٹ میں پہلے یہی درد اٹھتا ہے کہ لوگ اس کی پیروی کیوں نہیں کرتے؟ پھر وہ الٹے سیدھے نظریات وضع کرتا ہے اور ان پر ایسا اصرار کرتا ہے کہ جیسے اگر انہیں تسلیم نہ کیا جائے تو اسلام کی عمارت ہی منہدم ہو کر رہ جائے گی۔ ایسے لوگوں سے ہمیشہ چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ ہر چمک دار چیز سونا نہیں ہوتی۔'' (حدیث درد دل: ص ٣٠)

کچھ اسی طرح کا ایک تماشہ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ ہندستان میں ایک صاحب اپنی نرالی معلومات کی بنیاد پر خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ انتہائی نامانوس اور اجنبی الفاظ کا استعمال کر کے اقامت دین کا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔ ان کی نگاہ میں امت صدیوں سے فقہی طریقۂ فکر کی عادی ہو چکی ہے اور ان کے دل دو دماغ کو علمائے متقدمین کی شخصیت نے مبہوت کر رکھا ہے، جبکہ اسلام ربائیت اور پاپائیت کی طرح مولویت کی اجارہ داری کا انکاری ہے۔ آں جناب کے نزدیک کسی کو کسی کی صحیح العقیدگی پر شبہ وارد کرنے کا حق نہیں۔ اپنے مخصوص فکر ونظریہ کے تحت مزعومہ بحث و مباحثہ میں شامل ہونے کے لئے حضرت مولانا کو ایک خط لکھا اور اپنا مدعا بیان کرتے ہوئے مولانا کو بحث میں حصہ لینے کی دعوت دی۔ حضرت مولانا نے ان کی تحریر کا جو پوسٹ مارٹم کیا ہے وہ تو قابل مطالعہ ہے ہی، آپ کی غیرت ایمانی بھی لائق دید ہے۔ آپ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

> ''اب سنئے کہ آپ کے خط کو پڑھ کر مجھے جو الجھن ہوئی وہ تو ہوئی، میں اس سوچ میں پڑ گیا کہ ہم لوگوں کا ایمان کیا اتنا کمزور ہو گیا ہے کہ لوگ اس طرح کے باغیانہ خیالات کا مخاطب ہم لوگوں کو بنانے کا حوصلہ کرنے لگے ہیں؟''

آگے مولانا نے فرمایا کہ:

> ''میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ ان خود ساختہ خیالات کے پھندے سے نکلئے اور قرآن و

> سنت کی جو تشریح بالاتفاق چلی آرہی ہے، اس سے انحراف مت کیجیے ......خدا کے حضور اپنا مصنوعی اسلام لے کر نہ جایئے، وہ قبول نہ ہوگا۔ وہی اسلام قبول ہوگا جو امت میں اجماعی طور پر مقبول رہا ہے۔ ان نئی نئی تشریحات وتعبیرات سے ممکن ہے دولت کے انبار سے آپ مستفید ہوں، خواہشات کی آزادی میں آپ کو لطف آئے، لیکن نہ یہ دولت کام آئے گی اور نہ شہرت باعث نجات ہوگی، نہ خواہشات کی لذتیں باقی رہیں گی۔ اللہ سے ڈریئے اور صراط مستقیم پر قائم رہیے۔'' (حدیث دوستاں: ص۱۸۷)

اس طرح کے اور بھی نمونے ہیں جن پر حضرت مولانا کی وقیع تحریریں موجود ہیں۔ اصل میں مولانا کے سامنے کوئی ایسی بات آجائے جس سے دین کے صاف چہرہ کی شبیہ دانستہ یا نادانستہ خراب ہو رہی ہو اور اس سے معاشرہ کا دینی مزاج بگڑنے کا اندیشہ ہو، یا غلط فہمی پھیل سکتی ہو تو آپ نے اس پر خاموش رہنا گوارا نہیں کیا اور تحریف وتاویل کا پردہ چاک کرتے ہوئے دفاع دین کا حق ادا فرمایا ہے۔ ''مسئلہ''ایصال ثواب'' ہو یا ''نقد بر حقیقت رجم'' یا اور کئی مضامین ومکتوبات، اس کے مطالعہ سے اس پر صاف روشنی پڑتی ہے۔

ان تعقبات وتنقیدات میں آپ محسوس کریں گے کہ کہیں کہیں قلم میں شوخی اور لہجہ میں تیزی آگئی ہے، مگر مولانا نے اس کے لئے بعض وجوہات کی بنیاد پر معذرت کی ضرورت نہیں سمجھی ہے۔ اس تیزی کا احساس کچھ اپنوں کو بھی تھا۔ اس سلسلے میں ایک بڑے کرم فرما کا خط آیا، جس میں لب ولہجہ میں نرمی برتنے کی فہمائش کی گئی۔ آپ نے انہیں جواباً تحریر فرمایا:

> ''کسی کے دور ونزدیک ہونے کے خوف اور اندیشے سے اتنی احتیاط لب ولہجہ میں نہیں برتی جاسکتی، جو خوشامد کے دائرے میں آجائے۔ جس کا جی چاہے بدکے اور دور ہو، اور جس کا جی چاہے مانے اور قریب ہو۔ دین کی جڑ کھودنے والوں کے ساتھ وہ رویہ اختیار کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں ہے، جس کی آپ نے تلقین فرمائی ہے۔''

البتہ آپ نے اس کی پوری وضاحت فرمائی کہ:

> ''ہاں کوئی بات علم وتحقیق کی کسوٹی پر غلط ثابت ہو تو ہم بخوشی اس کا اعتراف کرلیں گے اور اس سے رجوع کرلیں گے۔'' (حدیث دوستاں: ص۶۳)

کوئی یہ نہ سمجھے کہ اختلاف مسلک ومشرب کی بنیاد پر یہ نکتہ چینی کی گئی ہے۔ نہیں۔ حاشا و کلا ہرگز نہیں۔ جن حضرات کو حضرت مولانا کی صحبت ومعیت کا شرف حاصل ہوا ہے، وہ خوب جانتے ہیں کہ دین وشریعت کے معاملہ میں حضرت کا مزاج کیا تھا؟ دینی غیرت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ آپ نے اپنے اساتذہ واکابرین سے قرآن وحدیث کی روشنی میں جو کچھ سیکھا تھا، اس سے سرمو انحراف کرنا نہیں جانتے تھے۔ دین کے معاملہ میں کسی سے کوئی سمجھوتہ کرنا آپ نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ جو غلط جانا اسے برملا کہہ دیا۔ کوئی ناراض ہوتو ہوا کرے۔ خدا ناراض نہ ہو۔ اسی لئے مولانا نے بجا شکایت کی ہے کہ معاشرہ کچھ ایسا بن گیا ہے کہ میں ''اجنبی اجنبی سا لگتا ہوں، کیوں کہ عام طور پر دورنگ کا ماحول بن گیا ہے۔'' (کمامر)

جماعت تبلیغ اکابرین دیوبند کی قائم کردہ جماعت ہے اور اس سے عرب وعجم کو روشنی مل رہی ہے۔ ہمارے تبلیغ کے بعض احباب کو دبے لفظوں میں شکایت رہی ہے کہ حضرت مولانا تبلیغ کے مخالف رہے ہیں اور انہوں نے اس جماعت پر کڑی تنقید کی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے جماعت پر نہیں، بلکہ اس کی بعض خامیوں پر متنبہ کیا ہے۔ جماعت کا تعارف اور اس کے فوائد و کارنامے کا اعتراف مولانا ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''تبلیغی جماعت ایک خاص انداز سے مسلمانوں میں دینی خدمت میں مشغول ہے۔ اسے خدمت کرتے ہوئے لمبا عرصہ گزر گیا۔ اس کا دائرہ کار بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اس کا حلقۂ اثر اب عرب وعجم کو محیط ہونے لگا ہے۔ عرب علما وعوام نے اس کی خدمت کو پسند کیا۔ عرب ممالک کے قافلے سرگرم سفر نظر آنے لگے۔ ہندستان میں بھی کثیر تعداد میں ان کی جماعتیں آنے لگیں۔ یہ خالص عوامی طرز کی خدمت ہے جو سادگی سے انجام پاتی ہے۔''

مولانا رقم طراز ہیں:

> ''اس کے ذریعہ بے شمار ایسے لوگ جو خدا کے آستانہ سے نہ صرف محروم، بلکہ باغی اور مجرم تھے، یکا یک اللہ کے دربار میں حاضر ہوکر سجدہ ریز ہونے لگے۔ جنہیں اسلام کی ابتدائی چیزوں کی خبر نہیں تھی، وہ اس میں لگ کر دین وایمان کے نمونے بن گئے۔ ایمان کی ایک تازہ بہار چمنستان اسلام میں خیمہ زن ہونے لگی۔ تبلیغی جماعت میں اسلام کے نام لیوا سبھی جماعتوں کے

صالح افراد شامل ہونے لگے۔‘‘

مزید فرماتے ہیں:

’’تبلیغی جماعت کا طریقہ کار مثبت اور مفید ہے، اور مفید بھی ایسا کہ لگے ہاتھوں فائدہ دکھائی دینے لگتا ہے۔ مسجدیں نمازیوں سے بھرنے لگتی ہیں۔ چہروں پر اسلام کا نور جھلکنے لگتا ہے پھر تبلیغی جماعت کے بڑے بڑے اجتماعات بھی ہوتے ہیں، جن میں شریک ہونے والے ہزاروں میں نہیں، لاکھوں میں گنے جاتے ہیں۔‘‘ (حدیث درددل: ص ۳۷)

لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس کے بے شمار فوائد کے پیش نظر اس کی کمیوں اور کوتاہیوں سے صرف نظر کرلیا جائے اور کام ٹھیک کررہی ہے تو رخنہ اندازی کا فائدہ کیا ہے؟ کی پالیسی پر عمل کیا جائے۔

حضرت مولانا نے ’’دیانت وامانت کا تقاضہ‘‘ سمجھ کر اکابرین جماعت کو اس طرف متوجہ فرمایا کہ مقصود چونکہ اللہ کی رضاء ہے جو نبوی طریقہ سے ہی حاصل ہوسکتی ہے، اس لئے:

’’اگر کوئی چیز نامناسب اس میں داخل ہوگئی ہو تو اسے چھانٹ دیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بعد ہر شخص، ہر جماعت ہر تحریک جو دینی خدمت کرتی ہے، وہ مکلّف ہے کہ اپنے طریقۂ کار کو قرآن وسنت پر پیش کرے، حضرات صحابہ کے تعامل پر پیش کرے۔ معیار یہی ہے۔‘‘

آپ نے واضح کیا ہے کہ:

’’تبلیغی جماعت بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ تحزب وعصبیت سے برکنار ہوکر یہ ضرور دیکھنا چاہئے کہ اس میں کوئی ایسی بات تو نہیں آچلی ہے جسے نہیں ہونا چاہئے۔‘‘ (علوم و نکات: ج ۲ ص ۲۲۱)

کئی اہم نکات کی طرف توجہ دلاتے ہوئے آپ نے یہ واضح فرمایا ہے کہ:

’’حضرت مولانا محمد الیاس صاحب نور اللہ مرقدہ نے جن خطوط پر جماعت کی تحریک چلائی تھی اور ان کے جو خیالات تھے، ان سے اب یہ جماعت بہت ہٹ چکی ہے‘‘۔ (ایضا: ۲۲۸)

واضح رہے کہ جماعت کی اکثریت بے چارے ان عام ناخواندہ مسلمانوں کی ہوتی ہے

جو کبھی اپنی زندگی میں دین سے دور تھے۔ اس جماعت کی چلت پھرت اور محنت نے انہیں خدا و رسول کے قریب کیا، پھر ان میں بھی یہ جذبہ کوٹ کوٹ کر بھر جاتا ہے کہ دوسرے بھائیوں کو بھی دین سے قریب کرنے کے لئے ان کی خوشامد کی جائے، جس کے نتیجے میں جماعت میں بعض حد سے بڑھی ہوئی بے اصولیاں در آئیں۔ حضرت مولانا نے کھل کر اس پر نکیر فرمائی ہے کہ:

> ’’غیر نبی کے ایجاد کردہ کسی طریقے کو خواہ وہ تجربہ سے کتنا ہی مفید اور ضروری معلوم ہوتا ہو، مقصود بنا دینا، اس کی طرف دعوت دینا، اس پر اصرار کرنا، اس میں شامل نہ ہونے والوں پر اعتراض کرنا ’’من احدث فی امرنا هذا ما ليس منه فهو رد‘‘ (جس نے ہمارے اس دین میں ایسی چیز جاری کر کے شامل کر دی جو اس میں شامل نہیں ہے، وہ رد ہے) کے مصداق ہے۔‘‘ (ایضاً: ۵۹۸)

’’ایک ذہین و ذکی صاحب علم اور نامور اور غیر معمولی خطیب‘‘ نے مجمع کثیر میں گل افشانی گفتار کا نمونہ پیش کرتے ہوئے اپنے خطاب میں ’’دعوی کیا کہ علم دین صرف وہی نہیں ہے جسے اب تک علماء ’’علم دین‘‘ قرار دیتے چلے آ رہے ہیں۔ یعنی قرآن وحدیث اور تفسیر وفقہ کا علم، بلکہ علم دین کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس دائرے میں وہ علوم بھی آتے ہیں جنہیں لوگ غلط فہمی سے علم دنیا سمجھتے ہیں‘‘۔ حضرت مولانا نے محسوس فرمایا کہ بات چاہے کتنی ہی خوبصورت رنگ میں کہی گئی ہے اور کہنے والا بھلے علم وفن کے مقام بلند پر فائز ہے، لیکن بات ایسی ہے جو فی الواقع مزاج شریعت سے میل نہیں کھاتی۔ اپنوں کے درمیان کہی ہوئی گفتگو، ایک بڑے مجمع میں آئی ہوئی بات، ایک بڑے عالم کی زبان سے، اندیشہ ہے کہ لوگ غلط فہمی کے شکار ہو جائیں گے۔ اور اندیشہ کیا، یہ واقعہ ہے کہ دنیا کی تقریباً تمام مسلم عصری تعلیم گاہوں میں یہ، بلکہ اس سے بڑھ کر قرآن وحدیث میں وارد علم کی فضیلت اور اس کے حصول کی ترغیب کے تعلق سے تمام نصوص کو بلا جھجک عصری علوم پر فٹ کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا نے ٹوکا کہ:

> ’’یہ ایک ایسا دعوی ہے جو علمائے امت میں اب تک کسی نے نہیں کیا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام جو علوم اللہ کے پاس سے لائے ہیں اور جس کی انہوں نے دعوت دی ہے، وہ علوم ہیں جن سے بندوں کا ربط اللہ تعالی سے درست اور استوار ہو۔‘‘

پھر قرآن وحدیث کے نصوص اور اکابرین سلف کی تصریحات سے اس بات کو ثابت کرتے ہوئے فرمایا کہ:

> ’’دنیا میں علم کے نام سے بے شمار چیزیں جو بکھری ہوئی ہیں، ان میں کوئی بھی ’’علم دین‘‘ نہیں ہے۔ علم دین وہی ہے جس کا تعلق وحی الٰہی سے ہے، جس کے ادراک میں عقل انسانی ناکافی ہے۔ باقی دوسرے علوم، اگر علم دین کے لئے معین ومددگار یا ضروری ہیں تو وہ علم دین سے تعلق رکھنے کی وجہ سے کسی درجے میں علوم دین میں شمار ہو سکتے ہیں اور ان کے علاوہ کوئی بھی علم ’’علم دین‘‘ نہیں ہے۔‘‘ (علوم ونکات: ج۲ص ۱۹۱تا ۲۰۴)

حضرت مولانا کے بچپن کے دوست اور محقق عالم دین مولانا ابو اللیث خیرآبادی نے حدیث کی ایک کتاب پر تحقیق کرکے اسے شائع فرمایا۔ اس کا ایک نسخہ حضرت مولانا کو بھی ملا۔ آپ نے جہاں مولانا خیرآبادی کے کام کو انتہائی وقیع الفاظ میں سراہا اور انہیں اس کام کے لئے مبارک باد دی، وہیں مولانا کی صاف دلی کی بات ہے کہ بچپن کے رفیق اور علاقہ کے زبردست عالم ومحقق ہونے کے ناطے ان کی اس بات کو نظر انداز نہیں کیا، بلکہ ان سے شکایت بھی کی کہ:

> ’’زہد کی تعریف وتعارف لکھتے ہوئے نہ جانے کیوں آپ نجدی اور غیر مقلدین کی زبان بولنے لگے؟ آخر تصوف بے چارہ یونہی کچھ اپنوں اور کچھ آج کل کے خود ساختہ محدثین کے ہاتھوں مظلوم بنا ہوا ہے۔ آپ کچھ دفاع کرتے، کچھ اس کا آنسو پونچھتے۔ یہ کیا کیا؟ کہ چلتے چلاتے آپ نے بھی ایک ہاتھ جما دیا۔‘‘ (حدیث دوستاں: ص ۱۸۲)

زمانے کی نو بہ نو ایجادات نے اور بعض حالات کے کثرت شیوع نے مسائل کے اعتبار سے بڑی پیچیدگی پیدا کردی ہے۔ مسلمان چونکہ اپنی زندگی شریعت کے مطابق گذارنے کا پابند و مکلّف ہے، اس لئے استعمال سے پہلے اس کے سامنے یہ سوال آنا فطری ہے کہ شرعاً اس کے استعمال کی اجازت ہے بھی یا نہیں؟ پھر علمائے امت کبھی انفرادی طور پر اور بسا اوقات اجتماعی شکل میں مسئلہ کے حل کے لئے کوشاں ہوتے ہیں۔ پھر بعض اوقات ضرورت ومجبوری کا حوالہ دے کر کچھ چیزوں کو سند جواز دینے کی سفارش کی جاتی ہے، لیکن:

> ’’واقعہ یہ ہے کہ یہ معاملہ اتنا ڈھیلا نہیں ہے کہ جس چیز پر ضرورت کا لیبل چسپاں کردیا

> جائے اور آدمی کی ہوسنا کیاں جنہیں ضروریات زندگی میں شامل کر دیں، انہیں دین خداوندی بھی قبول کر لے۔ مذہب اسلام کا ایک خاص عقیدہ اور نظریہ ہے۔ اس کا پاکیزہ طریقہ کار ہے۔ جو چیزیں اس کے موافق ہوں گی، انہیں قبول کیا جا سکتا ہے۔ اور جو امور اس کی ضد ہیں، انہیں کسی رنگ میں پیش کیا جائے وہ رد ہی کی جائیں گی۔'' (حدیث درد دل: ص ۱۵۶)

حضرت مولانا نے مسلمانوں کے اس رویہ بھی پر اپنے دکھ کا اظہار فرمایا ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں:

> ''لوگوں میں ایک دستور سا ہو گیا ہے کہ ضروریات زندگی کا نعرہ لگا کر غلط چیزوں کے حق میں اسلام سے تائید حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ کبھی یہ غیرت دلائی جاتی ہے کہ اسلام ایک آفاقی مذہب ہے، اسے زندگی کی ہر دور کا ساتھ دینا چاہئے، پس جو کچھ دنیا میں وجود میں آجائے، دین اسلام اسے جھٹ سندِ قبولیت دیدے، ورنہ زندگی کی دوڑ میں اسلام پیچھے رہ جائے گا۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں فلاں ملک میں علمائے دین نے عملاً اسے گوارا کر لیا ہے۔ دین وملت کے ماہرین کے گھروں میں یہ چیزیں ضرورت بن کر داخل ہو چکی ہے، پس تم کب تک اسے ناجائز کہہ کر زمانہ سے بے خبری کا ثبوت دیتے رہوگے؟ ہاں یہ بھی ایک بڑا عجیب نعرہ ہے کہ دین ومذہب اور احکام وشریعت کی خبر رکھنے والے عصر حاضر کے تقاضوں سے بے خبر ہیں۔ یہ نعرہ لگانے والے شاید بے خبر ہیں کہ علماء عصر حاضر کے کسی تقاضے سے بے خبر نہیں ہیں، مگر وہ اس دین کے اسرار ومزاج سے بھی باخبر ہیں۔'' (ایضاً)

یہ بات اپنی جگہ سو فیصد درست ہے کہ نئے پیش آمدہ مسائل میں علمائے امت کی ذمہ داری ہے کہ اس کے سلسلے میں قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کا حل تلاش کریں اور واضح کریں کہ وہ جواز کے دائرہ میں آتا ہے یا نہیں؟ اسی طرح بعض مسائل اس نوعیت کے بھی ہیں جن میں حالات وتقاضے کی وجہ سے حکم بدل سکتا ہے، اس کی وضاحت بھی ان کی ذمہ داری ہے۔ پھر ان کا صرف یہی کام نہیں ہے کہ جائز وناجائز کا حکم لگا کر خاموش بیٹھ جائیں، بلکہ وہ چیز اگر جواز کے دائرہ میں نہیں آتی اور انسانی ضرورت ہے تو پھر اس کا متبادل تلاش کرنا بھی ان کا کام ہے۔ مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:

> ”جو چیزیں کسی حقیقی انسانی ضرورت کی بنیاد پر وجود میں نہیں آئیں، ان کا کوئی متبادل تلاش کرنے کی نہ کوئی ضرورت ہے اور نہ ہم اس کے مکلّف ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی لاٹری اور سٹے کا متبادل مانگے تو ہمیں کوئی متبادل دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ ان کا انسان کی حقیقی ضرورت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن جو چیزیں انسانی ضرورت میں داخل ہوں یا داخل ہو چکی ہوں، لیکن اسے حاصل کرنے کے لئے طریقہ غلط اور ناجائز اختیار کرلیا گیا ہو، اس کے لئے متبادل جائز طریقہ تلاش کرنا نہ صرف مستحسن، بلکہ کم از کم مسنون ضرور ہے۔“ (غیر سودی بینکاری: ص۱۶)

یہ کیسا کانٹوں بھرا تاج اور کیسی نزاکت بھری ذمہ داری ہے؟ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کسی بھی رائے اور حکم پر متفق ہونے سے پہلے مطلوبہ شرائط ومعیار کی پوری رعایت اور اس کی تلاش وجستجو میں کما حقہ سر نہیں کھپایا گیا تو آخرت کی ساری جوابدہی ان کے ہی سر آئے گی۔ اس لئے حضرت مولانا نے یہ مشورہ دیا کہ:

> ”علماء کو خوب غور کرلینا چاہئے کہ جن چیزوں میں گنجائش نکالنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے، ان میں بہتیرے ایسی چیزیں ہیں کہ اگر انہیں سندِ جواز دے کر یا ہلکی گنجائش دے کر مسلمانوں کے ہاتھوں میں دیدیا جائے تو زیادہ وقت نہیں گزرے گا کہ ایک ایسا ماحول ومعاشرہ وجود میں آجائے گا جس کو اسلام سے کوئی مناسبت نہ ہوگی۔ بس جو گناہ ہے، اسے گناہ ہی قرار دیا جائے۔ کرنے والا اسے گناہ سمجھ کر کرے تو خود کو گناہ گار سمجھے گا، اور شاید کبھی اسے احساس ہو تو توبہ کی توفیق اسے ہوجائے گی۔ اور اگر اس گناہ کو سند جواز دیدی گئی تو آدمی زندگی بھر گنہگار رہتا رہے گا اور اسے کبھی توبہ نصیب نہ ہوگی۔“ (حدیث درد دل: ص۱۵۷)

ایسا بھی عین ممکن ہے کہ ضرورت ومجبوری کا حوالہ دے کر مسائل کے احکام میں نرمی پیدا کرنے کے بجائے انتظامی امور یا دوسری نوعیت سے محنت کرلی جائے تو اس کے بہتر نتائج نکل سکتے ہیں اور تلفیق کی راہوں سے بچا جاسکتا ہے۔ (مثلاً دیکھئے: حدیث درد دل: ص۸۶ تا ۹۰، اور حج وعمرہ کے بعض مسائل میں غلو)

حضرت قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کے نقطۂ نظر سے حضرت مولانا کا

اختلاف جگ ظاہر رہا ہے۔ واقعہ یہ ہے قاضی صاحبؒ کے مقابلہ میں مولانا اپنے کو بہت چھوٹا سمجھتے تھے۔ چاہے آپ اسے تواضع اور کسر نفسی پر محمول کریں، مگر مولانا نے تحریر فرمایا ہے کہ ’’یہ راقم الحروف سن وسال کے اعتبار سے بہت چھوٹا ہے اور علم وتفقہ میں درجۂ صفر سے بھی گرا ہوا ہے۔‘‘ (علوم ونکات: ج۲ص۲۹۰)

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ’’وہ بہت بڑے تھے یہ بہت چھوٹا ہے۔ بڑوں کے سامنے جانے سے ڈرتا ہے۔ دور سے نظارہ کرتا رہا، مرعوب ہوتا رہا۔‘‘ (کھوئے ہوؤں کی جستجو: ص۴۹۲)

کھلے دلوں سے حضرت قاضی صاحبؒ کے تعلق سے ان کے اس بلند کردار کا اظہار فرمایا ہے:

> ’’مسائل ومعاملات میں علماء کے درمیان اختلاف کا ہونا کوئی انہونی بات نہیں ہے، لیکن اختلاف کو اس کے حد پر رکھنا، اس میں حدود سے تجاوز نہ کرنا، بشری کمزوری پر ایک ایسی فتح ہے جس کی داد امید ہے کہ خدا کے دربار سے ضرور ملے گی۔ یہی چیز دیانت کو نفسانیت سے ممتاز کرتی ہے۔ قاضی صاحب ...... میرے تجربہ میں ...... اس وصف عالی کے سرمایہ دار تھے۔ ان سے، ان کی رایوں سے، ان کے طریقۂ عمل سے یقیناً اختلاف کیا گیا۔ علمی اعتبار سے بلند قامت ہستیوں نے بھی ان پر نکتہ چینی کی اور ان کے طریقہ کار پر گرفت کی ہے اور ہم جیسے کوتاہ قامت، بلکہ بے قامت افراد نے بھی نقطۂ اختلاف پر قلم رکھا، لیکن دور ونزدیک، معتبر اور نامعتبر، کسی طریقے سے یہ نہیں معلوم ہوا کہ انہوں نے اختلاف کرنے والوں کی شان میں کوئی نازیبا کلمہ کہا ہو۔ کیا ٹھکانا تھا ان کی وسعت ظرف کا۔‘‘ (ایضاً: ۴۹۳)

عظمت اور مقام بلند کے اس اعتراف کے باوجود حضرت مولاناؒ کو حضرت قاضی صاحبؒ کے نقطۂ نظر سے اختلاف تھا اور آپ نے کھل کر اس کا اظہار فرمایا۔ حضرت قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فقہ میں جس مقام بلند پر فائز تھے، اسے سامنے رکھتے ہوئے ان کے فقہی آراء سے اختلاف کرنا اور اس پر تنقیدی نگاہ ڈالنا، بڑے دل گردہ کا کام تھا۔ اس کے لئے فقہ پر گہری نگاہ کی ضرورت تھی۔ حضرت مولانا کو لگا کہ حضرت قاضی صاحب کی فلاں رائے سے اتفاق ممکن نہیں ہے تو آپ نے یہ ذمہ داری بھی قبول کی اور دلائل کے ساتھ قاضی صاحبؒ کی رائے سے اختلاف

فرمایا۔ یہ قاضی صاحب کا بڑا پن تھا کہ ’’قاضی صاحب اس مضمون کی تحسین کر رہے تھے۔‘‘

سمینار اور اس کے طریقوں سے بھی مولانا کو اختلاف تھا اور المآثر کے اداریوں میں اس پر کھل کر تنقید فرمائی۔ حالانکہ بعض حضرات کو ’’اس طرز عمل سے گرانی ہوئی، انہوں نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ ان کے خیال میں مسلمانوں اور دین کی خدمت کے لئے جو بھی قدم اٹھایا جائے اسے گوارا کرنا چاہئے۔ اس میں اگر کچھ غلطیاں ہو رہی ہوں تو بھی خاموش رہنا چاہئے، لیکن ظاہر ہے کہ اگر اسے قاعدہ بنا لیا جائے تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایک بڑا حصہ معطل ہو کر رہ جائے گا۔‘‘ اس لئے حضرت مولانا نے ان ناگواریوں کو دیکھا، سنا اور سہہ لیا۔ المآثر پر الزام لگا کہ ادارہ جارحیت کے راستے پر جا رہا ہے۔ اختلاف اور نزاع کر رہا ہے۔ لیکن آپ کا کہنا تھا کہ ’’جو چیز غلط ہے اس کی غلطی کو واضح کر دینا اختلاف نہیں ہے...... ہاں اگر دلیل سے یہ بات واضح کر دی جائے کہ جو کچھ کہا گیا ہے، وہ غلط ہے تو البتہ اس پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس کی جاے گی۔‘‘

بالکل بجا فرمایا آپ نے کہ ’’غلطی خواہ چھوٹی ہو یا بڑی اگر واقعۃً غلطی ہے تو اس پر ٹوکنے والا نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔ اس پر اختلاف کا الزام نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ اگر نہ تسلیم کیا جائے تو حق و باطل کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔‘‘ (دیکھئے: حدیث درد دل: ص ۱۱۹ تا ۱۲۵)

❑❑❑

پھر ہمارا مالک و خالق جس سے ہمیں دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر محبت و تعلق ہے، جس کے جذبۂ عشق نے ہمیں پوری زندگی کی مصیبت جھیلنے پر آمادہ کر رکھا ہے، جس کی ایک نگاہِ رضا و خوشنودی کے لئے ہم دو جہاں کی قربانی بڑی مسرت کے ساتھ دے سکتے ہیں، وہی ہمارا محبوب و معبود ہے، وہی ہمارا منظور و مسجود ہے، وہی ہمارا خدا ہے، ہم اس سے ایک بات کہتے ہیں، ایک چیز مانگتے ہیں، اس لئے مانگتے ہیں کہ ہم جانتے ہی نہیں کہ وہ چیز ہمارے حق میں مفید ہے یا مضر، پھر وہی محبوب ہم سے کہتا ہے کہ ہٹو میاں کیا مانگتے ہو، ہماری دیوڑھی پر پڑے رہو، دھوپ کھاؤ، سردی گرمی جھیلو، تکلیف اٹھاؤ، لیکن ہمارے دامنِ قُرب سے چمٹے رہو۔ خدا کی قسم کتنی بڑی دولت ہے، نگاہِ اِلتفات تو ہوئی، ہماری مانگی ہوئی چیز پر خاک ہو، ہمیں تو دوسرا ہی سرا ہاتھ آ گیا۔ (حدیث دوستاں)

مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب بحیثیت والد

مولانا محمد راشد اعظمی صاحب
ابن حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی

انسانی زندگی کے لئے ہوا اور غذا جس قدر ضروری ہے اس سے کہیں زیادہ ضروری اچھی تعلیم و تربیت ہے۔ کیوں کہ ان دونوں کے بغیر انسان زندہ تو رہ سکتا ہے مگر وہ زندگی کیسی ہوگی؟ اس کا اندازہ ان لوگوں کی زندگیوں سے لگایا جا سکتا ہے جو اس نعمت سے محروم ہیں۔ تعلیم کے مسئلہ میں تو ایک حدتک گنجائش ہے لیکن تربیت کی ناگریزیت کو ہر صاحب بصیرت سمجھ سکتا ہے۔ بچے کے وجود پذیر ہونے کے بعد جہاں اس کی دوا و غذا کی دیکھ ریکھ والدین کے ذمہ لازم ہوتی ہے، وہیں اس کی بہترین تربیت کا فریضہ بھی ان سے متعلق ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ ”اے ایمان والو! تم اپنے کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں“۔ (تحریم ٦٦:٦) یہ آگ سے بچانا جس کا حکم اللہ نے دیا ہے بہترین تربیت ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ حدیث شریف میں حضرت جابر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”انسان کا اپنی اولاد کو ادب سکھلانا ایک صاع صدقہ کرنے سے بہتر ہے“۔ (ترمذی: ۱۹۵۸) حضرت انس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”اپنی اولاد کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرو اور ان کے آداب کو بہتر بناؤ۔“ (ابن ماجہ: ۳۶۷۱) یہ بھلائی کا معاملہ اور آداب کا بہتر بنانا، جس کا حکم دیا جا رہا ہے اگر اس کو دوسرے لفظوں میں تعبیر کیا جائے تو یہی ہو سکتا ہے کہ ان کی بہترین تربیت کرو۔ گویا شرع اسلامی کے رو سے اولاد کی بہترین تربیت والدین کا اہم فریضہ ہے۔

والد محترم حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب کی جامع الکمال، ہمہ جہت اور ہمہ گیر

شخصیت نے جس طرح دیگر امور میں نظام اسلامی کے مطابق بھرپور اور خوب سے خوب تر کی طرف توجہ دی ہے، اسی طرح تربیت اولاد میں بھی انہوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی اولاد نے ان کی تربیت کو کس حد تک قبول کیا اور کتنا اس پر عمل پیرا ہوئی؟ مگر یہ مسلم ہے کہ انہوں نے نظام اسلام یعنی قرآن وحدیث کے رو سے ان پر اولاد کے سلسلے میں جو بھی حق تھا، اس کو باحسن وجوہ ادا کیا۔

والد صاحب کی سب سے اہم بات تمام اولاد کے ساتھ سلوک کی یکسانی تھی، اولاد نرینہ ہو یا مادینہ، شرعی اعتبار سے جس کا جو بھی حق تھا اسے ادا کرنے میں انہوں نے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ سب کے لئے بہترین دینی تعلیم کے مواقع فراہم کئے، اپنی نگرانی میں رکھ کر سب کو اپنے جیسا بنانے کی کوشش کی۔ جب وسعت وفراوانی ہوئی اور وسائل بڑھے تو سارے بھائیوں کو باری باری اپنے ساتھ حج پر لے گئے۔ ۲۰۰۸ء کے حج میں ان کی تین اولاد ان کے ساتھ تھیں۔ ایک بڑے عالم وبزرگ نے تین بیٹوں کو ساتھ دیکھا تو فرط مسرت سے بول اٹھے کہ ”باپ ہو تو ایسا ہو، جو تین تین بیٹوں کو بیک وقت حج پر لا رہا ہے۔“

طرز تربیت:

والد صاحب کی طرز تربیت کا اندازہ ان کے اس قول سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک صاحب نے دریافت کیا کہ آپ اپنی اولاد کے سلسلے میں کس حد تک آزادی کے قائل ہیں؟ تو جواب میں فرمایا کہ اس حد تک کہ بکری اپنے ہی کھیت میں رہے دوسرے کے کھیت میں منہ نہ مار سکے۔ پھر اس کی وضاحت کی کہ جس طرح بکری کے گلے میں اتنی بڑی رسی باندھی جاتی ہے کہ وہ اپنے کھیت کے حدود میں کھل کر آزادی کے ساتھ چر سکے مگر دوسرے کھیت تک اس کا منہ نہ پہونچ سکے۔ اسی طرح میں نے اپنی اولاد کو شرعی حدود کے اندر پوری آزادی دے رکھی ہے، اور حدود شرع کے باہر اپنی بساط ونگرانی کے بقدر قدم نہیں نکالنے دیتا ہوں۔

یہ واقعہ ہے کہ انہوں نے حدود شرع میں اپنی اولاد کو پوری آزادی دے رکھی تھی، انہوں نے اپنے خودساختہ قانون کو کبھی بھی اپنی اولاد پر مسلط نہیں کیا، جو بھی پابندی تھی وہ درجہ کراہت سے اُدھر کی تھی۔ ایک خاص بات یہ بھی تھی وہ تربیت کے نام پر تضریب وبے جا تادیب کے بھی

بہت زیادہ قائل نہ تھے، ناگزیر حالت میں ہاتھ اٹھتا یا ڈانٹ پڑتی، ورنہ بیشتر یہی دیکھا کہ غلطی سے ابتدائی مرحلہ میں صرف نظر کرلیا اور پھر مناسب موقع دیکھ کر سمجھا دیا۔ مارنے پیٹنے سے تو انہوں نے والدہ کو بھی منع کر رکھا تھا کہ مارنے کی بجائے سمجھانے کی کوشش کرو، اگر نہ مانیں تو مجھے بتلاؤ، میں اس غلطی کی اصلاح کی کوشش کروں گا۔

اب مختلف جہات سے اولاد کی تربیت اور ان کے ساتھ شفقت ومحبت کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں جس سے اولاد کے حق میں ان کی خیرخواہی اور سوز دروں کا اندازہ ہوگا، اور ان کے رجحانات ومیلانات اور ترجیحات کا بھی اولاد کے سلسلہ میں پتہ چلے گا۔

نماز کی تاکید:

میرا بچپن والد صاحب کی شہرت کا زمانہ تھا، جب میں سن شعور کو پہونچا تو ان کی شہرت چہار دانگ میں پھیل چکی تھی، اس زمانہ میں چھوٹے بڑے اسفار کثرت سے ہوا کرتے تھے، مدرسہ کی چھوٹی بڑی تعطیل سفر میں گزرتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ وہ جب بھی سفر میں جاتے اور میں رخصتی مصافحہ کے لئے حاضر ہوتا تو نماز کی تاکید ضرور کرتے، اور سفر سے واپس آنے کے بعد جب میں ملاقات کے لئے حاضر ہوتا تو سب سے پہلا سوال نماز کی پابندی کے بارے میں ہوتا۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ تاکید صرف مواقع سفر کے ساتھ خاص تھی، نماز کی تاکید تو ہمیشہ کیا کرتے تھے مگر اس موقع سے تاکید بلیغ ہوتی تھی۔ کیوں کہ ان کو بہر حال اندیشہ رہتا تھا کہ میری غیر موجودگی میں بکثرت یہ جرم سرزد ہوسکتا ہے۔ اور یہ جرم تو ایسا ناقابل عفو تھا کہ دیگر چھوٹی بڑی غلطیاں معاف تو ہوسکتی تھیں مگر اس جرم کی سزا یا تو ڈانٹ تھی یا پھر پٹائی۔

سلام کی عادت ڈالنا:

مجھے والد صاحب سے بہت انس تھا، میں نے ابھی شعور کی کچھ ہی منزلیں طے کی تھیں، اسی وقت سے یہ انس محسوس کرتا ہوں۔ کمرے میں ہوتے، میں پہونچتا، بے دھڑک دروازہ کھول کر دوڑتا ہوا داخل ہوجاتا، ایک نگاہ غلط انداز مجھ پر ڈالتے، مسکراتے، اور پھر حکم ہوتا کہ باہر جاؤ، چلو نکلو، فوراً نکلو، اور سلام کرکے اندر آؤ۔ اس وقت ان کا یہ حکم بہت شاق گزرتا، لڑکپن کا زمانہ تھا لوگوں کے سامنے اس طرح ڈپٹ دیتے، بس کلیجہ کٹ کر رہ جاتا مگر بادل ناخواستہ تعمیل حکم کرتے ہی

بن پڑتی۔ اس کے بعد پیار سے کان پکڑتے، دو تین چپت لگاتے، پھر سمجھاتے کہ گنواروں کی طرح کمرہ میں نہیں داخل ہونا چاہئے بلکہ سلام کرکے تہذیب کے ساتھ آنا چاہئے۔

ہم لوگوں کی تنخواہ:

والد صاحب کا معمول تھا کہ جمعرات کو اپنی ساری اولاد کو پیسے دیا کرتے تھے، جس کا نام ہم بھائیوں کی اصطلاح میں ’’تنخواہ‘‘ ہوا کرتا تھا۔ یہ ایک طرح سے جیب خرچ ہوتا تھا اور ہفتہ بھر کی غیر ضروری، ضروریات کی کفایت کے لئے ملتا تھا۔ مجھے پانچ روپئے سے ملنا یاد ہے، پھر بڑھ کر دس ہوئی پھر پندرہ پھر بیس پھر پچاس، پھر سو، اور اخیر تک سو ہی رہی۔

جب عمر کے ساتھ کچھ شعور بڑھا اور روپیوں پیسوں کی کچھ پرکھ ہوگئی تو تنخواہ لانے کی ذمہ داری میرے سر پر آن پڑی۔ ہر جمعرات کو باقاعدگی سے تنخواہ لینے جاتا، وہاں سے مجموعی رقم حاصل کرکے اماں کے حوالے کرتا، پھر اماں اس کو بھائیوں اور بہنوں کے درمیان تقسیم کرتیں۔ جمعرات کے دن مجھے دیکھ کر ایک خاص دلآویز انداز میں مسکراتے اور کہتے کہ ’’جمعرات فقیروں کا دن ہے۔‘‘ پہلی مرتبہ جب میں نے یہ بات سنی تو خاصی ناگوار گزری، دل میں سوچا کہ فقیر سمجھ رہے ہیں جو ایسی بات کہہ رہے ہیں۔ بچپن تھا سمجھ بوجھ تو تھی نہیں، ناگواری کا اثر چہرے پر آ گیا، دیکھتے ہی تاڑ گئے، کہا: فقیروں کا دن ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بھیک مانگنے والے فقیروں کا دن بلکہ اللہ والوں کو بھی فقیر کہا جاتا ہے، اس دن لوگ پیروں فقیروں کے یہاں اپنی حاجتیں لے کر جاتے ہیں، اس مناسبت سے میں نے کہا ہے۔

چاٹ کا ٹھیلا:

مدرسہ کے گیٹ کے سامنے چاٹ کا ٹھیلا لگا ہوا تھا، والد صاحب گھر جانے کے لئے مدرسہ سے نکلے تو مجھے ٹھیلے کے پاس کھڑا پایا، کان پکڑا اور بغیر کچھ بولے گھر لے آئے۔ سب سے پہلے جیب کی تلاشی لی، جیب سے پلاسٹک پگھلا کر بنایا ہوا سخت گیند، ماچس اور نہ جانے کیا کیا الم غلم نکلا۔ ماچس دیکھ کر آگ بگولہ ہوگئے، بہت سنجیدگی کے ساتھ پوچھا ’’آپ کی جیب میں اس کا کیا کام؟‘‘ ان کی عادت تھی کہ بھائیوں میں سے جب کسی حفا پر ہوتے تھے تو ’’آپ‘‘ کہہ کر مخاطب کرتے تھے، عام حالت میں بابو یا بیٹا کہتے تھے۔ ان کی زبان سے ’’آپ‘‘ سن کر روح فنا ہوجاتی

تھی۔ اب کاٹو تو لہو نہیں، زبان خشک، حلق میں کانٹے پڑ گئے، کوشش کے باوجود بھی کچھ نہیں بول سکا۔ ''کہیں آپ بیڑی سے شوق تو نہیں فرماتے؟'' یہ سن کر رہی سہی کسر بھی پوری ہوگئی۔ اس کے بعد ماچس اور چاٹ کے ٹھیلے کو لے کر جو ڈانٹ پڑی ہے تو پناہ بخدا!۔

دوسرے دن صبح ہی صبح طلبی ہوئی، ساری حرکتیں آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگیں کہ ان میں سے کس حرکت کی وجہ سے طلبی ہوئی ہے؟ ڈرتے ڈرتے حاضر ہوا، سلام کیا، خلاف توقع مصافحہ کے لئے ان کا ہاتھ بڑھا، مصافحہ کے بعد نگاہوں سے ہٹ کر ایک گوشہ میں جائے عافیت تلاش کرنے کے لئے بڑھا، آواز آئی ادھر آؤ بیٹے! یہاں بغل میں بیٹھو! جان میں جان آئی کہ ''آپ'' کی بجائے ''بیٹے'' سے خطاب ہوا ہے۔ پہلے تو کان مروڑا، گال پر دو چار چپت لگائے، اس کے بعد پانچ روپئے عنایت ہوئے کہ اگر کچھ کھانے کا جی چاہے تو دوکان سے خریدو، اور مدرسہ میں لا کر کہیں اطمینان سے بیٹھ کر کھالو۔ دوکان پر کھڑے ہو کر کھانا یا چاٹ کے ٹھیلے کے پاس کھڑا رہنا اچھی بات نہیں ہے، جو بھی دیکھے گا یہی سمجھے گا کہ کھڑا ہو کر للچا رہا ہے۔

اور ہاں، جیب میں ماچس رکھنا بدمعاشوں کا شیوہ ہے، جو بیڑی پیتے ہیں یا ادھر ادھر کھیتوں میں آگ لگاتے پھرتے ہیں۔ تم کو نہ بیڑی پینی ہے اور نہ ہی کہیں آگ لگانا ہے تو پھر تم کیوں جیب میں ماچس رکھتے ہو؟ اب موقع تھا کہ صفائی پیش کر دی جائے۔ عرض کیا کہ گیند بنانے کے لئے ماچس خریدی تھی، پلاسٹک جلا کر کے لکڑی یا لوہے کی مدد سے اسے مدور کیا جاتا ہے، کل جو گیند آپ نے دیکھی تھی وہ میں نے ہی بنائی تھی۔ تعریف کی کہ بہت اچھی اور گول بنائی تھی مگر اب مت بنانا، ضرورت ہوگی تو پیسے لے کر خرید لینا۔ ابھی سے آگ کا کھیل کھیلو گے تو کیسے بات بنے گی؟۔

تعلیم وتربیت کے باب میں چند خطوط کے اقتباسات:

تمام بھائیوں نے تعلیمی مراحل والد صاحب کی نگرانی اور ان کی تربیت کے سائے میں گزارے ہیں، والد صاحب جہاں بھی رہے، جس مدرسہ میں رہے، سب کو ساتھ رکھا، اپنے سے علیحدہ کر کے تعلیم کے لئے کسی کو دوسرے مدرسہ میں نہیں بھیجا۔ صرف فضیلت کے لئے دو سال کے لئے دارالعلوم دیوبند بھیجتے تھے۔ دارالعلوم جانے کے بعد یہ تاکید رہتی تھی کہ وہاں سے خطوط کے

ذریعے اپنے احوال سے آگاہ کرتے رہنا۔ یہ تاکید محض تربیتی ذمہ داریوں کی وجہ سے تھی کہ کہیں بڑی جگہ اور بڑے ماحول میں پہونچ کر آزاد اور بے لگام نہ ہو جائیں؟ چنانچہ خطوط کے ذریعے دارالعلوم پہنچنے کے بعد تمام مراحل میں راہنمائی کرتے رہتے۔ مولانا محمد عابد صاحب جب دارالعلوم پہونچے، ابھی داخلہ کے بعد چند ہی دن گزرے تھے کہ انہیں اپنے مزاج سے ہم آہنگ اور بڑے ماحول میں عام طور سے شر وفساد کی جو جڑ ہوتی ہے یعنی بے تحاشا میل جول اور تعلقات کی کثرت، اس کے سلسلے میں نصیحت کی کہ:

> ’’یکسوئی کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہو، اپنا کوئی امتیاز بنانے کا ارادہ مت کرنا۔ گمنام ہو کر رہو، کوشش کرو کہ میرے واسطے سے تعارف نہ ہو، شہرت مصیبت ہے۔ کسی طرح کے اجتماعی کام میں شریک نہ ہونا، اپنی کوئی مجلس نہ بنانا۔ تمہاری مجلس صرف کتابیں ہیں، انھیں کی صحبت میں رہنا، جو مقدر ہوگا تمہاری محنت وکوشش سے علم حاصل ہو جائے گا۔ نہ کسی سے دوستی نہ کسی سے دشمنی، ایک مسلمان جیسا تعلق سب سے رہے۔‘‘

دیوبند سے شاید انہوں نے خرابی صحت کی شکایت کی، تو اس کا جسمانی علاج تو تجویز کیا ہی، ساتھ ساتھ اپنی طبیعت ومزاج کے مطابق اصل کام کی طرف بھی متوجہ کیا اور اس پر عمل کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے صحت کے سلسلے میں اپنا رجحان بھی لکھ دیا۔ ذرا ملاحظہ ہو:

> ’’تمہاری صحت کے لئے دعا کرتا ہوں، شاید گرمی کی وجہ سے آنکھ کھل جاتی ہو، یہ عارضی احوال ہیں فکر نہ کرو۔ عصر کے بعد کچھ ٹہل لیا کرو، روزانہ ہلکا پھلکا غسل کر لیا کرو۔ باقی دعا میں گریہ وزاری کرو، صحت ومرض کے مالک اللہ تعالیٰ ہی ہیں۔ وہی جو چاہتے ہیں اپنے بندوں سے کام لیتے ہیں، اور جس کام سے چاہتے ہیں ہٹا دیتے ہیں۔ تمہارے باپ نے صحت کا کوئی خاص اہتمام نہیں کیا، جو غذا میسر آگئی، کھا لی، اور جو دوا آسانی سے مل گئی، استعمال کر لی، اور بحمد اللہ کام کے لائق صحت ہمیشہ رہی، بدن کی فکر کیا کرنی اسے تو مٹی میں ملنا ہے، بس اس کی فکر اتنی ہونی چاہئے کہ روح برباد نہ ہو۔‘‘

آج کل دینی مدارس ہوں یا عصری درس گاہیں، ان میں سب سے زیادہ اہمیت امتحان کے نمبرات کی ہے، تعلیم واخلاق وغیرہ قریب قریب ثانوی درجہ میں جا چکے ہیں۔ والد صاحب نے

اپنے خاص تربیتی انداز میں لکھا کہ:

> ’’تعلیم میں اپنی صحت وقوت کے لحاظ سے محنت کرتے رہو، اس میں کوتاہی نہ ہو۔ مجھے نمبروں سے دلچسپی نہیں، مجھے علم اور اخلاق سے دلچسپی ہے، اس میں کھرے اترو۔ نمازوں میں کوتاہی بالکل نہ کرو، یہی تو مومن کا اصل سرمایہ ہے۔‘‘

دیکھئے! ذیل کے خط میں اپنے فرزند کو کیسے حصول علم میں انہماک کی تاکید کررہے ہیں؟ اور دوران تعلیم اسباق کی اہمیت کو کس درجہ بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ اور ساتھ ہی ایک گُر کی بات یہ بھی سمجھائی کہ والدین میں سے کس کی اطاعت ہونی چاہئے اور کس کی خدمت ہونی چاہئے؟ غالبًا یہ خط کسی ایسے خط کے جواب میں لکھا گیا ہے جس میں طبیعت کے گھبرانے، جی نہ لگنے اور اسباق کے چھوٹ جانے کی شکایت کی گئی تھی۔ والد صاحب لکھتے ہیں:

> ’’فرزندِ عزیز! یہ راہ مجاہدے کی راہ ہے، اس میں ہمت مردانہ چاہئے، اگر طبیعت سے مغلوب ہوگئے تو کوئی چیز حاصل نہ ہوسکے گی۔ طبیعت کے غلام نہ بنو، طبیعت پر غالب رہو، طبیعت کا گھبرانا، نہ لگنا عارضی چیز ہے، اس سے صرفِ نظر کرو، اس کی طرف توجہ نہ دو، کام میں لگے رہو، تو یہ خود بخود پلٹ جائے گی۔ تعلیم کے ایک سبق کا بھی نقصان ناقابل تلافی ہے، اساتذہ کی نگاہ سے طالب علم کو گرادیتا ہے۔ ماں باپ گھر دُوار سب مل جائیں گے، مگر جو اسباق استاذ کے پاس سے چھوٹ گئے وہ کب ملیں گے؟ اور اپنی والدہ سے اس طرح کی بات فون پر مت کرو، عورتیں کمزور طبیعت کی ہوتی ہیں، ان پر بہت زیادہ اثر ہوجاتا ہے، اب تمہارے اسی فون کے بعد تمہاری ماں مستقل اضطراب کی شکار ہے۔ بس وہ چاہتی ہے کہ بھاگ کر آہی جاؤ، مگر تم ایسا ہرگز نہ کرو۔ خدمت ماں کی کرو، اطاعت باپ کی کرو۔‘‘

اولاد سے تعلق ومحبت:

والد صاحب کی سب سے خاص بات بلکہ کہنا چاہئے کہ زندگی کا محور جس کی گردان کی زندگی کی گردش رہی ہے، وہ ’’محبت‘‘ ہے۔ محبت والفت کی تو ان کے یہاں اتنی فراوانی تھی کہ بہت سے لوگ ان کے التفات وعنایات کو اپنی طرف دیکھ کر یہ سمجھ بیٹھے کہ مولانا سب سے زیادہ حتی کہ اپنی اولاد سے بھی زیادہ انہیں کو مانتے ہیں! مگر ظاہر ہے کہ اس مفروضہ کے غلط ہونے میں کوئی کلام

نہیں۔ لیکن اس سے یہ اندازہ تو بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی محبت اولاد کے حق میں کس حد تک رہی ہوگی؟۔

ایک دن بر سبیل تذکرہ اولاد کے تئیں والدین کے معاملے کی بات آ گئی تو فرمایا کہ ‘‘میں اپنی اولاد کو اپنے جسم کا ایک حصہ سمجھتا ہوں۔ جس طرح اگر میری انگلی کٹ جائے تو مجھے درد کا احساس ہوتا ہے، اسی طرح اگر میری کوئی اولاد پریشانی میں ہو تو مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ جس طرح کٹی ہوئی انگلی کا اگر میں علاج کروں تو یہ خود پر احسان نہیں ہے، اسی طرح اگر میں اپنی اولاد کے لئے کچھ کرتا ہوں تو یہ ان پر احسان نہیں ہے۔’’ آج کے دور میں بیٹے کے تئیں اس طرح کا جذبہ رکھنے والے باپ کتنے ہوں گے؟ شاید شمار کرنے میں کچھ انگلیاں بچ ہی جائیں۔

اب ان کے اس قول کے عملی نمونے کی ایک ہلکی سی جھلک بھی ملاحظہ کر لیجئے:

بیماری کے ایام میں جب ممبئی میں قیام تھا، میں بھی ساتھ تھا، ایک دن میں ان کے سامنے اس حال میں چلا گیا کہ بظاہر چہرے پر اداسی کے آثار تھے، حالانکہ اس وقت مجھے کوئی رنج تھا نہ اداسی کا باعث کوئی معاملہ پیش آیا تھا، بس ویسے ہی غیر شعوری طور سے منہ لٹکا ہوا تھا۔ والد صاحب نے اس حال میں مجھے دیکھا تو تڑپ گئے، فوراً پوچھا کہ کیا ہوا ہے؟ عرض کیا کہ کچھ نہیں تو فرمایا کہ ‘‘بیٹے! تمہارا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر مجھے پریشانی ہونے لگتی ہے، جو پریشانی ہو مجھ سے کہو، میں تدبیر کروں گا، دعا کروں گا، مگر خدارا چہرے پر کرب کے آثار کے ساتھ میرے سامنے مت آؤ، میرا دل بے چین ہو جاتا ہے، تم سے زیادہ مجھے تکلیف محسوس ہونے لگتی ہے۔’’ اس دن مجھے ان کی محبت کا اندازہ ہوا کہ وہ کس قدر ہم لوگوں کی خوشی کے لئے فکرمند رہتے ہیں؟۔

یہ والد صاحب کی محبت ہی تھی کہ بھائیوں میں سے جب کوئی سفر کے لئے نکلتا تو مستقل ان کی طبیعت اس کی طرف لگی رہتی۔ بار بار فون کرتے، راستے میں ہر ممکنہ سہولت کے انتظام کی کوشش کرتے اور جب تک وہ منزل تک پہونچ نہ جاتا، ان کو چین نہیں آتا۔ مولانا عابد اعظمی صاحب کے نام ایک خط کا اقتباس اس سلسلے میں ملاحظہ ہو:

> ‘‘تمہارا خط ملا۔ تم لوگوں کے سفر کے سلسلے میں میرے دل پر بھی دباؤ تھا، اور سفر والے دن، رات ہی سے میں مسلسل تم لوگوں کی طرف متوجہ تھا، اور دعائیں کرتا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے فضل

فرمایا اور تم لوگوں کا سفر آسان ہوا'' **والحمد للّٰہ علیٰ ذالک**

اس سلسلے میں تو میرا بارہا کا تجربہ ہے کہ دیوبند کے لئے جب میں نکلتا تو پہونچتے پہونچتے دسیوں باران کا فون آجاتا کہ کیسے ہو؟ سفر کیسا ہو رہا ہے؟ بلکہ ایک بار تو ایسا بھی ہوا کہ میں دیوبند جارہا تھا، رات گیارہ بجے لکھنو سے گاڑی تھی، ساڑھے گیارہ بجے ان کا فون آیا، حالانکہ یہ وقت ان کے سونے کا تھا، خیریت پوچھی، دعائیں دی، جب فون رکھنے لگے تو میں نے پوچھ دیا کہ ابھی تک آپ جاگ رہے ہیں؟ فرمایا کہ سو گیا تھا، گیارہ بجے نیند کھلی، سوچا کہ فون کروں، پھر خیال آیا کہ ابھی ٹرین آئی ہوگی، اس پر سوار ہونے کی ہماہمی میں ہوگے، اس لئے اس وقت فون نہیں کیا، تب سے جاگ رہا تھا کہ تمہاری خیریت معلوم کرکے سوؤں گا۔

۲۰۱۲ء کا حج جس میں مجھے بھی معیت کی سعادت حاصل ہوئی تھی، ایام حج کے بعد ہم لوگ مکہ ہی میں تھے، واپسی میں چندروز باقی تھے کہ ایک دن اطلاع ملی کہ مولانا عابد اعظمی صاحب کے چھوٹے صاحبزادے جن کی عمر دو سال رہی ہوگی، انتقال کرگئے۔ چند مہینے قبل انہیں کے بڑے بیٹے جن کی عمر چار سال رہی ہوگی، فوت ہوئے تھے۔ والد صاحب کو جب اس حادثہ کی خبر ملی تو نڈھال ہوگئے۔ جب طبیعت کچھ سنبھلی تو فرمایا کہ ''جو ہونا تھا، ہوگیا، بچہ جتنی عمر لے کر آیا تھا، پوری کرکے واپس چلا گیا، رنج ہونا تو فطری بات ہے، مگر مجھے اس سے زیادہ اس کی فکر ہے کہ بے چارے عابد پر کیا گزر رہی ہوگی؟ اس کو کتنی تکلیف ہو رہی ہوگی؟ مجھے بچے کے جانے کا غم تو ہے مگر اس سے زیادہ عابد کے بارے میں سوچ کر دکھ ہو رہا ہے۔'' اس واقعہ میں والد صاحب کے رضا بالقضا کی بھی جھلک ہے اور اولاد کے ساتھ ان کے لگاؤ اور محبت کی جھلکیاں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

تعلیم کا اہتمام:

والد صاحب کے نزدیک علم نام تھا علم دین اور متعلقات علم دین کا۔ اس کے علاوہ بقیہ علوم کو یا تو معلومات کے درجہ میں رکھتے تھے یا پھر فن کے کھاتے میں ڈال دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی تمام اولاد کو علم کے حصول میں لگایا، معلومات اور فنون کے حصول سے ابتدائے عمر میں باز رکھا۔

والد صاحب نے صرف اپنی اولاد کے لئے بہترین دینی تعلیم کے مواقع ہی نہیں فراہم

کئے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ تابمقدور ہر طرح کی کلفت و پریشانی کا ازالہ کر کے تعلیم میں منہمک رکھنے کی کوشش کی، اور اپنی اس کوشش میں بہت حد تک کامیاب بھی رہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ دوران تعلیم گھر کے کام کے لئے بھی کسی کو دور نہیں بھیجتے تھے کہ اس میں نقصان کا امکان تھا۔ استثنائی حالت کے علاوہ وہ اپنی اولاد کو مدتِ تعلیم میں کہیں سفر میں بھی لے جانے سے گریز کرتے تھے کہ اس سے تعلیم کی یکسوئی میں خلل واقع ہوگا۔ اس اہتمام اور انتظام کے باوجود اگر کسی کی طبیعت پڑھائی سے اچاٹ ہوگئی اور دل کا غالب میلان کسی فن کی طرف ہوگیا تو اس کو جبر پڑھانے کی کوشش بھی نہیں، بلکہ اس کے میلان طبع کو دیکھتے ہوئے، اسی فن میں اس کو لگا دیا مگر اس کا خیال رکھا کہ لائن نہ بدلنے پائے یعنی اس فن کے افراد جیسی شکل وصورت نہ ہو، اور دل ودماغ کا رجحان عملی دینداری سے نہ پھرے بلکہ سابقہ حالت پر رہے۔

❑❑❑

> چونکہ اس تعلیم میں کمائی کے مواقع محدود اور کم ہیں، اس لئے لوگ بھی اس میں لگانے کے لئے اپنی سب سے غبی اور گھٹیا اولاد کا انتخاب کرتے ہیں، جو کسی اور لائن میں چل ہی نہیں سکتی، سوچتے ہیں کہ اسی راہ سے جو تھوڑا کما لیں گے وہی غنیمت ہے، پھر یہی لوگ استاذ بن جاتے ہیں، ان کی نیت زندگی بھر درست نہیں ہوتی ایک طرف سرپرست کی نیت کی خرابی، اور دوسری جانب اس کے اثر سے استاذ کی نیت کا نقص، بس طالب علم پٹ کر رہ جاتا ہے، اسی لئے میں کہتا ہوں کہ طالب علم کو سنبھل کر رہنا چاہئے، اور اگر کبھی معیار کا استاذ میسر آجائے تو اسے گوہر سے بڑھ کر سمجھنا چاہئے۔ آج ہر چیز پیٹ کی نظر سے پرکھی اور دیکھی جاتی ہے کہ اس میں شکم پروری کا کتنا حصہ ہے اور اسی کو معیارِ کمال قرار دیا جاتا ہے۔ (حدیث دوستاں)
>
> عزیزانِ من! کیا بتاؤں امیدوں کے سہارا آج کے نوجوان طلباء ہی ہیں، لیکن جگر کٹ کر ٹکڑے ہوجاتا ہے جب ان کا رُخ دین مصطفیٰ سے پھرا ہوا دیکھتا ہوں۔ (حدیث دوستاں)

شریعت وطریقت کا بہترین سنگم
حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب

مولانا قمر الحسن صاحب
استاذ: مدرسہ تعلیم القرآن وفاطمہ یتیم خانہ اعظم گڑھ

استاذ محترم مولانا ضیاء الحق صاحب خیر آبادی نے حضرت الاستاذ مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی علیہ الرحمہ کی جامع کمال شخصیت کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے اور اچھا لکھا ہے:

’’ایک ہی شخص باکمال مدرس ومربی، بے مثال مقرر وخطیب، سحر نگار انشاء پرداز و خطیب، خضر راہ سالکِ شریعت وطریقت ہو، ایسا بہت کم ہوتا ہے، مگر جب اللہ تعالی کو کسی فرد سے ایک عالم کا کام لینا مقصود ہوتا ہے تو اس کے اندر یہ تمام خوبیاں جمع کر دیتے ہیں۔‘‘

میرے مربی ومحسن استاذ محترم حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب علیہ الرحمہ کی ذات ایسی ہی جامع صفات تھی۔ وہ اللہ تعالی کی قدرت کاملہ کی حجۃ بالغہ تھے۔ احقر حضرت الاستاذ کی جملہ صفات میں سے ایک وصفِ کامل کی گرہ کشائی کرنا چاہتا ہے، کہ حضرت الاستاذ بہترین مصلح اور شیخ کامل بھی تھے۔ راقم السطور حضرت الاستاذ کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوا جبکہ تصوف و سلوک کی ’’ت‘‘ اور ’’س‘‘ سے بھی واقف نہیں تھا۔

مدرسہ کی روحانی فضا، اور آپ کی صحبت کی برکت سے راہ تصوف سے آشنائی ہوئی۔ ۱۹۹۸/۹۹ء کی بات ہے، جب حضرت کی طرف سے بچوں کو بھی جمعرات کے دن بعد نماز مغرب ذکر میں شرکت کرنے کی اجازت ملی، کچھ بچے شرکت کرتے تھے، جن میں یہ ناکارہ بھی تھا۔ حضرت

ذکر کے بعد تصوف پر تھوڑی دیر وعظ فرماتے تھے، اس وعظ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ انسان ظاہر و باطن کے مجموعے کا نام ہے۔ جس طرح جسم بیمار پڑتا ہے تو اس کا علاج ڈاکٹروں کے ذریعے ہوتا ہے، اسی طرح قلب بیمار پڑتا ہے تو اس کا علاج بھی ہوتا ہے، اور اس کے معالج یہی مشائخ ہیں۔

حضرت الاستاذ کے تلامذہ حضرت کو راہِ شریعت کا پیشوا ماننے کے ساتھ راہِ طریقت کا بھی شیخ مانتے تھے۔ اسی لئے باطنی امراض کے علاج کے لئے حضرت کی خدمت میں عریضہ لکھتے اور حضرت جو علاج تجویز فرماتے اس پر مضبوطی سے عمل پیرا ہوتے۔

نمونے کے طور پر چند خطوط کا خلاصہ اور حضرت کا جواب ملاحظہ فرمائیں۔

ایک طالب علم نفس کی شرارتوں سے پریشان ہوکر مولانا کی خدمت میں ایک عریضہ لکھتا ہے:

''کل سے ذہن میں فاسد خیالات گردش کررہے ہیں، ہر ممکن ختم کرنے کی کوشش کی، لیکن نفس غالب رہا۔''

نفس کی شرارتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے آگے لکھتا ہے:

''اب کیفیت یہ ہے کہ خواہ کتاب پڑھوں یا نماز پڑھوں، ہر وقت وہی دھیان ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے، برائے مہربانی راہنمائی فرمائیں۔''

حضرت نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

> ''اپنے آپ کو خدا کے حضور میں حاضر سمجھو، اور یہ خیال کرو کہ اللہ تعالی کی نگاہ میرا ہر طرف سے احاطہ کئے ہوئے ہے۔ تنہائی میں بیٹھ کر دیر تک اس کا استحضار کرو۔ میں دعا کرتا ہوں، اللہ تعالی نفس کے شر سے محفوظ رکھیں، کل پھر خبر دو۔'' اعجاز احمد اعظمی۔ ۸/ذی قعدہ ۱۴۲۳ھ

طالب علم کا دوسرے دن کا عریضہ ملاحظہ فرمائیں:

> ''الحمد للہ حضرت کے بتائے ہوئے معمولات سے بہت اطمینان ہے، اب تو فاسد خیالات کے آنے سے دل کی عجیب کیفیت ہو جارہی ہے، اور اس وقت کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مجھے کیا ہوگیا؟۔''

حضرت نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

’’اللہ کا بڑا کرم ہے کہ اپنے پناہ میں لے لیا، اس معمول کو گاہے بگاہے جاری رکھو، میں دعا کرتا ہوں۔‘‘ اعجاز احمد اعظمی ۔ ۹/ ذی قعدہ ۱۴۲۳ھ

ایک صاحب اور نفسانی خواہش کا تفصیل سے تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’ایک رات حالت اس طرح ہوگئی کہ نفس ارتکابِ معصیت پر اڑا ہوا تھا، نیند بھی نہیں آرہی تھی۔ وعید والی آیت وحدیث میں غور کررہا تھا، استحضار کررہا تھا، لیکن کوئی تدبیر کارگر نہیں ہورہی تھی۔ اخیر میں آپ کے وجود کو پوری قوت کے ساتھ خیال میں بسایا کہ حضرت بیٹھے دیکھ رہے ہیں، تب جاکر راحت ملی، اور نیند آئی۔‘‘

حضرت نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

’’عزیزم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

انسان کمزور پیدا کیا گیا، اور اس کے ساتھ نفس اور شیطان کی آفات لگی ہوئی ہیں، کچھ اندرونی ہیجان، کچھ بیرونی تحریضات۔ ایسی حالت میں گناہ سے بچ جانا خاص نعمتِ الٰہی ہے، اللہ کا بہت بہت شکر وکرم ہے کہ اس بارگاہ سے حفاظت کا فیضان تم پر نازل ہوا، جو تدبیر تم نے اختیار کی وہ خوب ہے، اور تم نے خوب ہی اپنے نفس سے جہاد کیا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے استقامت عطا فرمائیں۔ یہ کشمکش اصل مجاہدہ ہے۔ اللہ تم کو زور وقوت عطا فرمائیں۔

عزیزم! یہ مقابلہ زندگی بھر کا ہے، اسی طرح نفس اور شیطان کو شکست ہوتی رہی تو وہ ضعیف ہوجائے گا، اور ایک گونہ اطمینان ہوجائے گا۔ بس اللہ کے حضور خوب تضرع وزاری کرتے رہو، اور چلتے رہو، اللہ مدد کرنے والے ہیں۔ میں دعا کرتا ہوں۔‘‘ اعجاز احمد اعظمی

حدیث شریف کے ایک طالب علم نے حدیث شریف سے شغف کے لئے دعا کی درخواست کی۔ اس کے جواب میں حضرت نے تحریر فرمایا:

’’جو حدیث پڑھو، اس خیال سے پڑھو کہ میں خود رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں آپ کی زبان مبارک سے سن رہا ہوں، اور اس کلام کا نور میرے سینے کے اندر سرایت کررہا ہے۔‘‘

ایک طالب علم نے نماز سیکھنے کی درخواست کے لئے عریضہ لکھا کہ اس سال نماز سیکھنا چاہتا ہوں، لہٰذا حضرت والا توجہ مبذول فرمائیں۔ اس کے جواب میں حضرت نے تحریر فرمایا:

’’نماز میں یکسوئی اور حضور بحضرتِ خداوندی مطلوب ہے، نماز کی نیت باندھتے وقت ایک مرتبہ اس کا استحضار کرو کہ میں اللہ کے سامنے کھڑا ہوں، اور اسی تصور کو نماز میں جمانے کی کوشش کرو۔ میں ان شاء اللہ متوجہ رہوں گا، تم اس کی اطلاع گاہے گاہے کرتے رہو۔‘‘

اعجاز احمد اعظمی۔ ۲۲؍ ذی قعدہ ۱۴۲۴ھ

دس روز کے بعد اس متعلمِ صلوۃ نے ۳؍ ذی الحجہ ۱۴۲۴ھ کو دوسرا عریضہ حضرت کی خدمت میں تحریر کیا، خط اور اس کا جواب من وعن ملاحظہ فرمائیں:

’’مکرمی ومشفقی ومربی دامت فیوضکم علینا وعلی الناس

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعدہ، عرضِ خدمت یہ ہے کہ کچھ روز قبل ایک عریضہ لکھا تھا، جس میں نماز سیکھنے کی درخواست کی تھی، حضرت نے اس کی ترکیب بتائی تھی، اس پر عمل کر رہا ہوں، لیکن ابتدا میں تین چار دن ایسے گزرے ہیں کہ حضور بحضرتِ خداوندی کے ساتھ نماز شروع کرتا، اور استحضار دیر تک باقی رہتا تھا، اور نماز میں خوب جی لگتا تھا، عموماً جو سورتیں پہلے پڑھتا تھا اس سے بڑی سورتیں پڑھنے لگا تھا، دوران نماز کوئی خیال آتا تو جلد ہی رفع ہو جاتا، اور ارکانِ نماز ادا کرتے وقت یہ خیال آتا کہ حضرت والا اس رکن کو ایسے ادا فرماتے ہیں، بعینہ ویسے ادا ہوتے، لیکن یہ کیفیت کچھ روز رہی پھر ختم ہوگئی۔ اب حالت یہ ہے کہ کم وقت استحضار رہتا ہے، زیادہ وقت خیالاتِ آتیہ کو رفع کرنے میں گزر جاتا ہے۔ اس پر توجہ کی درخواست ہے۔ بقیہ احوال لائق شکر ہیں، مزید درستگی احوال کے لئے دعا کی درخواست ہے۔‘‘

حضرت نے جواب تحریر فرمایا:

’’عزیزم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یہ کیفیت مسلسل نہیں رہتی، کوشش البتہ مسلسل رہنی چاہئے، اس حالت کو جو تم کو پیش آرہی ہے ’’تلوین‘‘ کہتے ہیں۔ مسلسل کوشش جاری رہے گی تو ’’تمکین‘‘ کی کیفیت حاصل ہوگی۔

خطراتِ فاسدہ جو دل میں آتے ہیں، انہیں دفع کرنے کی کوشش نہ کرو، بلکہ جیسے تیسے ہو فوراً خیال کو حق تعالی کی جناب میں متوجہ کردو، پھر ہٹ جائے تو پھر متوجہ کردو۔ یہ کشمکش کچھ عرصہ

تک چلے گی، پھر اللہ تعالیٰ کی مدد ہوگی، تو خطرات ضعیف و مضمحل ہو جائیں گے۔ بس کوشش میں لگے رہو، حق تعالیٰ اس کا ثمرہ عطا فرمائیں گے۔ عجلت نہ کرو، جتنا وقت اس کوشش میں گزرے گا وہ سب بھی طاعت میں شمار ہوگا۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ اس کیفیت میں رسوخ عطا فرمائیں۔'' والسلام اعجاز احمد اعظمی۔ ۳/ ذی الحجہ ۱۴۲۴ھ

اس خط کے تحریر کرنے کے گیارہ دن کے بعد ۱۴/ ذی الحجہ ۱۴۲۴ھ کو حضرت الاستاذ کے جسم کے دائیں حصے پر فالج کا شدید حملہ ہوا، بغرضِ علاج اعظم گڑھ شہر میں کافی دن قیام کرنا پڑا۔ آہستہ آہستہ روبصحت ہوئے، تو پھر درس و تدریس، اور اصلاح و تربیت کی محفلیں سجنے لگیں۔

طلبہ کو وعظ کرتے ہوئے ایک بیان میں خیالات کو کنٹرول کرنے کی طرف توجہ دلائی کہ کوئی خیال ایسا نہ ہو کہ بے خیالی میں آئے، اور دماغ سے گزر جائے، یا وہاں اپنا قبضہ جمائے۔

حضرت الاستاذ کی علالت کی وجہ سے طلبہ میں جو انجمادی کیفیت پیدا ہوگئی تھی وہ اس بیان سے دور ہوگئی۔ پھر وہ اصلاح حال کی طرف متوجہ ہوئے۔

سابق مکتوب الیہ حضرت مولانا کے بیان سے متأثر ہوکر قلم کے واسطے سے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوکر بزبان قلم یوں گویا ہوتے ہیں:

''حضرت استاذنا المکرّم **دامت برکاتکم وفیوضکم**

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عرض خدمت اینکہ میں نے شروع سال میں اصلاح نماز کے بارے میں ایک مکتوب آپ کی خدمت میں پیش کیا تھا، حضرت کی توجہ سے کچھ اصلاح ہوئی تھی کہ حضرت کی طبیعت علیل ہوگئی۔ نفس کو سستی کا ایک بہانہ ملا، اپنے احوال کی اطلاع نہ کی، پھر نماز جیسی تھی ویسی ہوگئی۔ چند دنوں سے قصد کر رہا تھا کہ ایک خط لکھ کر سستی کی معافی مانگ کر پھر اصلاح کی کوشش کروں، لیکن اس کی توفیق نہیں ہو رہی تھی۔ آخر کل آپ کے بیان نے ایک نیا جوش اور نیا ولولہ پیدا کیا، پھر خدمت میں حاضر ہو رہا ہوں، اس امید کے ساتھ کہ حضرت اتنے عرصے کی غیر حاضری کو معاف کر کے توجہ فرمائیں گے۔

کل کے بتائے ہوئے نسخے پر عمل کر رہا ہوں، ماشاء اللہ ایک حد تک نماز اور غیر نماز میں

خیالات پر کنٹرول ہے۔ حضرت توجہ اور دعا فرمائیں کہ باری تعالی حسنِ نماز اور نگہداشت قلب و خواطر کی توفیق دیں۔‘‘

عزیزم السلام علیکم

استحضار و کیفیت احسان کی تجدید کرتے رہو، اور جلدی جلدی کرتے رہو، ورنہ نفس کو بھاگتے دیر نہیں لگتی۔ اصلاح خیال اور نگہداشتِ قلب و دماغ نہایت ضروری بھی ہے، اور مفید بھی، غفلت نہ ہونے پائے، کوئی خیال ایسا نہ ہو کہ بے خیالی میں آئے، اور دماغ سے گذر جائے، یا وہاں اپنا قبضہ جمالے۔ اور اس قسم کا جب بھی خیال آئے جو نامناسب ہو تو خوب خیال کرکے اور خدا کی جانب دھیان جما کر ’’لا الہ الا اللہ‘‘ کا چند بار تکرار کرو، اور یہ خیال کرو کہ میں اس خیال کو نکال کر اللہ کے خیال کو دل میں جما رہا ہوں۔ ایسا دن میں متعدد بار کرو، اور اس سے غافل نہ ہو۔‘‘

ایک مسترشد حضرت الاستاذ کی خدمت میں اپنی دلی کیفیت کو الفاظ کا جامہ پہنا کر یوں رقم طراز ہیں:

’’آج کل میرے دل کی حالت اجڑے ہوئے چمن کی طرح ہے، یوں معلوم ہو رہا ہے کہ میری کوئی قیمتی چیز کھوگئی ہے، نہ نماز میں کوئی لطف، نہ ذکر و اذکار میں کوئی لذت۔ بس نماز فرض ہے ذمہ سے ساقط ہو رہی ہے، اور ذکر ایک معمول ہے، پورا ہو رہا ہے۔ یہ کیفیت تقریباً پندرہ بیس دن سے پیدا ہوئی ہے۔

میں نے اپنے قلب پر غور کیا تو کوئی ایسا مرض، امراضِ قلب میں سے نہیں پایا جو اس میں نہ ہو۔ جب جب اس چیز کو سوچتا ہوں تو طبیعت بہت کڑھتی ہے، طرح طرح کے وساوس پیدا ہوتے ہیں۔

یہ میرے احوال ہیں۔ حضرت والا توجہ فرمائیں اور دعا فرمائیں کہ آوارہ دل سنور جائے۔ آمین۔‘‘

’’عزیزم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آدمی جب اللہ کی راہ میں چلتا ہے تو اس پر دو طرح کی حالتیں طاری ہوتی ہیں، ایک وہ،

جس میں وہ چمن کی طرح کھلا ہوا ہوتا ہے، اسے ’’بسط‘‘ کہتے ہیں، دوسرے وہ، جب چمن اجڑا ہوا محسوس ہوتا ہے، یہ ’’قبض‘‘ ہے۔ دونوں حالتیں مبنی بر مصلحت ہوتی ہیں، دونوں حالتوں میں سالک کا فریضہ ہے کہ اپنے معمولات پر دل یا بے دلی سے کاربند رہے۔ گو قبض کی حالت میں کسی قدر کمی آجائے، مگر بالکلیہ ترک نہ کرے، پھر وہ حالت بدل جاتی ہے۔ اپنے کام میں لگے رہو، دو ہفتے سے زیادہ مدت اطلاعِ احوال میں نہیں ہونی چاہئے۔ قلبی امراض میں سے ایک ایک سے مطلع کرو، اور اس کا علاج پوچھو، پھر جیسا بتاؤں اس پر عمل کرو۔ ان شاء اللہ نجات مل جائے گی۔ اصل عمل ہی ہے، میں دعا کرتا ہوں۔‘‘ اعجاز احمد اعظمی۔ ۱۴؍ جمادی الاول ۱۴۲۸ھ

اس وقت عوام تو عوام، خواص بھی جس مرض میں مبتلا ہیں، وہ غیبت ہے۔ حضرت شیخ الحدیث شیخ زکریا علیہ الرحمہ نے فضائلِ رمضان میں لکھا ہے:

’’ہم لوگ اس سے بہت ہی غافل ہیں، عوام کا ذکر نہیں خواص مبتلا ہیں۔ ان لوگوں کو چھوڑ کر جو دنیادار کہلاتے ہیں، دینداروں کی مجالس بھی اس سے کم خالی ہوتی ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اکثر اس کو غیبت نہیں سمجھا جاتا ہے۔ اگر اپنے یا کسی کے دل میں کھٹکا بھی پیدا ہو تو اس پر اظہارِ واقعہ کا پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔‘‘ (فضائل رمضان: ص ۲۸)

ایک مولوی صاحب جو ایک مدرسہ کے مدرس ہیں، حضرت سے بیعت وارادت رکھتے تھے، ان کو غیبت سے بچنے کی فکر ہوئی تو حضرت کی خدمت میں ایک عریضہ تحریر کیا:

’’عرصہ سے غیبت سے بچنے کی کوشش کر رہا ہوں، بہت اہتمام کرتا ہوں تو کم ہو جاتی ہے، لیکن چھوٹ نہیں رہی ہے۔ خصوصاً اسٹاف کے افراد میں سے کسی سے گفتگو ہوتی ہے تو دوسرے ساتھیوں کی جی بھر کر برائی ہوتی ہے۔ زبان کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتا ہوں تو کان سے سننا ہی پڑتا ہے۔ حضرت کوئی ترکیب بتائیں، اور دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اس بلائے عظیم سے ہمیشہ کے لئے نجات دلادے۔‘‘ آمین

’’عزیزم السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ

حتی الامکان گفتگو کم کرو، قلت کلام بنیادی چیز ہے۔ سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ ’’ولکن کلامک جواباً.‘‘ ابتدا بالکلام نہ کرو۔ تمہارا کلام مجلس میں جہاں

سب بول رہے ہوں، جواب ہوا کرے، اس کے ساتھ اس کا استحضار رکھو کہ غیبت کرنا اپنے مردہ اور مجبور بھائی کا گوشت کھانا ہے۔ حرام کھانے سے اللہ کی ناراضگی کا دھیان رہے۔ پس غیبت مت کرو، اور جب ہونے لگ جائے تو کسی بہانے سے مجلس سے اٹھ جاؤ، آہستہ آہستہ یہ طریقہ عمل میں لاؤ۔ خاص اہتمام اس کا کرو کہ اگر لوگ غیبت شروع کردیں تو عملاً اس میں شریک نہ ہوجاؤ، بلکہ وہاں سے اٹھنے کی کوشش کرو، اور نہ اٹھ سکو تو دل سے برا سمجھتے رہو، یہ اضعف الایمان ہے۔ اتنے پر بھی عمل کرلو گے تو قوت پیدا ہوجائے گی۔ میں دعا کرتا ہوں۔''

اعجاز احمد اعظمی ۹؍ جمادی الآخر ۱۴۲۸ھ

نمونے کے ان چند خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ مدرسہ شیخ الاسلام صرف تعلیم وتعلم کی دانش گاہ ہی نہیں تھی بلکہ مردہ دلوں کی سیرابی کے لئے معرفت الٰہیہ کا سرچشمہ بھی تھا، جہاں ایک طرف ''قال اللہ وقال الرسول'' کی صدائے دلنواز بلند ہوتی تھی تو دوسری طرف معرفتِ الٰہیہ کے جام لنڈھائے جاتے تھے۔ طلبہ علومِ ظاہریہ سے آراستہ ہونے کے ساتھ ساتھ باطنی علم سے بھی فیض یاب ہوتے تھے، بالفاظ دیگر حضرت الاستاذ کی صحبت بابرکت شریعت وطریقت کا بہترین سنگم تھی، جس سے آج مولانا کے تلامذہ متعلقین ومنتسبین محروم ہوگئے۔

صمیمِ قلب سے میری دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ حضرت کی اولاد واحفاد کو متعلقین و منتسبین کو حضرت کا سچا جانشیں بنائے، اور ان کا علمی وروحانی وارث بنائے۔ **ھو اللہ الموفق المعین**

* * *

ایمان کے بعد معصیت مصیبت کو جلد لاتی ہے، جو بالکل نہیں مانتے انھیں دخولِ نار تک مہلت ہے، اس لئے ان کے یہاں کسی قدر چین ہے، لیکن ایک مومن جس کو حق تعالیٰ دخولِ نار سے بچاتے ہیں، وہ فوراً سزا کی زد میں آجاتا ہے، گنہگاروں کے گناہ اس سے مٹتے ہیں، صالحین کے درجات بلند ہوتے ہیں، آخرت کی پکڑ سے حفاظت ہوتی ہے، ہے تو بڑا فائدہ! مگر مصائب کی تاب ہمارے اندر کہاں؟ حق تعالیٰ حفاظت فرمائیں۔

(حدیث دوستاں)

حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب
کی تصنیفات کا تعارف

مولانا محمد عابد اعظمی صاحب
ابن حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی

نحمده و نصلی علی رسوله الکریم. اما بعد

دنیا میں کچھ شخصیتیں جامع الکمالات ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ کو جن اشخاص سے اپنے دین کا کام لینا ہوتا ہے اور جن سے اپنے بندوں کو نفع پہونچانا مقصود ہوتا ہے، ان میں وہ تمام مطلوبہ عناصر وافر مقدار میں جمع کر دیتا ہے جو راہِ وفا میں ثابت قدمی کے ساتھ حصول مقصد کے لئے ناگزیر ہیں۔ ابتداء ہی سے آزمائش وامتحان کی بھٹی میں تپا کر شخصیت کے ہر پہلو کو اتنا پختہ اور صیقل بنا دیتا ہے کہ زمانہ ان کی ہمت وعظمت صلابت واستقامت کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا ہے۔ زمانہ ان کو نہیں بناتا بلکہ یہ زمانے کو اپنا بنا کر اسے اپنے معیار پر ڈھالتے اور کام لیتے ہیں:

اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہلِ دل
ہم وہ نہیں کہ جن کو زمانہ بنا گیا

(جگر مرادآبادی)

حضرت والد صاحب علیہ الرحمۃ انہیں باتوفیق برگزیدہ بندگانِ خدا میں سے تھے، جنہیں قدرت نے ہر اعتبار سے جامع الکمالات اور منبع الفضائل بنایا تھا۔ تعلیم و تدریس، تحریر وتقریر، تصنیف وتالیف، اصلاح وارشاد، تربیت ورجال سازی، وعظ وتبلیغ، نصح وخیر خواہی، فیض بخشی ونفع

رسانی، ہر پہلو سے نمونہ کے انسان تھے۔ تعلیم وتدریس میں یکتا، تصنیف وتالیف میں یگانہ، اصلاح وارشاد میں مرشد کامل، تربیت ورجال سازی میں ممتاز، وعظ وتبلیغ میں بے مثل، نصح وخیر خواہی میں باعثِ رشک، اور فیض بخشی اور نفع رسانی میں اپنی مثال آپ تھے۔ حضرت والد صاحب علیہ الرحمہ کی ہمہ جہت اور پہلو دار شخصیت کے تمام روشن گوشوں پر دیگر اہل علم روشنی ڈالیں گے، ناچیز ان کی تحریر ونگارش، اور تصانیف وتراجم کے حوالے سے ان کی خدمات کا اپنی بساط کے مطابق اس مضمون میں ذکر کرے گا۔

والد صاحب علیہ الرحمہ نے زمانہ طالب علمی ہی میں مضمون نگاری شروع کر دی تھی، پڑھنے اور مطالعہ کرنے کا شوق چونکہ جنون کی حد تک تھا اور ساتھ ہی ذہن بھی بہت تیز اور اخاذ تھا، اس لئے کتاب کے تمام مضامین مستحضر ہو جاتے، اور اسی کی روشنی میں مضمون لکھا کرتے تھے۔ عربی چہارم کی طالب علمی کے زمانے میں سیرۃ النبی، علامہ شبلی نعمانی زیر مطالعہ تھی۔ اس سے اخذ کر کے متعدد موضوعات پر چھ سات تقریریں لکھیں، اس کے بعد یہ سلسلہ چلتا رہا۔ رسمی تعلیم سے فراغت کے بعد اشہبِ قلم نے جو تیزی دکھائی تو وفات کے وقت تک اس کی رفتار میں کمی نہ آئی، اس درمیان ہزاروں صفحات پر اس کی جولانیوں نے نقش ونگار اور گل بوٹے بنائے۔

١٣٩٢ھ مطابق ١٩٧٢ء میں جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب بنارس کے زمانہ تدریس میں باضابطہ ایک کتاب ’’قربانی کیجئے، قربانی دیجئے‘‘ کے نام سے تصنیف فرمائی۔ یہ کتاب حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب کی خواہش پر ایک ہی رات میں قلم برداشتہ لکھی تھی۔ یہ کتاب بنارس سے چھپ کر مقبول خاص وعام ہوئی، اب یہ نایاب ہے، اس کی دوبارہ اشاعت نہ ہو سکی۔ اس سے آپ کے استحضارِ معلومات اور سرعتِ تحریر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، اس کتاب کی تحریر و اشاعت کے بعد آپ کے قلم اعجاز رقم سے مختلف موضوعات پر سینکڑوں مضامین اور بیسیوں کتابیں منصۂ شہود پر آئیں اور عام وخاص میں یکساں طور پر مقبول ہوئیں۔ اس مضمون میں آپ کی مطبوعہ تصنیفات وتالیفات اور تراجم کا ایک جامع تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

(١) تسہیل الجلالین:

درس نظامی میں شامل امام سیوطی اور امام محلی کی مشہور تفسیر ’جلالین‘ کی شرح ہے۔ یہ تفسیر

مختصر ہونے کے باوجود بہت سی خصوصیات کی وجہ سے ہمیشہ سے اہل علم کے درمیان مقبول رہی ہے۔ اس تفسیر میں اس کا اہتمام کیا گیا ہے کہ کم سے کم الفاظ میں قرآن کریم کی آیات کی ایسی شرح کردی جائے، جس سے کلام اللہ کی مراد واضح ہوجائے۔ اسی اختصار کے پیش نظر تفسیری اقوال میں راجح قول کو لیا گیا ہے، اور جہاں اعراب بیان کرنے کی ضرورت تھی اسے بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اختلاف قرأت پر بھی موقع بموقع متنبہ کیا گیا ہے، حسب ضرورت شان نزول کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ یہ تفسیر اختصار کے باوجود جامع بھی ہے اور سہل بھی، تا کہ قرآن کریم کو سمجھنے میں یہ بنیاد کا کام دے۔

مذکورہ بالا خصوصیات کے پیش نظر حلقہ اہل علم کی طرف سے شدید تقاضا تھا کہ اس کی ایسی شرح لکھی جائے جس میں تفسیری الفاظ کی مکمل وضاحت وتشریح ہو، اور طلبہ کو تفسیری الفاظ کے سمجھنے میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں، ان کے حل کے ساتھ، عام لوگوں کے لئے بھی اس میں استفادے کا سامان ہو۔ والد صاحب نے اس خیال سے کہ درس قرآن کے ساتھ (جس کا سلسلہ تا حیات جاری رہا) تحریری طور پر بھی قرآن کی خدمت ہوجائے، شرح لکھنے کا کام شروع کیا۔ مختلف عوارض وامراض کی وجہ سے تسلسل کے ساتھ کام نہ ہوسکا، تاہم رکاوٹوں کے باوجود سورۃ بقرہ، آل عمران، النساء کی شرح وتفسیر پر پہلی جلد مکمل ہوئی۔ اور ۲۰۱۰ء میں چھپ کر منظر عام پر آئی۔ شرح کی خصوصیات اور طریقہ عمل خود شارح کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

(۱) تفسیر کا مع متن ترجمہ قرآنی ترجمہ
(۲) تفسیری عبارت کی توضیح وتشریح
(۳) تفسیر جلالین کی روشنی میں آیات کے مضامین کا مختصر بیان

ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے کہ متنِ قرآن اور تفسیر کا ترجمہ مسلسل ایک عبارت ہو، اور دونوں کے درمیان امتیاز کے لئے متنِ قرآن کے ترجمہ کو قوسین میں لکھا گیا ہے۔ ترجمہ اس انداز سے کیا گیا ہے کہ کوئی شخص صرف قوسین کی عبارت پڑھے تو وہ قرآن کریم کا مسلسل ترجمہ ہے، اور پوری عبارت پڑھے تو ترجمہ وتفسیر دونوں ہے۔

ترجمہ مکمل ہوجانے کے بعد تشریحات کے عنوان سے تفسیری الفاظ کی تشریح وتوجیہ کی گئی

ہے۔ پڑھنے کے دور میں اساتذہ نے بتایا تھا کہ جلالین کے حل کرنے کی کنجی انہیں تفسیری الفاظ کا سمجھنا ہے، ان سے قرآن کی مراد واضح اور متعین ہوتی ہے، قرآن فہمی کی راہیں کھلتی ہیں۔ اس لئے شرح میں اس کا بطور خاص خیال رکھا گیا ہے۔

تشریحات کے مکمل ہونے کے بعد ’’مضامین آیات وتفسیر‘‘ کے عنوان سے زیر تفسیر آیات کے مضامین کو اجمالاً آسان عبارت میں لکھ دیا گیا ہے، تا کہ بیک نظر زیر تحریر آیات کا مضمون سامنے آجائے۔ یہ حصہ وہ ہے جس سے عام اردو خواں بھی بطریق معتبر مستفید ہو سکتے ہیں۔

یہ تین کام تو اصل کتاب کی شرح سے متعلق ہیں، کہیں کہیں ضرورت محسوس ہوئی ہے تو مفسر کی تفسیر کے علاوہ دوسرے علما کی تفسیر وتاویل سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ ایسا بہت کم ہوا ہے، تاہم کہیں کہیں ہے، ورنہ مرکزِ توجہ تفسیر جلالین ہی کو بنایا گیا ہے۔

شارح نے کوشش کی ہے کہ تفسیر جلالین کی یہ شرح، شرح ہی رہے، اسی لئے عموماً دوسری تفاسیر کو زیر بحث نہیں لایا گیا ہے۔ جلالین سے ہٹ کر تحقیقات بھی نہیں کی گئی ہے، ہاں اگر کسی مقام پر علمانے جلالین کی تفسیر میں تسامح محسوس کیا ہے تو اس کی نشان دہی کر دی گئی ہے۔

حضرت والا کا ارادہ یہ تھا کہ شرح کا کام نصفِ اول اور نصفِ ثانی دونوں طرف سے ہو، اس لئے آپ نے پہلی جلد کی تکمیل کے بعد سورۃ کہف کی تفسیر لکھنا شروع کی، مختلف عوارض کے درمیان یہ سلسلہ چلتا رہا، تا آنکہ سورۃ الانبیاء کے ابتدائی حصہ کی شرح تک کام پہونچا تھا کہ وقت موعود آپہونچا اور یہ مبارک ومسعود سلسلہ موقوف ہوگیا۔ خدا کرے کہ حضرت کے تلامذہ، اولاد اور متعلقین میں سے کوئی باہمت آپ کے انداز اور اسلوب میں اس کی تکمیل کا بیڑہ اٹھائے اور اس کو انجام تک پہونچائے۔

(۲) حیاتِ مصلح الامت:

یہ کتاب ماضی قریب کے عظیم صاحب نسبت بزرگ، حضرت حکیم الامت تھانوی کے خلیفہ اجل، سراپا احسان واخلاص، مصلح الامت، عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتح پوری، ثم الہ آبادی قدس سرہ کی مکمل ومفصل سوانح عمری ہے، جو والد صاحب کے قلم گہر بار سے ۱۹۸۴ء میں مرتب ہوکر شائع ہوئی۔ اللہ تعالی نے اس کتاب کو بڑی مقبولیت عطا فرمائی، اکابر علما و

مشائخ نے اسے دادو تحسین سے نوازا، اوراپنی مجالس میں اسے پڑھوایا۔ ارباب معانی نے حضرت اقدس کی روحانیت کی حلاوت پائی، اور اصحاب ظواہر نے الفاظ وعبارت اور حسنِ انشا پردازی کو بنظر استحسان دیکھا۔ ترجمانِ مصلح الامت، حضرت مولا نا عبدالرحمان جامؔی صاحب نے اپنے تأثرات کا اظہاران الفاظ میں کیا:

> ’’اس راقم نے تو ازاول تا آخراس کی سماعت کی، جناب قاری مبین صاحب مدظلہ نے بھی اسے پسند فرمایا، اور بندہ تو بہت ہی محظوظ ہوا، اور جا بجا تو مولانا کے واقعات کی عکاسی کچھ اس طرح کی کہ اصل حال کا منظر سامنے آکر اس کے جیسا ہی متأثر کیا، اور کہیں کہیں لکھتے لکھتے جب حضرت اقدس کے الفاظ کا ذکر کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاتم میں نگینہ جڑ دیا گیا ہو، اور بہت سی جگہوں پر تو واقعات کے ذکر کرنے سے پہلے یا بعد میں تقریباً کچھ اس طرح سے وضاحت کردی ہے، جس نے اصل مضمون میں چار چاند لگادئے ہیں، ....غرض کہ ماشاءاللہ مولانا نے اپنے اس انتخاب میں اختصار کے باوجود کسی گوشہ کو تشنہ نہیں چھوڑا، اور حضرت مصلح الامت کی سوانح کو دوجلد میں مکمل کر کے اپنی اس تالیف کو رشکِ صد تالیف بنادیا ہے۔‘‘

مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کتاب کے پیش لفظ میں تحریر فرماتے ہیں:

> ’’میں نے جستہ جستہ اس پر نظر ڈالی اور اس کے بعض حصے سنے، کتاب جدید اسلوب اور مذاق کے مطابق لکھی گئی ہے، اور اس میں جہاں تک مجھے اندازہ ہوا وہ خصوصیات موجود ہیں جن کی طرف میں نے اشارہ کیا۔ میرا مصنف سے اس کتاب کے ذریعہ پہلی مرتبہ تعارف ہوا، وہ مدرسۂ دینیہ غازی پور کے مدرس ہیں، جن کا اصلاً اشتغال درس وتدریس سے ہوگا، لیکن ان میں تصنیفی سلیقہ، تحریر میں ایسی شگفتگی اور سلاست، کتاب میں ایسی حسن ترتیب اور مضامین کا حسن انتخاب ہے جو کہنہ مشق مصنفوں اور اہل قلم میں پایا جاتا ہے۔‘‘

کتاب کا پہلا ایڈیشن عرصہ ہوا ختم ہوگیا تھا، نئے ایڈیشن کے لئے احباب و متعلقین کی طرف سے مسلسل تقاضے ہوتے رہے، بالآخر چند مضامین کے اضافے کے ساتھ دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۷ء میں اشاعت پذیر ہوا۔

یہ کتاب بزرگوں سے محبت رکھنے والوں اور نسبت مع اللہ کی قدر کرنے والوں کے لئے ایک بیش بہا خزینہ ہے، جس میں بزرگوں کی روحانیت کی حلاوت بھی ہے، اور زبان وبیان کی

چاشنی بھی، اہل اللہ کی باطنی کیفیات کا دل پذیر مرقع بھی ہے، اور ظاہری حسن و جمال کا دل افروز نظارہ بھی۔ حضرت مصلح الامت کے عارفانہ ومحققانہ مضامین و کلام کا مظہر بھی ہے، اور حضرت مصنف علیہ الرحمہ کے جذب ومحبت کا پرتو بھی، صاحب سوانح کا حسنِ خلق، حسنِ سلوک، اور حسنِ تربیت کا بیان بھی ہے، اور صاحبِ تصنیف کے جذبِ دروں اور اہل اللہ سے تعلق ومحبت کی آئینہ دار بھی۔

(۳) کھوئے ہوؤں کی جستجو:

یہ کتاب حضرت والد صاحب علیہ الرحمہ کے ان تأثراتی مضامین کا مجموعہ ہے جو ملک کی مختلف شخصیات پر ان کی وفات کے بعد لکھے گئے ہیں، اور مجلّہ ''المآثر'' مئو، ماہنامہ ''ضیاء الاسلام'' اور مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔ والد صاحب کو بچپن سے صالحین اور بزرگوں کے تذکروں اور سوانح عمریوں سے شغف بلکہ عشق رہا ہے، اور اس راستے سے ان کی محبت وعقیدت ان کے رگ و ریشہ میں پیوست ہوگئی۔ گفتگو میں، وعظ وتقریر میں، درس وتدریس میں، بکثرت ان حضرات کا تذکرہ ہوتا رہتا تھا۔ پھر اسی محبت وعقیدت نے جب قلم اٹھوایا تو کتنے ہی بزرگوں کی سوانح عمریاں اور حالات زندگی کتاب ومضامین کے صورت میں جلوہ گر ہوئے۔ اس کتاب میں جن حضرات کا تذکرہ شامل ہے ان کے متعلق صاحب کتاب رقم طراز ہیں:

> ''ان اصحاب رشد وصلاح میں سے چند ہی حضرات وہ ہیں جن سے میری ملاقات نہیں، باقی سب حضرات سے میرے قریبی تعلقات رہے ہیں۔ مجھے ان سے محبت تھی، میں نے انہیں محبت کی نظروں سے دیکھا، مجھے ان میں خوبیاں دکھائی دیں، انہیں کو میں نے کاغذ پر نقش کردیا۔ میں مؤرخ نہیں ہوں، ان مضامین میں ماہ وسال کی تعیین زیادہ نہیں ملے گی، بس ذوق ومزاج کی قابل تقلید خصوصیتیں ملیں گی، حسنِ سیرت اور حسنِ عمل کی تصویریں ملیں گی، محبت الٰہی اور عشق نبوی کی حلاوتیں ملیں گی۔ اور یہ سب وہ باتیں ہیں جنہیں لکھنے والے نے اپنے قصورِ نظر، اور کوتاہی علم وعقل کے باوجود محسوس کیا ہے۔ اسی لئے ان صالحین کے پہلو بہ پہلو ہر جگہ یہ حقیر وجود بھی پڑھنے والوں کو نظر آئے گا، لیکن ظاہر ہے کہ مشاہدہ کو بیان کرنے کے لئے اس شخص کا وجود ناگزیر ہے، جس نے مشاہدہ کیا ہے، تو لکھنے والے کی حیثیت شریک تذکرہ کی نہیں ہے، صرف

مشاہد کی ہے۔ اس نے جو کچھ دیکھا، برتا اور محسوس کیا اسے بے تکلف لکھتا چلا گیا، خودنمائی نہ مقصد ہے اور نہ اس کی نیت ہے، لیکن اسے یہ خوب محسوس ہوا ہے کہ جیسے وہ صالحین کی محبت میں سرشار ہے یہ حضرات بھی اس پر کرم وعنایت کی نگاہ رکھتے ہیں۔ یہ ان کی عالی ظرفی اور بلند ہمتی تھی کہ ایک مشتِ خاک کو نوازتے رہے ہیں، اس تصور واحساس سے محبت کی سرشاری اور بڑھتی تھی، پھر جب یہ سرشاری قلم کے راستے دل سے ٹپکنے لگی تو میں نے اسے روکا نہیں بلکہ برسنے دیا۔"

(۴) تہجد گزار بندے

اسلام میں پنج وقتہ فرض نمازوں کے علاوہ نماز تہجد کی بڑی فضیلت اور تاکید وارد ہوئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس پر فرض کی طرح مواظبت فرمائی ہے، یہاں تک کہ اگر کبھی چھوٹ گئی تو اس کی قضا فرمائی ہے۔ یہ نماز ہے تو نفل مگر ابتدا میں فرض رہ چکی ہے، اس لئے ثواب کے لحاظ سے قریب قریب فرض کے ہم پایہ ہے۔ اللہ تعالی نے بندوں پر مہربانی فرمائی اور اسے فرض کے بجائے نفل قرار دے دیا کہ کوئی سست ہو اور اس کی پابندی نہ کر سکے، تو وہ گنہ گار نہ ہو، اور جس کو حوصلہ ہو، وہ مجاہدہ کر کے اس کی پابندی کرے، اور درجات عالیہ سے سرفراز ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ میں صالحین نے اس کا خاص اہتمام کیا ہے۔

اس کتاب میں مولف نے انہیں صالحین کی شب زندہ داری اور ان کی گریہ وزاری کے واقعات کو انتہائی سلیس، شیریں، اور دلنشیں انداز میں قلم بند کیا ہے۔ یہ تہجد گزار بندوں کا ایک روحانی سلسلہ ہے جو قرنِ اول سے لے کر دورِ تبع تابعین کے بزرگوں پر مشتمل ہے، جن میں ہر شخصیت کے حالات زندگی، تعلیم وتربیت، مقام ومرتبہ، علمی خصوصیات وخدمات پر مستند کلام کے ساتھ اصل موضوع تہجد گزاری کے واقعات کو اتنے عمدہ پیرائے میں بیان کا گیا ہے کہ دل پر اس کا خاص اثر ہوتا ہے، اور عبادت وریاضت کا ذوق بیدار ہوتا ہے۔

ترتیب یہ ہے کہ سب سے پہلے قرآن وحدیث میں واردشدہ نماز تہجد کی فضیلت واہمیت کا ذکر ہے، پھر تہجد گزاروں کے احوال وواقعات کا ذکر خیر ہے، جس کی ابتدا پیشوائے تہجد گزاراں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے مفصل ذکر سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد حضرات انبیاء کرام علیہم

السلام کا تذکرہ ہے، اس کے بعد حضرات صحابہ کرام، تابعین عظام، اور تبع تابعین کا ذکر خیر ہے۔

(۵) تذکرہ شیخ ہالیجوی:

یہ کتاب سندھ پاکستان کے بلند پایہ، صاحب نسبت بزرگ حضرت مولانا حماد اللہ صاحب ہالیجوی قدس سرہ العزیز کی مفصل سوانح عمری ہے، جو روحانیت کے اعلی مقام پر فائز ہوتے ہوئے بھی ہمیشہ اس بات کے لئے کوشاں رہے کہ انہیں خدا کے علاوہ کوئی نہ جانے، نام اور کلمہ صرف اسی کا بلند ہو۔ تواضع اور فنائیت کا عالم یہ تھا کہ فرماتے تھے کہ ''بیٹا! میرا نام کاغذ پر نہ لکھو کہ مبادا شہرت کا ذریعہ یہ بھی ہو جائے''۔ حضرت ہالیجوی کو سلسلہ قادریہ کے مشہور شیخ اور بزرگ عالم حضرت مولانا تاج محمود امروٹی علیہ الرحمہ سے اجازت وخلافت حاصل تھی۔ یہ بزرگ شریعت کے علوم ظاہرہ میں کمال کے ساتھ، تصوف ومعرفت کے بلند مرتبے پر فائز تھے، اکابر علما ان کے معترف ومداح تھے۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی علیہ الرحمہ سے ان کے خصوصی روابط تھے۔

حضرت ہالیجوی شریعت وطریقت کے جامع تھے، اللہ رب العزت نے علوم متعارفہ بالخصوص قرآن وحدیث میں وہ کمال عطا فرمایا تھا کہ بڑے بڑے علما نے آپ کے علم وفضل کا اعتراف کیا۔ کتاب میں صاحب سوانح کے حالات کے ساتھ ان کے شیخ ومرشد حضرت امروٹی اور سندھ میں سلسلہ قادریہ کے مشہور مشائخ کے حالات کا مفصل ذکر ہے۔ آخری باب میں حضرت ہالیجوی کے خلیفہ اجل، پاکستان کے مشہور بزرگ عالم حضرت مولانا عبدالواحد صاحب نور اللہ مرقدہ متوفی [۲۴/اکتوبر۲۰۱۵ء] (جو کہ مولف کتاب کے شیخ ومرشد ہیں) کا ذکر خیر ہے۔

یہ کتاب سب سے پہلے جامعہ حمادیہ کراچی پاکستان سے شائع ہوئی۔ ۲۰۰۳ء میں فرید بک ڈپو دہلی نے ایک باب ''میرے شیخ ومرشد'' کے اضافے کے ساتھ شائع کی۔

(۶) حیات سراج الامت:

یہ کتاب حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے خلیفہ اجل سراج الامت حضرت مولانا سراج احمد صاحب امروہوی (آمد: ۱۹/نومبر ۱۸۸۲ء مطابق ۱۳۰۲ھ۔ وفات ۲۴/ صفر ۱۳۹۹ھ مطابق ۱۴/جنوری ۱۹۷۹ء) کی سوانح حیات ہے، جسے حضرت مولانا نے صاحب

سوانح کے خلیفہ حضرت ماسٹر قاسم صاحب مدظلہ کی خواہش وحکم پر اپنے گہر بار قلم سے رقم فرمایا۔

مولانا سراج احمد صاحب کا تعلق ارباب فضل وکمال اور علما وصلحا کی بستی امروہہ سے تھا۔ آپ نے علوم دینیہ کی تکمیل وتحصیل امروہہ کی مشہور درسگاہ جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد سے کی، اس مدرسہ کو قاسم العلوم حضرت مولانا قاسم نانوتوی کے ہاتھوں قیام کا شرف حاصل ہے۔ حضرت نانوتوی کے شاگرد رشید حضرت مولانا سید احمد حسن صاحب محدث امروہوی تا عمر اس کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس رہے، اور علوم وفنون کے دریا بہاتے رہے۔ مولانا سراج احمد صاحب نے یہاں جن بزرگ علما سے کسب فیض کیا، ان میں حضرت مولانا حافظ عبدالرحمان صاحب اور حضرت محدث امروہوی کے خصوصی شاگرد وداماد حضرت مولانا سید رضا حسن صاحب سرفہرست ہیں۔

تعلیم سے فراغت کے بعد مختلف مدارس میں تدریس کی خدمات انجام دیں، اخیر عمر میں اپنی مادر علمی جامعہ اسلامیہ عربیہ امروہہ میں یہ خدمت انجام دی اور عمر کی اخیر منزل تک یہیں رہے

حضرت مولانا کو بیعت واجازت کا شرف حضرت حکیم الامت تھانوی سے حاصل تھا، آپ نے خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں چلنے والے مدرسہ میں ۱۳۵۰ سے ۱۳۵۵ھ تک باضابطہ درس دیا ہے۔ آپ خاموش طبیعت کے حامل بزرگ تھے، اخفا وتستر احوال اور فنائیت کا آپ پر غلبہ تھا، اسی کا اثر تھا کہ اپنی کوئی نسبت اور اپنا کوئی حال ظاہر نہیں فرماتے تھے، اور اسی خاموشی کے ساتھ پوری زندگی خدمت دین اور اصلاح وارشاد میں گزار دی۔

اس کتاب میں حضرت مولانا نے صاحب سوانح کے احوال ومقامات کو تفصیل سے بیان کیا، اور ان کی زندگی کے پوشیدہ گوشوں کو اجاگر کیا ہے۔

کتاب دو حصے میں ہے، پہلا حصہ سوانح سے متعلق اور دوسرا حصہ صاحب سوانح کے ملفوظات پر مشتمل ہے، جسے صاحب سوانح کے مسترشد وخلیفہ حضرت مولانا حکیم عبدالمنان صدیقی صاحب نے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب حضرت ماسٹر قاسم صاحب دربھنگوی مدظلہ نے اپنی زیرنگرانی شائع کی ہے۔ اب تک اس کتاب کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

(۷) حضرت چاند شاہ صاحب، اور ان کا خانوادۂ تصوف:

یہ کتاب مشہور بزرگ حضرت مولانا سید ابوالحسن صاحب نصیر آبادی کے خلیفہ اور بافیض مصلح ومرشد حضرت چاند شاہ صاحب ٹانڈوی علیہ الرحمہ اور ان کے مشائخ عظام، خلفائے کرام،

اور سلسلہ کے دوسرے بزرگوں کا دلآویز اور ایمان افروز مرقع ہے۔ حضرت چاند شاہ صاحب ٹانڈہ سابق ضلع فیض آباد اور موجودہ ضلع امبیڈکر نگر کے رہنے والے تھے۔ پوری زندگی شیخ کے حکم پر عزلت نشینی میں بسر کردی، اس عزلت نشینی کی داستان بہت دلچسپ اور نہایت سبق آموز ہے۔ حضرت چاند شاہ صاحب کے مفصل حالات کہیں قلم بند نہیں کیے گئے، نہ شاہ صاحب کو اس سے دلچسپی تھی اور نہ خدام ومتوسلین کو اس طرف متوجہ ہونے دیا۔ یہی حال ان کے خلفا اور مسترشدین کا بھی ہے۔ مولف کتاب نے ان کے حالات وکوائف کے حصول میں کتنی سعی وجستجو کی ہے؟ اس کی مفصل روداد کتاب کے مقدمے ''سعی وجستجو کی داستان سفر'' کے عنوان سے بیان کردی ہے۔ حضرت چاند شاہ صاحب آیۃ من آیات اللہ تھے، اللہ تعالی نے ان سے بہت کام لیا، یوپی کے کئی اضلاع اور اسی طرح بہار کے متعدد اضلاع کی اصلاح حضرت چاند شاہ صاحب کی وجہ سے ہوئی ہے۔ ٹانڈہ اور اس سے ملحق پورا خطہ حضرت چاند شاہ صاحب اور ان کے متوسلین سے فیضیاب ہے، حضرت کے مریدین ومتوسلین بے شمار تھے، جن میں اجلہ علما بھی تھے۔ ان بزرگوں کا دلآویز اور ایمان افروز تذکرہ شاملِ کتاب ہے۔

(۸) ذکرِ جامی:

ترجمانِ مصلح الامت، حضرت مولانا عبدالرحمان جامؔی صاحب الہ آبادی کے حالات زندگی، اور سوانح پر مشتمل ہے۔ مولانا جامی، حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب علیہ الرحمہ کے کاتب خاص ان کے شب وروز کے حاضر باش اور مولانا کے علوم ومعارف کے امین ومحافظ اور شارح وترجمان ہیں۔

یہ کتاب پندرہ ابواب اور ایک ضمیمہ پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں تمہید اور مولانا جامی سے تعارف کی ابتداء کا ذکر ہے، دوسرے باب میں نام ونسب اور وطن کا بیان ہے، تیسرے باب میں ولادت اور ابتدائی تعلیم کا ذکر ہے، چوتھے باب میں مظاہر علوم میں تعلیم کا ذکر ہے، پانچویں باب میں بارگاہ تھانوی میں رسائی اور خط وکتابت کی تفصیل ہے، چھٹے باب میں فراغت اور تدریس کا ذکر ہے، ساتواں باب بیعت واصلاحِ نفس سے متعلق ہے، آٹھواں اور نواں باب ''بارگاہ مصلح الامت میں'' کے زیر عنوان ہے، جس میں حضرت مصلح الامت سے بیعت اور ان کے افادات و

ملفوظات کی تحریر واشاعت وغیرہ کا بیان ہے، دسویں باب میں سفرحج کی روداد ہے، گیارہویں باب کا عنوان ''یادشیخ'' ہے، جس میں شیخ سے بے پناہ تعلق ومحبت، اور فنائیت کی پرلطف داستان ہے، بارہویں باب میں جامی صاحب کی خصوصیات ومزاج کا ذکر ہے، تیرہویں باب میں جامی صاحب کے لطائف وظرائف کے واقعات ہیں، چودہویں باب میں جامی صاحب کی تالیفات کا تعارف ہے، پندرہویں باب میں وفات اوراولاد کا ذکر ہے۔ ضمیمہ میں جامی صاحب کی بعض نصیحت، تحریر اور تقریر اور حضرت مولانا شاہ محمد عیسیٰ صاحب الہ آبادی، انیس بھائی مرحوم اور داروغہ مشتاق احمد صاحب پر مضامین ہیں۔ اس کتاب کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

(۹) تذکرہ مولانا عبدالقیوم صاحب فتح پوری:

فتح پور تال نرجا جسے مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتح پوری ثم الہ آبادی کے مولد وموطن ہونے کا شرف حاصل ہے، اسی بستی کے ایک گمنام مردِ درویش اور صاحب علم و صاحب نسبت بزرگ حضرت مولانا الحاج عبدالقیوم صاحب علیہ الرحمہ کے حالات وسوانح پر مشتمل تذکرہ ہے، جسے صاحب سوانح کے نامور فرزند حضرت مولانا قاری ولی اللہ صاحب فتح پوری مدظلہ امام وخطیب مسجد نور ممبئی کے ایماء وارشاد پر حضرت والد صاحب نے مرتب فرمایا۔ ۷۲؍صفحات پر مشتمل یہ تذکرہ بزرگوں کی سوانح وحالات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ایک عمدہ اور قیمتی تحفہ ہے۔

(۱۰) نمونے کے انسان:

یہ کتاب بزرگان دین اور سلف صالحین کے واقعات وحکایات کا دلکش اور حسین مجموعہ ہے۔ حضرت والا علیہ الرحمہ نے مدرسہ دینیہ غازی پور کے زمانہ تدریس میں اکابر علماء دیوبند کے ایمان افروز واقعات کو مختلف عناوین کے تحت ایک خاص انداز میں جمع کرنا شروع کیا تھا، جس کی متعدد قسطیں اس وقت مدرسہ ریاض العلوم گورینی جون پور کے رسالے ''الریاض'' میں شائع ہوئی تھیں، اور کچھ حصہ مسودہ کی شکل میں پڑا ہوا تھا اور کچھ حصہ ضائع بھی ہو گیا۔

اس کتاب کے پہلے حصے میں یہ تمام مضامین مختلف عنوان کے تحت مرتب کئے گئے ہیں۔ کتاب کے دوسرے حصے میں والد صاحب کی دیگر کتابوں میں لکھے ہوئے واقعات منتخب

کر کے جمع کئے گئے ہیں۔ ترتیب یہ ہے کہ اگر کسی بزرگ کے متعدد واقعات کسی کتاب میں درج ہیں تو ان بزرگ کے نام کے تحت ان کے تمام واقعات کو جمع کیا گیا ہے، مثلاً حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب اعظمی، حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب الٰہ آبادی، حضرت مولانا قاری صدیق صاحب باندوی، حضرت مولانا شاہ محمد احمد صاحب پرتاب گڑھی کے واقعات۔ بصورت دیگر کتاب کے نام کے تحت واقعات درج کئے گئے ہیں۔

اخیر میں والد صاحب کی خونوشت سوانح حیات ''حکایت ہستی'' سے خود ان کے واقعات چنے گئے ہیں، اور ''براویت دیگراں'' کے عنوان سے دوسرے لوگوں نے والد صاحب سے متعلق جو واقعات زبانی یا تحریری طور پر بیان کئے ہیں، ان کے حوالے کے ساتھ درج کئے گئے ہیں۔

(۱۱) حکایت ہستی

اپنی آپ بیتی اور حالات زندگی لکھنا بزرگوں کی روایت رہی ہے۔ صاحب سوانح اپنی آپ بیتی، اور اپنے احوال وواردات، اور مزاج ومذاق کو جس سچائی ودیانت داری کے ساتھ بیان کرسکتا ہے، دوسروں کے لئے ممکن نہیں۔

بزرگوں کی آپ بیتی کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ بعد کے لوگوں کو ان کے مجاہدات اور کارناموں کے ذکر سے خوبی وکمال، اور ترقی وعروج کی تحصیل کا حوصلہ ملتا ہے۔ نمونہ دیکھ کر باصلاحیت افراد کو چلنے کی راہ ملتی ہے، اور سفر کا حوصلہ بھی ملتا ہے۔ حضرت والد صاحب نے اپنے بعض متعلقین کے اصرار پر اپنی آپ بیتی لکھنی شروع کی تھی، جس کا پہلا حصہ یہ کتاب ''حکایتِ ہستی'' ہے۔

حضرت والد صاحب کی شخصیت ان خاصانِ خدا میں سے ہے جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ دوسروں کے لئے اسوہ ونمونہ ہے۔ حضرت مولانا کو اللہ نے اپنے خاص فضل وکرم سے علمی وعملی، تقریری وتحریری، تدریسی وتعلیمی، اور دعوتی وارشادی، ہمہ جہت کمالات سے وافر حصہ عطا فرمایا۔ حضرت مولانا کے ان تمام کمالات کا عکس اس آپ بیتی میں موجود ہے، اور بقول مولانا نثار احمد قاسمی مدظلہ:

> ''نہ کہیں اس میں ادعاء ہے نہ تعلّی، اور کہیں اپنے کردار واستقامت پر ناز ہے نہ اعتماد، ہر جگہ ایک عاجزی، بے بسی، بندگی اور تواضع جھلکتی ہے، نیز بامراد وشادکام ہونے پر تشکر وامتنان

کے آنسو جھلکتے اور چمکتے ہیں۔‘‘

کتاب بارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں مطالعہ کی سرگذشت دلچسپ انداز میں بیان کی گئی ہے۔ اصلاً یہ کتاب ’’مطالعہ کی سرگزشت‘‘ کے عنوان سے مقالہ کی شکل میں لکھی گئی، مطالعہ کے تذکرے کے ساتھ ساتھ داستانِ حیات کے دیگر گوشے اور زندگی کی دوسری تفصیلات بھی اس میں شامل ہوتی گئیں، اور اس مقالے نے خودنوشت سوانح کی شکل اختیار کر لی۔ مطالعہ کی یہ سرگذشت بہت دلچسپ اور سبق آموز ہے۔

دوسرے باب کا عنوان مکتب کی تعلیم ہے۔ اس باب میں تاریخ پیدائش، بچپن، اور ابتدائی مکتب کی تعلیم کا ذکر ہے۔ تیسرے باب میں درجہ فارسی اور عربی کے ڈیڑھ سال کی تعلیم کے احوال وواقعات درج ہیں۔ چوتھے باب میں جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں داخلہ اور پہلے سال عربی دوم کے تعلیمی احوال اور متعلقہ کتابوں کے اساتذہ کا ذکر خیر ہے۔ پانچویں باب میں عربی سوم (شوال ۱۳۸۵ھ تا شعبان ۱۳۸۶ھ) کے حالات کا بیان اور استاذ الاساتذہ حضرت مولانا یحییٰ صاحب کا بطور خاص ذکر ہے۔ چھٹا باب عربی چہارم کے تعلیمی سال سے متعلق ہے، جس میں تعلیم ومطالعہ، عربی ادب کے ذوق اور اس سلسلے کے واقعات کا بیان ہے۔ ساتویں باب میں عربی پنجم کی تعلیم کا ذکر ہے۔ آٹھواں باب شوق ودلچسپیوں سے متعلق ہے۔ نویں باب میں دارالعلوم دیوبند کی تیاری اور داخلہ کا بیان ہے۔ دسواں باب ’دارالعلوم دیوبند کی اسٹرائک‘ کے عنوان سے ہے، اس میں مشہور زمانہ اسٹرائک کے پسِ منظر اور اس کے بعد کے احوال وکوائف کا ذکر ہے۔ گیارہویں باب میں رسمی طالب علمی سے فراغت کے بعد کے واقعات اور ابتدائی تدریس کا بیان ہے۔ بارھواں باب ’میسور میں‘ کے زیرعنوان ہے، اس باب میں میسور کی حسین یادوں کا دلچسپ بیان ہے، جہاں صاحب سوانح کا امامت وخطابت، اور دعوت وتبلیغ کے تعلق سے چند مہینے قیام رہا۔ یہاں کتاب کی پہلی جلد مکمل ہوجاتی ہے، دوسری جلد پر بھی کام شروع ہوگیا تھا، اور دو قسطیں ماہنامہ ’’ضیاء الاسلام‘‘ میں شائع ہوئی تھیں کہ حق کی طرف سے بلاوا آگیا اور یہ معتبر سلسلہ اپنے اختتام کو پہونچ گیا۔ (اب یہ دونوں قسطیں بھی کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں شائع ہوچکی ہیں)

(۱۲) حدیثِ دوستاں:

حضرت والد صاحب کا خاص ذوق اور موضوع جس کے اردگرد آپ کی پوری زندگی محو

گردش ہے، تعلیم وتربیت، تزکیہ واصلاحِ نفوس، محبت وشفقت، ہمدردی وخیرخواہی ہے۔ آپ کے تلامذہ، محبین ومتعلقین کی ایک لمبی فہرست ہے جن کی دینی ودنیوی راہنمائی کے لئے اور ان کے پیچیدہ معاملات ومشکلات کے حل کے لئے خط وکتابت کے ذریعے مسلسل رابطہ رہا۔ یہ کتاب انہیں خطوط ومکاتیب کا مجموعہ ہے، جن میں تربیت واصلاح کے راہنما اصول بھی ہیں، دعوت وتبلیغ کے موثر طریقوں کا ذکر بھی ہے، اشکالات واعتراضات کا تسلی بخش اور مدلل جواب بھی ہے، فلسفہ وکلام کی گتھیاں بھی سلجھائی گئی ہیں، پیچیدہ احکام ومسائل کی وضاحت بھی ہے، ذاتی احوال وکوائف کے مشکلات کا حل بھی ہے، اور عصرِ حاضر کے فتنوں کا سدِ باب بھی ہے، اور مدارس اسلامیہ میں پیدا شدہ حالات کے اسباب اور حل پر کلام بھی ہے۔ غرض یہ کہ یہ ایک بیش بہا خزینہ ہے، جس میں ہر طرح کے لوگوں کے لئے تسلی وتشفی کا سرمایہ ہے۔ ان خطوط کا قاری خود کو بھی ان کا مخاطب محسوس کرتا ہے، اور اپنے مسائل اور الجھنوں کا حل پالیتا ہے۔

یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب ان خطوط پر مشتمل ہے جو بزرگوں کے نام لکھے گئے ہیں، دوسرا باب دوستوں کے نام خطوط پر مشتمل ہے، تیسرے باب میں ان خطوط کی شمولیت ہے جو تلامذہ اور عزیزوں کو لکھے گئے ہیں، چوتھا باب علمی مباحث پر مشتمل ہے، ان میں وہ خطوط شامل ہیں جو مختلف اشکالات واعتراضات کے جواب میں لکھے گئے ہیں، پانچواں باب متفرقات کے عنوان سے ہے، اس میں زیادہ تر ایسے خطوط ہیں جن کے مکتوب الیہ کا نام بعض مصلحتوں کی وجہ سے ظاہر نہیں کئے گئے ہیں۔

ان خطوط کی زبان انتہائی سلیس، شستہ اور شگفتہ ہے، اور صاحبِ مکاتیب کے بلند ادبی ذوق کی آئینہ دار ہے، جس نے ان میں بڑی جاذبیت ولطافت اور حسن پیدا کردیا ہے۔ حاصل یہ کہ یہ مجموعہ مکاتیب مکتوباتی ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے، اور اہل علم اور شائقینِ زبان وادب، اور مکتوباتی ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے کے لئے بیش قیمت سرمایہ ہے۔

(۱۳) حدیثِ دردِ دل:

یہ کتاب حضرت والد صاحب علیہ الرحمہ کے ان اداریوں کا مجموعہ ہے، جو مجلّہ ’’المآثر‘‘ مئو، ماہنامہ ’’انوار العلوم‘‘ جہانا گنج، ماہنامہ ’’ضیاء الاسلام‘‘ اور اس کے نقشِ اول ’’الاسلام‘‘ کے لئے لکھے گئے تھے۔ ان اداریوں میں مختلف مضامین اور پیش آمدہ مسائل واحوال کو موضوعِ بحث

بنایا گیا ہے۔ یہ مضامین اگر چہ مختلف اوقات میں مختلف تقاضوں اور مختلف پسِ منظر میں لکھے گئے ہیں، مگر روح سب کی ایک ہے۔ اور وہ ہے اس بات کی تڑپ کہ اہل ایمان اپنے نفس، اپنی طبیعت، اور اپنے گردوپیش کے مختلف تقاضوں کا فنا کر کے، ان سے منہ موڑ کر محض اللہ اور رسول کی اطاعت و وابستگی کے لئے یکسو ہو جائیں، زندگی کا مرکز ومحور صرف وہ ہو، جس کی دعوت اللہ کے آخری پیغمبر جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے دی۔ اس کے علاوہ جتنی راہیں ہیں سب سے قطعی اجتناب کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے ”**لایومن احدکم حتی یکون هواه تبعا لما جئت به.**“ آدمی اس وقت تک صاحب ایمان نہیں ہوگا جب تک اس کے ارادے اور اس کی خواہش میرے لائے ہوئے دین کے مطابق نہ ہو جائیں۔

ان اداریوں کی دعوت اسی حدیث کی تعمیل ہے، مختلف انداز میں اسی موضوع پر دل کا درد قلم سے ٹپک ٹپک کر کاغذ کے سینے پر ثبت ہوا، اس لئے اس مجموعے کا نام ”حدیثِ دردِ دل“ ہونا مناسب ہے۔

ان میں بدعات وخرافات کے سیل رواں کا سد باب بھی ہے، اور بے لگام سلفیت اور غیر مقلدیت پر قدغن بھی، مسلم معاشرہ میں پائی جانے والی بے راہ روی اور اخلاقی کمزوری کی نشان دہی اور اس کا علاج بھی ہے، عصرِ حاضر کے فتنوں کا قلع قمع بھی ہے، اور مدارس اسلامیہ میں پیدا شدہ حالات کے اسباب اور اس کے حل کا ذکر بھی، مروجہ جلسے اور اجتماعات کی بے اعتدالی اور ان کی اصلاح کا طریقہ بھی، دینی احکام ومسائل میں میڈیا کے پروپیگنڈہ کی حقیقت کی نقاب کشائی بھی، عبادات اور دینی شعائر کے ادب واحترام کی طرف توجہ کی دعوت بھی، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کی انجام دہی بھی ہے۔

(۱۴) مدارسِ اسلامیہ، مشورے، اور گزارشیں:

یہ کتاب ان مضامین کا مجموعہ ہے جو ماہنامہ ”ضیاء الاسلام“ ماہنامہ ”دارالعلوم“ دیوبند، مجلّہ ”المآثر اور ماہنامہ ”انوارالعلوم“ میں مدارس اسلامیہ کے تعلق سے لکھے گئے ہیں۔ کتاب کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے۔ ہندوستان میں مدارس اسلامیہ کی اہمیت وافادیت، اس کا موضوع، تعلیمی وتربیتی نظام، نصابِ تعلیم، اربابِ مدارس کی ذمہ داریاں، اساتذہ کے لئے راہنما اصول، طلبہ کے لئے مفید نصیحتیں، اور مدارس کے سلسلہ میں شکوک وشبہات جیسے اہم موضوعات پر

اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ وہ کون سے جذبات تھے جو ان مضامین کے لکھنے کا محرک اور سبب بنے؟ صاحب کتاب کی زبانی سنئے:

> ”میں چونکہ مدارس ہی کا پروردہ ہوں، ابتدائے شعور سے اب تک کی میری زندگی مدرسہ ہی میں بسر ہوئی ہے، میری زندگی کی تمام ضروریات مدارس ہی کی چہار دیواری سے پوری ہوئی ہیں، میں نے یہاں زندگی کا ہر ایک دور دیکھا ہے۔ اس لئے میں اپنے اوپر حق سمجھتا ہوں کہ وہ باتیں لکھ دوں جو میں نے محسوس کی ہیں، ان کے ادا کرنے میں اگر کوتاہی ہو، یا تعبیر میں غلطی ہو تو اس سے درگزر کی توقع کے ساتھ لکھنے کی ہمت کر رہا ہوں۔“

یہ کتاب سب سے پہلے پاکستان سے شائع ہوئی تھی، ہندوستان میں اس کا پہلا ایڈیشن مارچ ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا، اور ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ دوسرا ایڈیشن مزید اضافے کے ساتھ ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا۔

(۱۵) بطواف کعبہ رفتم:

یہ کتاب حضرت والد صاحب علیہ الرحمہ کے حج کا سفر نامہ ہے۔ یہ سفر نامہ والد صاحب کے پہلے سفر حج ۱۴۰۹ھ مطابق ۱۹۸۹ء کے مشاہدات وتأثرات کی روداد ہے، جس میں مصنف نے اپنے محسوسات اور وارداتِ قلبی کو الفاظ وعبارت کے پیکر میں ڈھال دیا ہے۔ یہ سفر نامہ معلومات ومشاہدات اور زبان وبیان کے لحاظ سے ادب کا شاہکار ہے۔ ایک مردِ مومن کے والہانہ جذبات واحساس کا آئینہ دار ہے۔ کون مسلمان ہے جس کے دل میں ربِ کائنات کے گھر کی حاضری اور محسنِ کائنات کے روضہ کی زیارت کا اشتیاق نہ ہو محض اس کا قصد ہی ایک مومن کے جذبات میں تلاطم پیدا کر دیتا ہے۔

ہر سال لاکھوں خوش نصیب اس سعادتِ عظمیٰ اور دولتِ بے بہا سے بہرور ہوتے ہیں، ان میں بعضے ایسے بھی ہوتے ہیں جو صاحب دل ہونے کے ساتھ صاحب قلم بھی ہوتے ہیں، جو اپنے دلی جذبات کو سینے سے سفینے پر منتقل کر کے عشق ومحبت کا نقش قائم کر دیتے ہیں۔ سفر حج عشق و سرمستی، شوق وبے تابی، جنون وبے خودی کا سفر ہے۔ حاجی عشق ومحبت میں سرشار ہو کر راہِ وفا میں جب قدم رکھتا ہے تو مشکلات ودشواریاں اور سختیاں اس کے جذب وشوق کے آگے سپر ڈال دیتی

ہیں۔ سفر حج کی یہ دلچسپ داستان تفصیل کے ساتھ شستہ وشگفتہ خوبصورت انداز میں قلم بند کی گئی ہے، جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ’’حج کا سفر عشق ومستی کا سفر ہے، شوق وبے تابی کا سفر ہے، گو کہ موجودہ ایجادات نے سفر کو آسان تر کر دیا ہے، مگر عشق وشوق کا بھی ایک خاصہ ہے، جو اس کے خمیر میں داخل ہے، وہ ہے عاشق کی کٹھن آزمائش، صبر وتحمل کا امتحان، مشکلات ومصائب کی یلغار، قدم قدم پر دشواریوں کا سامنا، اور انتظار کی سختیاں۔ زمانہ خواہ جس قدر ترقی کرے، اس کے قدم خواہ جتنے آگے بڑھ جائیں، اقدار وتصورات چاہے جتنے بدل جائیں، مگر ایک عشق ومحبت کی دنیا ہے جس کے آثار ولوازم میں تبدیلی ممکن نہیں۔ حاجیوں نے محبت کا دم بھرا ہے، عشق کی زبان سے لبیک پکارا ہے، پھر کیسے ہوسکتا ہے کہ عشق اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ طراز نہ ہو؟ چلو حاجیو! امتحان دو عشق ومحبت کا، چلو! اب دنیا والوں نے صحرا وبیاباں ختم کر دیئے ہیں، پہاڑوں کو شہروں میں تبدیل کر دیا ہے، ویرانے آباد ہو چکے ہیں، اب فرشتہ عشق نے تمہارے لئے ہوائی اڈہ ہی کو صحرا بنا دیا ہے، ہوائی اڈہ پر جاؤ، وہاں مشکلات وبدحواسیاں تمہارا انتظار کر رہی ہیں، دشواریاں اور پریشانیاں تمہارے امتحان کی تکمیل کرائیں گی۔‘‘

پوری کتاب زبان وادب کا شہ پارہ ہے۔ مصنف اردو کے صاحب طرز ادیب وانشا پرداز ہیں، کتاب کہیں سے کھولئے، پڑھئے اور لطف لیجئے، دلچسپ اتنی کہ پوری کتاب پڑھے بغیر رکھنا مشکل، پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کتاب نہیں پڑھ رہا ہے بلکہ خود سرگرم سفر ہے۔ کسی سفرنامے کی بڑی خصوصیت یہی ہے کہ پڑھنے والا خود مسافر ہو جائے۔

(۱۶) تصوف ایک تعارف:

تصوف اس کیفیت احسانی کے لئے مشق وتمرین کا نام ہے جس کا تذکرہ اس مشہور حدیث میں ہے جو اہل علم کے درمیان ’’حدیثِ جبریل‘‘ کے نام سے معروف ہے۔ یہ دین کے بنیادی مقصد کے حصول کے لئے جد وجہد کا نام ہے، لیکن آج دین کا یہ اہم شعبہ سب سے زیادہ مطعون اور سب سے زیادہ مظلوم ہے۔ ایک گروہ کا مسلسل اصرار ہے کہ یہ ایک غیر اسلامی طریقہ عمل ہے، تصوف سے بڑھ کر کوئی بدعت نہیں، اور صوفیہ سے بڑھ کر کوئی گمراہ نہیں۔

اس کتاب میں اسی نظریہ کا بطلان ہے، تصوف کا صحیح تعارف، اس کی حقیقت، اور

اصحابِ تصوف کی اہمیت وضرورت کو مدلل اور مفصل بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب پانچ مضامین کا مجموعہ ہے، پہلا مضمون ''تصوف کی حقیقت اور اصحابِ تصوف کی اہمیت وضرورت'' ہے، دوسرا مضمون ''متاع گمشدہ'' ہے، جس میں منکرین تصوف کے ساتھ ساتھ ان حامیانِ تصوف کا بھی جائزہ لیا گیا ہے، جنہوں نے تصوف کے نام پر تصوف کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ملا رکھا ہے، تیسرا مضمون جو اس سلسلہ کے کا سب اہم اور مفصل ہے ''تصوف کیا ہے؟'' کے عنوان سے ہے، چوتھا مضمون ''علماء مظاہر اور تصوف وسلوک'' ہے، پانچواں مضمون ''تصوف ہمارا قیمتی سرمایہ'' ہے۔ در حقیقت یہ کتاب تصوف کو سمجھنے کے لئے ایک مشعلِ راہ ہے۔

(۱۷) کثرتِ عبادت، عزیمت یا بدعت؟:

یہ کتابچہ برصغیر پاک وہند کے مشہور محدث وفقیہ حضرت مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی نور اللہ مرقدہ کے ایک عربی رسالہ ''**اقامة الحجه على ان الاكثار فى التعبد ليس ببدعة**'' کی ترجمانی وتلخیص ہے۔ بعض مدعیان حدیث اور مخالفین زہد وتصوف کی جانب سے یہ آواز بار بار آتی رہتی ہے کہ عبادت وریاضت کی کثرت اور زہد وتقوی کا بہت زیادہ اہتمام نہ صرف یہ کہ ناپسندیدۂ شریعت ہے بلکہ بدعت ہے۔ اس کتاب میں ان کے اسی دعوی کی قلعی کھولی گئی ہے، اور قرآن وحدیث اور صحابہ وتابعین کے اقوال واعمال سے اس کے بطلان کو واضح کیا گیا ہے۔

(۱۸) مودودی صاحب، اپنے افکار ونظریات کے آئینہ میں:

یہ کتاب محدث جلیل حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری صاحب علیہ الرحمہ کی عربی کتاب ''**الاستاذ المودودی، وشئی من حیاته وافکاره**'' کا اردو ترجمہ ہے، جس میں مودودی صاحب کے افکار ونظریات کا منصفانہ تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

یہ کتاب دراصل عرب دنیا کے لئے لکھی گئی تھی، مگر ضرورت تھی کہ اردو داں طبقہ بھی مودودی صاحب کے افکار ونظریات کی کجی اور ان کے قلم کی شوخی وبے احتیاطی سے واقف ہو۔ اسی کے پیش نظر حضرت مولانا علیہ الرحمہ نے نہایت سلیس اور رواں دواں اردو ترجمہ کیا، اور شروع کتاب میں ایک مبسوط مقدمہ تحریر فرمایا، اور ایک مضمون بعنوان ''تفہیم القرآن اور مودودی صاحب'' کا اضافہ کیا۔ اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے، جدید ایڈیشن خوبصورت اور

معیاری کتابت وطباعت کے ساتھ ادارہ دعوۃ الاسلام مئوناتھ بھنجن سے شائع ہوا ہے۔

(۱۹) مسئلہ ایصالِ ثواب، اور ایک ذہنی طغیان کا احتساب:

ایصالِ ثواب کا مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص کوئی نیک عمل کرتا ہے اور قرآن وحدیث کی بشارت کے مطابق اللہ کی طرف سے اجر وثواب کا مستحق ہوتا ہے، اب وہ شخص دعا کرتا ہے کہ یا اللہ اس کارِ خیر پر مجھے جو ثواب آپ کی جانب سے مرحمت ہوا ہے، اسے فلاں مسلمان کو عطا فرما دیجئے، یا وہ کارِ خیر ابتدا ہی سے اس نیت سے کرے کہ اس کا ثواب فلاں شخص کو عطا ہو جائے۔ اہل سنت والجماعت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ایک شخص کی دعا دوسرے کے حق میں مفید ہے۔ اسی طرح مالی عبادات مثلاً صدقہ ایک شخص کا دوسرے کے حق میں مفید ہے، اور ان دونوں کا ثواب اس شخص کو ملے گا جس کے لئے دعا کی گئی ہے، اور جس کو ایصال کی غرض سے صدقہ کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں اسی مسئلہ کو دلائل کی روشنی میں ثابت کیا گیا ہے، اور مخالفین کے دلائل اور اعتراضات کا منصفانہ جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب دراصل ایصالِ ثواب کے رد میں لکھی گئی کتاب ’’ردِ ایصالِ ثواب‘‘ کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ آج سے بیس سال پہلے مبارک پور ضلع اعظم گڑھ میں عبدالخالق نامی شخص نے یہ کتاب لکھ کر بڑا فتنہ پیدا کیا تھا، کتاب کیا تھی؟ لغویات کا ایک طومار تھی۔ حضرت مولانا نے کتاب کی اور صاحبِ کتاب کی علمی حالت کا مکمل جائزہ لیا ہے، اور مسئلہ ایصالِ ثواب کی مکمل اور تشفی بخش وضاحت فرمائی ہے۔

(۲۰) حج وعمرہ کے بعض مسائل میں غلو اور اس کی اصلاح:

اس کتاب میں حج عمرہ کے بعض ان مسائل سے بحث کی گئی ہے جن میں نام نہاد مجتہدین وغیر مقلدین کی طرف سے عوام الناس کو شک وشبہ اور مغالطہ میں ڈال کر گمراہ کیا جاتا ہے۔ کتاب میں جن مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے وہ یہ ہیں۔ ’’منی وعرفات میں نمازوں کا قصر، عرفات میں ظہر اور عصر کو جمع کرنا، مناسکِ حج میں ترتیب کا مسئلہ، نماز فجر اور نماز عصر کے بعد طواف کا مسئلہ، مکہ مکرمہ میں رہ کر عمرہ کی تکرار، رمی جمرات کا وقت، النفر الاول، بارہ ذی الحجہ کو منی سے مکہ مکرمہ جانا‘‘۔

شروع کتاب میں ایک مضمون ’’کیا مسائل فقہیہ میں پوری امت کو ایک نقطۂ اتحاد پر جمع

کرنا ممکن ہے؟'' بے حد معلوماتی، چشم کشا، اور حقیقت افروز ہے۔

(۲۱) قتل ناحق، قرآن وسنت کی روشنی میں:

کسی مسلمان کو قتل کرنا شریعت کی نظر میں انتہائی سنگین جرم ہے، قرآن نے اس کی جزا و بدلہ جہنم کی دائمی سزا بیان کی ہے۔ اس رسالہ میں قتل ناحق کی قباحت وشناعت، خون مسلم کی حرمت وعظمت اور قتل ناحق کی سزا وغیرہ کو نہایت تفصیل سے قرآن وحدیث، آثار صحابہ اور سلف صالحین کے واقعات کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے، اور ہاتھوں ہاتھ لئے گئے۔ جدید ایڈیشن عمدہ کتابت وطباعت کے ساتھ فرید بک ڈپو دہلی سے شائع ہوا ہے۔

(۲۲) تعویذات وعملیات کی حقیقت وشرعی حیثیت:

تعویذات وعملیات کے سلسلہ میں فی زمانہ لوگ حد درجہ افراط وتفریط کا شکار ہیں، ایک طبقہ مطلقاً اس کی نفی کرتا ہے، اور اسے بالکل ناجائز وحرام بتاتا ہے، اس کے بالمقابل دوسرا طبقہ اس پر قطعی یقین رکھتا ہے، اور نتیجۃً ایسے ایسے اعمال وافعال کا مرتکب ہوتا ہے جس سے ایمان بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ اس رسالہ میں تعویذات وعملیات کی حقیقت اور شرعی حیثیت کا جائزہ قرآن وحدیث اور اکابر امت کے افعال کی روشنی میں لیا گیا ہے، اور اس سلسلہ میں جو گمراہیاں اور خامیاں در آئی ہیں، ان کی نشان دہی کر کے راہ راست کی طرف راہ نمائی کی گئی ہے۔

(۲۳) شبِ برأت کی شرعی حیثیت:

ماہ شعبان کی پندرہویں رات جسے ''شبِ برأت'' کہا جاتا ہے، خیر القرون سے اس رات کی فضیلت سے فائدہ اٹھانے کا اہتمام کیا جاتا رہا ہے، لوگ اس رات میں عبادت کا خصوصی اہتمام کرتے رہے ہیں اور اب تک یہ سلسلہ جاری وساری ہے، مگر اب ایک طبقہ یہ باور کرانے کی کوشش میں مصروف ہے کہ اس رات کی کوئی فضیلت قرآن وحدیث سے ثابت نہیں ہے، اور اس رات میں جاگنا اور اس میں عبادت کو باعث اجر وثواب سمجھنا بے اصل اور بدعت وضلالت ہے۔

اس رسالہ میں ماہ شعبان کی پندرہویں رات کی فضیلت اور اس میں عبادت، اور پندرہ شعبان کے روزہ کی شرعی حیثیت کو احادیث وآثار اور اقوالِ ائمہ کی روشنی میں ثابت کیا گیا ہے۔ اس رسالے میں چار مضامین ہیں، پہلا مضمون ''پندرہویں شعبان کی حدیث'' محدث کبیر حضرت

مولانا حبیب الرحمان صاحب اعظمی علیہ الرحمہ کا ہے، جو اس رسالہ کی اصل اور اساس ہے، دوسرا مضمون ''پندرہویں شعبان'' ہے، تیسرا مضمون ''شب برأت کی شرعی حیثیت'' ہے، جو اس سلسلہ کا سب سے مفصل اور اہم مضمون ہے، چوتھا مضمون ''شب برأت میں اللہ کے رسول ﷺ کا عمل'' ہے۔ اپنے موضوع پر یہ رسالہ بہت معلوماتی اور حقیقت کشا ہے۔

(۲۴) اخلاق العلماء:

یہ کتاب امام ابوبکر بن محمد حسین آجری علیہ الرحمہ متوفی ۳۶۰ھ کے رسالہ ''اخلاق العلماء'' کا ترجمہ ہے۔ اس کتاب میں علما کا مقام ومرتبہ، فضائل، اوصاف واخلاق، علماء کے پاس حاضری کے آداب، علماء کی صحبت کے آداب، شہرتِ علم کے حقوق وآداب، علماء سو کے اخلاق و اوصاف جیسے اہم موضوعات کو بہت ہی موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب علماء اور طلبہ کے لئے ایک بیش قیمت تحفہ ہے۔

(۲۵) دین داری کے دو دشمن۔ حرصِ مال اور حبِ جاہ

حضرت کعب بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ جناب نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ''بھوک سے پریشان دو بھیڑیئے اگر بکریوں کے ریوڑ میں چھوڑ دیئے جائیں تو بکریوں کو اتنا نقصان نہیں پہونچا سکیں گے جتنا کہ انسان کے دین کو اس کی حرص مال اور حرص جاہ (مرتبہ کی ہوس) نقصان پہونچاتی ہے۔

مشہور حنبلی عالم علامہ ابن رجب حنبلی متوفی ۷۹۵ھ کا ایک رسالہ اسی حدیث کی شرح پر مشتمل ہے۔ یہ کتابچہ اسی رسالے کا ترجمہ ہے، جس میں حرص مال اور حب جاہ کی تباہ کاریوں اور اس کے مضرات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ رسالہ اس لائق ہے کہ ہر خاص وعام کے مطالعہ میں رہے۔

(۲۶) فتنوں کی طغیانی: ٹی وی سے متعلق ایک فکر انگیز تجزیہ:

ٹی وی کے استعمال کے غیر شرعی ہونے پر گزشتہ دنوں دار العلوم دیوبند کے دار الافتا سے ایک فتوی جاری ہوا تو اخباری دنیا میں ایک بھونچال سا آ گیا، اور وہ لوگ جو ٹی وی دیکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ علما اس کے جواز کا فتوی دیدیں، انہوں نے ٹی وی کی حاجت اور اس کے جواز کے

سلسلے میں ایک قلمی جنگ چھیڑ دی، اور اپنے منتشر اور گمراہانہ افکار وخیالات سے عوام الناس کے ذہن ودماغ میں شک وشبہہ کی تخم ریزی کرتے رہے۔ ان اخباری ہفوات کو پڑھ کر غیرتِ ایمانی اور حمیت دینی کے تقاضے پر حضرت مولانا علیہ الرحمہ نے قلم اٹھایا، اور ان ہفوات کا نہایت شافی اور مسکت ومدلل جواب دیا۔

(۲۷) اہل حق اور اہل باطل کی شناخت:

امت مسلمہ آج نہ جانے کتنے فرقوں اور جماعتوں میں بٹ چکی ہے، ہر فرقہ کا دعوی ہے کہ وہ راہ حق پر ہے اور دوسرے لوگ غلط راہ پر ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کون اس دعوی میں سچا ہے؟ اور حق وباطل کا معیار اور اس کی شناخت کیا ہے؟ اس رسالہ میں رسول اللہ ﷺ کی دو حدیثوں کی روشنی میں اس معیار اور شناخت کی وضاحت کی گئی ہے، جس سے نہایت آسانی سے اہل حق اور اہل باطل کے درمیان امتیاز ہوجاتا ہے، بس انصاف شرط ہے۔

یہ رسالہ ایک آئینہ ہے، جس میں ہر فرقہ اور ہر طبقہ اپنی اپنی تصویر دیکھ کر فیصلہ کرسکتا ہے کہ اس کا تعلق کس سے ہے؟۔

(۲۸) مالی معاملات کی کمزوریاں اور ان کی اصلاح:

دین اسلام ایک ہمہ گیر مذہب ہے، زندگی کے ہر شعبے میں انسانوں کی راہنمائی کے لئے اس میں ضابطہ، دستور، اور احکام موجود ہیں۔ شریعت اسلامی میں جس طرح عبادات کے شعبہ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے اسی طرح معاملات کا شعبہ بھی غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ اس لئے کہ اس کا تعلق حقوق اللہ کے ساتھ ساتھ حقوق العباد سے بھی ہے، لیکن افسوس کہ آج اس شعبہ میں لاپروائی عام ہے۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر حضرت مولانا علیہ الرحمہ نے اس موضوع پر قرآن وحدیث کی روشنی میں مفصل کلام کیا ہے۔

(۲۹) منصب تدریس اور حضرات مدرسین:

کتاب کا تعارف اور غرض وغایت خود حضرت مولانا کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں:

> ’’میں عرصے سے سوچ رہا تھا کہ مدرسین کے فرائض اور ذمہ داریوں سے متعلق ایک تحریر مرتب کروں، جس سے مجھے بھی فائدہ پہونچے اور ان دوستوں کے بھی کام آئے، جو خدمت کے

اس راستے پر چل رہے ہیں۔ ادھر کئی ماہ سے میرے کئی دوست اور میرے فرزند، جو ایک تازہ اور جدید مدرسہ، جو شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی نوراللہ مرقدہ کے نام نامی سے منسوب ہے، میں انتظامی اور تدریسی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں، بار بار یاد دلاتے رہے کہ اس موضوع پر کچھ کہئے، کچھ لکھئے۔

میں بھی سوچتا رہا کہ لکھوں، لیکن کیوں کر لکھوں؟ کیا اسلوب اختیار کروں، پھر بطور مقالے کے اسے لکھنا شروع کر دیا تھا کہ دفعتہً دل میں یہ بات آئی کہ میرے فرزند عزیز مولوی حافظ محمد راشد سلمہ، ایک سال قبل دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہو کر آئے ہیں، اور سال بھر سفر حضر میں میرے ساتھ رہے ہیں، ان سے اس موضوع پر متعدد بار گفتگو ہوئی، اب وہ تدریس کی خدمت پر فائز ہونے والے ہیں۔ میں سوچا کہ اس موضوع کا مخاطب انہیں کو بنا کر تحریر مرتب کر دوں، چنانچہ یہ مقالہ بشکل مکتوب مرتب ہو گیا۔ فرزند عزیز کی مخاطبت نے میرے لئے کچھ ایسے تجربات اور کچھ ایسی آپ بیتیوں کو لکھنا سہل کر دیا، جنہیں میں لکھنا چاہتا تھا مگر عام مقالہ و مضمون میں ان کے لئے کیا طرز و اسلوب اختیار کروں؟ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، اللہ نے یہ مشکل مکتوب کی شکل میں آ جانے کی وجہ سے حل کر دی۔ وللہ الحمد

(۳۰) برکاتِ زمزم:

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ روئے زمین پر سب سے بہتر پانی زمزم کا پانی ہے، زمزم جہاں ایک طرف بھوک کی حالت میں غذا ہے، وہیں وہ بیماریوں کے لئے شفا بھی ہے۔ اللہ کے برگزیدہ پیغمبر حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ایک معجزہ ہے۔ اس کتاب میں زمزم کی ابتدا، اس کی وجہِ تسمیہ، اس کے مختلف نام، برکات وفضائل، اس کے ذریعہ علاج و دوا، اور مشکل امراض سے شفا، اور بزرگوں کے تجربات کا تذکرہ ہے، نیز زمزم کے کنویں سے متعلق دلچسپ معلومات بیان کی گئی ہیں۔ یہ کتاب ایک عربی رسالہ ”**معجزات الشفاء بماء زمزم**“ کا ترجمہ ہے، جسے حضرت مترجم نے اردو داں طبقہ کے استفادہ کے لئے سلیس زبان میں ترجمہ کیا ہے۔

(۳۱) خواب کی شرعی حیثیت:

خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ خواب کی قسمیں کتنی

ہیں؟ خواب کے باب میں لوگوں کے درجات کتنے ہیں؟ خواب کو نبوت کا چھیالیسواں حصہ کیوں کہا گیا؟ ان سب سوالوں کا تحقیقی اور تفصیلی جواب اس کتاب میں موجود ہے، نیز خواب کے آداب، خواب کی تعبیر، خواب میں زیارتِ نبوی، خواب میں زیارتِ خداوندی، خواب گھڑنے پر وعید جیسے اہم امور پر مفصل کلام کیا گیا ہے۔ اپنے موضوع پر یہ ایک جامع کتاب ہے۔

(۳۲) رمضان المبارک۔ نیکیوں کا موسم بہار:

۴۰ صفحات پر مشتمل یہ کتابچہ رمضان المبارک سے متعلق چار قیمتی مضامین کا مجموعہ ہے۔ پہلا مضمون ''رمضان کا پیغام'' ہے، دوسرا تفصیلی مضمون ''روزۂ رمضان، خصوصیت و آداب'' کے عنوان سے ہے، تیسرا مضمون ''ماہ رمضان کی برکتیں'' ہے اور چوتھا مضمون ''رمضان شریف اور قرآن شریف کی مناسبت'' کے زیر عنوان مفصل اور محقق ہے، جس میں رمضان وقرآن کے باہمی تعلق ومناسبت کو قرآن وسنت اور اکابرین امت کے اقوال کی روشنی میں تفصیل وتحقیق کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اپنے موضوع پر یہ کتابچہ ''بقامت کہتر بقیمت بہتر'' کا شاندار نمونہ ہے۔

(۳۳) مروجہ جلسے! بے اعتدالیاں اور ان کی اصلاح:

وعظ ونصیحت اور تبلیغ وتلقین کے لئے دینی واصلاحی اجلاس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے، جب تک یہ اجلاس سادگی، سنجیدگی اور اخلاص کے ساتھ منعقد ہوتے رہے اس کے اثرات معاشرے میں محسوس کئے جاتے رہے۔ اہل اسلام اس میں ذوق وشوق سے شریک ہوتے اور علما ومشائخ کے مواعظ وخطبات سے اپنے دلوں میں عمل کا جذبہ لے کر لوٹتے تھے لیکن رفتہ رفتہ صورت حال بدل گئی اور اس سادگی کی جگہ نمائش، وعظ وبیان کی جگہ نعت خوانی ومقابلہ بازی نے ان جلسوں کو اپنے مقصد سے دور کردیا ہے۔ حضرت والا علیہ الرحمہ ابتداء ان جلسوں میں شریک ہوتے تھے لیکن پھر صورت حال کی خرابی کی وجہ سے شرکت ترک فرمادی اور جو خرابیاں اور نقصانات انہوں نے محسوس کئے ان کی اصلاح کے لئے ایک مفصل مضمون سپرد قلم کیا جو بہت پسند کیا گیا۔ وہی مضمون اب رسالہ کی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی امر بالمعروف ونہی عن المنکر پر دو مختصر اور کارآمد مضمون بھی شامل رسالہ ہے۔

(۳۴)تسہیل المیبذی:

یہ کتاب مدارس عربیہ کے نصاب میں شامل فلسفہ کی پیچیدہ کتاب ''میبذی'' کی قسم اول، طبعیات کے فنِ اول کی شرح ہے۔ کتاب کا نہج اور انداز خود شارح کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں:

''میبذی میں ہدایت الحکمت کی عبارتیں شرح کے ساتھ مخلوط ہیں، امتیاز کے لئے ان پر خط کھینچ دیا جاتا ہے، اس کتاب میں ہدایت الحکمت کی ہر فصل کا یکجا سلیس اور عام فہم ترجمہ کر دیا گیا، اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ نفس مسئلہ مکمل ایک جگہ دستیاب ہو جائے گا، اور اسے یاد رکھنا اور محفوظ رکھنا سہل ہو جائے گا۔

میبذی میں متن کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان کی شرح کی گئی ہے، اس کتاب میں شارح کی عبارتوں کا مطلب سوال و جواب کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ جس ترتیب سے میبذی میں شرح ہے، ٹھیک اسی ترتیب سے سوال و جواب بھی ہیں۔ میبذی سامنے رکھ کر اس کا مطالعہ کیا جائے تو بآسانی یہ معلوم ہو جائے گا کہ کس عبارت کی ترجمانی کہاں ہے؟۔

اس کتاب میں جہاں جہاں سوال کا عنوان ہے اسے میبذی میں تلاش کیجئے، میبذی کی عبارت سامنے رکھ کر سوالات وضع کئے گئے ہیں اور کتاب کی عبارت کو جواب قرار دیا گیا ہے، اس سے امتحان میں بھی سہولت ہوگی اور سمجھنے میں بھی۔ اگر میبذی سامنے نہ ہو جب بھی فہمِ مطلب میں ان شاء اللہ کہیں دشواری نہ ہوگی، لیکن مناسب یہ ہے کہ اس کے مطالعہ کے پہلے یا بعد میں میبذی کی متعلقہ بحثیں بھی بغور پڑھی جائیں۔''

(۳۵)تکبر اور اس کا انجام:

یہ کتابچہ حضرت مولانا کے درسِ قرآن کی ایک تقریر ہے، جس میں تکبر کی قباحت و شناعت پر قرآن وحدیث کی روشنی میں مفصل کلام کیا گیا ہے۔

(۳۶)المد التعظیمی لاسم الجلالۃ۔ یعنی لفظِ اللہ میں مد کی تحقیق:

اذان میں اسمِ ذات ''اللہ'' میں مد کے سلسلے میں حال کے بعض بزرگوں کی طرف سے اس بات پر اصرار کیا جاتا ہے کہ یہ جائز نہیں ہے۔ اس رسالہ میں اس رائے کے عدمِ صواب پر فقہ و تجوید کی روشنی میں محققانہ گفتگو کی گئی ہے، علماء وفقہاء، قراء ومجودین کی آرا سے مزین یہ رسالہ اپنے

موضوع پر تحقیقی شاہکار ہے۔

(۳۷) اذکار وافکار:

اس رسالہ میں سلسلہ عالیہ قادریہ حمادیہ کی تعلیمات، اوراد واشغال اور اذکار وافکار کو حضرت مولانا نے اپنے شیخ ومرشد، سلسلہ قادریہ حمادیہ کے مستند شیخ طریقت حضرت مولانا عبدالواحد صاحب نوراللہ مرقدہ کی تحریر کی روشنی میں سالکین کی تعلیم وتربیت کے لئے مرتب فرمایا ہے۔ یہ رسالہ اہل سلسلہ کے لئے اپنے معمولات کو جاننے کے لئے معاون اور عمل میں لانے کے لئے دستور العمل ہے۔

(۳۸) کاروان حرم:

حضرت والد صاحب نے اپنی زندگی کے بالکل اخیر حصے میں حضرت سید احمد شہید علیہ الرحمہ کے سفر حج کے حالات وکوائف کو مرتب کرنا شروع کیا تھا۔ سید صاحب کے حالات وواقعات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ''وقائع سید احمد شہید'' میں سید صاحب کے سفر حج کے احوال بہت تفصیل سے درج ہیں۔ یہ کتاب سید صاحب کے رفقا کی مرتب کی ہوئی ہے، جو سید صاحب اور ان کی دعوت وتحریک سے متعلق مراجع میں سب سے وسیع ذخیرہ ہے۔

والد صاحب اس کتاب سے اخذ کر کے سفر حج کے حالات وواقعات مرتب فرما رہے تھے کہ تکمیل کے مرحلہ تک پہونچنے سے پہلے ہی والد صاحب خود اپنی آخری منزل پر پہونچ گئے، اور یہ کام تشنہ رہ گیا۔ خوشی کا مقام ہے کہ برادر عزیز مولانا محمد عرفات اعظمی سلمہ نے اس منصوبے کی تکمیل کا حوصلہ کیا اور بحمد للہ بحسن وخوبی اس کو انجام تک پہونچایا، ساتھ ہی سید صاحب کے حالات وسوانح، ان کی دعوت وتحریک جہاد، ان کے داعیانہ ومجاہدانہ کردار، ان کے اصلاحی وتبلیغی کارناموں کو مفصل قلم بند کیا ہے جو سید صاحب کی سیرت وشخصیت کو سمجھنے میں مدد ومعاون ہوگا۔

کتاب طباعت کے لئے مکمل طور پر تیار ہے، جلد ہی ان شاء اللہ زیور طبع سے آراستہ ہو کر قارئین کے ہاتھوں میں ہوگی۔

❑❑❑

مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمیؒ
اور حیاتِ مصلح الامتؒ

مولانا انصار احمد معروفی، پورہ معروف
مدرسہ چشمۂ فیض، ادری، مئو یوپی

’’حیاتِ مصلح الامت‘‘ مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمیؒ کی وہ شاہ کار تصنیف ہے، جو اتنی مقبول ہوئی کہ اس کے کئی ایڈیشن منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ مولانا نے اس کی تالیف ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء میں کی، مگر ۱۴۰۴ھ میں وہ شائع ہوئی۔ علمی شخصیات پر تعزیتی اور تأثراتی مضامین قلم بند کرنا، مولانا کے اشہبِ قلم کا خاص میدان تھا، اس میدان میں انہوں نے اتنی تیزی دکھائی کہ ان کے ہم عصران سے بہت پیچھے رہ گئے۔ مولانا مرحوم کے تعلقات کا دائرہ بے حد وسیع تھا، جس میں ان کے اکابر، بزرگان دین، صوفیائے عظام، دینی مزاج کے حامل شعرائے کرام، مدارس سے وابستہ وغیر وابستہ علمائے عصر، طلبائے عزیز، جو ان کی زندگی ہی میں اونچے مقام پر فائز ہو چکے تھے۔ اس کے ساتھ عصری تعلیم کے اداروں سے جڑے ہوئے بہت سے اساتذہ و دیگر حضرات، جن کی رحلت پر مولانا نے جب قلم اٹھایا تو صفحات کے صفحات ان کی صفات وخوبیاں بیان کرنے میں اس طرح خرچ کردیے کہ جانے والوں کی حیات وخدمات کے مستور گوشوں کو بھی نوکِ قلم سے واضح کرکے ایسا منور کردیا کہ قارئین کی آنکھیں اس کے مطالعے کے بعد کھل گئیں، کہ ہم نے ایسے لوگوں کی قدر کیوں نہیں کی؟ یا ہم ایسے لوگوں سے ملاقات سے محروم کیسے رہ گئے؟ کسی کی حیات وخدمات کے سلسلے میں خاکہ نگاری کے تعلق سے مولانا اپنی مثال آپ تھے۔ اس وقت بھی وہ اس دشت کی سیاحی

میں ایک عمر گزار چکے تھے، جب وہ کسی رسالہ کے مدیر یا سرپرست نہیں تھے، اور جب رسالہ ‘المآثر’ مئو، ‘انوار العلوم’ جہاناگنج، ‘ضیاء الاسلام’ شیخوپور اور ‘سراج الاسلام’ چھپرہ وغیرہ سے بطور ذمہ دار وابستہ ہوگئے تو گویا ان کے قلم کو لامحدود صفحات کی وسعت مل گئی۔ خاکہ نگاری ان کا خاص اور پسندیدہ موضوع ہونے کی وجہ سے انہوں نے جس شخصیت پر بھی قلم کو حرکت دی اسے اپنے اعجازِ قلم سے زندۂ جاوید بنا دیا۔

’’خاکہ نگاری‘‘ اب ادب کی ایک خاص صنف اور ایک منصب اختیار کر چکی ہے، خاکہ نگاری کے ذریعے کسی کی مختصراً اور اجمالاً اس انداز میں تصویر کشی کی جاتی ہے کہ اس سے اس کی بھرپور شخصیت اپنی تمام تر رعنائیوں، لطافتوں اور نفسیاتی پیچیدگیوں کے ساتھ منظر عام پر آجائے۔ اس فن کے ذریعے کسی بھی شخصیت پر متعدد پہلوؤں سے روشنی ڈالی جاتی ہے۔ یہ بہت مشکل اور نازک فن ہوتا ہے کیوں کہ اس میں ایک طرف جہاں اس کی شخصیت کو قلم کے ذریعے ابھارنے کی کوشش کی جاتی ہے وہیں اس کا بھی مطالبہ ہوتا ہے کہ اس میں ایسی کوئی بات نہ آجائے جو اخلاقی اور حقائق کے اعتبار سے ناقابل قبول ہو۔

کسی نے ایک سنگ تراش سے پوچھا کہ تم ایک پتھر سے اتنی حسین مورت کس طرح تراش لیتے ہو؟ اس نے جواب دیا مورتی تو خود اس پتھر میں موجود تھی، میں نے صرف زائد حصے کو تراش کر علاحدہ کر دیا ہے۔ یہی کام خاکہ نگار کا ہوتا ہے۔ (از: فن اور تنقید) اس حوالے سے اگر ان کے ان تمام مضامین کا مطالعہ کیا جائے جسے انہوں نے شخصیات پر لکھا ہے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ان کے اندر ایک سنگ تراش کی طرح کوئی فن کار موجود تھا، جسے انہوں نے اپنے نوکِ قلم سے اس شخصیت کے زائد حصے کو اس سے الگ کر کے جانے والے کی صورت وسیرت، اس کی خوبیاں، صفات اور اس کے لافانی کردار کے نقوش کو صفحات کے آئینے پر اس طرح بکھیر کر رکھ دیا کہ اس کی حیات کے تمام چھپے زاویے قلم کی جادو بیانی، اور تحریر کے اعجاز سے ابھر آئے۔ ان کی یہ خوبی علمی حلقوں میں تقریباً مشہور ہے۔

جس شخصیت کی خاکہ نگاری یا سوانح حیات قلم بند کی جاتی ہے، وہ جتنی بلند و بالا اور عظیم ہوتی ہے، وہ تخلیق بھی اس کے قلمی معیار کے تناسب سے عظیم اور لافانی ہو جاتی ہے۔ اسی کے پہلو

بہ پہلو یہ بات بھی مسلّم ہے کہ سوانح نگاری کے لئے صاحبِ سوانح سے اگر تعلقات اور روابط ہوتے ہیں، اس سے کچھ یادگار ملاقاتیں رہتی ہیں تو اس کے خدوخال کا بیان کرنا سہل ہوتا ہے، اس کی خلوت وجلوت کے بارے میں بہت سی ضروری چیزوں کا ذکر آسان ہونے کے ساتھ اس کے اوصاف کو نمایاں کرنے میں یہ ملاقاتیں مددگار ہوتی ہیں۔ ’’مولانا کے تعزیتی مضامین کا مجموعہ ’’کھوئے ہوؤں کی جستجو‘‘ میں جن شخصیات کا تذکرہ آیا ہوا ہے، ان سے حضرت مولانا کی براہِ راست ملاقات بھی تھی اور ان سے دیرینہ تعلقات بھی تھے۔

لیکن ’’حیات مصلح الامت‘‘ ایک ایسی کتاب ہے کہ صاحبِ سوانح حضرت مولانا وصی اللہ صاحب فتح پوریؒ، اگرچہ مؤلفِ کتاب کے دور میں موجود تھے، ان کے تقوی اور تدین کے علاوہ ان کی خانقاہ کا بھی مولانا کے علاقے میں شہرہ تھا، نیز وہ مولانا کے علاقے ہی سے تعلق بھی رکھتے تھے مگر ان سے ملاقات کی نوبت نہیں آسکی، جس کی وجہ مولانا کے الفاظ میں یہ ہے ’’تذکرہ نگار نے گو کہ حضرت مصلح الامت کا زمانہ پایا ہے لیکن وہ طالب علمی کی بے شعوری کا دور تھا، حضرت مولانا اس وقت الہ آباد میں تشریف فرما تھے، دید وزیارت کے شرف سے بھی محروم رہا، اس بنا پر حالات سے ذاتی واقفیت کا کوئی سوال ہی نہیں۔‘‘ (حیات مصلح الامت: ص ۱۹) لیکن اس نادیدگی کے باوجود مولانا نے ان کی حیات کا مفصل تذکرہ اس کتاب میں اس طرح کیا ہے اور ان کے خدوخال اور ان کی زندگی کے نقوش کو کتاب کے دامن پر اس تفصیل اور دلکش انداز سے بکھیر دیا ہے کہ اگر خود مولانا سے اپنی عدمِ ملاقات کا ذکر نہ کرتے تو قارئین کو اس کی اطلاع اس کے مطالعے سے نہ ہو پاتی، مگر مولانا نے حضرت مصلح الامت کی سوانح جو ایک واصل الی اللہ اور ایسے شیخ کے خلیفہ اور مجاز تھے جس کے یہاں آدمی کو محض بزرگ بنانے کے بجائے انسان کامل بنایا جاتا تھا، جب کہ ابھی مؤلف اس راہ کے نو وارد مسافر ہی نہیں بلکہ ابھی اس سے بالکل نا آشنا تھے۔ خود مولانا تحریر فرماتے ہیں:

> ’’حیرانی یہ ہے کہ زمین پر بیٹھ کر آسمان کی تصویر کیسے بنائی جائے؟ جس راہ پر آدمی کا قدم بھی نہیں پڑا ہے وہ اس مسافر کے احوال کیا بیان کرسکتا ہے جس نے پوری عمر یہی راستہ طے کیا ہو؟ اندھے سے کہئے کہ چمن کے پھولوں کی رنگت، ان کا حسن وجمال اور مالی کے کمال فن کی

> داددے تو یہ مطالبہ کہاں تک معقول ہوگا؟ یہی حال اس وقت سوانح نگار کا ہو رہا ہے۔‘‘ (حیات مصلح الامت: ص۲۶۶)

مگر حیرت اور تعجب ہوتا ہے کہ مولانا نے ان سب کے باوجود جب علما کے اصرار اور ان کی دعاؤں کے سہارے حضرت مصلح الامت کی سوانح لکھنے کے لئے قلم اٹھادیا تو ہزار دشواریوں کے باوجود ان کا قلم اسی وقت خاموش ہوا جب اسے اپنی منزل مقصود مل گئی۔ مولانا نے لکھا ہے کہ ’’تاہم باوجود نارسائی کے جب کچھ پیش کرنے کا عزم باندھا گیا ہے تو قلم بھی مجبور ہے کہ کچھ نہ کچھ تصویر کشی کر ہی ڈالے۔‘‘ (حیات مصلح الامت: ص۲۶۶)

کتاب اور وجہِ تالیف:

میرے سامنے کتاب حیات مصلح الامت کا پہلا ایڈیشن ہے جو ۱۴۰۴ھ کا طبع شدہ ہے، ابتدائے کتاب میں حضرت کی بنائی ہوئی مسجد، مدرسہ، اور مکان کی چند تصویریں ہیں۔ کتاب دو حصے میں ہے۔ پہلے حصے میں حضرت مصلح الامتؒ کے گاؤں کے ماحول اور خاندان کے تذکرے سے قبل اکابر اور بزرگوں کے کلمات طیبات ہیں جن میں سب سے پہلے حضرت مصلح الامت کے داماد اور جانشین حضرت مولانا قاری شاہ محمد مبین صاحب مدظلہ نے مولانا اعجاز احمد صاحب سے اس کتاب کے لکھنے کی فرمائش کا ذکر اس طرح کیا ہے:

> ’’فکر تھی کہ یہ کام آخر کس سے لیا جائے؟ حسن اتفاق کہ مولانا اعجاز احمد سلمہ مدرس مدرسہ دینیہ غازی پور جب الہ آباد عارضی قیام کے لئے تشریف لائے اور ان کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا تو اندازہ ہوا کہ مولانا موصوف اس کام کے لئے نہایت ہی موزوں ہیں۔ ماشاء اللہ تحریری سلیقہ، حضرت اقدس سے والہانہ عقیدت، حضرت والا کے مضامین کا ذوق اور فہم پھر خود حضرت نور اللہ مرقدہ کی ذات اور آپ کی تعلیمات وتصوف سے مناسبت، یہ تمام امور بیک وقت آپ کے اندر موجود پائے اور یہ کہ گو حضرت والا کی زیارت آپ نے دیدۂ ظاہر سے نہیں کی تھی مگر اس کی تلافی بطریق احسن ان کے جذبۂ عشق ومحبت نے کردی۔ ان امور کو دیکھتے ہوئے ترتیب سوانح کی انہیں سے فرمائش کی گئی۔‘‘ (حیات مصلح الامت: ص۱۲)

جادوئی قلم:

حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب پر اللہ تعالی نے بے حد احسان کیا کہ ان کی زبان میں

جہاں اللہ نے یہ تاثیر رکھی تھی کہ سخت سے سخت دل والے بھی پگھل کر نرم ہوجاتے اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے، اسی طرح مبدأ فیاض نے ان کے قلم میں وہ جادوئی اثر رکھا تھا کہ جو کوئی ان کی کوئی تحریر پڑھ لیتا اس کے سحر میں ڈوب جاتا، اور پھر ان کی تحریروں کو تلاش کر کر کے پڑھنے کی جستجو میں لگا رہتا، بالخصوص ان کے وہ تأثراتی مضامین جو کسی شخصیت پر انہوں نے لکھے ہیں۔ وہ اپنے قلم سے کسی کی شخصیت کا ایسا نقشہ کھینچ دیتے تھے کہ قاری ان کی سحر طرازیوں میں کھوجاتا اور ایسا محسوس کرتا گویا وہ اس شخصیت کے ساتھ ساتھ چل پھر رہا ہے، اور سارا منظر اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم رہا ہے، حتیٰ کہ ماہر قلم کار اور نامور مصنف مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن صاحب ندویؒ اس کتاب کے مطالعے کے بعد یہ لکھنے پر مجبور ہوئے: ''ان میں تصنیفی سلیقہ، تحریر میں ایسی شگفتگی اور سلاست، کتاب میں ایسی حسن ترتیب اور مضامین کا حسن انتخاب ہے جو کہنہ مشق مصنفوں اور اہل قلم میں پایا جاتا ہے۔ (حیات مصلح الامت: ص۱۲)

منظر نگاری اور تصویر کشی میں مولانا کو کمال حاصل تھا، اسی کتاب میں ایک جگہ دیوبند کے ماحول کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے وہاں کی عطر بیز اور نورانی فضا کا کتنا دلکش منظر پیش کیا ہے:

> ''ان (اساتذہ) کا ہر ہر فرد جہاں علم وفضل کے اعلیٰ مراتب پر رسوخ رکھتا تھا وہیں زہد و تقویٰ، خلوص وللّٰہیت، خدا ترسی، دیانت داری، اور عشقِ الٰہی ومحبت نبوی کا بھی مکمل نمونہ تھا۔ پھولوں سے بھرے ہوئے کسی چمن میں نکل جایئے، دل ودماغ کیسے تازہ ومعطر ہوجاتے ہیں، اس کی نشاط انگیز اور عطر بیز ہوائیں، سرور ومستی کا کیسا پیغام دیتی ہیں۔ آپ خود سوچئے! علوم نبوت کا شاداب وروح پرور چمن لہلہا رہا ہے، گلشن کے مالیوں نے ہر ہر روش سنوار رکھی ہے، پورا گلستاں جوش بہار پر ہے، دن میں قال اللہ وقال الرسول کی صدائیں گونج رہی ہیں، تو رات کو ''لا الہ الا اللہ'' اور ''اللہ اللہ'' کا نغمۂ سرمدی روح کو تازگی بخش رہا ہے۔ کہیں کلامِ الٰہی کی خوشبو پھوٹ رہی ہے، کہیں حدیث کا درس بہار پر ہے، کہیں فقہ کے موتی لٹائے جارہے ہیں، کہیں معقولات کی بادیہ پیمائی ہورہی ہے، غرض ایک بہار کا سماں تھا، نشاط ہی نشاط تھا۔'' (ص۴۱)

کتاب کا اجمالی تعارف:

کتاب کے دو حصے ہیں اور دونوں حصے ایک ہی جلد میں منضم ہیں۔ پہلے حصہ میں

حضرت مصلح الامت کی پیدائش، تعلیم، بچپن، عربی تعلیم، قیام دیوبند، قیام تھانہ بھون، مرشد کی نگاہ کرم، تدریس، نکاح، قیام وطن، خانقاہ کے شب وروز، مجلس، مصلح الامت اور کوپا گنج، مخالفت اور اس کی اصلاح کے ذکر کے ساتھ ہجرت، قیام گورکھ پور، الہ آباد، اسفار، سفرحج اور وصال کا تذکرہ ہے۔

دوسرے حصے میں حضرت مصلح الامت کے ذوق، مزاج، اوران کی خصوصیات کا مفصل تذکرہ ہے، جس میں ان کی خلوت گزینی، ذاتِ نبوی کے ساتھ شیفتگی، زہدوتقویٰ، محبت وشفقت، رعب وجلال، اور ذوقِ علم وغیرہ کو بھی زیرتعارف لایا گیا ہے۔

مولانا جب کسی واقعہ یا صفت کا ذکر کرتے ہیں، تو اس سے پہلے اس صفت یا واقعہ کو قرآن، حدیث یا تاریخ سے مبرہن کرکے آگے بڑھتے ہیں۔ چنانچہ کتاب میں ایک عجیب وغریب واقعہ اور زمینی حقیقت کو سامنے لاتے ہوئے مولانا نے حضرت مصلح الامت کے ایک استاذ، جامع المعقول والمنقول حضرت علامہ ابراہیم بلیاویؒ صاحب (دیوبند) کا ذکر کیا ہے جو اپنے شاگرد حضرت مصلح الامت کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوگئے تھے۔ اس پر حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب نے یوں روشنی ڈالی ہے:

> ''تاریخ اسلام میں ایسی مثالیں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ تاریخ کی یہ شہادت ہے کہ علامہ طیبی نے اپنے شاگرد عمر خطیب تبریزی سے مشکوۃ شریف تالیف کراکے خود اس کی شرح لکھی۔ ماضی قریب میں حضرت مولانا مفتی الہی بخش کاندھلویؒ، جنہوں نے مثنوی مولانا روم کا تکملہ تحریر فرمایا، زبردست عالم وفاضل حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے تلمیذ خاص اور مرید تھے، لیکن بعد میں اپنے چھوٹے بھائی اور اپنے شاگرد جناب حاجی کمال الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے........

آگے تحریر فرمایا ہے:

> ''دونوں بزرگوں کی ملاقات اور باہم مکاتبت میں ایک عجیب کیف محسوس ہوتا تھا، ایک طرف حضرت علامہ بایں جلالت شان اپنے کو حضرت والا کے سامنے مسترشدانہ اور مستفیدانہ پیش کرتے ہیں، اور ادب واحترام کی وہی نگہداشت ملحوظ رکھتے ہیں جو ایک مرید کو اپنے شیخ کے

ساتھ ملحوظ رکھنی چاہئے ، اور دوسری طرف حضرت مصلح الامت بالکل ایک تلمیذ اور شاگرد کی صف میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں جیسا کہ استاذ کا حق ہے ، اور حق یہ ہے کہ دونوں بزرگوں نے اپنی دونوں حیثیتیں کماحقہ نباہ دی ہیں۔ ‘‘(حیات مصلح الامت: ص ۳۲۷)

کتاب کے دوسرے حصے میں حضرت مصلح الامت کے علمائے عصر سے تعلقات اور روابط کا بھی تذکرہ ہے ، جس میں ان بزرگوں کا بقدر ضرورت تعارف بھی شامل کتاب ہے ، جس میں حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ ، مولانا شاہ عبدالغنی پھول پوریؒ ، مفتی محمد شفیع صاحبؒ ، مولانا ظفر احمد عثمانیؒ ، قاری محمد طیب صاحبؒ ، ڈاکٹر عبدالحی صاحبؒ اور مولانا محمد زکریا صاحبؒ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ایک باب کرامات اولیا اور قبولیت دعا کا ہے ، جس میں واقعات کو شواہد سے مبرہن کیا گیا ہے ، نیز مولانا نے حضرت مصلح الامت کے طریقۂ بیعت واصلاح ان کے تمام دستور العمل ، شجرہ ، اوراد ووظائف ، مشائخ کی کتابوں سے شغف ، اور اہل وعیال کی اصلاح کے سلسلے میں مفصل تحریر پیش کی ہے۔ حضرت کی اولاد واحفاد ، داماد ، اور ان کے مواعظ کے جو مجموعے کتابی شکل میں شائع ہوئے ان کی فہرست اور تعارف کا بھی ذکر ہے۔ حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندوی کا ایک مضمون بھی شامل کتاب ہے جب وہ فتح پور ، ضلع مئو آئے اور چار ہفتہ قیام کرکے ایک مضمون ’’چار ہفتہ ایک کہف میں‘‘ کے عنوان سے لکھا ، اسی کے ساتھ حضرت مصلح الامتؒ کے بیانات اور ان کی مجالس ، نیز ان کا ایک درس جو منطق کی ایک مشہور کتاب ’’سلم العلوم‘‘ سے متعلق ہے ، اسے بھی مولانا نے شامل کتاب کرکے حضرت کی اس فن سے مناسبت کا اظہار کردیا ہے۔ آخر میں حضرت حکیم الامتؒ سے حضرت مصلح الامتؒ کی جو اصلاحی خط وکتابت رہی ، ان میں سے چند خطوط کا عکس مع جوابات بھی اس کتاب میں شامل کرکے کتاب کی زینت میں اضافہ کیا گیا ہے۔

۵۱۲ر صفحات پر مشتمل اس اصلاحی کتاب کا اگر باذوق قاری مطالعہ کرے گا تو یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی دلکشی ، زبان وبیان کی شگفتگی ، انداز بیان ، اور صاحب سیرت کی حیات کے پاکیزہ نقوش اور ان کی حیات آفریں مجالس کے مناظر کی جس انداز میں عکاسی کی گئی ہے ، وہ اس کتاب کے معتد بہ حصہ کو ایک ہی مجلس میں پڑھے بغیر نہیں رکھ سکتا۔ ان شاء اللہ اسے ایسا ہی

محسوس ہوگا جیسے وہ خود حضرت مصلح الامت کی مجلس میں موجود ہے، اور حضرت ان کے سامنے اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ اپنے مریدین کی اصلاح وتربیت میں مصروف ہیں۔

حضرت مصلح الامت کے ایک خلیفہ ومجاز حضرت مولانا حکیم محمد بشیر الدین صاحب کوپا گنجیؒ نے صحیح لکھا ہے:

> ’’حضرت مولانا قدس سرہ العزیز کے حالات اور واقعات، کشف وکرامات، اور مخصوص طرزِ اصلاح کی جو آپ نے عکاسی کی ہے وہ بالکل صحیح اور درست ہے۔ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ آپ کی ملاقات حضرت والا نور اللہ مرقدہ سے نہیں ہوئی اور نہ آپ نے ان کو دیکھا، تاہم آپ نے ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ گویا آپ ان کی مجلس وعظ میں شریک تھے، اور کل باتیں اپنے کانوں سے سنی ہیں، اور واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔‘‘ (حیات مصلح الامت: ص۱۰)

حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمیؒ جو حضرت مصلح الامت کے شاگرد نہیں، ان کے مرید بھی نہیں، بلکہ حضرت کی ان سے کبھی ملاقات تک نہیں ہوسکی، اس کے باوجود حضرت سے وہ کس طرح اتنے متأثر ہوگئے کہ حضرت کے بڑے بڑے خلفا، جو اہل علم اور صاحب قلم بھی تھے، ان کی موجودگی میں مولانا نے حضرت کی پوری سوانح لکھ دی؟ اس سلسلے میں خود مولانا نے اپنے ایک خط میں مولانا جامی صاحب کو لکھا ہے:

> ’’ابھی چندروز ہوئے دسمبر ۷۳ء کا شمارہ (معرفت حق) ایک صاحب سے دیکھنے کو ملا، اس سے پہلے بھی بعض شمارے دیکھے تھے، مگر ’’کل امر مرھون بأوقاته‘‘ کے تحت اس وقت کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ اب جس وقت ہاتھ آیا، اور اس کے مضامین پڑھے، تو چونک اٹھا، بلاشبہہ ایک عجیب چیز ہے۔ حضرت مصلح الامت کے نفس گرم کی تاثیر سنی تو ضرور تھی، احساس اب ہوا، بے اختیار دل کھنچتا چلا گیا، لفظ لفظ پڑھا، عجیب وغریب کیف محسوس ہوا، اب تو صبر نہ ہوا، مدرسہ (دینیہ) میں ڈھونڈھا تو تین رسالے اور مل گئے، انہیں پڑھا، مزید شوق ہوا، مخدومی جناب مولانا بشیر الدین صاحب کے یہاں سے حاصل کرکے پڑھا، اور اب نوبت یہاں تک پہنچی کہ مستقل خریداری کے بغیر قرار نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت کے ملفوظات بیمار انسانیت کے لئے آب حیات ہیں، میں ان کو بار بار پڑھتا ہوں، اور ہر ہر مرتبہ ایک نیا لطف حاصل ہوتا

ہے۔“

ایک دوسرے خط میں یوں لکھا ہے:

”حکیم صاحب موصوف کے یہاں سے جس قدر رسائل مل سکے، ان کا ایک ایک لفظ پڑھ چکا ہوں، مجھ کو کچھ ایسا محسوس ہوا کہ یہ وہ آبِ زلال ہے کہ جس کے پینے کے بعد جہاں روحانی سیرابی حاصل ہوتی ہے، وہیں شوق وانتظار کی تشنگی بدرجہا بڑھ جاتی ہے، اور اب تو یہ شوق دل میں سما رہا ہے کہ چل کر اس جلوہ گاہ کی زیارت کرنی چاہئے، جس کی ضیا پاشیوں سے صدہا تاریک قلوب نے روشنی پائی۔“

ایک دوسری جگہ مولانا نے اپنے مطالعے کا حال یوں تحریر کیا ہے:

”حضرت اقدس کے لطف مضامین اور اپنے شوق مطالعہ کا یہ عالم ہے کہ کئی کئی شب اس طرح گذر گئیں کہ عشا کے بعد ان کتب ورسائل کا مطالعہ شروع کیا اور فجر کی اذان ہوگئی، رات کے گذر جانے کا احساس تک نہ ہوا۔“ (ص:۱۵)

مولانا جامی صاحب لکھتے ہیں:

”اس کے بعد خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ خود مولانا ہی کا تعلق حضرت قاری صاحب مدظلہ سے ہوگیا، اور پھر مولانا مدرسہ وصیۃ العلوم میں مدرس بھی ہو کر تشریف لے آئے، اور تقریباً چار سال قیام فرمایا، اس اثنا میں مولانا موصوف کے ذوق وشوق، فہم استعداد اور حضرت والا کے ساتھ انس کو دیکھ کر مخدوم ومحترم جناب قاری محمد مبین صاحب مدظلہ نے (بلکہ ہم سب ہی حاضرین خانقاہ نے) ان سے یہ خواہش ظاہر کی کہ حضرت کی سیرت اور حالات جو رسالہ ”معرفت حق“ اور ”وصیۃ العرفان“ کے طویل وعریض صفحات میں پھیلے ہوئے ہیں اس میں سے انتخاب کر کے ایک مختصر مگر جامع سیرت مرتب ہو جاتی تو شاید لوگوں کو اس سے زیادہ نفع پہنچتا۔ مولانا نے اس کو منظور بھی فرمالیا پھر ایک موقعہ پر الہ آباد ہی تشریف لا کر آپ نے اس کی ابتدا فرمائی، اور غازی پور جا کر اس کی تکمیل فرمائی۔

مولانا نے اپنے اس انتخاب میں اختصار کے باوجود کسی گوشہ کو تشنہ نہیں چھوڑا، اور حضرت مصلح الامت علیہ الرحمہ کی سوانح کو بہمہ وجوہ مکمل ذکر کر کے اپنی اس تالیف کو رشک صد تالیف

> بنا دیا ہے۔ چنانچہ مولانا موصوف کی اس سعی وکوشش پر دل سے دعا نکلی کہ اولاً تو یہ موضوع خود ہی محبوب تھا، پھر مولانا اعجاز صاحب کے قلم اعجاز رقم نے اس میں سونے پر سہاگہ کا کام کر دیا۔ (ص:۱٦)

جس شخص کو تصنیف وتالیف کا ذوق ہے وہ جانتا ہے کہ تصنیف وتالیف کا کام نہایت دقت طلب، پیچیدہ، اور چیونٹی کے منھ سے شکر جمع کرنے کے مترادف ہے۔ مولانا نے ان مذکورہ اکابر کی درخواست کو حکم سمجھ کر قبول فرمالیا مگر راہوں کی صعوبتوں اور تالیفی دشواریوں کی وجہ سے کتنی جگہ صبر وتحمل کا دامن چھوٹنے کے قریب ہو گیا، اور اپنے ”ہاں“ کہنے پر افسوس ہونے لگا، مگر اللہ نے مدد فرمائی۔ لکھتے ہیں:

> ”کسی بزرگ، خدا رسیدہ عالم کے حالاتِ زندگی لکھنا اس کے ظاہری اور باطنی حسن و جمال اور امتیازات وخصوصیات کا نقشہ موئے قلم سے کھینچنا یوں بھی ایک مشکل اور نازک کام ہے، استطاعت تو کیا عزم وحوصلہ بھی گھبراتا تھا، تاہم ان اکابر کے اس سوال کے بعد سچی بات یہ ہے کہ معذرت کا ایسا کوئی کلمہ بھی نہ کہہ سکا جو قابل قبول ہوتا۔ اپنی کوتاہ ہمتی، ناتجربہ کاری، اور تذکرہ نویسی کے کوچے سے ناآشنائی کو سوچے بغیر یہ ذمہ داری قبول کر لی لیکن جب کام شروع کیا اور اس کی دشواریاں قدم قدم پر قلم کا راستہ روکنے لگیں تو بار بار یہی سوچتا رہا کہ اے کاش! یہ ذمہ داری قبول نہ کی ہوتی۔“ (ص:۱۹)

وقت کی قدر:

اب اس مضمون کو حضرت مصلح الامتؒ کے ایک اقتباس کو تبرکاً نقل کر کے ختم کرتا ہوں، جسے حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمیؒ نے کتاب کے صفحہ ۸۵/۸۴ پر نقل کیا ہے، جس پر احقر نے اپنی طرف سے ”وقت کی قدر“ کا عنوان لگا دیا ہے۔ مولانا اعجاز صاحب بطور تمہید لکھتے ہیں:

”مسودات صاف کرنے کے متعلق حضرت کا ایک ارشاد سنئے: اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت تھانویؒ کے لکھے ہوئے مسودات کو صاف کرنا ہر ایک کا کام نہ تھا، اس کے لئے علم وفن کی لیاقت شرط تھی۔ فرماتے ہیں: ”تم لوگوں کو کچھ لکھنے پڑھنے کا کام دیتا ہوں تو اس کو لے کر بیٹھے رہتے ہو، ذرا بھی محنت تم لوگوں سے نہیں ہوتی، اور تھانہ بھون میں حضرت مولانا بھی ہم لوگوں کو کام

دیتے تھے، کوئی مسودہ لکھ کر دیدیتے تھے اور فرماتے تھے کہ ابھی صاف کرکے لاؤ، اور حضرت کی تحریر ایسی ہوتی تھی کہ کاغذ کا کوئی حصہ سفید نظر نہیں آتا تھا، قریب قریب سطروں میں لکھتے تھے، اور ایک جانب سے لکھ لینے کے بعد اس کو الٹ کر بین السطور پھر لکھتے، کہیں کہیں خط کھینچ کر یا نشان لگا کر مضمون کا جوڑ لگاتے چلے جاتے، ہم لوگ جب اس کو صاف کرنے لگتے تو سر میں درد ہونے لگتا، مگر جو کام ملتا تھا کرتے تھے۔ چنانچہ بعض مرتبہ کام کی اس قدر کثرت ہوتی تھی کہ:

’’کھانا کھانے تک کا موقعہ نہیں ملتا تھا، اس لئے میں تو کبھی کبھی یہ کرتا تھا کہ دال یا سالن جو بھی کھانے میں ہوتا اس کو پہلے ہی پی لیتا، اور پھر تنہا روٹی توڑ توڑ کر کھاتا رہتا تھا، اور نظر سے لکھے ہوئے پروف کا مقابلہ کرتا جاتا تھا۔ اس طرح ایک ہی وقت میں دو کام بسہولت ہوجاتے تھے۔

(حیات مصلح الامت: ص ۸۵)

❑❑❑

علم صرف ذہانت وذکاوت ہی سے نہیں ملتا ممکن ہے دنیا کا علم اسی طرح حاصل ہوتا ہو لیکن جس کو میں علم کہتا ہوں اس کا حساب وکتاب اور ہے، یہ ضرور ہے کہ ذہانت مدد ومعاون ہے، اس سے راہِ علم میں سلوک کی سہولت ہوتی ہے، تاہم اس کی حیثیت اَساسی اور بنیادی نہیں ہے، دین کا علم زیادہ تر خلوص نیت، عزم وعمل اور مسلسل محنت وکاوش سے حاصل ہوتا ہے، ہم نے بہت سے ذہین دیکھے ہیں جو درمیان میں گر پڑ کے ختم ہوگئے، وہ نہ تو اپنے علم سے خود فائدہ اٹھا سکے، اور نہ ہی دوسروں کو کچھ دے سکے، اور بہت سے غبی، کند ذہن جن کو حصول علم کے زمانہ میں اساتذہ کے نزدیک بالکل وقعت حاصل نہ تھی، وہ اپنے اپنے دور کے شمس العلماء بنے۔

آج ضرورت بہت زیادہ ذہین علماء کی نہیں، ایسوں کی ضرورت ہے جن کے پاس علم کے ساتھ فراست ایمانی بھی ہو، اور یہ فراست حاصل ہوگی تصحیح نیت سے۔ (ح۔ د)

درحقیقت یہ اس دور کا ایک بڑا المیہ ہے کہ وہ لوگ جن کے ہاتھوں میں زمانے کی باگ ڈور ہونی چاہئے تھی وہ مذہب کی قبا تار تار کرکے اس کی دھجیاں فروخت کررہے ہیں فوا أسفاہ دل جلتا ہے، طبیعت سلگتی ہے لیکن کون جانے دل کا حال! (حدیث دوستاں)

حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب کے مجموعۂ مضامین ''علوم ونکات'' کا تعارف

محمد عرفات اعجاز اعظمی

والد محترم (حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب نور اللہ مرقدہ) عبقریت کے حامل جامع الجہات انسان تھے، دینی وشرعی علوم کے تقریباً ہر بحر کی انہوں نے شناوری کی اور آبدار موتی چنے، ساتھ ہی میدان طریقت کے شہسوار اور مرد میدان بھی رہے ہیں۔ ان کی پوری زندگی شریعت وطریقت کے دشت بے کراں کی آبلہ پائی میں گزری ہے۔ کیا علم اور کیا عمل؟ ہر میدان میں ان کی زندگی قابل رشک رہی ہے۔ ان کی عملی زندگی کی کافی شہادت ہند وبیرون ہند بصورت تلمیذ ومتعلق ومنتسب موجود ہے، اور ان کی علمی زندگی کا کچھ حصہ سفینہ میں منتقل ہوکر بصورت کتاب لوح عالم پر ثبت ہے۔

والد صاحب کو قلم وقرطاس سے بہت زیادہ مناسبت نہیں تھی، وہ اصلاً تدریس کے آدمی تھے، لکھنے لکھانے سے ان کو ایک طرح کا گریز تھا، ہاں تدریس کے لئے ہمہ وقت مستعد رہا کرتے تھے۔ مدرسی کے ابتدائی زمانہ میں انہوں نے پڑھایا اور صرف پڑھایا ہے، لکھنے کے نام پر صرف خطوط اور اس کے جوابات تھے۔ والد صاحب نے قاضی اطہر صاحب مبارک پوری علیہ الرحمہ کے تذکرہ میں ایک جگہ لکھا ہے کہ:

> ''ایک بار مجھ سے انھوں نے اپنے ذوق ومزاج کے مطابق، لیکن ذرا زور دے کر پوچھا کہ آج کل کچھ لکھ رہے ہو؟ میں قاضی صاحب کی مہربانیوں کی وجہ سے کچھ گستاخ سا ہو گیا تھا،

> اس کے جواب میں، میں نے ایسی بات کہہ دی، جو مجھے نہیں کہنی چاہئے تھی، اب بھی سوچتا ہوں تو ضمیر ملامت کرتا ہے۔ میں نے بے تکلفی میں کہہ دیا کہ جی لکھ رہا ہوں، پوچھا کہ کیا؟ میں نے عرض کیا کہ خطوط! اس وقت میں طلبہ کی تعلیم وتربیت سے متعلق بکثرت خطوط لکھا کرتا تھا، بعض طلبہ کچھ اشکالات لکھ لکھ کر بھیجتے تھے، ان کے جواب خاصے مفصل دیا کرتا تھا۔ وہی بات پیش نظر تھی اور میں نے کہہ دی۔ ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا، فرمایا یہ کیا چیز ہے؟ میں یہی پوچھتا ہوں؟ کوئی علمی وتصنیفی کام کرو، محنت سے بچنے کے لئے یہ سب حیلے بہانے ہیں، پھر دیر تک سمجھاتے رہے۔ میں بہت شرمندہ ہوا، اس کے بعد پھر کبھی میں نے ایسی بے تکلفی کی گفتگو قاضی صاحب سے نہیں کی۔''

خط لکھنے کے معاملہ میں والد صاحب بہت فراخ اور کشادہ دل تھے، اہتمام کے ساتھ بزرگوں، شاگردوں اور خردوں کو خطوط لکھتے تھے، اور ان کے مکتوب کا جواب دیتے تھے۔ بہرحال مکتوب سے آگے قلم کا سفر بدرجۂ مجبوری اور اشد ضرورت کے وقت ہوتا، پھر رفتہ رفتہ انہیں ضرورتوں اور مجبوریوں نے اپنے بال وپر نکالنے شروع کئے اور محفل قرطاس وقلم ان کی زندگی کا ایک اٹوٹ حصہ بن گئی، اور دنیائے تصنیف وتالیف میں ان کا نام معتبر اور معزز مصنفین کے زمرہ میں شمار ہوکر مرتبۂ سند پر فائز ہوا۔

والد صاحب کی قلمی زندگی میں تیز رفتاری مجلّہ ''المآثر'' مئو کی ادارت کے بعد آئی، اس سے پہلے بھی انہوں نے چند کتابیں، کتابچے اور مضامین لکھے تھے مگر لکھنے کا بہت زیادہ اہتمام نہیں تھا، سخت ضرورت پر قلم اٹھاتے تھے۔ المآثر کی ادارت کے بعد پرچہ کی ترتیب، اداریہ کی تیاری اور دیگر مضامین کی فراہمی نے ان کے اشہب قلم کو برق رفتار بنادیا، اس کے بعد ماہنامہ ''انوار العلوم'' جہاناگنج اور ''ضیاء الاسلام'' کی ذمہ داریوں نے ان کے قلم کو اور زیادہ متحرک کردیا۔

والد صاحب کے قلم سے نکلے ہوئے بیشتر علمی واصلاحی شہ پارے کتابی صورت میں شائع ہوچکے ہیں، اور جو کسی کتاب کی زینت نہ بن سکے ان کی بھی تعداد کچھ کم نہیں ہے۔ زیر نظر کتاب میں انہیں مقالات ومضامین کو یکجا کیا گیا ہے۔ کتاب میں شامل تمام تحریریں چند ایک کے استثنا کے ساتھ کسی نہ کسی علمی مجلّہ یا رسالہ کی زینت رہی ہیں۔ انہیں رسالوں اور مجلوں سے چن

کر کتابی صورت میں اکٹھا کر دیئے گئے۔

علوم ونکات کی جلد اول کا پہلا جلی عنوان ’’فقہی مضامین‘‘ ہے۔ اس عنوان کے تحت کل ۱۰؍ مضامین ہیں، جس کا پہلا مضمون ہے:

(۱) مسئلہ عنین:

یہ مضمون ۱۳۹۹ھ میں لکھا گیا ہے، اور اسی وقت کتابچہ کی صورت میں شائع ہوا تھا۔ یہ کتابچہ والد صاحب کے اصل نام سے نہیں بلکہ تاریخی نام یعنی (مولانا) نعیم اختر (اعظمی) کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس وقت والد صاحب مدرسہ وصیۃ العلوم الٰہ باد میں کار تدریس انجام دے رہے تھے۔ اس مضمون کا محرک محکمۂ شرعیہ مئو ناتھ بھنجن کی جانب شائع کیا گیا ’’ایک اہم فیصلہ‘‘ نامی رسالہ ہے، جس میں ایک قصیر الذکر شخص کے تفریق نکاح کا قضیہ زیر بحث ہے، جو اصولی اور شرعی اعتبار سے غلط تھا، اور مزید اس رسالہ میں قاضی مجاہد الاسلام صاحب کا ایک تائیدی مقالہ بھی تھا، جس میں قاضی صاحب نے اس شخص کو ملحق بالمجبوب قرار دے کر محکمہ شرعیہ کے اس غلط فیصلہ کی تائید کی تھی۔ یہ مقالہ اسی رسالہ کے تعاقب میں لکھا گیا ہے، اور اصول فقہ اور فقہا کے اقوال کی روشنی میں اس رسالہ کا احتساب کیا گیا ہے۔

(۲) لفظ اللہ میں مد کی تحقیق:

اس مضمون میں اذان کے اندر لفظ اللہ میں مد کی تحقیق فقہ اور تجوید کی روشنی میں کی گئی ہے، کہ آیا مد جائز ہے یا نہیں؟ اور اگر جائز ہے تو ’’اللہ اکبر‘‘ کے کس لفظ میں جائز ہے؟ اور اگر ناجائز ہے تو وہ کون سے الفاظ ہیں؟۔

زمانۂ قریب کے مشہور بزرگ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب نور اللہ مرقدہ اذان میں مد صوت (آواز کو دراز کرنا) کو ناجائز کہتے تھے، اور اس پر شدت سے نکیر فرماتے تھے۔ یہ مضمون اسی نظریے کا احتساب ہے۔ اس مضمون کا اسلوب و انداز تردیدی نہیں خالص معروضی ہے۔ یہ مضمون پہلی مرتبہ حضرت مولانا مفتی محمود الحسن صاحب گنگوہیؒ کی توجہ وعنایت سے ۱۳۹۹ھ میں مکتبہ نعمانیہ دیوبند سے کتابچہ کی صورت میں شائع ہوا تھا، پھر اس کی دسری اشاعت ایک مقدمہ کے اضافے کے ساتھ ہوئی تھی۔ کتاب میں مذکورہ رسالہ اور مقدمہ دنوں موجود ہیں۔

(۳) نوٹوں کی شرعی حیثیت اور ان سے قرض کی ادائیگی کا مسئلہ:

اس مضمون میں نوٹ کی شرعی حیثیت اور ان سے قرض کی ادائیگی کے مسئلہ سے مدلل بحث کی گئی ہے۔ شریعت نے ثمن کے طور پر سونے اور چاندی کو متعین کیا ہے، کاغذی نوٹ اور گلٹ کے سکوں کی شریعت کی نگاہ میں کوئی حیثیت نہیں ہے، مگر فی زمانہ سارے معاملات انہیں نوٹوں اور سکوں سے کئے جاتے ہیں۔ اسی لئے ایک زمانہ میں بعض مفتیان کرام نے یہ فتوی دیا تھا کہ قرض میں دیئے گئے نوٹ کی تعداد اور گنتی کا کوئی اعتبار نہیں ہے، کیوں کہ وہ بے حیثیت ہیں، بلکہ اس مالیت کا اعتبار ہے جو ان نوٹوں کے عوض سونے یا چاندی کی صورت میں ملے گی۔ لہٰذا قرض کے واپسی کے وقت نوٹ کی تعداد قابل اعتنا نہیں ہوگی بلکہ وہ مالیت دیکھی جائے گی جو قرض دیتے وقت ان نوٹوں کی تھی۔

اس مضمون میں اسی رجحان اور نظریے کے عکس سے بحث کی گئی ہے اور بدلائل ثابت کیا گیا ہے کہ نوٹ کی حیثیت ثمن ہی کی ہے، اور بوقتِ واپسی قرض اس کی تعداد معتبر ہوگی، مالیت نہیں۔

(۴) دارالحرب میں ربوا کی شرعی حیثیت:

اس مضمون میں دارالحرب میں ربوی معاملات کی نوعیت اور ان کی شرعی حیثیت کو فقہاء کرام خصوصاً فقہاء احناف کی آراء کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے، نیز ضمناً ہندوستان جیسے ملک کے سلسلے میں بھی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کی عبارات کی روشنی میں بحث کی گئی ہے کہ آیا ہندوستان دارالاسلام ہے یا دارالحرب، یا ان کے علاوہ کچھ اور؟۔

(۵) گاؤں میں جمعہ:

جمعہ کے جواز کی شرطوں میں سے ایک شرط مصر جامع ہے، اسی شرط کی وجہ سے گاؤں میں جمعہ کے عدم جواز کا فتوی ہے۔ مصر جامع کی جو تعریف فقہا نے لکھی ہے اس کے اعتبار سے ہندوستان کا کوئی شہر یا قصبہ مصر جامع کا مصداق نہیں بن سکتا (مصر جامع کی تعریف مضمون میں ملاحظہ فرمائیں) لیکن اس کے باوجود ہندوستان میں چھوٹے گاؤں اور چند دیہات کو چھوڑ ہر جگہ

جمعہ کے جواز کا فتوی ہے۔

زیر نظر مضمون میں متقدمین ومتأخرین فقہا کی تصریحات کی روشنی میں مصر جامع کی تعریف اوراس کے مصداق سے بحث کی گئی ہے، نیز ہندوستان میں اس شرط پر عمل ہے یا نہیں؟ اس کو دکھایا گیا ہے، اور معروضی انداز میں حضرت نانوتوی کے ایک مکتوب (جس سے اس سلسلے میں ان کے رجحان کا پتہ چلتا ہے) اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کی تصریحات سے گاؤں میں جمعہ کے جواز کو پیش کیا گیا ہے، اور اخیر میں گاؤں میں جمعہ کی ضرورت، فوائد اوراس کے مضمرات کو سامنے رکھ کر حضرات اہل فتاوی کو دعوت فکر دی گئی ہے۔

(۶) شرعی پنچایت یا قاضی:

عامۃ المسلمین یا ارباب حل وعقد کی متفقہ رائے سے تقرر قاضی کے جواز وعدم جواز کا مسئلہ کچھ سالوں قبل ارباب فتاوی اوراہل علم کے درمیان زیر بحث تھا۔ اسی تعلق سے مولانا عبدالحلیم صاحب گورینی نے اپنے پرچے ''ریاض الجنۃ'' میں ایک کالم اس موضوع کے لئے خاص کردیا تھا، جس میں مولانا کی جانب سے اس سلسلے میں کئے گئے سوال کا جواب شائع کیا جاتا تھا۔ سوال یہ تھا: ''کیا ہندوستان جیسے ملک میں فقہ حنفی میں عامۃ المسلمین کی طرف سے تقرر قاضی کا دعوی درست ہے؟''

یہ مضمون مولانا کے اسی استفتا کا جواب ہے، اس مضمون میں مدعیان جواز کے دلائل و استدلالات کی کمزوریوں کو واضح کیا گیا ہے۔

(۷) زکوٰۃ:

اس مقالہ میں شرائط زکوٰۃ اوراس کے ضمن میں متعدد جزئیات سے بحث کی گئی ہے، مثلاً ایسا مال تجارت جس کی رقم پیشگی ادا کردی گئی ہو تو زکوٰۃ کس پر واجب ہوگی؟ بائع پر یا مشتری پر؟ ڈپوزٹ کی رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ حلال وحرام مال مخلوط غیر ممتاز ہو تو زکوۃ دینے کی کیا صورت ہوگی؟ مشترک تجارت میں زکوۃ اجتماعی طور پر نکالنی ہوگی یا انفراداً؟ ہیرے جواہرات پر زکوۃ کس صورت میں ہوگی؟ اور کس صورت میں نہیں ہوگی؟ شیئرز کی زکوۃ اوران کی مالیت کا تعین کیسے ہوگا؟ وغیرہ وغیرہ، دور حاضر کے پیدا شدہ ان مسائل پر اصول شرع کی روشنی میں بحث کی گئی

ہے۔

(۸)فی سبیل اللہ:

قرآن کی رو سے مصارف زکوۃ آٹھ ہیں، ان میں سے ایک مصرف فی سبیل اللہ ہے۔ فی سبیل اللہ کا مصداق کیا؟ اور اس سے صرف مجاہد فی سبیل اللہ مراد ہیں یا ان کے علاوہ دیگر کار خیر میں مشغول افراد بھی مراد ہیں؟ اس سلسلہ میں احادیث اور دور صحابہ کا عرف کیا کہتا ہے؟ فقہا کی آرا اور اجماع امت سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ وغیرہ جیسے امور میں تحقیق پیش کی گئی ہے۔

(۹)مصرف زکوۃ۔ ایک اہم استفتا کا جواب:

ماہنامہ جامعۃ الرشاد ۱۹۹۲ء میں مولانا شہاب الدین ندوی صاحب نے مصرف زکوۃ بالخصوص فی سبیل اللہ کے مصداق کے سلسلے میں ایک لمبا چوڑا استفتا شائع کیا تھا، استفتا کیا تھا گویا ایک طرح کا فتویٰ تھا، جس میں یہ عندیہ پیش کیا گیا تھا کہ فی سبیل اللہ کے مصداق صرف مجاہد اور منقطع الحاج نہیں ہیں، بلکہ یہ عام ہے، اور تمام کار خیر اس میں شامل ہیں، حتی کہ وہ امور خیر بھی جن میں زکوۃ کی رقم کسی فرد خاص کی ملکیت میں نہیں جاتی، بلکہ کسی ادارہ یا تنظیم کے حوالے ہوتی ہے، وہ بھی اس میں شامل ہیں، جیسے دینی پروگرام اور وہ تنظیمیں جو امور خیر میں لگی ہوئی ہیں، ان کے پروگرام یا اشاعت کے لئے زکوۃ کی رقم دی جاسکتی ہے۔ گویا کہ انہوں نے ملکیت کی شرط کو کالعدم قرار دے دیا۔

یہ مضمون اسی استفتا کے تعاقب میں لکھا گیا ہے، مستفتی کی دی ہوئی دلیلوں کا محاکمہ اور ان کے اس نظریہ کی بدلائل تردید کی گئی ہے، اور ان کو اجماع امت سے عدول پر تنبیہ کی گئی ہے۔

(۱۰)مسئلہ رفع یدین:

رفع یدین کا مسئلہ کوئی جواز یا عدم جواز کا مسئلہ نہیں، اس میں صرف اولیٰ اور غیر اولیٰ کا اختلاف ہے، مگر غیر مقلدیت نے اس فرعی مسئلہ کو اصولی اور نماز کے لئے مدار صحت بنا کر رکھ دیا ہے۔ یہ مضمون ایک غیر مقلد ہی کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے معرض وجود میں آیا، اس میں احادیث و آثار، صحابہ وتابعین اور فقہاء امت کی آرا کی روشنی میں عدم رفع یدین کو ثابت کیا گیا ہے۔

جلد اول کا دوسرا جلی عنوان ’’تعارف کتب حدیث‘‘ ہے۔ اس کے تحت کل پانچ مضامین ہیں۔ یہ مضامین محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمان الاعظمی نور اللہ مرقدہ کی تحقیق و تحشیہ اور تعلیق سے مزین کتب احادیث کا تعارف ہیں۔

(۱) مسند حمیدی۔ حضرت محدث اعظمی کا ایک عظیم کارنامہ:

امام ابوبکر عبداللہ بن زبیر قرشی اسدی حمیدی مکی حدیث کے بلند پایہ اور عظیم المرتبت حفاظ میں سے ایک ہیں، سفیان بن عیینہ اور امام شافعی کے شاگرد ہیں، مسند حمیدی ان کی مشہور تصنیف ہے۔ یہ کتاب نایاب تھی، محدث کبیر کی علمی لگن اور حدیث کے ساتھ ان کے غیر معمولی شغف نے اس کے مخطوطات کو تلاش کیا اور حواشی وتعلیقات سے مزین کر کے شائع کیا۔

اس مضمون میں امام حمیدی کا تعارف، ان کے متعلق کبار علما کی رائے، مسند کے مخطوطات کی تعداد، محدث کبیر کے کام کی نوعیت، بصیرت کے لئے کچھ مثالیں اور ان پر رسالہ ’’محدث‘‘ بنارس کی جانب سے لگائی گئی تہمت بے جا اور اس کا جواب بہترین اسلوب اور دلچسپ پیرایہ میں دیا کیا گیا ہے۔

(۲) کتاب الزہد والرقائق۔ حضرت محدث اعظمی ایک عظیم خدمت حدیث:

امام الزہاد والمتقین حضرت عبداللہ بن مبارک کی بابرکت تصنیف ’’کتاب الزہد والرقائق‘‘ زہد وتقوی کے موضوع پر اپنے رنگ کی اہم کتاب ہے۔ اس کتاب کا قلمی نسخہ والی قطر سے محدث کبیر کو ہدیۃً ملا تھا، جس کی بنیاد پر آپ نے اس کتاب کی تحقیق وتحشیہ اور اشاعت کا ارادہ کیا۔

اس مضمون میں حضرت عبداللہ بن مبارک کا تفصیلی تعارف، قلمی نسخوں کی تعداد اور ان کا تعارف مع اسماء رواۃ کے، محدث کبیر کی تحقیق کا منہج اور اس کے مراحل مع مثال کے درج ہیں۔

(۳) المطالب العالیہ بزوائد المسانید الثمانیہ:

حافظ ابن حجر عسقلانی علیہ الرحمہ نے ’’المطالب العالیہ بزوائد المسانید الثمانیہ‘‘ کے نام سے مسند ابوداؤد طیالسی، مسند حمیدی، مسند ابن ابی عمرو، مسند مسدد، مسند احمد بن منیع، مسند ابی بکر ابن

ابی شیبہ، مسند عبد بن حمید اور مسند حارث بن اسامہ کے زوائد کو یعنی ان روایتوں کو جو صحاح اور مسند احمد بن حنبل میں نہیں ہیں، تتبع وتلاش کر کے جمع کیا، نیز ان کے ساتھ مسند ابویعلی کی ان روایتوں کو بھی شامل کرلیا جو ''مجمع الزوائد'' میں علامہ ہیثمی سے چھوٹ گئی تھیں، اور مسند اسحاق بن راہویہ کا ناتمام مجموعہ ان کے پاس تھا اس کے زوائد کو بھی شامل کرلیا۔ اس کتاب کی اہمیت کے پیش نظر محدث کبیر علیہ الرحمہ کو اس کے مخطوطہ کی تلاش بہت شدت سے تھی، ہندوستان وحجاز کے متعدد کتب خانوں میں بارہا تلاش کیا، بالآخر کامیابی مل ہی گئی۔

اس مضمون میں کتاب اور صاحب کتاب کا مفصل اور دلچسپ تعارف، محدث کبیر کی تلاش وجستجو کی داستان، قلمی نسخوں کا تعارف، محدث کبیر کی تحقیق وتعلیق کا نہج اور مثالیں پیش کی گئی ہیں۔

(۴) کشف الاستار عن زوائد البزّار:

امام ابوبکر احمد بن عمرو بن عبدالخالق البزار البصری کی کتاب ''مسند کبیر معلل''، جس کا نام ''البحر الذخار'' ہے، کے زوائد کو حافظ نورالدین ہیثمی نے ''کشف الاستار'' کے نام سے جمع کیا ہے۔ اس کتاب کا ایک عمدہ قلمی نسخہ محدث کبیر علیہ الرحمہ کو کہیں سے دستیاب ہوگیا، اس کو بنیاد بنا کر تحقیقات وتعلیقات کے بعد شائع کیا۔

اس مضمون میں امام بزار کا مختصر تعارف ابتدا میں ذکر کیا گیا ہے، اس کے بعد علامہ نورالدین ہیثمی قاہری کا مفصل ذکر خیر ہے، جس میں ان کے استاذ حافظ زین الدین عراقی سے ان کے تعلق خاطر کو خاص طور سے بیان کیا گیا ہے۔ مخطوطہ کا تعارف، تحقیق وتعلیق کا انداز اور اس کے نمونے، مخطوطہ میں کتابت کی غلطی اور اس کے علاوہ دیگر اغلاط اور محدث کبیر کے مواخذات کو بھی ذکر کیا گیا ہے۔

(۵) مؤطا امام محمد۔ تعارف واہمیت:

مؤطا امام محمد کی اہمیت وحیثیت اہل علم پر مخفی نہیں ہے۔ یہ کتاب درحقیقت امام مالک علیہ الرحمہ کی مرتب کردہ مؤطا ہے، جس کی روایت امام محمد نے کی ہے۔ یہ کتاب ہر زمانہ میں اہل علم کے مابین متداول رہی ہے، مگر قدیم طرز طباعت کے ساتھ۔ مولانا تقی الدین ندوی صاحب نے

موطا امام محمد مع ''التعلیق الممجد'' کو جدید طرز طباعت کے ساتھ شائع کیا، اور اس پر ایک مبسوط مقدمہ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ سے لکھوایا، یہ مضمون اسی مقدمہ کا ترجمہ قدرے تلخیص کے ساتھ ہے۔

اس مضمون میں موطا کا تعارف، اس کی اہمیت، اس کا زمانۂ تالیف، امام محمد کا تفقہ اور ان کی محدثانہ حیثیت، نیز امام محمد اور اصحاب رائے خصوصاً احناف کے سلسلے میں محض رائے کی وجہ سے محدثین کرام کی کرم فرمائیاں، بالفاظ دیگر محدثین کی زیادتی، اور اس کے اسباب وعلل اور اس کے نقصانات جیسی اہم چیزوں سے بصیرت افروز بحث کی گئی ہے۔

کتاب کا تیسرا جلی عنوان ''متعلقات حدیث'' ہے، اس کے تحت کل چار مضامین ہیں

(۱) استدراکات علمیہ:

مسند امام احمد بن حنبل کو شیخ احمد محمد شاکر محدث مصر نے جب اپنی تحقیق وتعلیق اور بیش قیمت حواشی سے مزین کر کے شائع کرنا شروع کیا تو کئی جلدوں کی اشاعت کے بعد انہوں نے خوب سے خوب تر کی جستجو میں پوری دنیا کے علما کو دعوت نقد دی۔ محدث کبیر علیہ الرحمہ کو جب یہ جلدیں ملیں تو انہوں نے نہایت عرق ریزی سے اس کا مطالعہ کیا اور استدراک لکھ کر شیخ کے پاس بھیجا، جس کو انہوں نے بہت پسند کیا، اور محدث اعظمی کے شکریے کے ساتھ کتاب کی پندرہویں جلد میں شائع کیا۔

اس مضمون میں انہیں استدراکات کو اردو کا جامہ پہنا کر درج کیا گیا ہے، ان استدراکات سے محدث کبیر کا علمی رسوخ اور تبحر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

(۲) ضعیف اور موضوع احادیث کے متعلق حضرات محدثین کی اصطلاحات:

احادیث کے مرتبہ ومقام کی وضاحت کے لئے محدثین کرام خاص خاص الفاظ استعمال کرتے ہیں، جس سے حدیث کی حیثیت واضح ہوتی ہے، جیسے لااعرفہ، لااصل لہ، لیس لہ اصل، موضوع وغیرہ وغیرہ۔ محدثین جب ان الفاظ کا استعمال کرتے ہیں تو ان کا لغوی معنی نہیں بلکہ اصطلاحی مفہوم جو ان کے عرف میں مشہور ہے، مراد ہوتا ہے۔ بسا اوقات ایک ہی لفظ کئی احادیث کے مرتبہ کو بیان کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں، مگر سب کی مراد حدیث کے موقع ومحل کے لحاظ

سے جدا ہوتی ہے، یہ ایک نازک اور دقیق علم ہے۔

یہ مضمون شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کی اس تحریر کی روشنی میں لکھا گیا ہے جو انہوں نے حضرت ملاعلی قاری علیہ الرحمہ کتاب ''المصنوع فی معرفۃ الحدیث الموضوع'' پر تعلیقات کے لئے بطور مقدمہ کے لکھی ہے۔ اس میں صرف ضعیف اور موضوع احادیث کے متعلق محدثین کی اصطلاحات سے بحث کی گئی ہے، کہ کس موقع اور کس مناسبت سے محدثین کے کون سے لفظ سے کیا مراد ہوتا ہے؟۔

(۳) کتابت حدیث کے اصول وقواعد

حدیث کی حفاظت وصیانت کے لئے محدثین نے جو اصول وقواعد وضع کئے ہیں اور ان کو بروئے کار لانے کا جو اہتمام کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے شاید ہی کوئی ذی ہوش حدیث کی حفاظت میں مین میخ نکالنے کی جسارت کرے۔ حدیث اور حدیث سے متعلق کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس کے قواعد وضوابط نہ ہوں، اور قواعد وضوابط بھی ایسے سخت مگر معقول ہیں کہ ردی چیزیں خود بخود اصل سے جدا ہو جائیں۔

اس مضمون میں کتابت حدیث کے سولہ قواعد بیان کئے گئے ہیں، جو کہ حافظ ابن صلاح کی کتاب ''مقدمہ ابن صلاح'' سے ماخوذ ہیں۔

(۴) محدث کبیر کی اسناد حدیث

محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمان الاعظمی نوراللہ مرقدہ کی اسناد حدیث اس مضمون میں ذکر کی گئی ہے، ابتداء مضمون میں اسناد کی ضرورت، اس کے مقام ومرتبہ، اس کی فضیلت اور اس کے فوائد کو بیان کیا گیا ہے، اس کے بعد محدث کبیر کی سند بخاری ان کے استاذ مولانا کریم بخش سنبھلی سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تک ذکر کی گئی ہے، اور تمام واسطوں کا کچھ کا اجمالی اور کچھ کا تفصیلی تعارف بھی مذکور ہے۔

یہ مضمون تین قسطوں میں ہے۔ پہلی قسط کا اوپر ذکر ہوا۔ دوسری قسط میں حضرت شاہ ولی اللہ کے استاذ شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم کردی مدنی سے لے کر شیخ محمد بن یوسف فربری امام بخاری

کے شاگرد تک ہے۔

یہ تو بخاری کی سند کا ذکر ہوا، اس کے علاوہ محدث کبیر علیہ الرحمہ کو اپنے استاذ مولانا عبدالغفار صاحب علیہ الرحمہ سے بھی کتب احادیث اور ادعیہ ماثورہ کی سند واجازت حاصل تھی، تیسری قسط میں اسی سند کا تذکرہ ہے۔ اس قسط میں صرف مولانا عبدالغفار صاحب اور ان کے شیخ فقیہ النفس حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کا تفصیلی ذکر خیر ہے۔

چھوتھا جلی عنوان ''متفرقات'' ہے۔ اس کے تحت کل چار مضامین ہیں۔

(۱) نقد بر حقیقت رجم:

زانی محصن کا رجم کچھ حدود قیود کے ساتھ شرع کا اجماعی مسئلہ ہے، متقدمین ومتأخرین میں سے کوئی قابل ذکر شخص رجم کا منکر نہیں ہے۔ کچھ سالوں پہلے جناب عنایت اللہ سبحانی صاحب سابق استاذ جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ نے ''حقیقت رجم'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں انہوں نے بزعم خود رجم کی تردید کی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ شرع میں زانی خواہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ، کے لئے رجم نامی سزا کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی اس بات کو ثابت کرنے کے لئے تحریف، تبدیل اور تفسیر بالرائے حتی کہ من چاہے ترجمہ سے بھی گریز نہیں کیا، اور ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا، ثابت تو کچھ نہیں ہوا مگر ہاں اتنا ضرور ہوا کہ ان کی کتاب لطیفے کی کتاب بن گئی۔

اس مضمون میں اسی کتاب کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس کی اعجوبہ کاریوں کو دکھلایا گیا ہے۔

(۲) امام محمد اور اہل الرائے ہونے کی حقیقت وحیثیت:

یہ مقالہ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کے ''**التعلیق الممجد علی المؤطا الامام محمد**'' کے جدید ایڈیشن پر لکھے گئے مقدمہ سے مستفاد ہے۔ اس مضمون میں محدثین کی جانب سے امام محمد پر اہل الرائے کے الزام کا جائزہ لیا گیا ہے، اور محدثین کی اس رائے پر نقد اور فقیہ کے لئے حدود شرعیہ کے اندر رہ کر رائے اور قیاس کی ناگریزیت کو بیان کیا گیا۔

(۳) البانی شذوذہ واخطاءہ:

شیخ ناصرالدین البانی دنیائے عرب کے مشہور عالم ہیں، حدیث کی متعدد کتابیں ان کی

تحقیق وتعلیق اور حواشی کے ساتھ شائع ہوئی ہیں۔ عالم عرب میں ان کے علمی رعب کا یہ عالم تھا کہ ایک زمانہ میں ان کا ہر فرمایا ہوا مستند سمجھا جاتا تھا، ان کی تحقیق میں کسی کو قیل وقال کی مجال نہیں ہوتی تھی، مگر تا کجے؟ تحقیق تو تحقیق ہے، کسی کی بھی تحقیق حرف آخر نہیں ہوسکتی، غلطی کا امکان بہر صورت رہتا ہے۔

محدث کبیر علیہ الرحمہ نے جب ان کی کتابوں کا مطالعہ کیا تو ان کی علمی غیرت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ وہ ان کی فاش غلطیوں پر پردہ ڈال کر علمی دنیا کو مغالطہ میں رکھیں۔ چنانچہ انہوں نے ’’الباني شذوذه واخطاء ہ‘‘ کے نام سے ایک رسالہ تصنیف کیا، جس میں البانی صاحب کی غلطیوں اور مغالطہ انگیزیوں کو ظاہر کیا۔

یہ رسالہ عربی میں ہے، زیر تعارف مضمون اسی کی قدرے تلخیص اور ترجمانی ہے۔ یہ مضمون خالص علمی ہے اور محدث کبیر کی علمی گہرائی و گیرائی کا آئینہ دار ہے۔

(۴) سنن مؤکدہ کی اہمیت

یہ مضمون محدث کبیر علیہ الرحمہ کے غیر مطبوعہ عربی رسالہ جو کہ سنت مؤکدہ کی اہمیت و فضیلت کے بیان پر مشتمل ہے، کی اردو ترجمانی ہے۔ عالم عرب کے کوئی عالم شیخ محمد نور مکی نے کسی رسالہ میں سنت مؤکدہ کے سلسلے میں زہر افشانی کی اور اس کے مرتبہ کو اس رسالہ میں گھٹا کر دکھانے کی کوشش کی۔ محدث کبیر نے اس رسالہ کو پڑھنے کے بعد اپنی انصاف پسند طبیعت کے تقاضے کے مطابق یہ رسالہ لکھا، جو سنن کے سلسلے میں چشم کشا اور بصیرت افروز ہے۔

کتاب کے اخیر میں ’’شیخو پور سے چھپرا تک‘‘ کے عنوان سے ایک مضمون ہے۔ یہ حضرت مولانا کی بالکل آخری تحریر ہے، وفات سے کچھ دنوں پہلے ’سراج الاسلام خصوصی اشاعت حضرت مولانا زین العابدین صاحب نور اللہ مرقدہ‘‘ کے لئے بطور اداریہ تحریر فرمایا تھا۔

علوم نکات جلد دوم:

جلد دوم کی ضخامت ۶۰۰ ؍صفحات پر محیط ہے، جس میں مقالات ومضامین اور مجلّہ ’المآثر‘ اور ماہنامہ ’ضیاء الاسلام‘ کے وہ اداریے جو کسی وجہ سے والد صاحب کی کسی کتاب میں نہیں آسکے، سفرنامے، تعارف وتبصرے اور مقدمات وتقریظات ہیں۔ اس جلد کے تمام مشمولات کا تعارف

کرانے کے لئے تو پورے ایک دفتر کی ضرورت پڑے گی، اس لئے اس جلد کے کلیدی مضامین کے تعارف پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

مقالات ومضامین کے تحت کل ۲۱/مقالات ہیں۔ پہلے اور دوسرے مقالے کا عنوان ''قاضی اطہر مبارک پوری۔ معاصر اہل علم کے خطوط کے آئینے میں''، اور ''دیار پورب میں علم اور علما، قاضی صاحب کی ایک قابل قدر تصنیف، تعارف اور قدرے تلخیص'' ہے۔ پہلے مقالے میں قاضی صاحب کے نام معاصر اہل علم کے خطوط درج کرکے ان کی علمی شخصیت کا جائزہ لیا گیا ہے، اور دوسرے مقالے میں قاضی صاحب کی قابل قدر تصنیف ''دیار پورب میں علم اور علما'' کا تعارف اور پوری کتاب کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔

مولانا زوّار حسین صاحب۔ بحیثیت مترجم:

پاکستان کے نامور شیخ، صاحب تصانیف بزرگ، عالم ربانی حضرت مولانا زوّار حسین صاحب، جنہوں نے حضرت مجدد الف ثانی اور ان کے عالی مرتبت فرزند حضرت خواجہ محمد معصوم کے مکتوبات کا ترجمہ کیا ہے۔ اس مقالے میں انہیں مکتوبات کے تراجم کا جائزہ اور بحیثیت مترجم مولانا زوار حسین صاحب کے فنی کمالات کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس مضمون کی خاص بات یہ ہے کہ شروع میں بطور تمہید کے ترجمہ کا فن، اس کی باریکیاں، اس میں ملحوظ رکھے جانے والے امور، جن سے ترجمہ میں چار چاند لگ جاتا ہے، مترجم کی ذمہ داری اور بہترین ترجمہ کی علامت کو قدرے تفصیل کے ساتھ ذکر ہے۔ جس سے خود صاحب مقالہ کی ترجمہ کے فن پر وسیع وعمیق نظر کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔

کیا رسول اللہ ﷺ کی تجہیز وتکفین میں حضرات شیخین شریک نہ تھے؟:

اس کا تعارف خود صاحب مقالہ کے قلم سے پڑھئے:

> ''بسا اوقات یہ سوال سننے میں آتا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا تو اہل بیت نبوت پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، اس وقت اہل تعلق کے ہوش وحواس بجا نہ تھے لیکن دوسری طرف دیکھئے تو حضرت ابوبکر وعمر اور دوسرے بہت سے صحابہ حکومت وامارت کی فکر میں سرگرداں تھے، اور اسی مشغولیت میں پڑ کر آپ ﷺ کی تجہیز وتکفین تک میں شریک نہ ہو سکے۔ یہ سوال تو ایک

ہے ، مگر اس کے نتیجے میں کئی اعتراضات پیدا ہوتے ہیں، اوّل یہ کہ ان حضرات کو حضور اقدس ﷺ کی وفات کا رنج نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ یہ حضرات خلافت و امارت کے آرزومند تھے۔ تیسرے یہ کہ اس اندیشہ سے کہ کہیں خلافت دوسروں کے ہاتھ میں نہ چلی جائے، ضروری ہنگامی تقاضوں کو نظر انداز کر کے خلافت طلبی میں منہمک ہوگئے۔ چوتھے یہ کہ اسی انہماک کے باعث تجہیز و تکفین میں شریک نہ ہوئے۔ زیر نظر مضمون میں ان اعتراضات کا تاریخ کی روشنی میں منصفانہ جائزہ لیا جائے گا۔''

قصہ حضرت موسی و خضر علیہما السلام۔ معارف و حقائق:

قرآن کریم میں سورہ کہف میں اللہ تعالی نے حضرت موسی علیہ السلام کے ایک سفر کی اجمالی قدرے تفصیل سے سرگزشت ذکر کی ہے۔ اور حدیث شریف میں اسی سفر کی جزئیات سمیت تفصیلات بیان کی گئی ہے۔ حدیث شریف کی تصریح کے مطابق اس سفر میں جن بزرگ سے حضرت موسی علیہ السلام کی ملاقات ہوئی تھی، وہ بزرگ حضرت خضر تھے۔ حضرت خصر کی شخصیت سے متعلق علمائے امت میں کئی طرح کے اختلافات پائے جاتے ہیں۔

اس مقالہ میں موسی علیہ السلام کے سفر کی سرگزشت حدیث شریف کی روشنی میں پیش کر کے حضرت خضر کی شخصیت اور ان کے تینوں کام جن پر موسی علیہ السلام نے تشریعی اعتبار سے اعتراض کیا تھا، ان کے حقائق و معارف کو شرح و تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ اس مضمون سے صاحب مضمون کی تفسیری بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ اس فن میں کہاں تک تھی؟۔

سبیل المومنین سے انحراف:

علم دین کسے کہتے ہیں؟ آیا علم دین صرف وہی علوم ہیں جن کو متقدمین و متأخرین علما علم دین قرار دیتے چلے آرہے ہیں؟ یعنی تفسیر، حدیث، فقہ وغیرہ، یا پھر اس میں وہ علوم بھی داخل ہیں جنہیں عام طور سے ''علم دنیا'' سے تعبیر کیا جاتا ہے؟ جیسے سائنس ڈاکٹری، لوہاری اور معماری وغیرہ بالفاظ دیگر علم ایک اکائی ہے یا علم دین و دنیا کی تقسیم کی جاسکتی ہے۔ یہ بڑا اہم سوال ہے، ہمارے دور کے بہت سے معتبر عالم، علم کے اکائی ہونے کے قائل ہیں، اور دوسرے نظریہ کے حاملین کی بھی اہل علم و نظر میں خاصی تعداد موجود ہے۔

اس مقالہ میں اسی سوال کا جواب قرآن وحدیث اور سلف صالحین کے اقوال کی روشنی میں دیا گیا ہے، اور بدلائل ثابت کیا گیا ہے کہ علم کو اکائی ماننا دور جدید کی اعجوبہ کاری ہے، معتبر علمائے سلف کے مطابق علم، علم دین اور علم دنیا میں منقسم ہے۔

یہ مقالہ اصلاً مولانا سید سلمان صاحب ندوی کی ایک تقریر کے رد میں لکھا گیا تھا، جس میں انہوں نے اپنی گل افشانی گفتار کے ذریعہ علم دین ودنیا کو باہم ضم کرنے کی کوشش کی تھی۔

تبلیغی جماعت کے طریقہ کار کی شرعی حیثیت:

تبلیغی جماعت ایک عالم گیر تحریک ہے، اس سے مسلمانوں کا کہنا چاہئے کہ سواد اعظم وابستہ ہے، اس جماعت کے مثبت ومنفی ہر طرح کے اثرات لوگوں کی زندگیوں پر پڑے ہیں۔ ابتدا میں بانی کے خلوص اور علما کی نگرانی کی وجہ سے اس جماعت کی بہترین کارکردگی سامنے آئی، لیکن چونکہ فطری طور پر یہ ایک تحریک تھی، اس لئے تحریکات کے مزاج کے مطابق مرور ایام کے ساتھ اس میں بھی خرابیاں اور کمزوریاں در آتی گئیں، اور پھر اس جماعت میں بلاتفریق ہر فرد کی شمولیت کی گنجائش ہے، اس لئے رفتہ رفتہ عوامی رسوخ بڑھتا گیا اور علما سے دوری ہوتی گئی، حتی کہ اس جماعت کی امارت بھی غیر علما کے ہاتھوں میں آ گئی۔ اس پس منظر میں جہاں عوام ہی عوام ہوں، اس کا حد اعتدال سے تجاوز کر جانا اور اس کے عنان توجہ کا اصل مقصد سے ہٹ کر غلو وانحراف کی طرف پھر جانا، کیا مستبعد ہے؟۔

اس مقالہ میں حضرت مولانا نے تبلیغی جماعت کے اسی انحراف کو اصول شرع اور علمائے دیوبند کے ارشادات کی روشنی میں واضح کیا ہے، اور اس جماعت کے فی زمانناٗ مائل بدعت ہونے کو بدلائل ثابت کیا ہے۔ یہ مقالہ خالص علمی وتحقیقی ہے جو غور فکر کی دعوت کے ساتھ ایک نئی فکری جہت سے روشناس کراتا ہے۔

اس کے علاوہ تبلیغی جماعت کی بے اعتدلیوں پر دو مضمون اور کتاب میں شامل ہیں۔ ایک ’’جماعت تبلیغ۔ مشورے اور گزارشیں‘‘ اور دوسرا ’’تبلیغی جماعت اور اس کے اجتماعات‘‘۔ ان میں تبلیغی جماعت اور جماعتی احباب کی بے راہ روی کو مشاہدہ کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے، اور ان کے لئے درست طریقہ کار اور معتدل راستے کی نشان دہی کی گئی ہے۔ یہ مضمون طبقہ عوام کے لئے

بھی مفیداور کارآمد ہے، ان کی درست فکراور درست سمت کی طرف راہنمائی کرے گا۔

اس کتاب میں کل چار سفرنامے شامل ہیں، جس میں دو تو محض نام کے سفرنامے ہیں، سفراور مشاہدات سفر سے متعلق اس میں کچھ بھی نہیں ہے، بلکہ دو اہم کتابوں کا تعارف ہے۔ ایک سفر کاندھلہ، اور دوسرا تحفۂ مدینہ۔ ’’سفر بنگلہ دیش‘‘ میں سفرنامے کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ اس میں بنگلہ دیش کے عالمی اجتماع اور وہاں کے مدارس کے متعلق مشاہدات وتأثرات ہیں۔

تحفہ بہار کے عنوان سے صوبہ بہار کے ایک علمی، تبلیغی واصلاحی سفر کی روداد ہے، جو آج سے ۲۵/سال قبل حضرت ماسٹر قاسم صاحب مدظلہ العالی کی دعوت پر کیا گیا تھا۔ اسی سفر میں ’’حیات سراج الامت‘‘ بھی حضرت مولانا نے ترتیب دی تھی۔ اس سفرنامہ میں آج سے پچیس سال قبل اہل بہار کی معاشرت، ان کی طرز زندگی، ان کی دینداری، علما وصلحا کی قدر شناسی اور ان کے قصبات ومکانات اور سڑکوں کی خستہ حالی کے دلچسپ مناظر دیکھنے کو ملیں گے۔ غرض اس سفرنامہ میں ہر وہ چیز ملے گی جو کسی بھی سفرنامے کو دلچسپ بنانے کے لئے ناگزیر ہوتی ہے۔

کتاب کا ایک بڑا حصہ یعنی صفحہ ۳۹۵ سے لے کر ۵۹۹ تک کتاب کے تعارف وتبصرے اور مقدمات وتقریظات پر مشتمل ہے۔ تعارف وتبصرے میں ۲۱/کتابوں کا تعارف درج ہے، جن میں سے بعض مفصل اور بیشتر تعارف برائے تعارف۔ جیسے مولانا ابوبکر صاحب غازی پوری کی کتاب ’وقفۃ مع اللامذہبیہ‘ اور حجۃ اللہ البالغہ کی شرح ’رحمۃ اللہ الواسعہ‘ کا تعارف خاصا طویل ہے۔ اور بعض کتابوں پر اگر عوامی زبان میں کہا جائے تو کس کر تبصرہ ہے۔ جیسے مولانا بدرالدین الحافظ کی کتاب ’’صدیق اکبر۔ ایک انسان کامل‘‘ مولانا عبدالرشید صاحب کی تحقیق سے شائع شدہ حضرت نانوتوی کی کتاب ’’تقریر دل پذیر‘‘ اور پروفیسر غلام احمد حریری کی کتاب ’’ائمہ عظام کی جانب منسوب غلط فہمیوں کا ازالہ‘‘۔ یہ کتاب علامہ ابن تیمیہ کے وقیع رسالے ’’رفع الملام عن الائمۃ الاعلام‘‘ کا ترجمہ ہے۔ ان کتابوں پر تبصرے خاصے کی چیز ہیں، اور تبصرہ نگار کی دقت نظر اور عربی واردو زبان کے ذوق صحیح کا منہ بولتا ثبوت ہے، اور ان کی قوت گرفت کا آئینہ دار ہے۔

مقدمات وتقریظات کے تحت مختلف موضوعات پر چودہ کتابوں پر حضرت مولانا کے قلم سے نکلے ہوئے مقدمات وتقریظات ہیں۔ جن میں مولانا نورالحسن راشد صاحب کی کتاب

''باقیات فتاوی رشیدیہ'' کے لئے مولانا کے قلم سے نکلا ہوا مقالہ بعنوان ''حضرت گنگوہی۔ بحیثیت فقیہ ومجدد'' مولانا طاہر گیاوی صاحب کی کتاب "**احسن التنقیح لرکعات التراویح**'' پر بعنوان غیر مقلدیت۔ جماعت یا فرقہ؟'' عہد نبوی کے غزوات وسرایا اور شہدائے اسلام'' کا مقدمہ بعنوان'' جہاد اور شہادت'' امہات المومنین کا مقدمہ بعنوان ''سیرت نبوی کی جامعیت کا ایک درخشاں پہلو'' اور'' اندلس میں اسلام'' کا مقدمہ بعنوان'' اندلس اور ہندوستان'' خاص طور سے قابل ذکر اور لائق مطالعہ ہیں۔

حضرت مولانا کی علمی وفنی متنوع خدمات اور فکری جہات کو جاننے اور سمجھنے کے لئے ''علوم ونکات'' کی یہ دونوں جلدیں ناگزیر ہیں۔ اس میں ہر طرح کے ذوق کے لوگوں کے لئے دلچسپی، دلبستگی اور تسکین کا سامان موجود ہے۔ یہ کتاب کیا ہے، بس سمجھ لیجئے کہ اعلیٰ قسم کے تحقیقی و تنقیدی مقالات، بہترین تعارف اور دلچسپ تبصرے اور معیاری تراجم کی کشکول ہے۔

❑❑❑

ان سب کے بعد میں اپنی اس آخری بات پر آتا ہوں جس کو میں نے بار بار بیان کیا ہے، مگر مجھے معلوم ہوتا ہے کہ بالکل نہیں کیا ہے، وہ یہ کہ یہ سارے علوم مقصود بذاتہا نہیں ہیں کہ ساری عمر انھیں کے پڑھنے پڑھانے میں صرف کردی جائے، بلکہ یہ وسائل ہیں، اصل مقصد شریعت مطہرہ پر صحیح ڈھنگ سے عمل اور اپنے مولیٰ کو راضی کرنا ہے، یہ سارا کاروبار کتابوں کا، مدرسوں کا، اساتذہ وطلباء کا، اسی لئے پھیلایا گیا ہے کہ اسلام پر صحت کے ساتھ عمل کرنے والے پیدا ہوتے رہیں، اگر یہ نہیں ہوا تو کچھ بھی نہ ہوا، اخلاق درست ہوں، عبادات درست ہوں، معاملات ٹھیک ہوں، جب خدا کی رضامندی حاصل ہوگی، اور اس کے حصول کا زمانہ پڑھنے کے بعد نہیں آئے گا، یہی وقت ہے جس میں اپنے احوال ٹھیک کئے جاسکتے ہیں، آج جس چیز کو لوگ علم کہتے ہیں، درحقیقت وہ علم ہے ہی نہیں، سراسر جہل ہے، علم نام ہے اس نور کا جو اللہ رب العزت اسلام پر پختگی اور اخلاص کے ساتھ عمل کرنے سے مومن کے قلب میں پیدا کر دیتا ہے، جو کتابوں سے حاصل کیا جاتا ہے، یہ معلومات ہیں علم کا نور ان سب کے بعد سچے عمل سے حاصل ہوتا ہے۔ (حدیث دوستاں)

نگارشات اعجاز:

میرے استاذ، میرے محسن
حضرت مولانا محمد افضال الحق صاحب قاسمی نور اللہ مرقدہ

حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب نور اللہ مرقدہ

وہ عرصہ سے بیمار تھے، بہت دنوں سے صاحب فراش تھے، مدرسہ سے اٹھ کر گھر آ گئے تھے۔ نہیں وہ بیمار نہ تھے لمبی عمر کا ضعف تھا، نسیان کا غلبہ تھا، از خود اٹھنے بیٹھنے سے معذوری تھی۔ تکلم بہت کم ہو گیا تھا، پوچھئے کہ کوئی تکلیف ہے؟ تو فرماتے نہیں، خیریت سے ہیں؟ جی ہاں، بھوک لگتی ہے کھانا کھا لیتے ہیں؟ جی ہاں، جان پہچان کم ہو گئی تھی، ذہن اور دماغ کسی خاص رخ پر لگ گیا تھا، روح عالم دنیا سے کسی اور عالم کی طرف متوجہ ہو گئی تھی، قریبی لوگ بھی حاضر ہوتے تو ایسا لگتا کہ اجنبی ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ دیکھتے ہی پہچان لیتے، اللہ ہی جانتا ہے کہ کس دنیا میں ہیں، دنیا کی کسی چیز پر دھیان نہ تھا، دھیان دلا یا جاتا تو کچھ ”ہاں نہیں“ کہہ لیتے۔ وہ میرے استاذ تھے، میرے محسن تھے، مجھ پر انھوں نے اس وقت دست شفقت رکھا تھا جب کہ میں ہر طرف سے دھتکارا گیا تھا۔ انھوں نے بغیر کسی علت کے مجھ پر مہربانی فرمائی اور میں ان کی محبت و شفقت میں جذب ہو کر رہ گیا۔ میں نے اپنا دستور بنایا تھا کہ ہر ماہ ایک بار خدمت میں حاضر ہوں گا اور پہونچتا تھا، کبھی بیماری کی وجہ سے، یا طویل سفر کی وجہ سے ناغہ بھی ہو جاتا، مگر جب پہونچتا کھل اٹھتے، خوش ہوتے، باتیں نہیں کرتے، میں کچھ کہتا تو ہاں یا نہیں کہتے یا مسکراتے، میں کچھ دیر بیٹھ کر رخصت چاہتا تو فرماتے بیٹھو، پھر میں بیٹھ جاتا، دیر تک بیٹھا رہتا، کچھ نہ فرماتے مگر چہرہ دمکتا رہتا۔

ایک مرتبہ حاضر ہوا تو اس وقت نسیان کا بڑا غلبہ تھا، صاحبزادۂ محترم ڈاکٹر محمد رشاد

صاحب نے تعارف کرایا کہ فلاں آئے ہیں، مسکرا کر فرمایا ''میں انھیں تم سے زیادہ پہچانتا ہوں۔''

اللہ ہی جانے کیا کیفیت تھی، کبھی کوئی اظہار تکلیف نہیں، کبھی کوئی شکایت نہیں، ایک سکینت جیسی سکینت، ایک اطمینان جیسا اطمینان!

میں ان کے پاس بیٹھا چائے پیتا ہوتا، انھیں کھانے پینے کی کوئی چیز پیش کرتا تو خوشی سے قبول کرتے ایک آدھ گھونٹ چائے بھی پی لیتے پھر بس! کھانے کی چیز منھ میں رکھ لیتے مگر وہ حلق سے نیچے نہ اترتی، دیر تک منھ میں لئے رہتے۔

مجھے سفر کرنا ہوتا تو جا کر انھیں دیکھ آتا، سفر سے واپس آتا تو پھر جا کر دیکھتا، برسوں یہی معاملہ چلتا رہا۔ حج میں جانا ہے، حاضر ہوتا، بتاتا، خوش ہوتے، کچھ نہ بولتے، دعا کے لئے کہتا تو دعا کرتے۔ عمرہ میں جانا ہے، جاتا، عرض کرتا، خوب مسکراتے۔ بیمار ہوتا، حاضری میں دیر ہوتی، پہونچتا، اپنی بیماری بتاتا، افسوس کے آثار چہرے پر ظاہر ہوتے۔

انھوں نے اپنے شاگرد سے بہت محبت کی، اپنے بیٹوں کی طرح مانا، بیماری کے آغاز میں دو پوتوں کا نکاح تھا، میرے پاس حکم بھیجا کہ تم آؤ اور نکاح تمھیں پڑھاؤ۔ میں نے پوچھا کہ برات جائے گی؟ اور کہاں جائے گی؟ کہلوایا کہ برات نہیں جائے گی دونوں جگہ سے لڑکی والے آئیں گے اور گھر پر نکاح ہوگا۔ میں گھر پر حاضر ہوا، معذوری شروع ہو چکی تھی، خود سے چل نہیں سکتے تھے سہارا دے کر لوگ مجلس نکاح میں لائے۔ اس دن بہت صاف ستھرا روشن کپڑا پہنے ہوئے تھے، چہرہ دمک رہا تھا۔ میں ان سے بہت ڈرتا تھا، میرے دل پر ان کا رعب بہت تھا، میں سوچنے لگا ان کی موجودگی میں خطبہ نکاح کیوں کر پڑھوں گا؟ ایجاب کے الفاظ کس طرح ادا کروں گا؟ حکم ہوا نکاح پڑھاؤ، میں نے بیٹھ کر خطبہ پڑھنا چاہا، آہستہ سے فرمایا کھڑے ہو کر پڑھو۔ میں نے کھڑے ہو کر خطبہ پڑھا اور بیٹھ کر ایجاب وقبول کرایا۔ مولانا نے دعا کرائی، صاحبزادۂ محترم ڈاکٹر محمد رشاد صاحب سے گراں قدر ہدیہ دلوایا۔

میں بھی کئی سال سے گردہ کی بیماری میں گرفتار ہوں، کھانا پینا عرصہ سے بند ہے، ہر وقت متلی کا زور رہتا ہے، ضعف بڑھتا جا رہا ہے۔ اس کے علاج کے لئے بمبئی کا پروگرام بنا، ۱۴؍نومبر ۲۰۱۲ء کا ٹکٹ ہے، باوجود کمزوری اور بیماری کے میں سفر سے دو تین روز پہلے خدمت میں حاضر ہوا،

منھ پر کپڑا اڈالے دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑے تھے۔ میں قریب گیا، سلام کیا، سماعت جواب دے چکی تھی، صاحبزادۂ گرامی محمد عارف نے ذرا بلند آواز سے پکار کر میرا نام لیا، اندر ہی اندر حرکت شروع ہوئی، میں نے دیکھا کہ داہنا ہاتھ نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں، بڑی مشکل سے ہاتھ نکال پائے۔ میں نے مصافحہ کیا، آنکھیں کھولیں ایک نگاہ کی، پھر آنکھیں بند ہوگئیں، میں کچھ دیر ہاتھ تھامے بیٹھا رہا اور وہ بھی اسی حالت میں پرسکون رہے، کوئی بات نہ ہوسکی۔ میں دھڑکتے دل سے زیارت کرتا رہا، ان کا چہرہ سفید ہو رہا تھا، کچھ دیر کے بعد میں نے رخصتی مصافحہ کیا اور ان کے پاس سے اٹھ آیا۔ دل میں خطرے کی گھنٹی بج چکی تھی، میں لمبے سفر پر جا رہا ہوں اور علاج طویل المیعاد ہے، اللہ جانے اب زیارت ہو یا نہ ہو۔

دل پر بوجھ لئے وہاں سے واپس آیا صاحبزادوں میں ڈاکٹر محمد رشاد، مولانا محمد راشد اور محمد عارف خدمت میں موجود تھے۔ میں ۱۴/نومبر کو ممبئی آ گیا، یہاں میرے مرض نے شدت اختیار کی، بالکل ہی صاحب فراش ہوگیا لیکن دل مولانا کی طرف لگا ہوا تھا، جب کوئی فون اپنے علاقہ سے آتا تو دل دھڑک اٹھتا۔ ۳۰/نومبر کو صاحبزادۂ محترم جناب مولانا محمد راشد صاحب کا فون آیا، کہا، ابا رخصت ہوگئے۔ ایسا محسوس ہوا کہ دل سینے سے باہر آ گیا ہو، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ وہ ایمان کی قوت تھی کہ زبان پر تلقین ربانی انا للہ وانا الیہ راجعون کا وظیفہ جاری تھا۔ میں تڑپ رہا تھا، بہت دور ہوں، بہت بیمار ہوں، بظاہر حاضری کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اس کے غم کے ساتھ کئی غم یاد آنے لگے، پانچ چھ سال پہلے میرے والد صاحب کا انتقال ہوا تھا تو میں دہلی میں تھا اور اسی روز عمرہ میں جانے لئے روانگی تھی، بہت بے قرار ہوا لیکن تسلی تھی کہ ایک مبارک اور مقدس جگہ جا رہا ہوں، دعائے مغفرت اور ایصال ثواب کا اچھا موقع ملے گا۔ ابھی چند دن پہلے ۲۶/نومبر کو میرے محبوب دوست مولانا محمد فاروق صاحب کا حیدرآباد میں انتقال ہوا، تو اس وقت بھی محروم رہا۔

ان غموں نے اور بھی دل کو نڈھال کر دیا، پھر اللہ کی مہربانی سے صبر کی کیفیت حاصل ہوئی تو میں نے اپنے بیٹوں کو فون کرنا شروع کیا کہ وہ جنازہ میں ضرور حاضر ہوں۔ میرے نہ ہونے کی تلافی میری اولاد سے ہو۔ مولانا میرے بیٹوں کو بھی بہت چاہتے تھے، بیماری کے دوران میرے

بیٹے بھی حاضری دیا کرتے تھے، جمعہ کا دن تھا میرے پانچ بیٹے حاضر جنازہ ہوئے، میرے تعلق والے، تلامذہ، دوست، احباب بکثرت اس سعادت میں شریک ہوئے۔

مولانا محمد راشد صاحب نے جنازہ کی نماز پڑھائی، میں سوچتا رہا کہ میں ہوتا تو میں یہ شرف حاصل کرتا، کیوں کہ مولانا کو جہاں اختیار ہوتا، میں موجود ہوتا تو امامت کے لئے مجھے ہی آگے بڑھاتے۔ سفر میں حضر میں ہمیشہ کا معمول تھا کہ نماز کی امامت کا شرف اسی شاگرد کو بخشتے۔ مولانا کے صاحبزادگان نے بھی ہمیشہ مجھے اپنا بڑا بھائی ہی سمجھا، باپ، بیٹوں نے میرے ساتھ ایسی محبت کی ہے کہ میں اس کے بیان سے قاصر ہوں۔ یہ حروف لکھتے وقت میری آنکھیں بھیگ رہی ہیں۔

نماز جمعہ کے بعد ہزاروں کے مجمع نے نماز جنازہ ادا کی، اور دادا محترم، صاحب نسبت بزرگ، حضرت مولانا شاہ فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادی کے مرید، حضرت حاجی عبدالرحیم صاحب فضلی قدس سرہ کے پہلو میں اس گنجینۂ خوبی کو لوگوں نے دفن کر دیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

السلام علیکم یا اهل القبور یغفر الله لنا ولکم انتم سلفنا ونحن بالاثر وانا ان شاء الله بکم لاحقون

مولانا اب دنیا میں نہیں رہے، معلوم تھا کہ نہ رہیں گے مگر اس کا خیال کم ہی آتا تھا، جب کوئی مشکل پیش آتی تو ذہن میں رہتا کہ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوں گا، ان کی ایک نگاہ لطف دل کو تسلی دے گی اور ان کا ناخن گرہ کشا عقدہ کو کھول دے گا۔ میں انھیں فون نہیں کرتا تھا، مجھے ہمت نہیں ہوتی تھی، ہاں حاضری کا بہت اشتیاق رہتا تھا۔ معمولی معمولی بہانوں سے خدمت میں حاضر ہوتا، گفتگو میں خاصی بے تکلفی ہوتی، ہمیشہ دلداری کرتے، دلنوازی کرتے، آج سوچ رہا ہوں کہ محبت کا یہ تخم کب سرزمین وجود میں بویا گیا تو ایک دھندلا سا نقش ۱۹۶۷ء کا یاد آتا ہے۔ ہم لوگ جامعہ عربیہ احیاء العلوم میں اپنے محبوب استاذ حضرت مولانا عبدالمنان صاحب کی خدمت میں ”نورالانوار“ پڑھ رہے تھے کہ دروازہ کے باہر دیکھا کہ ایک دراز قد، بھاری بدن کے عالم شیروانی پہنے ہوئے، بالکل سیدھے قامت کے، چہرہ نہایت بارعب، آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی ہوئی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے دارالاہتمام کی طرف سے آرہے ہیں۔ ہم لوگوں کی نگاہیں

ان کی وجاہت سے بھر گئیں، مولانا بے اختیار اٹھے یہ کہتے ہوئے کہ میرے استاذ مولانا افضال الحق صاحب ہیں! ہم بھی ہڑ بڑا کر اٹھے، سلام کیا، مصافحہ کیا۔ بدن جتنا بھاری تھا آواز اتنی ہی باریک تھی، وہ مصافحہ کر کے آگے بڑھ گئے، مولانا سے کیا کہا آج کچھ یاد نہیں، ہم لوگ بھی سبق پڑھنے میں لگ گئے۔ ان کی اہمیت وعظمت کے لئے یہی بات کافی تھی کہ ہمارے مولانا کے استاذ ہیں۔ یہ پہلی جھلک ہے جو میں نے دیکھی تھی۔

ایک سال ہم طالب علموں نے اپنی حیثیت وحوصلہ سے بڑھ کر ایک منصوبہ بنایا، وہ یہ کہ طلبہ کی انجمن جمعیۃ الطلبہ کے سالانہ جلسے کی صدارت کے لئے اس وقت کے عظیم شیخ الحدیث جو مرتبہ کی بلندی کے ساتھ عمر کے آخری مرحلہ سے گزر رہے تھے، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب کے شاگردوں میں اس وقت آخری فرد تھے، یعنی دار العلوم کے جلیل القدر شیخ الحدیث حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب علیہ الرحمہ کو دعوت دی گئی۔ ہم لوگوں کی نہ ہمت تھی نہ حوصلہ! یہ تو حضرت الاستاذ مولانا محمد مسلم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کرم فرمائی تھی، پھر انھیں کی کوشش تھی کہ حضرت نے دعوت منظور فرمالی۔ حضرت شیخ الحدیث کی تشریف آوری کا جیسے ہی اعلان ہوا، جامعہ عربیہ احیاء العلوم کا احاطہ وصحن علماء ومشائخ سے بھر گیا، ایک نورانی جلسہ ہوا، اتنا عظیم مجمع ہوا، عقیدت کی اتنی کہکشائیں زمین پر آگئی تھیں کہ پورا ماحول نہیں، پورا علاقہ نور کے جمال سے جگمگا گیا۔ اس نورانی کہکشاں میں پھر وہ علم وفضل کا تابندہ ستارہ نظر آیا جس کی زیارت پچھلے سال ہوئی تھی، حضرت مولانا افضال الحق صاحب کو اب کی اسٹیج پر دیکھا، وہ شیخ الحدیث علیہ الرحمہ کے بارے میں تعارفی کلمات ارشاد فرما رہے تھے، آواز باریک، لہجہ ناصاف، لیکن تعارف بہت مرتب اور سلجھا ہوا، کسی نے اعتراض کیا مگر ہم لوگوں کا سر عظمت سے جھکا رہا۔

معلوم ہوا کہ مولانا گونڈہ میں پڑھاتے ہیں، اس کے علاوہ اور کچھ جاننا یاد نہیں۔ ہم لوگ اسی سال عید کے بعد دارالعلوم دیوبند چلے گئے، وہاں چھ ماہ خیریت سے گزرے، چھ ماہ کے بعد ایک طوفان بلاخیز آیا جس نے ماحول کو الٹ پلٹ دیا۔ اس طوفان میں طلبہ کی ایک خاصی جماعت تلپٹ ہوگئی، دار العلوم سے اخراج ہوا، اور ہندستان کے ہر مدرسہ کا دروازہ ان پر بند کر دیا گیا۔ آندھی کے کوے کی طرح وہ پورے ملک میں چکراتے پھرتے تھے اور نگاہ رحم کو تلاش کرتے

مگر ہر طرف نظر گرم سے سابقہ پڑتا تھا۔ ان کی ہمدردی میں کہیں سے کوئی آواز نہ آتی تھی، ہر شخص غصے میں تھا، ہر طرف ملامت کے تیر چل رہے تھے۔ اخبارات طلبہ کے حق میں طنز وطعن کے تیروں سے بھرے آتے تھے، خود جہاں کہیں ان لوگوں کا گزر ہوتا گرم گرم نگاہوں کی حرارت سے سر چکرا جاتا۔ لوگ اس نظر سے دیکھتے جیسے یہ لوگ خونی، دہشت گرد، قزاق اور رہزن ہوں۔ واقعی غلطی تو ہوئی تھی اور بڑی غلطی ہوئی تھی، یہ لوگ مدرسوں کے مصلح نہ تھے، طالب علم تھے اور طالب علم کو علم کی طلب سے کام رکھنا چاہئے، انتظام کی گتھیوں میں خود کو نہیں پھنسانا چاہئے مگر مدرسہ والوں کو اتنا غصہ تھا کہ وہ اعتراف جرم کو بھی سننے کے لئے تیار نہ تھے۔ اپنی غلطی ماننے کے اندر بھی انھیں سازش کی بو آتی تھی۔ اس وقت طلبہ کی ہمدردی میں کہیں سے کوئی آواز آئی تو وہ مولانا افضال الحق صاحب کی تھی، کسی اخبار میں ان کا مضمون آیا کہ یہ بچے ہیں، ان سے غلطی ہوسکتی ہے مگر ان پر تعلیم کا دروازہ بند نہیں کرنا چاہئے، اپنے انتظام کی خامیوں اور کمیوں کا جائزہ لینا چاہئے۔ اسی طرح کا مضمون تھا جو چار دہائیاں گزرنے کے بعد پورا کیوں کر یاد رہے گا۔

دارالعلوم کے اس طوفان بلاخیز کے بعد چھ ماہ تک یہ طلبہ کٹی پتنگ کی طرح چکراتے پھرے، پھر جب رمضان کا مہینہ گزر گیا تو چند طلبہ نے بڑی امیدوں، بڑی توقعات کے ساتھ وقت کے شیخ الحدیث حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب علیہ الرحمہ کے آستانہ مبارک کا رخ کیا، حضرت بہت اخلاق سے ملے، بہت دلجوئی فرمائی، بزرگانہ شان کرم سے ان میں سے زیادہ تر طلبہ کی جامع مسجد امروہہ میں سفارش کردی جس کے وہ سرپرست تھے، اس میں ان کا داخلہ ہوگیا، مگر ان سطور کا لکھنے والا اس سفارش سے محروم رہا۔ میرے ساتھیوں نے دس پندرہ دن جامع مسجد امروہہ میں وقت گزارا، وہاں کے مہتمم صاحب سے مجھ غریب کا تذکرہ کیا، انھوں نے ازراہ تلطف میرے ساتھیوں کو اجازت دی کہ اسے بھی بلوالو، اس کا بھی داخلہ ہم کرلیں گے۔ میرے دوستوں میں مولانا طاہر حسین گیاوی خوش ہوکر تشریف لائے اور مجھے لے کر چلے۔ میں نے دریافت کیا کہ امروہہ میں یہی ایک مدرسہ ہے جہاں دورے تک تعلیم ہوتی ہے یا اور کوئی مدرسہ ہے؟ انھوں نے بتایا کہ محلّہ چلہ میں بھی ایک مدرسہ ہے جس کے شیخ الحدیث وہ مولانا ہیں جنھوں نے اخبارات میں ہم لوگوں کے حق میں کلمہ خیر کہا تھا۔ میں نے بے ساختہ کہا مجھے اسی مدرسہ میں

پہونچادو۔ مولانا کی عظمت پہلے سے دل و دماغ میں جاگزیں تھی، میں نے اصرار کیا کہ مجھے انھیں کی خدمت میں لے چلو۔ مولانا طاہر حسین صاحب نے مجھے ایک مسجد میں لے جاکر رکشہ سے اتارا، ایک متوسط درجہ کی پرانی مسجد! اس کے شمال و جنوب اور مشرق میں مدرسہ سائز کے چند حجرے! کہنے لگے یہی مدرسہ چلہ ہے، جنوب میں تین کمرے تھے، درمیانی کمرے میں مولانا نظر آئے۔ میں نے اندر جاکر ملاقات کی، مولانا بہت اخلاق سے ملے، مولانا طاہر حسین صاحب نے تعارف کرایا، داخلہ کی درخواست کی۔ مولانا نے بہت خندہ پیشانی اور بشاشت سے باتیں سنیں اور زبانی طور سے درخواست قبول فرمالی، کاغذی کاروائی سے پہلے کھانا منگوایا، صاحبزادۂ محترم حافظ محمد ارشد صاحب کو حکم دیا کہ کھانا کھلاؤ، ظہر کی نماز کے بعد میں پہونچا تھا، عصر کے پہلے تک ساری کاروائی ہوگئی اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

چھوٹا سا مدرسہ، چھوٹا سا ماحول، دورہ حدیث میں دو ساتھی پہلے سے تھے تیسرا میں ہوا، مگر استاذ بہت بڑے، بہت ذہین، بڑی اونچی طبیعت کے، بہت وسیع الظرف تھے۔ دو ایک روز کے بعد اسباق شروع ہوئے، مولانا کی خدمت میں بخاری شریف اور ترمذی شریف کے درس تھے مولانا کی آواز مہین تھی اور لہجہ خوب واضح نہ تھا، اس لئے ابتداء میں بات سمجھنے میں دشواری ہوئی، اکثر جملے پورے الفاظ کے ساتھ ادا نہ ہوتے، ناتمام حروف، نامانوس لہجہ، بہت غور سے سننے کے بعد بھی کچھ مطالب رہ جاتے، مگر چند ہی دنوں کے بعد ذہن نے ان کے انداز گفتگو کو اخذ کرلیا، الفاظ گرفت میں آنے لگے جو حروف ناتمام رہ جاتے، ذہن ان کی تکمیل کرلیتا۔ پھر ان کی تقریر، درس میں خصوصاً ترمذی میں اتنی مرصع، اتنی مرتب، اتنی مدلل معلوم ہوئی کہ طبیعت عش عش کرنے لگی جس حدیث پر کلام کرتے اس کے مالہ ماعلیہ پر اس قدر ترتیب، اور اتنی تفصیل سے کلام کرتے کہ ہر سوال کا جواب ہو جاتا اور نئے نئے فوائد حاصل ہوتے۔ ہر سبق میں ایسا محسوس ہوتا کہ علم و فن کے تازہ تازہ پھول دامن مراد میں آرہے ہیں۔ ہر سبق کے بعد طبیعت کو ایک خوشگوار آسودگی حاصل ہوتی۔ مطالعہ میرا بھی خاصا وسیع تھا، کتابوں کا مجھ کو جنون تھا لیکن ذہانت کی وجہ سے جو نئے نکتے یا دلائل کی نئی ترتیب مولانا کے ذریعہ ملتی، وہ علم کے نادر ابواب تھے۔ مولانا نے جو محبت کی، اخلاق کی جو بلندی ان کے یہاں ملی، طلبہ کے حق میں جو شفقت و ہمدردی ان کے پاس پائی، طلبہ

کی معذرت کے قبول کرنے میں ان کے اندر جو وسعت ملی، غلطیوں کو نظر انداز کرنے کا جو حوصلہ ان کی خدمت میں پایا، طلبہ کی خوبیوں پر انداز شاباس و آفریں جوان کے یہاں دیکھا، وہ میرے لئے نادر تو تھا ہی لیکن صرف اتنا ہی نہ تھا، علم کی گیرائی و گہرائی، ذہانت کی قوی گرفت، دلائل کی قوت اور طلبہ کو مطمئن کرنے کا وہ سلیقہ بھی ملا کہ طبیعت کو کہیں سے بے اطمینانی اور کمی کا احساس نہیں ہوا۔ ترمذی شریف کا درس بہت مفصل ہوتا، بخاری شریف کا درس اس کی بہ نسبت قدرے اختصار سے ہوتا مگر تشنگی باقی نہ رہتی تھی۔ میرا جی خوب لگا، بہت پابندی اور بہت ذوق وشوق سے درس میں حاضر ہوتا، عبارت میں ہی پڑھتا۔ دارالعلوم کے حادثہ کی وجہ سے طبیعت پڑھنے سے اچاٹ ہو چکی تھی مگر مولانا کے درس میں طبیعت کا رخ پھر مڑ گیا اور تعلیم و مطالعہ میں خوب جماؤ حاصل ہوا۔

مولانا بہت محنت سے مطالعہ کرتے، رات گئے تک مطالعہ میں مشغول رہتے، دیر تک کچھ لکھتے رہتے، سبق بڑی محبت سے پڑھاتے۔ میں تو خطا کار تھا، فرد جرم پختہ تھا مگر مولانا کے وسعت ظرف کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے کبھی کسی موقع پر سابقہ غلطی کا حوالہ نہیں دیا، نہ بر سبیل تذکرہ نہ بطور طعن وطنز!

تعلیم کا یہ سال مولانا کی صحبت میں بہت اچھا گزرا، مولانا ہر جمعرات کو ہم لوگ سے مضمون لکھواتے۔ جمعرات کو آخری گھنٹے میں کسی ایک موضوع سے متعلق چند سوالات لکھواتے اور فرماتے کہ اس کے جواب اس ترتیب سے لکھو کہ ایک مرتب مضمون تیار ہو جائے، پھر دیکھتے، اصلاح فرماتے، مولانا کے اس طریقہ کار کا مجھ کو بہت فائدہ پہونچا۔

سال کھسکتا رہا آہستہ آہستہ شعبان کا مہینہ آ گیا، کتابیں تمام ہونے کو آئیں، امتحان کا وقت آ گیا، سالانہ امتحان کے معاً بعد مولانا نے دستار بندی کا جلسہ رکھا تھا۔ اس جلسہ میں از راہ ذرہ نوازی اس حقیر سے علم کے موضوع پر تقریر کروائی اور بہت تحسین فرمائی۔ دستار بندی کے لئے امام اہل سنت حضرت مولانا عبد الشکور صاحب لکھنوی کے صاحبزادے حضرت مولانا عبد السلام صاحب کو دعوت دی تھی اور خطیب کی حیثیت سے اپنے رفیق درس حضرت مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی دہلوی کو زحمت دی تھی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد مولانا سے ربط و تعلق باقی رہا، مولانا کے آبائی گاؤں سے میرا

گاؤں بیس کلومیٹر کے فاصلہ پر ضلع مئو میں ہی ہے۔ چھٹیوں میں جب مولانا گھر پر ہوتے تو میں اکثر سائیکل سے ان کے گھر چلا جایا کرتا، ایک مرتبہ کسی مختصر چھٹی میں مولانا گھر تشریف لائے تھے، مجھے معلوم نہ تھا، میں کہیں گیا ہوا تھا، گھر واپس آیا تو والد صاحب نے بتایا کہ مولانا افضال صاحب تشریف لائے تھے۔ میں حیرت اور خوشی میں ڈوب گیا، مولانا کی یہ خردنوازی تھی، مجھے معلوم نہیں تھا کہ مولانا گھر تشریف لائے ہیں، تو خود ہی ملاقات کے لئے آ گئے۔ والد صاحب نے بتایا کہ سائیکل سے آئے تھے، انھیں تعجب ہو رہا تھا کہ اتنے بڑے عالم اور سائیکل چلا رہے تھے۔ یہ مولانا کی سادگی اور بے نفسی تھی۔ مولانا اس وقت مالی اعتبار سے خوشحال نہ تھے، آمدنی کم اور عیال کثیر تھے، فرماتے تھے کہ ضرورت پر اگر ہم سائیکل چلا لیں تو کیا شان گھٹ جائے گی؟ واقعہ یہ ہے کہ مولانا کے یہاں عرفی شان و وجاہت کا کوئی تصور ہی نہ تھا۔ مولانا سفر بہت کرتے تھے اور سفر میں کسی طرح کا تکلف ان کے یہاں نہیں تھا، کسی بھی سواری میں بیٹھ کر، کھڑے ہو کر بے تکلف اور بے تکان سفر کر لیتے تھے۔ بدن بھی اللہ تعالیٰ نے بہت مضبوط اور تنومند عطا فرمایا تھا، تھکنا جانتے ہی نہ تھے۔ میں نے بارہا دیکھا کہ لمبے سفر سے آ رہے ہیں، سفر میں نہ جانے کن کن مشقتوں سے دو چار ہوئے ہوں گے مگر آتے ہی وقت ہوتا تو کتاب اٹھاتے طلبہ کو اطلاع ہوتی اور سبق شروع ہو جاتا، کبھی نہ فرماتے کہ تھک گیا ہوں یا بڑی مشقت کا سفر ہوا ہے، ایک عام حالت جیسی حالت ہوتی، ہاں سفر میں کوئی خاص سبق آموز یا عبرت انگیز بات ہوتی تو ذکر کرتے۔

مولانا کی یہ خاص شان تھی کہ اہل تعلق سے بغیر کسی غرض سے محض للہ فی اللہ ملاقات کے لئے پہونچ جایا کرتے تھے اور ہم لوگوں کو اس کی تعلیم بھی دیتے تھے، فرماتے تھے کہ ضرورت وغرض پر ہر شخص تو ملتا ہی ہے لیکن جس سے تعلق ہو، محبت ہو، بغیر کسی دنیوی غرض کے بھی ملنا چاہئے، اس سے محبت استوار رہتی ہے۔

میں ۱۹۷۲ء میں جامعہ اسلامیہ بنارس میں مدرس تھا، یہ میری ملازمت اور مدرسی کا آغاز تھا، میں ابتدائی درجہ کا نوعمر مدرس تھا، ایک روز فجر کی نماز کے بعد اپنے کمرے میں بیٹھا مطالعہ میں مصروف تھا کہ ’’السلام علیکم‘‘ کی مانوس سی آواز آئی، دیکھا تو مولانا دروازہ پر کھڑے مسکرا رہے ہیں، میں ہڑبڑا کر اٹھا، مصافحہ کیا اور ادب واحترام سے بٹھایا۔ میں حیرت میں تھا، ادھر کئی ماہ سے

میری ملاقات نہ تھی، کیوں کہ میں درمیان میں کچھ دن میسور رہا تھا، اچانک بے وہم وگمان مولانا کو دیکھا تو میں سراپا خوشی کے ساتھ حیرت میں ڈوب گیا۔ مولانا نے کرم فرمایا، میں حیرت کا اظہار کر رہا تھا، اپنی خوش نصیبی پر ناز کررہا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ میں نہیں سمجھ رہا ہوں کہ بیداری میں آپ کو دیکھ رہا ہوں یا خواب میں؟ مولانا ہنسے اور فرمایا بعض لوگ بیداری میں بھی خواب دیکھتے ہیں، پھر فرمایا میں فلاں جگہ جارہا ہوں، بنارس پہونچا تو خیال آیا کہ تم یہیں ہو، جی چاہا کہ تم سے مل لوں، اس ملاقات سے محبت کا وہ گہرا نقش بیٹھا کہ اب تک جگمگا رہا ہے۔

فراغت کے بعد......ہم لوگوں پر جو تہمت لگی تھی اس کا اثر یہ تھا کہ......ہم لوگوں کو کوئی بھی درس گاہ اپنے یہاں خدمت کے لئے لینے کے واسطے تیار نہ تھی، مولانا کو اس کی بہت فکر تھی، شعبان کی چھٹیوں میں، میں مولانا کے گھر حاضر تھا، مولانا نے فرمایا اب کیا کروگے؟ میں نے عرض کیا، آپ جو حکم دیں، وہ چاہتے تھے کہ کسی کام پر لگا دیں، فرمایا کہ مدرسوں کی جانب رخ کروگے تو مشکل پیش آئے گی، میں مولانا اسعد صاحب کو خط لکھے دیتا ہوں، رمضان میں وہ ٹانڈہ میں رہیں گے، ان کے پاس خط لے کر چلے جاؤ، وہ کہیں جمعیۃ علماء میں لگا دیں گے۔ میں نے مولانا سے خط لے لیا اور رمضان کے اخیر عشرہ میں ٹانڈہ گیا، حضرت مولانا اسعد صاحب سے ملا، انھوں نے فرمایا عید بعد دلی آجاؤ، میں نے مولانا سے ذکر کیا، مولانا نے تاکید کی کہ عید بعد ضرور چلے جانا۔

میں عید بعد گیا تو ضرور مگر حضرت مولانا اسعد صاحب کسی لمبے سفر پر گئے ہوئے تھے، میں ہفتہ بھر جمعیۃ علماء کے دفتر میں رہا، پھر میں تبلیغی مرکز میں کسی تقریب سے گیا، وہاں کئی اکابر نے حکم دیا کہ چلے میں جاؤ، مجھے اتنا موقع نہ مل سکا کہ مولانا سے دریافت کرتا اور میں چلے میں نکل گیا، چلے سے واپسی کے بعد مولانا سے ملاقات ہوئی، مولانا نے کوئی مواخذہ نہیں فرمایا اور میری زندگی بھی ایک خاص رخ پر چل پڑی تھی جو رخ مولانا کو پسند تھا۔

تبلیغ سے واپسی کے بعد کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ مجھے گھر پر رہنے کی مجبوری پیش آئی، میں ڈیڑھ دو سال تک گھر پر ہی رہا، اس دوران مولانا سے کبھی کبھار ملاقات کی توفیق ہوتی رہی۔

مئی ۱۹۷۲ء میں جمعیت علماء ہند کا سالانہ اجلاس تھا، اس وقت جس مجبوری کی وجہ سے

مجھے گھر رہنا ناگزیر تھا، وہ مجبوری ختم ہوچکی تھی۔ مجھے فکر ہوئی کہ زندگی کے کسی عمل میں لگ جانا چاہئے کہ دین کی کچھ خدمت ہو اور ماضی کی غلطیوں کی کچھ تلافی بھی ہو۔ مجھے پھر مولانا یاد آئے، مولانا دلی جمعیۃ علماء کے اجلاس میں یقیناً ملیں گے، یہ سوچ کر میں دلی چلا گیا، امید کے مطابق مولانا سے ملاقات ہوئی، بڑی محبت، بہت التفات سے ملے، حالات پوچھتے رہے۔ میں نے عزم ظاہر کیا کہ اب کسی مشغلہ میں لگنے کی نیت سے آیا ہوں، مولانا نے تحسین فرمائی، اجلاس کے دوران مولانا کی توجہ وعنایت سے میسور جانا طے ہوگیا لیکن ابھی وہاں جانے میں تھوڑا عرصہ درکار تھا، مولانا اس وقت بھی امروہہ میں شیخ الحدیث تھے، مجھ سے فرمایا کہ امروہہ چلو، درمیانی عرصہ وہاں گزارو، پھر میسور چلے جانا۔ میں ساتھ ہی امروہہ چلا گیا، وہاں میرے استاذ حضرت مولانا عبدالمنان صاحب مظفرپوری طویل چھٹی پر گھر گئے ہوئے تھے، حضرت مولانا نے ان کی زیردرس ساری کتابیں میرے سپرد کردیں اور دو ماہ میرا اچھا وقت گزر گیا۔

حضرت مولانا اس وقت بھی جب میں طالب علم تھا اور اس وقت بھی جب عارضی طور سے وہاں پڑھا رہا تھا، تدریس اور مطالعہ کے اوقات کے علاوہ مسلسل قرطاس وقلم کی بزم سجائے رہتے تھے، رات کو عموماً ایک ڈیڑھ بجے تک لکھتے رہتے تھے، ان دنوں متفرق مضامین کے علاوہ جو وہ مختلف مجلّات کے لئے لکھا کرتے تھے، مستقل ایک تصنیفی پروگرام چھیڑ رکھا تھا۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ کے درس ترمذی کی کئی سال کی قلمی کاپیاں، جو انھوں نے جمع کر رکھی تھیں، جو حضرت شیخ کے ذہین تلامذہ نے دوران درس نوٹ کر رکھی تھیں، مولانا ان سب کو بغور پڑھتے، پھر ان سب کی روشنی میں ایک جامع اور مرتب تقریر تیار کرتے، الفاظ وکلمات حضرت شیخ ہی کے رکھتے، کہیں کہیں ترتیب درست کرنے کے لئے ضروری لفظ بڑھاتے۔ بہت محنت سے یہ کام کرتے اور درس ترمذی میں اس سے کام لیتے، اس کے لئے حوالہ اور مراجع کا مسلسل مطالعہ کرتے۔ کتاب الحج تک غالباً یہ سلسلہ مکمل ہوگیا تھا، اس کی ایک قسط مولانا نے شائع بھی کی تھی مگر باقی ماندہ حصہ چھپ نہ سکا۔ مولانا کے ذخیرہ کاغذات میں ان شاء اللہ محفوظ ہوگا، اخلاف کی ذمہ داری ہے کہ یہ گرانمایہ علمی خزانہ منصۂ شہود پر لایا جائے۔

مولانا ذہانت وذکاوت کے ساتھ موزونی طبع کے مالک تھے، طبیعت شعروادب کی

طرف مائل ہوتی تو ایک سے بہتر ایک شعر نکالتے، لیکن مولانا جن علمی اور انتظامی کاموں میں مسلسل لگے رہتے ان میں شعر گوئی کی طرف نہ توجہ کرنے کا موقع ہوتا اور نہ اس کا تکلف کرتے۔ البتہ مولانا بکثرت سفر کرتے تھے، سفر کے دوران ٹرین اور بس پر طبیعت کو تھوڑی سی فرصت ملتی تو شعر گوئی کی طرف مائل ہوتے۔ آپ کے کلام کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں، ایک تو ’’نجم سحر‘‘ دوسرے ’’دار ورسن‘‘۔ مولانا کا تخلص جوہرؔ تھا، مجھے یہ معلوم نہیں کہ مولانا نے کسی سے اصلاح لی ہے یا نہیں؟ البتہ یہ معلوم ہے کہ گونڈہ کے زمانہ قیام میں مشہور شاعر رئیس المتغزلین جناب جگرؔ مرآدبادی کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔

مولانا دارالعلوم دیوبند سے ۱۹۴۰ء میں فارغ ہوئے، مولانا نے اپنی طالب علمی کی داستان کچھ ناتمام سی لکھی ہے، اس کی جگہ مولانا کی سوانح عمری ہے۔ فارغ ہونے کے بعد کچھ دنوں جین پور ضلع اعظم گڑھ کے مدرسہ جامع العلوم میں تدریس کی خدمت انجام دی، حضرت مولانا عبدالمنان صاحب اور حضرت مولانا عبدالحی صاحب چشتی خلیفہ حضرت مدنی قدس سرہ نے جین پور میں مولانا سے تعلیم حاصل کی ہے۔ جین پور کے بعد بہرائچ مدرسہ نورالعلوم میں مدرس ہوئے، بہرائچ کے بعد گونڈہ مدرسہ فرقانیہ میں تشریف لے گئے۔ یہی زمانہ مولانا کی بہترین کارکردگی کا ہے، اس وقت آپ تعلیم وتربیت کے موضوع میں فنا تھے، گونڈہ میں آپ کے اٹھارہ سال گزرے۔ مولانا کے حسن تعلیم وتربیت سے اور حسن انتظام سے مدرسہ فرقانیہ ایک نمونہ کا مدرسہ بن گیا تھا، وہاں سے مولانا کے بڑے اعلی اور جید تلامذہ تیار ہوئے۔

مولانا محمد احمد فیض آبادی استاذ دارالعلوم دیوبند، مولانا شمس تبریز آروی مرحوم لکھنو یونیورسٹی، مولانا عطاء اللہ صاحب دیوریاوی وغیرہ بکثرت علماء نے گونڈہ میں مولانا سے اکتساب فیض کیا۔

اٹھارہ سال کے بعد بعض حالات کی وجہ سے مولانا نے گونڈہ چھوڑ دیا، اس کا مولانا کی طبیعت پر بہت اثر تھا۔ اس کے بعد متعدد جگہوں پر پڑھایا مگر گونڈہ چھوٹنے کا اثر تھا کہ طبیعت کو کہیں جماؤ نہیں ہوتا تھا۔ مولانا کی طبیعت میں شان بے نیازی بہت تھی، انتظامی سیاست کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے، وہ مزاج یہ ہے کہ جو بھی اس انتظام میں داخل ہو، ہر مناسب اور نامناسب پر

بلکہ ہر غلط اور صحیح پر سر جھکائے رہے، سر تسلیم خم کئے رہے، غلط کو اگر غلطی سے غلط کہہ دیا تو انتظامی سیاست کی پیشانی پر بل آجاتا ہے۔ یہ سیاست چالباز ہوتی ہے، اس کو اگر کسی کے اندر شجاعت کا شائبہ محسوس ہوتا ہے تو اسے اپنا مد مقابل سمجھ لیتی ہے اور مختلف حیلوں اور چالبازیوں سے اسے اپنی راہ سے ہٹانے کا منصوبہ سوچنے لگتی ہے۔ مولانا کی یہ غلطی بہت نمایاں تھی، مولانا طبیعت اور دل و دماغ کے اتنے مضبوط تھے کہ کسی طاقت اور کسی وجاہت کے سامنے دبنا جانا ہی نہیں اور عقل ورائے کے اتنے پختہ تھے کہ کسی کچی رائے اور عقل ودانائی سے منحرف کسی بات کو قبول کرنے سے انھیں مناسبت تھی ہی نہیں، اور کسی غلط بات کو کسی مصلحت اندیشی کی بنا پر درست کہنے کا انھیں یارانہ تھا، اکثر پڑھا کرتے تھے:

اے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شدی

دور حاضر کی انتظامی سیاست خواہ وہ ملکی پیمانے کی ہو یا کسی ادارہ و تنظیم چلانے کے پیمانے کی ہو، اس روشنیٔ طبع کو برداشت نہیں کرتی۔ آج کی اصطلاح میں اس روشنیٔ طبع اور شجاعت و بے خوفی کو خودداری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ خودداری بسا اوقات کبر کی سرحد میں داخل ہو جاتی ہے، مگر مولانا کبر ونخوت سے بہت دور تھے۔ وہ شجاع تھے متکبر نہ تھے، وہ صاحب رائے تھے مگر ضدی نہ تھے، وہ حق بات بے تکلف کہہ دیتے تھے مگر دل میں کینہ بالکل نہ رکھتے تھے، وہ اپنی بات پر بڑے پختہ تھے مگر دوسروں کی بات بڑے حوصلے اور وسعت سے سنتے تھے لیکن بسا اوقات سیاست کو ان کی یہ پختگی ناگوار ہوتی تھی، وہ کبھی کبھی ہم لوگوں کو ماحول کی کشمکش سمجھانے کے لئے بتاتے تھے کہ ’’انتظامی سیاست کی ناگواری کے لئے یہ ضروری نہیں کہ تم اس کی خرابی پر اسے ٹوک دو بلکہ اسے یہ بات بھی ناگوار ہوتی ہے کہ اس کی خرابیاں اور کمزوریاں تمہارے علم میں آجائیں، اگر اسے شبہہ بھی ہوگا کہ تم اس کی خرابیاں اور بدنیتیاں جان گئے ہو تو وہ تم سے ناراض ہو جائے گی۔‘‘

گونڈہ چھوڑنے کے بعد مولانا نے کہیں جم کر رہنے کا ارادہ نہیں کیا، فرماتے تھے کہ لائن نہیں بدلی جائے گی، جگہ بدلی جاسکتی ہے۔ چنانچہ مولانا نے علم دین کی خدمت کو زندگی کا نصب العین بنایا اور زندگی اسی نصب العین پر بسر کر لے گئے مگر کسی خاص جگہ کو مطمح نظر نہیں بنایا کہ اسے چھوڑنا ہی نہیں ہے۔ فرماتے تھے کہ ’’نماز تو پڑھنی ہے مگر اس کے لئے کوئی ایک خاص مسجد تو

ضروری نہیں کسی مسجد میں سجدہ کیا جا سکتا تھا۔“

چنانچہ گونڈہ کے بعد دار العلوم مئو، میرٹھ، امروہہ، حیدرآباد، مہوا بسم اللہ، گورینی جونپور اور گورکھپور میں کچھ کچھ وقفہ تک قیام رہا۔ ان جگہوں میں کچھ طویل قیام گورینی میں رہا اور گورکھپور میں، گورینی میں آٹھ سال اور گورکھپور میں تقریباً ۱۸؍۱۹ سال۔

مگر ہر جگہ اس طرح رہے جیسے کوئی مسافر رہتا ہو، مقیم کی طرح کہیں نہیں رہے، گورکھپور کا قیام کسی درجہ میں مقیم کی طرح رہا مگر جب اٹھے تو اس طرح اٹھے کہ کوئی تعلق باقی نہ رہا۔

مولانا نے دینی تعلیم وتربیت کو اپنا نصب العین بنایا تو پوری زندگی مدرسوں میں گزار دی، کیوں کہ دینی تعلیم وتربیت کے مراکز یہی ہیں اور ابتدائی کتابوں سے لے کر دورۂ حدیث شریف تک سب درجوں کی کتابیں پڑھائیں۔ مولانا کے پڑھانے کا انداز مجتہدانہ تھا، وہ فن کو طالب علموں کے ذہن کے بہت قریب کر دیتے تھے، فن کی اصطلاحیں سمجھانے کے لئے وہ سامنے کی روز مرہ استعمال آنے والی چیزوں میں سے مثالیں ڈھونڈ لاتے تھے۔ فن منطق وہ اس طرح پڑھاتے تھے جیسے وہ انسانوں کے برتنے کی عام چیز ہو، اسی طرح فن نحو، فن صرف، اصول فقہ کو وہ زندگی سے بہت قریب کر دیتے تھے۔

حدیث پڑھانے کا تذکرہ میں اوپر کر چکا ہوں، قرآنی حکمت سے مولانا کو بہت مناسبت تھی، انھوں نے تفسیر کا خصوصی درس حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری مفسر قرآن کی خدمت میں لیا تھا۔ قرآنی حکمت انسان کی روزمرہ زندگی میں کس طرح نافذ ہو؟ اس کی حکمت و جامعیت کن کن آفاق کو محیط ہے؟ مولانا کا ذہن بڑی سرعت سے اس تک پہونچتا تھا اور اس کی تعبیر بڑے اچھوتے انداز میں کرتے تھے۔

یہ حقیر مولانا کی خدمت میں امروہہ میں ایک سال ۱۹۷۰ء میں رہا، اس وقت مولانا استاذ تھے، صدر المدرسین تھے، شیخ الحدیث تھے اور یہ بندہ ایک معمولی طالب علم تھا۔ فراغت کے بعد گاہے گاہے مولانا کی خدمت میں حاضری ہوتی رہتی تھی، حضرت بھی کرم فرماتے رہتے تھے، میرے ساتھ معاملہ اولاد جیسا ہوگیا تھا، گھر پر بکثرت میری حاضری ہوتی تھی لیکن طویل یکجائی کا موقع نہیں ہوا تھا۔ مولانا اپنے نظریہ کے مطابق دین کی خدمت کرتے ہوئے جگہ بدلتے رہتے

تھے۔ میرا تعلق ۱۹۷۳ء سے ۱۹۸۵ء تک مدرسہ دینیہ غازی پور سے رہا، مدرسہ دینیہ کے مہتمم جناب مولانا عزیز الحسن صاحب صدیقی کو مولانا سے ذہنی مناسبت تھی، مولانا بھی جمعیۃ علماء ہند کے مخلص خادم تھے، صدیقی صاحب بھی جمعیۃ کے سرگرم رکن تھے۔ میں مدرس بن کر پہونچا تو میرا وجود مولانا کا ممنون کرم تھا، اس مناسبت سے مدرسہ دینیہ کی ہر تقریب میں مولانا کو دعوت دی جاتی اور مولانا کہیں ہوتے ضرور کرم فرماتے، وقت نکال کر آتے، رہنمائی فرماتے، مشورے دیتے۔

صدیقی صاحب بڑے سیال ذہن کے مالک ہیں، ان کا زرخیز ذہن عملی میدانوں میں نئے نئے پروگرام بناتا رہتا ہے۔ میرے پہونچنے کے بعد انھوں نے ایک نیا منصوبہ بنایا کہ فارغ التحصیل طلبہ کو تعلیم و تدریس کی ٹریننگ دی جائے، انھیں پڑھانے کا سلیقہ سکھایا جائے، تربیت کا انداز بتایا جائے، تاکہ جب وہ مدرس بن کر مدرسہ میں پہونچیں تو بہتر طریقہ سے خدمت انجام دے سکیں۔

اس کا انھوں نے پروگرام بنایا، اہل نظر کے سامنے پیش کیا، اس کے لئے ’’دائرۃ التربیت‘‘ کے نام سے مدرسہ دینیہ میں ایک شعبہ کا انعقاد کر دیا، اس موضوع سے مولانا کو خصوصیت سے دلچسپی تھی۔ مولانا تشریف لائے اور کئی دن تک قیام کیا، طریقہ کار سمجھایا، اس میں ایک منصوبہ یہ بھی تھا کہ جن فارغ التحصیل طلبہ کی تربیت ہوگی، ان کے لئے ایک نصاب بنایا جائے، جسے وہ ایک سال میں سبقاً سبقاً اساتذہ سے پڑھیں۔ صدیقی صاحب نے اس نصاب کی تشکیل میرے ذمے لگائی، میں نے اپنی دانست میں بہت غور و فکر کر کے ایک نصاب بنایا۔ مولانا جب تشریف لائے تو میں نے وہ نصاب ان کے سامنے پیش کیا، انھوں نے ایک نگاہ ڈالی اور اسے فیل کر دیا اور فرمایا کہ جو بات ذہن میں ہے، سب نہیں لکھی جاتی، اس میں انتخاب کیا جاتا ہے۔ پھر انھوں نے اسے بہت مختصر کر دیا اور زندگی بھر کے لئے ایک سبق دیدیا کہ ذہن بڑا زرخیز ہوتا ہے جو کچھ ذہن میں آئے نہ اسے بولنا چاہئے نہ لکھنا چاہئے بلکہ اس میں بہت غور و فکر کر کے انتخاب کرنا چاہئے جو مقصد سے ہم آہنگ ہو اور مخاطب کے حالات و ظروف کے مناسب بھی ہو۔

مولانا اس طرح مختصر مختصر جملوں میں بڑی بڑی باتیں سمجھا دیا کرتے تھے۔ ۱۹۷۳ء میں حضرت مولانا عبد اللطیف صاحب نعمانی علیہ الرحمہ کا مئو میں انتقال ہوا، تو اس کے کچھ دنوں کے

بعد مولانا کے گھر میری حاضری ہوئی، اس وقت مولانا کی وفات کا بہت چرچا تھا، مئو سونا سونا ہوگیا تھا، ہر بات میں لوگ مولانا کو یاد کرتے تھے۔ میں مولانا کی خدمت میں حاضر تھا، مولانا مرحوم کا تذکرہ چل پڑا، میں نے عرض کیا کہ مولانا کیا گئے، لوگ پریشان ہوگئے، فرمایا ہاں جی، میدان میں ایک عظیم سایہ دار درخت تھا، وہ نہ رہا تو ہر طرف دھوپ پھیل گئی۔

پھر فرمایا جانتے ہو آدمی کسے کہتے ہیں؟ میں خاموش رہا تو فرمایا: ''آدمی وہ ہے کہ جب وہ نہ رہے تو اس کی کمی محسوس ہو۔''

مولانا کے ساتھ طویل یکجائی امروہہ کے بعد مدرسہ ریاض العلوم گورینی جونپور میں ہوئی۔ میں گورینی میں چار سال رہا، مولانا تین چار سال پہلے سے تھے، میرے وہاں پہونچنے سے مولانا کو بہت خوشی ہوئی، گورینی میں بہت دنوں تک اور بہت قریب سے مولانا کو دیکھنے، برتنے اور معاملات کرنے کا موقع ملا، اس وقت مولانا کی خوبیاں اور نکھر کر سامنے آئیں، ان کی محبت سے خوب مستفید ہوا۔

مولانا کو قریب سے دیکھنے کے بعد ایک بات جسے میں مولانا کے بارے میں جانتا تھا اور واضح طور پر نکھر کر آئی، وہ یہ کہ اتنا تو معلوم تھا کہ مولانا بہت مخلص ہیں، منافقت سے پاک ہیں، ان کے یہاں زبان پر کچھ دل میں کچھ، کی پالیسی کبھی نہیں رہی، حالانکہ ان کا سابقہ کئی تنظیموں سے رہا اور بعض تنظیموں میں ان کی حیثیت اساسی رکن کی رہی ہے، اور دور حاضر کی تنظیموں کی بنیادی خصوصیات میں ایک بات عموماً یہ بھی ہوتی ہے کہ پالیسی کا اندرون و بیرون الگ الگ ہو، مگر مولانا اس فن سے ناواقف تھے۔ میں نے انھیں جمعیۃ علماء کے اجلاسوں میں، اس کی خصوصی میٹنگوں میں دیکھا ہے، جس بات سے انھیں اختلاف ہوتا برملا اس کا اظہار کرتے، تاہم اپنے امیر اور اپنے بڑے کی اطاعت میں بھی فرق نہ آنے دیتے۔ بارہا حضرت مولانا سید اسعد مدنی سے اختلاف کرتے دیکھا مگر جب کوئی بات طے ہوجاتی تو خواہ وہ مولانا کی رائے کے خلاف ہی ہوتی، مولانا اسے دل سے تسلیم کرتے۔ لیکن یہ سب اس وقت تک ہوتا جب تک تنظیمی امور میں اختلاف ہوتا، گورینی میں جب مولانا تھے تو ایک موقع ایسا آگیا کہ مسئلہ جمعیۃ میں کسی تنظیمی امر کے اختلاف تک نہیں رہا، بلکہ ایک اصولی اور دینی اور شرعی امر میں اختلاف پیدا ہوگیا، وہ مسئلہ ''امارت شرعیہ'' کا

تھا۔ یہ ایک علمی اور شرعی مسئلہ تھا، جس میں مولانا اپنے آپ کو حضرت مولانا سید اسعد مدنی صاحب علیہ الرحمہ کی رائے اور موافقت تک نہ لا سکے تو باوجودیکہ مولانا مدنی سے مولانا کو قلبی تعلق تھا، ان کے ہر ارشاد کو حکم کا درجہ دیتے تھے لیکن امارت شرعیہ کے مسئلہ پر اتنا اختلاف ہوا کہ مولانا نے جمعیۃ علماء کی پالیسی سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ یہ مولانا کے لئے بڑا سخت مجاہدہ تھا، کیوں کہ چالیس پینتالیس سال تک مسلسل جمعیۃ کے ساتھ مولانا کی رفاقت رہی ہے، اس کا چھوٹا بڑا کوئی اجلاس ایسا نہ تھا کہ جہاں مولانا کلیدی کردار نہ ادا کرتے رہے ہوں۔ اب ایک شرعی مسئلہ میں مولانا کے نزدیک جمعیت کا قدم راہ مستقیم سے منحرف ہورہا تھا تو یہ مولانا کی ہمت تھی اور ان کا خلوص تھا کہ انھوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔ انھوں نے سمجھانے کی کوشش کی مگر تنظیموں کا مزاج عجیب ہوتا ہے، مولانا کامیاب نہ ہوئے لیکن مولانا نے بھی اپنے ضمیر کا سودا نہ کیا۔ ان دنوں میں مولانا کے بہت قریب تھا اور اس موضوع پر کھل کر باتیں ہوتی تھیں، میں جتنا ان سے مباحثہ کرتا، ان کی ضمیر کی پاکیزگی، ان کے دل میں مسائل شرعیہ کی اہمیت و عظمت اور ان کا خلوص روشن سے روشن تر ہوتا رہا۔

دوسری چیز جو میں نے گورینی کے دوران قیام دیکھی، وہ مولانا کی ان تھک جدوجہد تھی، مولانا جب گورینی تشریف لائے تھے تو حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب علیہ الرحمہ سے یہ بات طے کرلی تھی کہ میں ہفتہ کے سات دنوں کی حاضری کا پابند نہ ہوں گا، مہینہ کا ایک ہفتہ یکجائی طور پر یا الگ الگ مجموعی طور پر میری مدرسہ سے رخصت کا رہے گا۔ مولانا جمعیت علماء ہند کے نظام کے تحت قومی وملی کاموں میں نہ صرف ذوق وشوق سے بلکہ ایک عبادت اور فریضہ سمجھ کر حصہ لیتے تھے، مولانا کا اصل مزاج علمی اور تعلیمی تھا مگر قومی وملی مسائل میں وہ بہت انہماک سے شریک ہوا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے اس موضوع پر اشکال کیا تھا تو فرمایا کہ ”موجودہ حالات میں مسلمانوں کے اجتماعی وقومی احوال میں شرکت کرنے کا حضرت شیخ الاسلام علیہ الرحمہ نے مجھے حکم دیا ہے، اسے میں اپنے حق میں فرض سمجھتا ہوں۔“ اس فریضہ کی ادائیگی میں مولانا کو بہت سفر کرنے پڑتے تھے۔ مولانا اطمینان سے پڑھاتے ہوتے جمعرات کو آخری سبق پڑھا کر کمرے میں تشریف لاتے بیگ میں سامان رکھتے، پوچھنے والا کوئی پوچھتا کہ حضرت کہیں کا سفر ہے؟ فرماتے کہ دلی جارہا ہوں کھانا کھاتے، بیگ اٹھاتے، مدرسہ کے باہر سڑک پر آتے، جونپور سے شاہ گنج کوئی گاڑی جاتی

ہوتی، بھری ہوتی، گھسنے کی جگہ نہ ہوتی مگر مولانا اطمینان سے اس میں داخل ہوجاتے، بیٹھنے کی جگہ مل جاتی تو بیٹھ جاتے، ورنہ کھڑے ہی کھڑے شاہ گنج پہونچ جاتے۔ وہاں سے دلی جانے والی ٹرین ڈھائی بجے ملتی، کبھی ریزرویشن کا دردسر مول نہ لیتے، جہاں جگہ ملتی بیٹھ جاتے، گنجائش ہوتی تو برتھ ریزرو کرالیتے ورنہ بیٹھ کر دلی پہونچ جاتے۔ کبھی سیٹ پر، کبھی زمین پر۔ اللہ نے مولانا کو مضبوط جسم عطا کیا تھا اور ہمت ایسی کہ کبھی تھکنے کا نام نہ جانتی تھی۔ اس وقت مولانا کی عمر ساٹھ سال سے متجاوز تھی مگر بڑھاپے کا ضعف واضمحلال ابھی پاس سے نہیں گزرا تھا، سستی اور کاہلی کا کوئی ہلکا سا نشان بھی نہ تھا، سنیچر کو اور کبھی اتوار کو واپس آتے، ظہر کی نماز کے بعد مدرسے میں داخل ہوتے، باوضو ہوتے اور اگر وضو نہ ہوتا تو وضو کرتے اور حدیث کی کتاب بخاری شریف اٹھاتے اور درس گاہ میں پہونچ جاتے، طلبہ میں خبر پھیل جاتی کہ مولانا آگئے ہیں، بغیر کسی تمہید کے، بغیر کسی تکان کے تذکرے کے، سبق شروع ہوجاتا۔ سبق سے فارغ ہوکر اپنے روزمرہ کے معمولات میں مشغول ہوجاتے۔ آرام کرنے کا کوئی خانہ مولانا کی زندگی میں نہ تھا۔ ہر ہفتہ مولانا کا یہ منظر سامنے سے گزرتا، سب کے سامنے سے گزرتا، یہ بھی گویا روزمرہ کا ایک معمول تھا۔ میں چار سال کی مدت میں مسلسل ان کے ساتھ رہا، سفر میں کم حضر میں زیادہ، مگر مولانا سے یہ لفظ نہیں سنا کہ تھک گیا ہوں۔

مجھے یاد ہے کہ مدرسین کا ایک قافلہ ضلع بستی کے ایک گاؤں جانے والا تھا، مولانا کے شاگرد مولانا عتیق الرحمان صاحب معتمد مالیات تھے، ان کے گھر پر کسی شادی کی تقریب تھی، انھوں نے اپنے ہم عمر اور کم عمر اساتذہ کو دعوت دے رکھی تھی۔ سب بے تکلف تھے، ایک جیپ کے بقدر قافلہ تیار تھا، اتفاق ایسا کہ مولانا کا اس دن کہیں سفر نہ تھا، ان سے درخواست کی گئی، مولانا کو اپنے چھوٹوں کی دلداری کا بڑا اہتمام تھا، مولانا بھی شریک قافلہ ہوگئے۔ ایک خاص مسافت تک تو سڑک اچھی تھی، سفر بخیر گزرا، مگر ایک تہائی راستہ بہت خراب تھا، سڑک بنی نہ تھی، تمام دھول مٹی میں جیپ ہچکولے کھا رہی تھی، قافلہ ان ہچکولوں میں زیروزبر ہو رہا تھا، جیپ کی حرکاتِ نشیب وفراز کے ساتھ دھول اتنی اڑ رہی تھی کہ نہ کسی کی صورت پہچانی جارہی تھی اور نہ کسی کا لباس سمجھ میں آرہا تھا، وقت کی ایک خاصی مدت قطع کرنے کے بعد جب منزل مقصود پر یہ کارواں پہونچا ہے تو ہر شخص

دھول مٹی کا ایک مجسمہ بنا ہوا تھا، سفر کی ستم ظریفی کا شکوہ ہر ایک کی زبان پر تھا، سب رومال لے لے کر اپنے اپنے اوپر سے گرد و غبار صاف کر رہے تھے، اس پورے قافلہ میں اگر کوئی بالکل پر سکون تھا نہ زبان پر کوئی شکوہ تھا، نہ کوئی غیر معمولی حالت محسوس ہو رہی تھی، تو وہ مولانا کی ذات تھی۔ مولانا بھی دھول مٹی کا مجسمہ بنے ہوئے تھے، مولانا کی شیروانی کہیں سے دکھائی نہیں دے رہی تھی، چہرہ غبار میں اٹا ہوا، ڈاڑھی دھول میں چھپی ہوئی، میں نے مولانا کے قریب جا کر ایک شعر پڑھا:

خاکساران جہاں را بحقارت منگر
تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

دنیا کے ان خاکساروں کو حقارت کی نگاہ سے مت دیکھو، تمہیں کیا پتہ کہ اس گرد و غبار میں کوئی سوار ہو۔

مولانا یہ سن کر صرف مسکرائے، زبان سے ایک لفظ نہ کہا، پھر میں نے اور دوسرے رفقا نے مولانا کے بدن سے گرد و غبار جھاڑی۔

مولانا سفر و حضر میں نہایت بے تکلف تھے، ایک روز میں شاہ گنج روڈویز پر پہونچا، مجھے اعظم گڑھ جانا تھا، بس پر چڑھا تو دیکھا کہ مولانا بھی تشریف فرما ہیں، مجھے دیکھتے ہی پوچھا ظہر پڑھ چکے ہو؟ میں نے عرض کیا جی، فرمایا بیٹھو میں پڑھ آؤں۔ مولانا شیروانی پہنے ہوئے تھے، تیزی سے اترے، ہنڈ پائپ کے پاس گئے، ایک ہاتھ سے اسے چلانے لگے اور وضو کرنے لگے، میں نے اپنے رفیق کو بھیجا کہ تم جا کر نل چلاؤ، وہ بھی تیزی سے اترا لیکن جب تک پہونچتا ہے، مولانا فارغ ہو گئے، پھر روڈویز کی بنچ پر جو قبلہ رخ تھی، آپ چڑھ گئے، اور شیروانی نکال کر بچھا دی اور نماز پڑھنے لگے۔

گورینی کے بعد مولانا نے گورکھپور کا رخ کیا، گورکھپور میں ”دارالعلوم گورکھپور“ کے نام سے حکیم وصی احمد صاحب مرحوم اور ان کے رفقا نے عربی کا ایک مدرسہ قائم کیا تھا، حکیم صاحب مولانا کو گورکھپور لائے، اور مدرسہ ان کے حوالہ کر دیا۔ میں بھی مولانا کے ساتھ ہی گورینی سے نکلا اور شیخوپور آ گیا، اب ظاہری اور جسمانی قرب نہ رہا، مگر آمد و رفت مسلسل قائم رہی، میں اکثر گورکھپور حاضر ہوا کرتا، اور مولانا بھی جب کبھی اعظم گڑھ کی طرف آتے تو کتنا ہی قلیل وقت ہوتا

شیخو پور تشریف لاتے۔ مولانا کی بڑی صاحبزادی جن سے مولانا کو بہت تعلق تھا، جین پور کے قریب خالص پور میں ہیں، وہاں آتے تو شیخو پور بھی آجاتے۔

مولانا کے یہاں مدرسہ میں جب بھی کوئی تقریب ہوتی، یا جلسہ ہوتا، تو مولانا اس شاگرد کو ضرور یاد کرتے اور میں بھی بہر حال حاضری کو اپنی سعادت سمجھتا۔

مولانا کو میں نے ہر رنگ میں دیکھا، اس وقت بھی دیکھا جب مولانا مالی اعتبار سے خوش حال نہ تھے، اور اس وقت بھی دیکھا جب اچھی خاصی خوش حالی آچکی تھی۔ مولانا کی طبیعت کا ایک ہی رنگ رہا، خرچ میں میانہ روی، طبیعت میں کشادگی، اپنی معاشرت میں جفاکشی، مزاج میں استغنا وبے نیازی۔ کبھی محسوس نہیں ہونے دیا کہ غربت وتنگدستی ہے، اور خوشحالی کے بعد کبھی ایسا رویہ اختیار نہیں کیا جس میں اتراہٹ اور فخر وناز کا اثر ہوتا۔ ابتدائی ملاقات میں بسا اوقات ملنے والے کو طبیعت میں تیزی اور تندی کا احساس ہوتا، لیکن وہ فطری ہیبت تھی جو اول نظر میں دیکھنے والوں پر چھا جاتی، مگر جب معاملہ پڑتا اور برتنے کا موقع ملتا تو مولانا بہت نرم، پانی کی طرح خوشگوار، زمین کی طرح متحمل، اور سورج کی طرح فیض رساں ہوتے۔ میں نے مولانا کو غصہ میں بھی دیکھا، اور غصہ سے ٹھنڈے ہوتے بھی دیکھا، بظاہر کسی غلط بات پر غصہ جلد آتا تھا، مگر ٹھنڈا اس سے جلد ہوتا تھا۔ میں نے چالیس بیالیس سال کی رفاقت اور برتاؤ میں کبھی کسی کے ساتھ کینہ رکھتے نہیں پایا، آدمیوں کو پہچانتے خوب تھے، اور ہر ایک کے بارے میں ان کی ایک پختہ رائے ہوتی تھی اور جب کوئی معاملہ کرنا ہوتا تو اسی کی روشنی میں کرتے، مگر سلوک اور برتاؤ سب کے ساتھ حسن اخلاق کا ہوتا، اور دل ہمیشہ صاف رکھتے۔

مجھے یاد ہے کہ جب ان کے درس سے فارغ ہو کر دنیا کے عملی میدان میں اترنے کا وقت آیا تو انھوں نے اس وقت کچھ نصیحتیں کی تھیں، یہ نصیحتیں بڑی قیمتی تھیں، ان میں سے ہندستان کی چند بڑی شخصیات کے بارے میں بھی انھوں نے کچھ باتیں، ان کے مزاج، ان کے رویہ کے بارے میں بتائی تھیں کہ اگر کبھی ان سے معاملہ کا سابقہ پڑے تو ناواقفی میں کوئی دھوکہ نہ ہو، اور ایسا اتفاق ہوا کہ ان میں سے اکثر سے سابقہ پڑا، اور جس کے بارے میں جو فرمایا تھا، برتنے کے بعد انھیں ویسا ہی پایا۔ ان تجربوں کے بعد مولانا کی دانائی اور مردم شناسی کا نقش اور گہرا ہو گیا، اور بحمد للہ

اس کی وجہ سے طبیعت کے فساد اور دل کے کینہ سے محفوظ رہا۔

مولانا اصطلاحی اعتبار سے بظاہر صوفیہ اور مشائخ کے زمرے میں نہ تھے، ایک عالمانہ وقار تھا، ایک بے تکلف سادگی تھی، نہ تواضع کا مظاہرہ تھا، نہ کبر وغرور کا شائبہ تھا، وظائف کی کثرت نہ تھی، اوراد واشغال کا مشغلہ نہ تھا، نفلی عبادات کا زور نہ تھا، مگر ان کے پاس بیٹھ کر، ان سے بات کر کے ہمیشہ یہ احساس ہوا کہ اللہ کی ذات پر بغایت یقین، اللہ کی حکمتوں پر انتہائی بصیرت، رسول اکرم ﷺ کی ذات اقدس سے آخری حد تک شیفتگی، شریعت کی نہایت عظمت، اور صحابہ وائمہ کرام کے حق میں کمال ادب کا جذبہ قلب کی گہرائیوں میں ہے، اتنا کہ خود اپنا قلب بھی اس سے متأثر ہوتا تھا۔ خصوصیت سے قرآن کریم کی حکمتوں پر ایسی گہری نظر اور ایسی روشن بصیرت تھی کہ جب اس موضوع کو بیان کرتے یا لکھتے تو وہ حکمت غامض ہونے کے بعد بدیہی اور واضح حقیقت معلوم ہوتی۔ وہ کیفیت جسے اصحاب شرع، اور ارباب طریقت ''شرح صدر'' کہتے ہیں، مولانا کی گفتگو سن کر اور مولانا کے مضامین پڑھ کر بار بار خیال ہوا کہ مولانا کو شرعی علوم ومسائل پر شرح صدر حاصل ہے۔

مولانا کو شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ کا تلمذ اور ان کی صحبت کی سعادت حاصل تھی، مذکورہ صفات واحوال کے حصول کے لئے یہ بابرکت تلمذ وصحبت خود ضمانت ہے، اس کے ساتھ خاندانی اور وراثت کے اثرات بھی ایک موثر عامل رہے ہیں۔ مولانا کے دادا حضرت حاجی عبد الرحیم صاحب فضلی علیہ الرحمہ ایک اعلی درجہ کے قلندر صفت، صاحب نسبت، درویش کامل تھے۔ ابتداء عمر میں انھوں نے حضرت مولانا شاہ فضل رحمان صاحب گنج مراد آبادی کی خدمت میں حاضری دی تھی اور ان سے بیعت ہوئے تھے، پھر ان پر ایک جذبی کیفیت طاری ہوئی اور انھوں نے تمام تعلقات دنیا کو توڑ تاڑ کر اور سب سے پر جھاڑ کر مدینہ طیبہ کا رخ کیا، اور پیدل ہی یہ طویل مسافت طے کر کے خدمت نبوی میں حاضر ہوگئے۔ بارہ سال انھوں نے اسی ذوق وشوق میں گزارے۔ یہی دور تھا کہ جب حضرت مدنی قدس سرہ کے والد گرامی حضرت سید حبیب اللہ صاحب علیہ الرحمہ نے بھی اپنے پورے خاندان کے ساتھ مدینہ طیبہ ہجرت کی تھی، یہ بزرگ بھی حضرت گنج مرادآبادی کے مرید وخلیفہ تھے، حضرت مدنی علیہ الرحمہ اسی نسبت

سے حاجی صاحب کو چچا کہا کرتے تھے۔

بارہ سال کے بعد بارگاہ نبوت سے مبشرات میں حکم ہوا کہ وطن جاؤ، وطن تشریف لائے اور حضرت گنج مرادآبادی کے خلیفہ و جانشین حضرت مولانا شاہ عبدالکریم صاحب علیہ الرحمہ کی خدمت میں حاضری دی، اوران سے اجازت وخلافت سے سرفراز ہوکر، ان کے حکم سے فیض آباد میں بیٹھ گئے، اور وہاں سے ان کا فیض جاری ہوا۔ مولانا کو اپنے دادا کی صحبت بھی خوب حاصل ہوئی، دادا نے طویل عمر پائی۔

ایک تیسرے بزرگ مولانا ضرغام الدین صاحب مظفرنگری تھے، جنھیں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب نوراللہ مرقدہ نے فیض آباد بھیجا تھا۔ یہ مولانا کے ابتدائی استاذ تھے، انھوں نے مولانا کو نصیحت فرمائی تھی ’’بیٹا! جہاں تمہارا علم مطمئن ہو، بیعت وہاں ہونا‘‘۔ مولانا نے اس بات کو گرہ میں باندھ لیا تھا۔

۱۹۴۰ء میں جب مولانا اوران کے بڑے بھائی دارالعلوم دیوبند سے حضرت مدنی کی درس گاہ سے فارغ ہوکر اٹھے، تو جو کچھ پڑھا تھا، اس کا اطمینان کامل استاذ کے یہاں ملا، اس وقت علما و مشائخ طریقت بہت تھے، خود مولانا کے دادا شیخ کامل تھے۔ مولانا کے وطن میں مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب کا آغاز تھا، مگر مولانا استاذ محترم کی درس گاہ میں بیٹھ کر انھیں کی محبت وعقیدت میں جذب ہو چکے تھے۔ فراغت کے بعد انھیں سے بیعت ہوئے، مگر تصوف کے اشغال میں لگنے کا باقاعدہ موقع نہ ملا، علم ومطالعہ، تدریس وتصنیف، قومی وملی اور اجتماعی مسائل کی مشغولیت ایسی رہی کہ یکسوئی اور سکون جس کی ضرورت سلوک وتصوف کے مشاغل میں ہوتی ہے، انھیں اس کے لمحات میسر نہ آئے۔ بیعت اور ابتدائی تسبیحات کے بعد حضرت نے پاس وانفاس کی مشق وتمرین تک پہونچایا تھا، اس کے آگے باقاعدہ بڑھنے کی نوبت نہیں آئی تھی، تاہم اس بیعت و صحبت کا اثر یہ تھا کہ دین وشریعت کے علوم واعمال میں مولانا کو انتہائی پختگی اور رسوخ کا ملکہ تھا، بزرگوں سے عقیدت ومحبت بدرجہ اتم تھی، طریقت وسلوک کی ضرورت محسوس کرتے تھے، اپنے شاگردوں کو کسی بزرگ کے دامن فیض سے وابستہ ہونے کا مشورہ ضرور دیتے تھے۔

فراغت کے سال مجھ سے فرمایا تھا کہ تم بھوپال مولانا محمد یعقوب صاحب مجددی کے

پاس چلے جانا، لیکن اسی سال میری فراغت سے پہلے ان کا وصال ہوگیا، تب مولانا نے مجھ کو بانس کنڈی مولانا احمد علی صاحب خلیفہ حضرت مدنی علیہ الرحمہ کی خدمت میں جانے کا مشورہ دیا، مگر غالبًا بہت دور ہونے کی وجہ سے اور لمبے سفر سے اس وقت میری وحشت کی وجہ سے، اس پر عمل نہ ہوسکا۔

مولانا کے علمی و ذہنی کمالات کے ساتھ ان کی زندگی کا ایک اور رخ عرصہ تک مولانا کی زندگی اور ان کی شہرت پر محیط رہا، یہ رخ ایسا تھا، جس کا تعلق عام حالات میں علم سے نہیں ہوتا، مگر مولانا کی ذہانت وفطانت نے اس میں علم وفن کے گل بوٹے کھلا رکھے تھے۔ مولانا سے واقف ہر شخص جانتا ہے کہ ان کے یہاں تعویذات وعملیات اور جھاڑ پھونک کا زور تھا، حاجت مند بہت دور دور سے مولانا کی خدمت میں آتے اور فائدہ اٹھاتے تھے۔ جب میں امروہہ میں ان کی خدمت میں پڑھتا تھا، اس وقت تعویذات وعملیات کا کچھ زیادہ مشغلہ نہ تھا، مولانا کا زیادہ تر وقت تصنیف و تالیف، مطالعہ وتدریس اور سفر میں گزرتا تھا، کبھی کبھی کوئی حاجت مند تعویذات کے لئے بھی آنکلتا تھا مگر یہ عمل اتنا غالب نہ تھا کہ ان کی کوئی شناخت بن پاتا، البتہ یہ دیکھا کہ تعویذات وعملیات کی بعض کتابوں کا مطالعہ بہت انہماک سے کرتے تھے، مثلاً ایک ضخیم کتاب عربی میں ’’شمس المعارف الکبری‘‘ کو دیکھا کہ مستقل ان کے مطالعہ میں رہتی، یہ تعویذات وعملیات پر ایک مفصل اور ضخیم دائرۃ المعارف ہے، دوسرے امام جلال الدین سیوطی کی کتاب ’’الرحمۃ‘‘۔ ان دونوں کتابوں کا بکثرت مطالعہ کرتے، ان سے نقل واقتباس کرتے، اس دور میں بھی کبھی کبھی حاضرات کا عمل کیا کرتے تھے مگر ہم طالب علموں کو اس سے ذرا بھی مناسبت نہ تھی، اس لئے مولانا کے اس رخ کی جانب کبھی دلچسپی نہ ہوئی۔ یہ بات ۱۹۷۰ء کی ہے۔

اس کے بعد مولانا جہاں جہاں رہے معلوم ہوتا رہا، دیکھتا رہا، سنتا رہا کہ مولانا کا انہماک اس موضوع پر بڑھ رہا ہے، پھر تو یہ حال ہوا کہ مولانا کے اوقات کا روزانہ ایک بڑا حصہ اسی کے نذر ہوتا۔ ۱۵؍سال کے بعد گورینی میں دوبارہ جب مولانا کے ساتھ رہنے کا موقع ملا تو یہ مشغولیت بہت بڑھ چکی تھی، تعلیم کے اوقات میں تو اہتمام تھا کہ اس مشغلہ کو ہاتھ نہ لگاتے، اس کی وجہ سے درس کا نقصان نہ ہوتا، لیکن دوپہر میں جہاں اسباق سے فارغ ہوتے، اہل حاجت کی بھیڑ لگ

جاتی۔ مولانا کی لغت میں نہ آرام کا لفظ تھا نہ معنی، وہ اس وقت ایسا مشغول ہوتے کہ کھانے کا وقت مشکل سے ملتا، دوپہر میں آرام کرنے یا سونے کا مسئلہ ان کی کتاب زندگی میں درج نہیں تھا کہ اس کا اہتمام کرتے، ایسے ہی عصر کے بعد، مغرب کے بعد یہ سلسلہ چلتا رہتا، عشاء کی نماز کے بعد یہ کام بند ہو جاتا، پھر کتابوں اور تصنیف و تالیف میں لگ جاتے، اور اس میں رات کا ایک بج جاتا، دو بج جاتے۔ شاید ارادہ کر کے نہیں سوتے تھے، جب نیند کا غلبہ ہوا سو گئے، بستر وغیرہ کی قید سے عموماً آزاد رہتے، فجر سے پہلے اٹھ جاتے، پھر تمام دن سونے کی نوبت نہ آتی۔

مجھے اس موضوع سے بالکل دلچسپی نہیں ہے، اس لئے مولانا جب اس مشغلہ میں ہوتے تو میں وہاں سے اٹھ جاتا، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ باوجود مناسبت نہ ہونے کے میں بھی اس میں مبتلا ہوں، اور اس موضوع پر اچھا خاصا بدنام ہوں۔ مولانا نے کبھی کبھی مجھ سے فرمایا کہ اس طریقہ کو سیکھ لو، بالخصوص حاضرات کا عمل مگر اس میں وقت بہت لگتا ہے، اور نہ جانے اس میں کون سی مخلوق دکھائی دیتی ہے؟ اس کے معتبر اور نامعتبر ہونے کا کیا معیار ہے؟ اس سے کام لینے کے اثرات خود عامل پر کیا ہوں گے؟ عامل قوی ہو تب تو خیر، ورنہ اپنا بچاؤ مشکل ہوگا۔ انھیں خیالات کی وجہ سے میں معذرت کر لیتا، بعض تجربوں کی بنیاد پر میں یہ سمجھتا تھا کہ حاضرات کے عمل کا دار و مدار قوت خیال پر ہے، اور قوت خیال پر اعتماد کرنا گویا اپنے ہی خیال پر اعتماد کرنا ہے۔ اس کو معیار بنانا، اس کو بیماری، سحر، آسیب کے جاننے کا ذریعہ بنانا کتنا مناسب ہے؟۔

مولانا کبھی حاضرات کا ذکر کرتے تو میں بطور لطیفہ کے کہتا کہ حضرت! ہم لوگ اس لئے نہیں ہیں کہ جنات وغیرہ کو حاضر کریں، بلکہ ہمارا کام یہ ہے کہ انھیں غائب کریں، مولانا اسے سن کر خوب مسکراتے، اور از راہ مہربانی کوئی جواب نہ دیتے۔

بعض دفعہ مولانا کے ساتھ رہ کر عجیب عجیب تجربات ہوئے، ایک بار مولانا گورینی سے جونپور تشریف لے جا رہے تھے، میں بھی ساتھ ہو لیا، جونپور میں ایک صاحب اپنے گھر لے گئے، ان کا پندرہ سولہ سال کا ایک لڑکا بیمار تھا، بظاہر صحت مند تھا، مگر حس و حرکت سے بے نیاز چادر اوڑھے پڑا تھا۔ مولانا نے اس پر کچھ پڑھ کر دم کیا تو اچانک اٹھ کر بیٹھا، اور پھر گھر کے کاموں میں مشغول ہو گیا۔ ہم لوگوں کی خدمت کرتا رہا، کھانا کھلانے میں شریک رہا، ظہر کا وقت ہوا تو ہم لوگ

قریب کی مسجد میں گئے، وہ بھی گیا۔ ہم لوگ نماز سے فارغ ہوکر آئے تو یہ ہوا کہ وہ پہلے آ گیا تھا اور اب وہ اللہ جانے گھر کے کھپریل پر کس طرح پہونچ گیا تھا؟ اور اس پر ہنگامہ کر رہا تھا، مولانا نے پھر کچھ پڑھا تو وہ کھسکتا ہوا نیچے آ گیا، میں سمجھ رہا تھا کہ گرے گا تو سخت چوٹ آئے گی، مگر وہ اس طرح سے آہستہ سے نیچے آیا جیسے کسی نے اسے سہارا دے کر زمین پر رکھ دیا ہو۔ اب اس کے دونوں پاؤں بیکار تھے، بالکل مفلوج، اس سے اٹھنے کے لئے کہا گیا تو حرکت بھی نہ کرسکا، پاؤں بالکل ڈھیلے اور بے جان تھے، گھر والوں نے اسے اٹھا کر بستر پر لٹا دیا۔ مولانا نے کالی مرچیں منگوائیں، ان پر معوذتین پڑھ کر دیر تک دم کرتے رہے، اور ایک برتن میں پانی منگوا کر ان میں ان مرچوں کو گھستے رہے، پھر گھر والوں سے کہا کہ اس پانی کو مریض کی آنکھ میں لگاؤ، پانی کا لگانا تھا کہ اس کے پاؤں درست ہوگئے، اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں حیرت سے دیکھ رہا تھا، میں نے مولانا سے پوچھا کہ یہ کیا تھا؟ فرمایا کہ اس پر جنات کا اثر ہے، جنات اس پر سحر کرکے بھاگ گئے تھے، اب یہ ٹھیک ہے۔ اس کے بعد کچھ دیر تک ہم لوگ وہاں رہے، وہ بچہ ٹھیک ٹھاک رہا، پھر ہم لوگ جامعہ حسینیہ جونپور چلے گئے، جہاں ہمیں جانا تھا۔

مولانا کے یہاں اس طرح کے آسیبی اور سحر زدہ مریضوں کا تانتا بندھا رہتا تھا، اور مولانا ان کا علاج کرتے تھے، علاج زیادہ تر کامیاب رہتا۔

لیکن اس علاج کا ایک مضر پہلو یہ تھا کہ جو ساحر یا جن اس علاج کی زد میں آتا تھا، وہ علاج کرنے والے کا دشمن ہوجاتا تھا۔ مولانا نے کئی بار بتایا کہ کسی ساحر نے یا جن نے پلٹ کر مولانا پر حملہ کرنے کی کوشش کی۔ ایک مرتبہ مدرسہ دینیہ غازی پور میں مولانا تشریف لائے، دیکھا کہ دائیں ہاتھ کی کلائی پر پٹی بندھی ہوئی ہے، اور مولانا لکھنے کا کام بائیں ہاتھ سے کررہے ہیں، میں نے پوچھا تو ٹال گئے، میں اصرار نہیں کرسکتا تھا۔ رات کو جب کاموں سے فراغت ہوئی تب انھوں نے بتایا کہ ایک روز رات کو نیند سے بیدار ہوا تو مجھے محسوس ہوا کہ غسل کی حاجت ہے، میں اٹھ کر غسل خانے کی طرف چلا، تو ایسا لگا کہ کسی نے مجھے زور سے ڈھکیل دیا، میں بے تحاشہ گر گیا، اور کلائی ٹوٹ گئی، بعد میں ایک جن نے بتایا کہ فلاں جن کو آپ نے ایک مریض سے ہٹایا تھا، وہ آپ کے پیچھے پڑا ہے، آج اسے موقع مل گیا تو بدلہ لے لیا۔

مولانا نے بتایا کہ وہ تحفظ کے لئے فلاں فلاں دعائیں پڑھتے ہیں، مگر جنابت کی حالت میں اجنہ کو کسی قدر موقع مل جاتا ہے اور وہ قریب آجاتے ہیں۔ مولانا بہت طاقتور تھے، اس لئے موذی اثرات ان پر کم آتے تھے، لیکن خطرہ رہا کرتا تھا۔

اس موضوع پر اب سے پہلے مولانا ابوالوفا صاحب شاہجہاں پوری بھی بہت کامل تھے، اور غالباً مولانا نے ان سے بھی اس فن کو کچھ حاصل کیا تھا۔ مولانا سے اکثر میں نے مولانا شاہجہاں پوری کا نام اور تذکرہ سنا ہے، بعض تعویذ وعملیات میں ان کا حوالہ بھی دیتے تھے۔

مولانا سے اس میدان میں بہتوں کو فائدہ پہونچا ہے، حضرت مولانا سید صدیق احمد صاحب باندوی، اور مولانا افضال الحق صاحب قاسمی اس موضوع پر دو مستند نام تھے، جن کی خدمت میں لوگ اپنی حاجات کے لئے بے تکلف جاتے تھے، اور کامیاب ہوتے۔ ان حضرات نے خدمت بہت کی مگر اس خدمت کا کبھی معاوضہ نہیں لیا، معاوضہ تو درکنار کبھی معاوضہ کا تصور بھی نہیں کیا، کسی طرح کا تکلف نہیں کیا۔ سچائی اور سادگی دونوں بزرگوں کا شعار تھا، چلتے پھرتے، سفر وحضر ہر جگہ مخلوق خدا کو فائدہ پہونچاتے، اور اس کا خود کوئی فائدہ نہ اٹھاتے تھے۔

مولانا کی داستان طویل ہے اتنا کچھ لکھنے کے بعد بھی مجھ کو محسوس ہو رہا ہے کہ کئی چیزیں نہیں لکھ سکا، اور وہ چیزیں نہیں لکھ سکا جو مولانا کی خصوصیات خاصہ تھیں۔ میں تلاش کر رہا تھا کہ کسی نے کچھ لکھا ہو تو اس کو اپنی اس تحریر کا حسن خاتمہ بناؤں، مولانا عزیز الحسن صدیقی غازی پوری نے مولانا کی یاد میں ”تذکیر“ کا ایک خصوصی نمبر شائع کیا ہے، اس کی ایک تحریر کا اقتباس تذکیر کے شکریہ کے ساتھ حسن اختتام بناتا ہوں:

> ”ہمارے ممدوح ومکرم مولانا افضال الحق جوہر قاسمی علماء کی اس صف سے تعلق رکھتے ہیں جس نے ملک کی آزادی اور قومی تعمیر وترقی کے محاذ پر زبردست قربانیاں دیں، اور جام شریعت اور سندان عشق دونوں کو سنبھالے رکھا۔ وہ جہاں بھی رہے، جس حال میں رہے، دونوں منصب کا حق ادا کرتے رہے، درس وتدریس سے بھی وابستہ رہے، طلبہ کی تربیت اور کردار سازی میں بھی مصروف رہے، اور ساتھ ہی ساتھ سیاسی مشاغل سے بھی سروکار رکھا۔ مسلمانوں میں سیاسی شعور بیدار کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ وہ مولانا آزاد کے اس قول کو رہنما سمجھتے تھے کہ:

''مسلمان کاسہ لیسی کی زندگی اختیار نہ کریں''

وہ اس بات کو مانتے تھے کہ:

''اس ملک میں ہم جو اجلے نقوش دیکھتے ہیں وہ ہمارے ہی اسلاف کے لائے ہوئے تھے، اور یہ کہ اس ملک کے دروبست پر مسلمانوں کا اتنا ہی حق ہے جتنا کسی اور کا ہوسکتا ہے۔''

مولانا مرحوم کے دل میں جو کچھ ہوتا تھا، وہی زبان پر بھی ہوتا تھا، وہ ہمیشہ خدالگتی کہتے، کون ان کی باتوں سے خوش ہوتا ہے؟ کون ناک بھوں چڑھاتا ہے؟ اس کی انھوں نے کبھی پرواہ ہی نہیں کی، حتی کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اپنوں نے ہی انھیں حق گوئی کی پاداش میں کنارے لگادیا، مگر ان کے اندر جو ''جوہر'' تھا وہ کسی انسان کا عطا کردہ نہیں بلکہ عطیہ الٰہی تھا، وہ اپنے مقام ومنصب سے آگاہ تھے، اور آخری دم تک اس کا حق ادا کرتے رہے۔ انھوں نے اپنے پیچھے اپنے عزیزوں، جاں نثاروں، شاگردوں اور معتقدوں کی ایک اچھی خاصی جماعت چھوڑی ہے، جو صرف درس وتدریس ہی کا کام نہیں کررہی ہے، بلکہ قیادت وسیادت کا بھی فریضہ انجام دے رہی ہے۔''

اعجاز احمد اعظمی
۱۵؍رجب المرجب ۱۴۳۴ھ
۲۶؍مئی ۲۰۱۳ء

* * *

دل معرفت ومحبت کا مرکز ہے، اس میں صرف یہی سرمایۂ گراں قدر ہونا چاہئے، باقی سب فضول ہے۔ لوہا اگر آگ میں ڈال دیا جائے اور آگ کو خوب دھونکا جائے تو تھوڑی دیر میں لوہا غائب، صرف آگ ہی نظر آئے گی، یوں ہی سمجھ لیجئے کہ دل کو ذکرِ الٰہی کی حرارت میں اتنا تپایا جائے دل غائب ہوجائے، صرف ذکر ہی رہ جائے۔ (حدیث دوستاں)

جانشین مصلح الامت

(حضرت مولانا شاہ قاری محمد مبین صاحب مدظلہ)

عارف باللہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب نور اللہ مرقدہ

۱۳۹۴ھ کے موسم سرما میں ایک سہ پہر کو دو نو وارد الہ آباد حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ کی خانقاہ کے زینے پر چڑھ رہے تھے، ایک لمحے کے بعد وہ ایک وسیع کمرے میں کھڑے ایک صاحب سے دریافت کر رہے تھے کہ حضرت قاری صاحب سے ملاقات ہو سکتی ہے؟ انھوں نے اشارہ سے بتایا کہ مشرقی جانب آخری کمرے میں تشریف رکھتے ہیں، لپک کر اشتیاق میں وہاں پہونچے، پانچ چھ افراد ایک دائرہ میں بیٹھے تھے، مجلس میں خوشگوار قسم کی سنجیدگی چھائی ہوئی تھی، ایک صاحب شیروانی پہنے صدر میں بیٹھے تھے مگر حلیہ اور طرز لباس صاف بتلا رہا تھا کہ مطلوب یہ بزرگ نہیں ہیں۔ حاضرین نے استفہامیہ نگاہیں نو وارد کے چہرے پر جما دیں، نو وارد نے سلام و مصافحہ کے بعد اپنا مختصر تعارف کرایا۔ یہ نو وارد خاکسار راقم الحروف تھا اور ایک رفیق سفر بھی ساتھ میں تھے۔ حاضرین میں سے ایک بزرگ سے مراسلاتی تعارف تھا، وہ کھل اٹھے تھوڑی دیر بعد میں بھی اس مجلس کا ایک فرد بن گیا، لیکن نگاہیں اپنے مطلوب کے جستجو میں ہر ایک کے چہرے پر بار بار اٹھ رہی تھیں۔ دروازہ کے پاس ایک بزرگ پرانا اونی کرتہ پہنے، گول چوگوشیہ ٹوپی زیب سر کئے، گردن جھکائے خاموش بیٹھے تھے، بڑی بڑی خمار آلود آنکھیں شراب محبت کی مستی کا پتہ دے رہی تھیں، کشادہ پیشانی، سر پر سجدہ کا ہلکا سا نشان، جبین آسمان پر چاند معلوم ہو رہا تھا، بڑا سا چہرہ، اس پر مختصر سی داڑھی عجب محبوبیت کی شان لئے ہوئی تھی، تواضع و مسکنت کے

باوجود ہزاروں عظمتیں قدموں پر نثار ہو رہی تھیں۔ دل بار بار سرگوشی کر رہا تھا کہ ہو نہ ہو یہی تمہارے مطلوب ہوں، لیکن دیکھنے سے پہلے ذہن اور تخیل نے جو بھاری بھرکم سراپا تراش رکھا تھا، اس کے مطابق نہ پاکر طبیعت کی کشمکش کوئی فیصلہ نہیں کرنے دے رہی تھی۔ پوری مجلس یہ بزرگ خاموش بیٹھے رہے، گفتگو کے دوران صرف ایک بار زبان تکلم کھولی اور یہ مصرعہ ارشاد فرمایا:

حقا کہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

مجلس کے خاتمے پر عقدہ کھلا کہ یہی بزرگ مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب علیہ الرحمۃ کے داماد اور جانشین حضرت مولانا قاری شاہ مبین صاحب مدظلہ العالی ہیں، جن سے ملاقات کی غرض سے غازی پور سے الہ آباد کا سفر اختیار کیا گیا تھا۔

حضرت قاری صاحب کی عمر لگ بھگ ۴۵ سال ہے، اصل باشندے ضلع اعظم گڑھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں ''کاری سات'' کے ہیں۔ اوائل عمر ہی سے سعادت کے آثار ہویدا تھے، حضرت مولانا وصی اللہ صاحب کا وطن کاری سات کے قریب فتح پور تال نرجا تھا، مولانا کی نگاہ انتخاب ابتدا ہی میں حضرت قاری صاحب پر پڑی اور جوہر قابل سمجھ کر اپنی تربیت میں لے لیا۔ درس نظامی کی تعلیم بتمام وکمال حضرت مولانا کی نگرانی میں مکمل کی، زیادہ تر کتابیں مولانا نے خود پڑھائیں۔ پھر وصال تک مولانا نے اپنی صحبت ہی میں رکھا، پنج گانہ نمازوں کی امامت آپ کے سپرد کی۔ حضرت قاری صاحب قرآن حکیم اس والہانہ انداز میں پڑھتے ہیں کہ سننے والا متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، مولانا کو آپ کی قرأت بے حد پسند تھی، اسی بنا پر حضرت قاری صاحب کی موجودگی میں کسی کی امامت پسند نہ فرماتے تھے۔ سفر ہو یا حضر مولانا اپنے اس منظور نظر کو کبھی نگاہوں سے اوجھل ہونے نہیں دیا۔ شیخ کامل کی صحبت میں یہ جوہر کامل کندن بن کر چمک اٹھا، دیکھنے والوں کی نگاہوں نے آغاز کار ہی میں تاڑ لیا کہ یہ خاموش کم آمیز، منحنی سا نوجوان بظاہر ایک معمولی سالک نظر آتا ہے، کل کو آسمان طریقت کا آفتاب وماہتاب بننے والا ہے۔

غالبا ۱۳۷۴ھ یا ۱۳۷۵ھ میں آج سے پچیس سال قبل مولانا عبدالباری صاحب ندوی فتح پور خانقاہ تشریف لے گئے تھے، وہاں کے حالات ایک خط کی شکل میں مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کو لکھے، جو ''صدق'' میں شائع بھی ہوئے۔ ایک جگہ تراویح کا ذکر کرتے ہوئے

لکھتے ہیں:

> ’’اور امام صاحب (مولانا مدظلہ کے داماد) قاری محمد مبین سلمہ کا تو کہنا ہی کیا؟ ماشاءاللہ چہرہ باطنی وبطنی آثار سعادت کا آئینہ، بہت ہی نمایاں اثر السجود سے پرانوار، رفتار وگفتار میں سراپا عجز وانکسار، نماز میں قرأت بالکل دل کی آواز، یہ بے بہرہ ساتھ ہی خاصا بہرہ، آواز کے ساتھ الفاظ کم ہی سن پاتا تھا، لیکن نفس تکبیر ’’اللہ اکبر‘‘ ہی کی لذت وحلاوت ایسی کہ آج تک کانوں میں بسی ہے۔ ختم کے بعد امام سلمہ پر رقت وگریہ کا کچھ ایسا عالم طاری ہوا کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک ساری صفیں زاروقطار تھیں، آہ وبکا سے مسجد کے درودیوار گونج رہے تھے۔
>
> حالتے رفت کہ محراب بہ فریاد آمد
>
> دس پندرہ منٹ تک یہی حالت رہی ہوگی، اور بڑھتی ہی جا رہی تھی، غالبًا حد سے بڑھتی دیکھ کر آخر خود مولانا ہی نے حکیمانہ وحاکمانہ لہجہ میں فرمایا کہ بس مبین بس۔‘‘ (معرفت حق صفحہ ۱۵ جون ۱۹۷۰ء)

یہ پچیس سال قبل کی تحریر ہے، دیکھنے والے اس اجمال کی تفصیل حضرت قاری صاحب مدظلہ کی ذات گرامی میں دیکھ رہے ہیں۔ جو لوگ مولانا کے انداز تربیت سے واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس نوجوان صالح کی کیسی تربیت ہوئی ہوگی! شیخ کے فیضان نظر اور مرید کے جذبہ محبت کے باہمی اتصال نے سلوک وعرفان کی جو منزلیں دم کے دم میں طے کرائی ہوں گی اسے بجز علام الغیوب کے کون جان سکتا ہے؟ دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ مولانا کو اپنے محبوب مرید کے ساتھ کیسا دلی تعلق اور قلبی لگاؤ ہے، اور خود مرید اپنے مرشد کامل کے قدموں پر عقیدت ومحبت کی کیسی پونجی نچھاور کر رہا ہے، اور راہ سلوک میں یہی دو بنیادی زنجیریں ہیں جو سالک کو کھینچ کر عبدیت ونیاز کے اعلی مراتب پر پہونچاتی ہیں۔ یعنی شیخ کامل کی دلی توجہ اور قلبی انشراح، اور مرید صادق کی سچی عقیدت اور صدق طلب۔ یہاں یہ دونوں چیزیں بدرجہ کمال تھیں، طے کرنے والا اندر ہی اندر سلوک کی منزلوں پر منزلیں طے کرتا چلا جا رہا تھا۔ دنیا سمجھ رہی تھی کہ شیخ کامل کا یہ منظور نظر ہے، شرف دامادی کی وجہ سے مرکز توجہ بنا ہوا ہے اور شیخ کامل کی نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ ان کا یہ لاڈلا فرزند ولایت وعرفان کی کن بلندیوں پر پہونچ چکا ہے۔ اللہ اللہ

میان عاشق و معشوق رمزیست
کراماً کاتبیں را ہم خبر نیست

بالآخر دنیا نے دیکھ لیا کہ یہ منحنی نوجوان شیخ کی جانب سے خلعت خلافت سے سرفراز ہوا اور آخر میں قدرت کا فیصلہ شیخ کی جانشینی کے لئے اسی کے حق میں ہوا۔

یوں تو دنیا کسی وقت اللہ کے سچے نام لیواؤں سے اور رسول کے مخلص جانشینوں سے خالی نہیں رہتی، ہر دور میں یہ عاشقان پاک طینت اللہ کے بھٹکے ہوئے بندوں کو اس کے دروازے تک پہونچانے کا فریضہ انجام دیتے رہتے ہیں، مظلوم بے بس انسانیت ان کے سایہ داماں میں پناہ لے کر ایک قلبی و روحانی سکون محسوس کرتی ہے۔ تاہم:

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

کے مصداق ہر بزرگ کا خاص رنگ جدا ہوتا ہے، کسی اللہ والے کے حقیقی مرتبے پر قلم اٹھانا تو سرے سے ممکن ہی نہیں۔ کیونکہ یہ راز ہے جو اللہ اور بندے کے درمیان پوشیدہ ہوتا ہے، تاہم اندرون خلوت کی جلوہ سامانیوں کا کوئی حصہ کبھی کبھی جلوت میں بھی چھلک پڑتا ہے، جس سے ان کے مرتبے کا کسی قدر مبہم سا اندازہ ہو جاتا ہے۔

حضرت قاری صاحب ان خاصان حق میں سے ہیں جو تواضع و مسکنت کی طویل و دبیز چادر میں اپنی عظمت و کمال کی تمام تر خوبیاں پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں۔ آپ کی صحبت میں بیٹھنے والا آپ کے انداز گفتگو، طرز نشست و برخاست اور بے تکلف وضع معاشرت سے بالکل اندازہ نہیں کرسکتا کہ وہ کس باکمال ہستی کے قرب سے شرف یاب ہے؟ یہ قاری صاحب کی وہ جوہری خصوصیت ہے جس کا اندازہ ہر شخص کرسکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے تمام کمالات اپنے اندر نمود و اظہار کا شدید جذبہ رکھتے ہیں۔ ہر صاحب کمال کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ لوگوں تک اس کے کمال کا شہرہ پہنچے اور دلوں پر اس کا سکہ جمے، مگر یہ کمال بالائے ہر کمال ہے کہ آدمی اپنے فضل و ہنر کی تشہیر کا جذبہ فنا کردے۔ راہ سلوک کا یہ بہت ضروری رکن ہے، لیکن خاص خاص لوگ ہی اس رتبہ بلند کو حاصل کر پاتے ہیں۔ حضرت قاری صاحب باوجودیکہ نسبت مع اللہ کے حامل، مستقیم الاحوال بزرگ ہیں، مگر فنائیت و تواضع کا یہ

عالم ہے کہ آپ کے قول وعمل سے کبھی اظہار کمال کی کوئی جھلک محسوس ہو جائے، ناممکن ہے۔ وہ حقیقۃً خود کو بالکل ہیچ اور ہر قسم کے فضل وہنر سے عاری سمجھتے ہیں۔ بارہا ارشاد فرمایا کہ:

''حضرت مولانا (وصی اللہ صاحب) کی حیات میں کبھی یہ وسوسہ بھی نہیں گزرا کہ کوئی وقت ایسا بھی آئے گا جب مجھ پر یہ ذمہ داریاں ڈالی جائیں گی اور اب بھی تعجب ہوتا ہے کہ حضرت نے باوجود میری ناکارگی کے کیوں یہ کار عظیم سونپا۔''

اس تواضع اور فروتنی ہی کا یہ اثر ہے کہ سکوت وخمول آپ کو بے حد پسند ہے۔ ہم جیسے لوگوں میں یہ مرض بہت عام ہے کہ جہاں دو چار الفاظ سیکھ لئے، علم کے نام پر چند معلومات جمع کرلیں، کتابوں کا قدرے مطالعہ کرلیا، بس اپنا حق واجبی یہ سمجھنے لگے کہ ہر جگہ اظہار علم وفضل میں زبان کورواں دواں رکھیں، کوئی مجلس ومحفل ہو، کوئی موقع محل ہو، زبان کی روانی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ حالانکہ محقق علما پر یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ چھوٹی سی اس زبان کی بے تحاشہ حرکت بے شمار مصیبتوں اور بڑے بڑے گناہوں کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ اسی لئے حدیث میں کثرت گویائی سے بہت منع کیا گیا ہے۔ امام غزالی نے زبان سے متعلق بیس آفتیں شمار کرائیں ہیں۔ لوگ اپنی زبان ہی کی وجہ سے بکثرت لقمۂ جہنم بنیں گے۔ گفتگو میں ضروری بات پر اگر اکتفا کیا جائے تو آدمی اپنی قوت اور وقت کا بڑا حصہ محفوظ کر لے گا۔ خواہ مخواہ کی آویزشوں سے بچا رہے گا، اور گناہ کی نجاست بھی اس کا دامن آلودہ نہ کر سکے گی۔ اللہ تعالی نے حضرت قاری صاحب کو یہ خصوصی وصف عطا فرمایا ہے، سوائے ضروری امور کے بہت کم گفتگو فرماتے ہیں۔ آدمی قریب رہ کر دیکھے تو اسے محسوس ہوگا کہ کوئی خاص محویت اور استغراق ہے، جو ہمہ وقت اپنی لذت وحلاوت میں مصروف و منہمک رکھتی ہے۔ آج چونکہ ہر طرف زبان ہی کی فرمانروائی ہے، تھوڑی دیر کی خاموشی محفل کو بوجھل بنا دیتی ہے۔ ہر وقت بولتے رہنا اور مسلسل زبان کو حرکت دئے چلے جانا چونکہ لوگوں کی عادت بن چکی ہے، بلکہ اب تو فضل وکمال کو بھی زبان آوری ہی کے پیمانے سے ناپا اور تولا جاتا ہے۔ اس لئے سکوت کا یہ وصف محمود نامانوس اور اجنبی بن کر رہ گیا ہے، ناواقف شخص اس خوبی کو مورد اعتراض سمجھتا ہے، حالانکہ احادیث میں وارد ہے کہ جس کو خاموش دیکھو اس کے پاس بیٹھو، اسے حکمت تلقین کی جاتی ہے۔ اگر آپ حضرت قاری صاحب کے پاس مسلسل تقریر سننے کی نیت

سے حاضر ہوں گے تو آپ کو مایوسی ہوگی، یہاں آپ کو ایسا سکوت ملے گا جس پر ہزار تقریریں فدا ہوں، کبھی کسی نے سوال کر دیا تو مختصر جواب دے کر اپنے ذکر و فکر میں محو و منہمک ہو جاتے ہیں۔

روزانہ جو مجلس ہوتی ہے اس میں بھی تقریر و خطابت کا کوئی گزر نہیں ہے۔ حضرت تھانوی یا حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب کی تصانیف یا مجالس جو شائع ہو چکی ہیں، حالات کے مطابق انہیں میں سے کوئی مضمون سنا دیتے ہیں، بیشتر اوقات صرف پڑھ دینے ہی پر اکتفا فرماتے ہیں، اور اپنی طرف سے کچھ ارشاد نہیں فرماتے، تاہم تاثیر کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اہل مجلس پر گویا محبت و معرفت کی موسلا دھار بارش ہوتی ہے اور جب وہ مجلس سے اٹھتے ہیں تو نمایاں طور پر اپنے قلوب میں تازگی ایمان میں حلاوت، اور محبت الٰہی کا جوش محسوس کرتے ہیں۔

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ کے وصال کے تھوڑے عرصے بعد حضرت قاری صاحب کے خلاف مخالفت اور بہتان طرازی کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ بعض حاسدین جن کے دلوں میں حضرت موصوف کی مقبولیت کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی، دشمنی و عناد کے اس طوفان میں کود پڑے اور مخالفت میں گفتنی و ناگفتنی کوئی حربہ باقی نہیں چھوڑا۔ بعض مخلصین بھی اس سے متأثر ہو گئے، کتنے لوگ جن کی پاکبازی اور تقدس پر اعتماد کیا جاتا تھا، ان کی زبانیں بدگوئی اور تہمت طرازی کی نجاست میں آلودہ ہو گئیں، لیکن ایک ذات جو استقامت کا کوہ گراں بنی ہوئی یہ ایمان سوز نظارہ دیکھتی رہی اور اپنا دامن داغدار ہونے سے بچائے رکھا، وہ حضرت قاری صاحب کی ذات گرامی تھی۔ الزام تراشی اور ہرزہ سرائی کے سیلاب آگے بڑھتے اور صبر و استقلال کے اس پہاڑ سے ٹکرا کر واپس چلے جاتے۔ الحمد للہ کہ حضرت موصوف آج بھی باعزت و سرخرو ہیں اور معاندین اپنے ہی بچھائے ہوئے دام میں پھنس کر موت کی جاں کنی میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں۔

حضرت قاری صاحب دام مجدہم کا انداز اصلاح اور طریقہ تربیت بھی عجب محبوبانہ ہے اور درحقیقت سنت نبوی کا ایک حسین نمونہ ہے۔ کسی بھی عیب یا بدخلقی وغیرہ کی اصلاح و تعدیل منظور ہوتی تو انفرادی طور پر اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرمانے کے بجائے اکابر اہل اللہ اور زیادہ تر حضرت تھانوی یا حضرت مصلح الامت کا کوئی مضمون جو اس کے مناسب ہوتا ہے، پڑھ کر سنا دیتے ہیں۔ سننے والا اگر ذرا بھی تیقظ و بیداری کا ثبوت دے تو اس کو صاف محسوس ہو جائے گا کہ اس کے

فلاں مرض پر انگلی رکھی جارہی ہے۔ یہ انداز اتنا ناصحانہ اور مشفقانہ ہوتا ہے کہ آدمی لوٹ پوٹ ہوجائے۔ خطوط کے اصلاحی جوابات میں بھی محبت وتعلق کا وہ جذبہ فراواں ملتا ہے کہ سالک اپنی خوبی قسمت پر ناز کرنے لگے۔

حضرت قاری صاحب کی ایک بڑی خصوصیت جس پر ہزار کرامتیں نثار ہوجائیں، آپ کی بے نظیر استقامت ہے۔ حالات کیسے ہی ہوں، صحت کے ایام ہوں یا بیماری کے، حضر کا سکون ہو یا سفر کی پریشانیاں، جاڑے کی کڑکڑاتی سردی ہو یا گرمی کی چلچلاتی دھوپ، عبادات ومعاملات کے جو اصول اور معمولات مقرر ہیں، ان میں کوئی تخلف نہیں ہوسکتا۔ نماز پنج گانہ کی امامت خود فرماتے ہیں، کوئی بتا نہیں سکتا کہ جماعت کے وقت مقررہ سے چند منٹ بھی کبھی تاخیر ہوجاتی ہو۔ اس پابندی میں کوئی موسم اور حادثہ حائل نہیں ہوسکتا۔ اگر کسی وقت مصلے پر حضرت قاری صاحب نظر نہ آویں تو یقین کرلینا چاہئے کہ یا تو کہیں باہر تشریف لے گئے ہیں یا سخت بیمار ہیں کہ مسجد تک تشریف نہیں لاسکتے۔ مغرب کی نماز کے بعد خلوت میں اپنے محبوب حقیقی سے راز و نیاز اور مناجات کا معمول ہے، سفر وحضر کہیں بھی اس محبوب مشغلے میں کوئی فرق نہیں آتا۔ صبح ایک گھنٹہ مجلس میں رونق افروز ہوتے ہیں۔ ممبئی کے زمانہ قیام میں مجلس رات میں ہوتی ہے۔ فتح پور تال نرجا میں اس کا وقت بعد ظہر ہوجاتا ہے، لیکن خواہ کوئی وقت ہو، اس کی پابندی اسی شان استقامت کے ساتھ فرماتے ہیں۔ ان معمولات میں موسم کے تغیرات ہوں، مہمانوں کی کثرت ہو، سفر کا اضطراب ہو، امراض کا ہجوم ہو، خطوط کے انبار ہوں، مخالفین کی شورش ہو، کسی حال میں کوئی انتشار نہیں ہوتا۔ یہ بے نظیر پختگی درحقیقت آئینہ دار ہے اس قلبی استقامت کی جو حق تعالیٰ کی نسبت راسخہ کی برکت سے خاصان حق کے قلب وروح میں پیوست ہوتی ہے۔ قلب کی یہی وہ درستگی ہے جس کے بارے میں حدیث میں فرمایا گیا کہ:

”اذا صلحت صلح الجسد كله“. جب وہ درست ہوتا ہے تو سب درست ہوجاتا ہے۔

یہی وہ استقامت اور اصلاح ہے جس کے بعد قلب ”قلب سلیم“ بنتا ہے، جو اللہ کے نزدیک مدار نفع بخشی ہے۔

”**یوم لا ینفع مال ولا بنون**“. جس دن مال واولاد کچھ بھی نفع بخش نہ ہوں گی۔ ”**الا من اتی اللہ بقلب سلیم**“. ہاں جو اللہ کے پاس قلب سلیم لائے (وہ سودمند ہوگا)

اہل اللہ اور خاصان خدا کے یہاں ایک وصف کمال جس کا مشاہدہ ہر شخص کو عیاناً ہو جاتا ہے، وہ کارساز حقیقی پر صدق توکل اور پرخلوص اعتماد! یہ حضرات معیت الٰہی اور معرفت خداوندی کے اس بلند مرتبے پر فائز ہوتے ہیں، جہاں سے دنیا کی ہر مخلوق معمولی اور حقیر دکھائی دینے لگتی ہے۔ سورج کی روشنی کی طرح انہیں یہ یقین حاصل ہوتا ہے کہ کائنات کا ہر ہر ذرہ قدرت الٰہی کی بے شمار بندشوں میں جکڑا ہوا ہے، اس کے اذن وتصرف کے بغیر نہ کسی کو کچھ نفع پہونچ سکتا ہے اور نہ کوئی نقصان ہوسکتا۔ اسی یقین وتوکل کے بدولت جب مصائب کا ہجوم اور آفات کا تلاطم بڑے بڑے شہ زوروں اور مدبروں کے پاؤں میں لرزہ ڈال دیتا ہے، اس وقت بھی یہ حضرات ہجوم بلیات کی طغیانی میں مسکراتے رہتے ہیں۔ ان کی نظر حوادث کے بجائے خالق حوادث پر ہوتی ہے، جو ان پر مسلسل فضل وکرم اور الطاف وعنایات کی بارش برساتا رہتا ہے۔

ہر دم جو مصائب میں مَیں ہوں رہتا خوش وخرم
بیٹھا کوئی دیتا ہے تسلی میرے دل کو

حضرت قاری صاحب کو یہ وصف کمال رب کریم کی بارگاہ سے جس پیمانہ پر عطا ہوا ہے ہم جیسے کورانِ بصیرت تو اس کا اندازہ بھی نہیں کرسکتے۔ مختلف نوع کی بلاؤں، امراض اور دوسرے عوارض کا جیسا گوناگوں ہجوم حضرت پر اور حضرت کے متعلقین پر رہتا ہے، اس کا تھوڑا سا حصہ دوسروں کا زہرہ آب کرنے کے لئے کافی ہے، مگر واہ رے ہمت واستقلال! کیا مجال کی زبان پر حرف ملال آجائے۔ سب کچھ صبر وسکون کے ساتھ جھیلتے رہتے ہیں اور پاس والوں کو بھی خبر نہیں ہوتی کہ اس مرد خدا پر کیا گزر رہی ہے؟۔

حضرت کے صدق توکل کا ایک نمونہ آپ کا مدرسہ یعنی وصیۃ العلوم بھی ہے۔ اس مدرسہ میں ابتدائی تعلیم سے لے کر ہدایہ، جلالین تک کا انتظام ہے۔ یہ مدرسہ ملک کے اور عربی مدارس سے مختلف ہے، جن اصولوں پر حضرت تھانوی اور حضرت مصلح الامت مدرسے کا بندوبست رکھتے تھے، ٹھیک انہیں اصولوں پر یہ آج بھی گامزن ہے۔ آج کے دور میں جبکہ دین اور علم دین کو ایک غیر

ضروری اور زائد شے سمجھنے کا رجحان بڑھتا جارہا ہے، علماء نے علم دین کی بقا کے لئے جگہ جگہ عربی مدارس قائم کررکھے ہیں لیکن ان مدارس کو چلانے اور ترقی دینے کے لئے جو کچھ جتن کرنے پڑتے ہیں، اسے وہی جانتے ہیں جن کے کاندھوں پر اس کا بوجھ ہے۔ پورے سال مدارس کے سفرا حصول چندہ کے لئے ملک بھر کا دورہ کرتے ہیں، اہل ثروت کے دروازے پر مدرسے کی ضروریات لے کر جاتے ہیں، مختلف پمفلٹ اور اشتہارات نیز جلسوں کے ذریعہ عوام کی توجہات مدرسے کی جانب مبذول کرتے ہیں، پھر رمضان شریف میں مہتمم و مدرس حضرات بھی فراہمی مالیات کی اس کاوش وکاہش میں پوری قوت کے ساتھ شریک ہوجاتے ہیں، اس پر قلت سرمایہ کی شکایت باقی رہ جاتی ہے اور بہت سے کاموں کے منصوبے رکاوٹوں کی نذر ہوکر رہ جاتے ہیں۔ کبھی مدرسین کی تنخواہیں چڑھ جاتیں ہیں اور کبھی طلبہ کے آٹے دال کا ذخیرہ جواب دے جاتا ہے۔ ان حالات میں یہ حضرت قاری صاحب کے صدق توکل ہی کی برکت ہے کہ آپ کے مدرسے سے نہ کبھی کوئی سفیر بھیجا جاتا ہے، نہ کسی رئیس کبیر سے چندہ کا مطالبہ کیا جاتا ہے، نہ رمضان شریف میں مدرسین کی تگ ودو ہوتی ہے، نہ کسی کے دروازے پر طلبہ بھیجے جاتے ہیں، نہ تشہیر کے ذرائع استعمال کئے جاتے ہیں، حتی کہ رمضان شریف میں کسی قسم کے اشتہار بھی نہیں شائع کئے جاتے۔ خوشی سے جو چندہ دیتا ہے قبول کرلیا جاتا ہے۔ چندہ دہندگان کو باقاعدہ رسید بھی نہیں دی جاتی، مخلصین حضرت کے اعتماد پر چندہ پیش کرتے ہیں اور انہیں صحیح مصرف پر خرچ کیا جاتا ہے۔ اتنے بڑے مدرسہ کا نظام اس پیمانہ پر نہایت حیرت انگیز ہے! درحقیقت اللہ کی شان ربوبیت کا مظہر ہے، پچاس سے زائد طلبہ مدرسہ سے وظیفہ پاتے ہیں اور دس بارہ مدرسین معقول مشاہرہ پر مدرسہ کی خدمات انجام دیتے ہیں، اور الحمد للہ سال بسال مدرسہ کا نظم ونسق بحسن وخوبی انجام پاتا چلا جاتا ہے۔ دیکھنے والا سمجھ سکتا ہے کہ مدرسہ کا یہ نرالا نظام توکل علی اللہ کی کس درجہ قوت کا پتہ دیتا ہے۔ عام لوگ جب عالم اسباب کی تگ ودو میں مصروف ہوتے ہیں تو یہ مرد حق آگاہ مسبب الاسباب کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اور مانگنے والے کو وہاں سے سب کچھ مل جاتا ہے۔

یہ مدرسہ تو علوم ظاہری کی درسگاہ ہے جس میں حضرت کے رفقاء کار حضرت ہی کے سایہ عاطفت میں نشر علوم دین میں مشغول ہیں۔ اسی کے دوش بدوش علوم باطنی کی تعلیم، تزکیہ نفس اور تربیت اخلاق کے لئے خانقاہ بھی قائم ہے۔ متوسلین وسالکین دور دور سے آتے ہیں اور اپنے دامن

میں بقدر وسعت وظرف گوہر مراد سے بھر کر لوٹتے ہیں، جو لوگ حاضر نہیں ہوسکتے وہ خطوط کے ذریعہ رابطہ قائم رکھتے ہیں اور شیخ کامل کی توجہ کیمیا ساز سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ سفر سے گوکہ بہت وحشت ہوتی ہے تاہم خدام کے اصرار پر سال میں ایک دو بار گورکھپور، اعظم گڑھ وغیرہ کا سفر فرماتے ہیں اور جس جگہ بیٹھ جاتے ہیں وہیں خانقاہ بن جاتی ہے، دورونزدیک سے تشنہ کامان محبت آ آکر اس ساقئ بادۂ معرفت کو گھیر لیتے ہیں اور پھر صہبائے محبت کے دور چلنے لگتے ہیں، گورکھپور، فتح پور، کوپا گنج، مبارکپور، پورہ معروف کے مناظر بڑے روح پرور ہوتے ہیں۔ دنیاوی الجھنوں اور پریشانیوں کی بھٹی میں سلگتا ہوا انسان جب اس پیکر محبت کے جاں نواز حلقے میں پہونچتا ہے تو اسے اپنے قلب وجگر میں ایک عجیب رونق اور فرحت واطمینان محسوس ہونے لگتا ہے۔ خانقاہ کا یہ ماحول اضطراب وبے چینی کے سمندر میں رحمت وسکینت کا ایک جزیرہ معلوم ہوتا ہے جہاں رحمت الٰہیہ کی موسلا دھار بارش ہوتی ہے۔ شیخ کی نگاہوں کا ایک ہلکا سا التفات سالکین کو باغ وبہار بنا دیتا ہے اور روح میں حلاوت ولذت کی گھلاوٹ محسوس ہونے لگتی ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے بھی کوئی پہونچ جاتا ہے تو اس لمحہ کو سرمایہ زندگی اور حاصل عمر تصور کرتا ہے اور ہمیشہ اس کی لطف وشیرینی کو یاد کرتا رہتا ہے اور دوبارہ حاضری کی تمنا دل میں ہوتی رہتی ہے۔

نہ جانے اس مردکم سخن کی نگاہوں میں کیا تاثیر ہے کہ قلوب محبت واُنس کی زنجیروں میں بندھے کھنچتے چلے آتے ہیں اور محبوب کا ایک خندۂ زیرلب دلوں کی دنیا زیروزبر کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ نگاہ محبت کے اشارے کچھ عشاق ہی سمجھتے ہیں:

لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

حضرت کی صحبت ومجلس کی خصوصیات کوئی کہاں تک بیان کرے؟ کوئی ایک شان ہوتو بیان بھی ہوسکے، یہاں تو ہر ہر ادا دامن دل کو کھینچتی ہے کہ جان وتن قربان کرو:

زفرق تابقدم ہر کجا می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

اعجاز احمد اعظمی ۲۷؍صفر ۱۴۰۰ھ

◆ ◆ ◆

اندھیرے کی اولاد

از.........مرزا شاہین صحرائی

آج نہ جانے کیا خطا سرزد ہوئی تھی کہ علی الصباح مولوی بہرام علی غریب خانہ پر طلوع ہوئے، موصوف غیر مقلد قسم کے آدمی ہیں، ہر نامعقول چیز کو پسند کرتے ہیں اور معقول بات سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ لمبا تڑنگا قد، بے ڈول موٹاپا، گردن قد کے لحاظ سے بہت چھوٹی، سر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پہاڑ کے اوپر ہنڈیا رکھی ہوئی ہو، رنگ خوفناک حد تک سیاہ!

میں ان کی غیر متوقع آمد پر گھبرا سا گیا، اپنے آپ کو ان کا سامنا کرنے کے لئے تیار کر ہی رہا تھا کہ وہ یکا یک میری کمزور سی چار پائی پر اس زور سے نازل ہوئے کہ اس کی ہر چول بلبلا اٹھی۔

''خیریت تو ہے''؟ میں سراسیمہ ہوکر پوچھا۔

''جی! بالکل خیریت ہے''۔ یہ کہتے کہتے ایک ہولناک مسکراہٹ ان کے بھدے لبوں تک آکر رک سی گئی۔ ناک سکوڑ کر کہنے لگے:

''احناف اینڈ کمپنی نے اودھم مچا رکھی تھی کہ دیہات میں اور چھوٹے گاؤں میں جمعہ جائز نہیں ہے۔ اب ایک شیر ہمارے ہاتھ آیا ہے، ایک دیہات ہی سے ہمیں یہ جیالا دستیاب ہوا۔ کہتا یہ بھی اپنے آپ کو حنفی ہے، مگر احناف کی مٹی پلید کر کے رکھ دی ہے۔ تم بھی گورینی کے مفتیوں کے چکر میں پھنسے ہوئے ہو، دیکھو یہ رسالہ نمبر ایک '**تاج الوری فی تحقیق الجمعه فی المدن والقری**'' اس میں دلائل سے ثابت کیا گیا ہے کہ احناف کے مسلک کے لحاظ سے دیہات میں جمعہ واجب ہے۔''

ویری گڈ........میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ اب تک تو میں نے یہی سنا تھا کہ احناف کے نزدیک دیہات میں جمعہ درست نہیں ہے۔ اچھا یہ رسالہ جزیرہ پہونچا یا نہیں؟

''ہاں جزیرہ پہونچا تھا''۔ انہوں نے فخر سے فرمایا۔ تمہارے مفتی، ارے وہ بکری والے، ان کی جو شامت آئی تو اس کا جواب انہوں نے لکھ مارا۔ جواب اگرچہ تحقیقی اور لاجواب تھا، مگر ہمارا شیر بپھر گیا۔ اس نے ایسا رد لکھا کہ تمام حنفیوں کا ذائقہ بدل جائے گا اور نام بھی ایسا عجیب رکھا کہ تمہارے پرکھوں نے بھی نہ سنا ہوگا۔

کیا نام ہے؟ میں نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

کان کھول کر سنو! یہ کہہ کر انہوں نے اپنے منہ کا زاویہ کچھ اس انداز سے بدلا جیسے کتابچہ کا نام پڑھنے کے لئے منہ کو ورزش کرا رہے ہوں۔

''تحفة المفتاق فی تحقیق الجمعه فی الرستاق''

مولانا! میں نے گھبرا کر کہا۔ خدارا میرے حال پر رحم کیجئے۔ ابھی میں نے چائے تک نہیں پی۔ خالی پیٹ ایسے وزنی اور گرانڈیل نام کی تاب نہیں لا سکتا۔

ابھی کیا ہے؟ موصوف چہکے۔ مصنف کا نام سنو گے تو تمہاری ہڈیاں تک چیخ اٹھیں گی۔

ٹھہریئے! میں ذرا چائے اور ناشتہ کی فرمائش گھر میں کر دوں۔ میں نے عاجز ہو کر کہا۔

چائے ناشتہ رہنے دو، مجھے فرصت نہیں ہے۔ پہلے مصنف کا نام سن لو۔

''تاج السفہاء، رئیس الحمقاء، عدو العقل والعقلاء، جاموس العلم والعلماء، کانِ غلاظت، مجسمہ جہالت، خان بہادر، علامہ دیجور خان، الملقب بہ مفتی............ایم، اے، سوشیالوجی، بی، ایس، سی، ایگری کلچر، اور فاضل دیوبند۔

میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میں نے حیرت سے پوچھا!

''کیا یہ سب نام ایک شخصیت کے ہیں؟''

پھر کیا۔ مولوی صاحب خوش ہو کر بولے۔ ابھی یہی کیا؟ اور بھی بہت سے نام ہیں۔ عربی میں بھی، فارسی میں بھی، اردو اور انگلش میں بھی۔ میں نے تو صرف چند نام لئے ہیں، اور سنو گے تو تمہارے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔

ارے صاحب! میرے تو اٹھائیس طبق روشن ہو گئے۔ آپ یہ دونوں کتابچے لیتے جائیے، میں ان سے محروم ہی رہنا چاہتا ہوں۔

خاموش رہو! مولوی صاحب غرائے۔ تمہارے ہی لئے لایا ہوں۔ تم بڑے معتقد ہو نا؟ جزیرہ والے مفتی کے۔ دیکھو یہ ہمارے علامہ دیجور نے کیسی ان کی حجامت بنائی ہے؟

مولانا! میں کان پکڑتا ہوں۔ جزیرہ والے مفتی سے اب اعتقاد نہ رکھوں گا۔ اب تو انہیں لے جائیے، اور میرے اوپر کرم فرمائیے۔

تم بہت فریبی ہو۔ مولوی صاحب نے پھر مسکرانے کی کوشش کی۔ میں یہ دونوں کتابچے چھوڑے جا رہا ہوں۔ انہیں غور سے پڑھو، تمہارے مفتی صاحب کی حقیقت آئینہ ہو جائے گی، اور حنفیت کی پوشیدہ سلوٹیں بھی نظر آ جائیں گی۔

یہ کہہ کر وہ چل دئے۔ میں نے کسی قدر اطمینان کا سانس لیا۔ وہ عجلت میں تھے، ورنہ میرے دماغ کی رگیں جب تک ادھیڑ نہ لیتے، ہرگز نہ جاتے۔

میں نے رسالہ نمبر ایک اٹھایا۔ اس کا نام تو ذہن میں آ گیا، مگر اندر مضمون پڑھا تو ایسا محسوس ہوا، جیسے کوئی مجذوب جامع مسجد دلی کی سیڑھیوں پر کھڑا بڑ ہانک رہا ہو۔ اس قدر بے ربط، منتشر، اور زبان اس درجہ کج مج اور نامانوس کہ جی چاہا کہ رسالہ پھینک دوں، اور ابھی جا کر خان بہادر، علامہ بقلم خود سے کہوں کہ جب آپ تحریر کی ابجد بھی نہیں جانتے تو امت کو مصیبت میں کیوں ڈالا؟ مگر پھر ڈرا کہ خان بہادر نے بہادری کا مظاہرہ شروع کر دیا، تو میری بیوی بچوں کو کون دیکھے گا؟ بس صبر کا گھونٹ پیتا رہا اور دل و دماغ پر ظلم کر کے پڑھتا رہا۔

اس رسالہ میں دو مضامین ہیں۔ ایک تو قبلہ کا طبع زاد ہے، جو بے ربطی کا شاہکار ہے۔ اور دوسرا حضرت مولانا قاسم نانوتوی علیہ الرحمہ کے ایک فارسی مکتوب کا ترجمہ ہے۔

مثل مشہور ہے کہ ''پڑھیں فارسی، بیچیں تیل'' موصوف نے فارسی پڑھنے سے زیادہ تیل بیچا ہے۔ اس لئے ترجمہ ایسا کیا ہے کہ اگر حضرت نانوتوی دوبارہ زندگی پا کر تشریف لائیں، اور یہ ترجمہ ملاحظہ فرمالیں، تو یقین ہے کہ بے تامل اپنے مکتوب سے دستبرداری، اور بیزاری کا اعلان فرما دیں گے۔

خیر جوں توں کر کے ایک رسالہ تو پورا کر لیا۔ گو ہاتھ کچھ نہیں لگا۔ ع

مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

پھر دوسرا رسالہ اٹھایا، لیکن اس کے نام ہی سے ذہن و دماغ کو ایسا جھٹکا لگا کہ میں گھبرا کر اپنا سر سہلانے لگا کہ خدانخواستہ کوئی رگ کھسک تو نہیں گئی۔

ناظرین! نام کا مطالعہ کرنے سے پہلے عربی کی چند لغات سامنے رکھ لیں، ورنہ بغلیں جھانکنی پڑیں گی۔ دماغ کے دریچے کھول لیں، اور گوش ہوش سے سنیں۔

تحفة المفتاق فی تحقیق الجمعه فی الرستاق

قلقلہ کرتے کرتے آپ کے حلق میں گرہ پڑ جائے گی۔ ذرا دو، تین مرتبہ پے در پے ادا کر کے تو دیکھئے۔

پھر جو کتابچہ کھولتا ہوں تو ایسا لگا کہ جیسے علامہ دیجور پر دیوانگی اور ہذیان کا دورہ پڑا ہے، اور جنون میں بکتے چلے جا رہے ہیں۔ میں نے سوچا یہ رسالہ میرے بس کا نہیں۔ پڑھوں گا تو مجھے بھی جنون ہو جائے گا۔ رسالہ لے کر میں باہر نکلا۔ تیزی سے بھاگا جا رہا تھا کہ مولانا شمس وقمر صاحب ٹکرا گئے۔ مولانا موصوف میرے دیرینہ کرم فرما ہیں۔ نہایت سنجیدہ ومتین، شرافت ونجابت کی تصویر، جب کوئی گتھی الجھتی ہے تو مولانا ہی کا ناخنِ گرہ کشا اسے سلجھاتا ہے۔

دیکھتے ہی انہوں نے پکارا۔

ارے بھئی مرزا! کہاں بھاگے جا رہے ہو؟ ایسی بدحواسی کیا ہے؟

’’مولانا میں آپ ہی کے پاس جا رہا تھا‘‘۔ میں نے جلدی سے جواب دیا۔

عجب مصیبت میں جان پھنس گئی ہے۔ ابھی سویرے سویرے مولوی بہرام علی آئے تھے، اور یہ مصیبت میرے اوپر ڈال گئے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے میں نے رسالہ مولانا کی طرف بڑھا دیا۔

اچھا یہ ہے؟ مولانا مسکرائے۔

ہاں! بھئی عجب کتاب لکھ ماری ہے۔ بہترا آدمی اوپر سے اچھا بھلا معلوم ہوتا ہے مگر ذرا سی بات پر بالکل ننگا ہو جاتا ہے۔ اب یہی علامہ دیجور ہیں، میں انہیں جانتا ہوں، یہ تو معلوم تھا کہ مزاج میں گرمی معمول سے زیادہ ہے، مگر یہ نہ معلوم تھا کہ ذہنی ودماغی سطح اتنی پست ہے۔

مولانا! پہلے رسالہ کا نام پڑھئے۔ میں نے مولانا کو متوجہ کیا۔

اس کا تلفظ کیا ہے؟ اور اس کا ترجمہ کیا ہے؟

مولانا نے بغور اسے ملاحظہ کیا۔ چہرے اور پیشانی پر چند سلوٹیں نمودار ہوئیں، جو یہ خبر دے گئیں کہ مولانا بھی اس جگہ بے بس ہیں۔ فرمانے لگے:

’’بھئی! میں لغت کی کتاب تو لئے نہیں پھرتا۔ گھر چلو، لغت میں تلاش کروں۔ میں نے تو اس نام پر غور کیا ہی نہیں تھا۔‘‘

یہ کہہ کر مولانا اپنے گھر کی طرف پلٹے، میں بھی ساتھ ہو لیا،

مولانا بولے۔ مرزا! ایک لطیفہ سنو:

’’فقہا لکھتے ہیں کہ اگر کوئی پاگل آدمی اپنی بیوی کو حالتِ جنون میں طلاق دے، تو وہ نہیں پڑتی۔ میں ایک بار اپنے حجرے میں بیٹھا ہوا تھا، ایک جوان آدمی پریشان صورت، سلام کر کے اندر داخل ہوا، اور کہنے لگا کہ میں نے اپنی بیوی کو تین طلاق دیدی ہے، اب کیا ہوگا؟ کئی بچے ہیں، میں بہت پریشان ہوں۔

میں نے کہا اب تو تیر کمان سے نکل چکا ہے، بیوی تمہارے ہاتھ سے ہمیشہ کے لئے گئی۔ صرف حلالہ کی صورت میں تمہارے پاس آسکتی ہے۔

کہنے لگا کہ ’’مولانا میں نے بہت غصے میں طلاق دی تھی۔‘‘ مجھے ہنسی آ گئی۔

میں نے کہا ’’ارے میاں! کوئی خوشی میں بیوی کو طلاق دیتا ہے؟‘‘

بولا ’’میں غصے میں پاگل ہو گیا تھا۔‘‘ میں سمجھ گیا کہ یہ پڑھا لکھا جن ہے۔

میں نے پوچھا کہ ’’پاگل پن کی دلیل؟‘‘

کہنے لگا ’’میں نے غصے میں اپنا کرتا پھاڑ دیا تھا۔‘‘

’’اور پاجامہ؟‘‘ میں نے دوسرا مصرعہ دہرایا۔

وہ کھسیا گیا۔ بولا ’’پاجامہ نہیں پھاڑا تھا۔‘‘

تب تم پاگل نہ تھے۔ بیوی کو طلاق پڑ گئی۔

لیکن میاں مرزا! یہ علامہ دیجور جس نے یہ کتابچہ لکھا ہے، اس پر غصہ کا اتنا زبردست

بھوت سوار ہوا کہ اس نے صرف کرتہ ہی نہیں پھاڑا ہے، پاجامہ اور چڈی تک نوچ کر پھینک دی۔ یہ تو اس حالت میں ہے کہ اپنی بیوی کو طلاق دے تو ہرگز نہ پڑے۔ پھر تم خود ہی سوچ لو کہ اس رسالہ میں معذور ہے یا نہیں؟ اس دیوانہ کو خبر نہیں کہ میں کیا بک رہا ہوں۔ اور میری اچھل کود کی زد میں پوری دنیائے حنفیت کس طرح کچل گئی؟۔

مولانا! ''اس رسالہ کو پڑھ کر میرا ذہن متلا گیا۔''

میں نے عرض کیا'' آپ دیکھئے تو سہی، مولانا مفتی..........صاحب کو کیسے بیہودہ القاب سے نوازا ہے۔''

اوہو! مولانا بولے۔ تم سمجھے نہیں، جو کچھ اس نے مفتی..........صاحب کو لکھا ہے، در حقیقت یہ سب اس کے القاب ہیں۔ مفتی........صاحب نے ایک آئینہ اس کے سامنے رکھ دیا تھا، اس میں اپنی صورت دیکھ کر بھڑک گیا۔

چوڑے منہ کے ایک برتن میں پانی بھرا ہوا تھا، ایک لڑکے نے روٹی کھاتے ہوئے، اس میں جھانکا، تو اسے اپنا عکس نظر آیا۔ چلا کر کہا، ابا! یہ دیکھئے، یہ میری روٹی چھین رہا ہے۔ اب جو ابا نے اس میں جھانکا، تو بڑے میاں کی تصویر نظر آئی۔ لگے خفا ہونے کہ ارے او بڈھے! تم کو شرم نہیں آتی، بڈھے ہو کر بچے کے ہاتھ سے روٹی چھینتے ہو۔

تو مرزا! جیسا وہ بڈھا، اس سے کچھ زیادہ ہی علامہ دیجور۔ اپنے ہی کو گالیاں دے رہا ہے۔ صلواتیں سنا رہا ہے۔ اور خوش ہو رہا ہے کہ چاند پہ تھوک دیا۔ حالانکہ سارا تھوک اس کے بدنما چہرے پر غلاظت بنا ہوا ہے۔

ہاں مولانا! میں نے پوچھا۔ ایک بات اور بتایئے۔
یہ شخص مفتی..........صاحب پر اس قدر برہم کیوں ہے؟
اچھا! تم کو ابھی یہی نہیں معلوم؟ مولانا نے بتانا شروع کیا:

''یہ علامہ کئی مدرسوں میں مدرس رہ چکا ہے، چونکہ طبیعت بے انتہا جھگڑالو ہے، اس لئے ہر جگہ سے نکالا گیا۔ آخر میں مدرسہ جزیرہ میں گھسنا چاہتا تھا، مگر دال نہ گلی۔ مفتی..........صاحب یہاں کے صدر مدرس اور شیخ الحدیث ہیں۔ شاید اس نے یہ سمجھا ہو کہ یہی میری راہ میں رکاوٹ بنے

ہیں۔ ورنہ میں ہی شیخ الحدیث ہوتا، پھر جب کہیں امان نہ ملی تو ان کے ایک عزیز نے ایک دیہات میں انہیں مقرر کر دیا۔ جہاں ہے معمولی سا مکتب، مگر مسجد بہت بڑی ہے، تاہم نمازی ڈیڑھ ہی ہیں۔ کچھ لوگ باہر رہتے ہیں، وہ کسی خاص فنڈ سے بھاری تنخواہ دیتے ہیں۔ گاؤں چھوٹا ہے، جمعہ وہاں ہوتا نہیں، اور اسے مجمع چاہئے۔ خالی بنیا کیا کرے، اس کوٹھی کا دھان اس کوٹھی میں کرے۔ بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ دیہاتوں میں جمعہ جائز کرانا چاہئے۔ یہ خیال آیا اور ایک رسالہ لکھ مارا۔ اس نے اپنے دل میں یہ پندار جمایا کہ جہاں رسالہ شائع ہوا سارے مفتیان کرام لبیک پکار کر ''الجواب صحیح'' لکھنے پر مجبور ہو جائیں گے، لیکن اس کی بدقسمتی تھی کہ یہ توقع پوری نہ ہوئی۔ اور ہاں ''تحفۃ المفتاق کا صفحہ ۹۷ نکالو تو! اس کی آخری سطر پڑھو! مولانا کا حکم ہوا۔

اب جو میں نے پڑھنا چاہا تو اولِ قدم پر ہی زبان ٹھوکر کھا کر لڑکھڑا گئی، اور دماغ نے معنی کی طرف توجہ کی تو وہ بھی سنسنا کر رہ گیا۔ ناظرین بھی سن لیں۔ اگر سمجھ لیں تو ان کا کمال! اور نہ سمجھیں تو علامہ دیجور کی فتح!

''اگر جرأتِ فزلباشی نے ناعاقبت اندیشی کا پردۂ بکارت زائل کیا تو خنجر قلم سے گردن زدنی کا جرم ہم بھی کریں گے۔''

میں نادان کچھ نہ سمجھ سکا۔ مولانا سے دریافت کیا۔

حضرت! یہ ''فزلباشی'' کیا بلا ہے؟ یہ کس زبان کا لفظ ہے؟ خاص علامہ دیجور کے شکم سے برآمد ہوا ہے؟ یا لغت میں اس کا وجود ہے؟۔

تم نہایت واہیات ہو۔ مولانا ڈانٹتے ہوئے بولے۔

میرا خیال ہے کہ یہ کتابت کی غلطی ہے، اس رسالہ میں کتابت کی غلطیاں بے شمار ہیں۔ علامہ دیجور کو عجلت میں تصحیح کا موقع نہ مل سکا۔ یہ لفظ ''قزلباشی'' ہے۔ قزلباش قدیم زبان میں سپاہی کو کہتے ہیں۔ علامہ کو لغات بولنے کا بہت شوق ہے، لیکن سمجھتا کم ہے۔ اپنے رسالہ میں صفحہ ۶۲ پر علامہ نے ''من یرغب'' کا جو لطیفہ لکھا ہے، وہ موصوف ہی کا ہے۔ موصوف نے از راہ انکسار اپنا نام نہیں لیا۔

اصل بات تو سنو! جس کے لئے میں نے یہ عبارت پڑھوائی ہے۔

نہیں مولانا! میں نے بات کاٹتے ہوئے عرض کیا۔ ایک بات پہلے بتلا دیجئے، پھر اصل بات سنوں گا۔

''ناعاقبت اندیشی کا پردۂ بکارت'' کیا ہے؟

کیا ''ناعاقبت اندیشی'' علامہ کی اہلیہ محترمہ کا نام ہے؟ اور کیا اب تک اس کا پردۂ بکارت زائل کرنے پر قادر نہیں ہو سکے ہیں؟ اور انہیں خطرہ ہے کہ کہیں ''جرأتِ قزلباشی'' ایسا کر نہ گزرے؟

ارے! لاحول ولاقوۃ۔ مولانا نے منہ بگاڑا۔ یہ کیا خرافات بکنے لگے؟ اس وقت تو تم علامہ دیجور کے شاگرد معلوم ہوتے ہو۔ ایسی بات کہو گے تو تمہارے دل و دماغ کی طہارت سات سمندر سے بھی نہ ہوگی۔ علامہ دیجور کی اور بات ہے۔ تم نہیں جانتے وہ کس پائے کا آدمی ہے۔

توبہ کیجئے مولانا! میں جھلا گیا۔ مجھ کو تو وہ آدمی ایک پائی کا بھی نہیں معلوم ہوتا۔

اچھا خیر۔ مولانا سنجیدہ ہو گئے۔ اصل بات سنو!

مفتی.........صاحب نے....علامہ کی زبان و تعبیر میں.....علامہ دیجور کی جہالت کا پردۂ بکارت نوکِ قلم سے زائل کر دیا۔ بس وہ تلملا گیا، اسی وجہ سے اتنا برہم ہے۔

سلسلہ گفتگو تھوڑی دیر کے لئے رکا۔ میں رسالہ الٹتا پلٹتا رہا۔ اچانک صفحہ ۷۵ پر ایک شعر نظر پڑا۔ شعر کیا تھا؟ علامہ کی چابک دستی کا آئینہ دار تھا۔ یہ شعر نہ تھا، غالبؔ کی ایک غزل کے دو مصرعے تھے، جو زبردستی جوڑ دیئے گئے۔ جب کہ دونوں میں کوئی ربط نہیں ہے۔ مگر علامہ کو جنونِ غضب میں کچھ پتہ نہ چل سکا۔ انہوں نے دونوں مصرعوں کو حکم دیا کہ باہم مل جاؤ، پہلا مصرعہ شاید کچھ ہچکچایا، تو علامہ نے اس کی ٹانگ توڑ کر رکھ دی۔ علامہ نے شعر اس طرح لکھا ہے:

حیران ہوں کہ روؤں یا پیٹوں جگر کو میں
ہر ایک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

اب اصل شعر سنئے، اور علامہ کی بیداد کی داد دیجئے۔ اور غالبؔ کی روح کے لئے صبر و تسکین کی دعا کیجئے۔ ان کو معلوم ہوتا کہ میرے اشعار کو علامہ جیسے لوگ بھی ہاتھ لگائیں گے تو شعر کہنے کی ہمت ہی نہ کرتے۔

حیران ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

دوسرا شعر ملاحظہ ہو:

چھوڑا نہ اشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر ایک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

پڑھئے، اور علامہ کی قابلیتِ شعری کی داد دیجئے۔

مولانا نے فرمایا کہ میاں! شعر کی بحث چھوڑو۔ یہ بحث غیر متعلق ہے۔

جی ہاں، میں نے کہا۔ یہ بحث تو غیر متعلق ہے، اور مجدد والی بحث، جس پر علامہ نے لے دے مچائی ہے، وہ تو بہت متعلق ہے؟ آپ سچ بتائیے یہ شعر میں تحریف ہیں یا نہیں؟

مرزا! تم تو بال کی کھال نکالتے ہو۔ شعر میں تحریف نہیں ہوتی، تصرف ہوتا ہے۔ اور علامہ جیسے عقل کل کو تو اس سے زیادہ کا حق حاصل ہے۔

اچھا حضرت! یہ بتائیے، میں نے پوچھا۔ ''مفتی حنیف صاحب نے کہیں ضمناً ''حکیم الامت حضرت تھانوی'' کو ''مجددِ وقت'' لکھ دیا، تو علامہ دیجور کے پیٹ میں قراقر کیوں ہونے لگا؟ اور غلاظت کیوں برسنے لگی؟''

''یہ معمہ تو واقعی سمجھ میں نہیں آیا'' مولانا نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ بظاہر ایسا سمجھ میں آتا ہے کہ یہ شخص ہر معقول چیز سے چڑھتا ہے۔ اسی کے نتیجہ میں یہ حضرت تھانوی سے بھی چڑھتا ہے۔ ورنہ اس ایک لفظ پر اتنی اودھم مچانے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

کیا یہ سچ ہے کہ حضرت تھانوی کو پہلے پہل مجدد کہنے والے مفتی شفیع صاحب ہیں؟ علامہ نے تو بڑے زور و شور سے اس کا دعوی کیا ہے، گو کہ اس کی دلیل کچھ نہیں پیش کی۔ میں نے معلومات کے لئے سنجیدہ ہو کر دریافت کیا۔

سو فی صد جھوٹ اور سفید جھوٹ! یہ شیطان کی جانب سے وحی مخصوص ہے، جو علامہ دیجور کے اوپر نازل ہوئی ہے۔ ابھی مفتی صاحب دیوبند میں پڑھتے تھے اسی وقت حضرت تھانوی کے علمی وتجدیدی کارنامے کافی مشہور ہو چکے تھے، اور لوگوں کی زبانوں پر ان کے لئے مجدد کا لفظ

آنے لگا تھا۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کے والد ماجد مولانا یحییٰ صاحب، جن کا وصال ۱۳۲۴ھ میں ہوا ہے، وہ حضرت تھانوی کو اس وقت مجدد فرما چکے تھے جب مفتی صاحب طالب علم تھے۔ ''اشرف السوانح'' دیکھو۔ مفتی صاحب دیوبند سے ۱۳۳۶ھ میں فارغ ہوئے، اور ۱۳۴۶ھ میں حضرت تھانوی سے بیعت ہوئے ہیں۔ اسی طرح حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کے ایک بڑے خلیفہ حضرت مولانا محمد روشن خان صاحب مراد آبادی ہیں، انہوں نے تو بالمشافہ حضرت تھانوی سے فرمایا کہ ''اللہ نے آپ کو اس صدی کا مجدد بنایا ہے۔''[۱]

لیکن مولانا! میں نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ علامہ دیجور کو یہ بات نہ معلوم ہو، ورنہ وہ اس کا مطلق لحاظ نہ کریں گے کہ مولانا یحییٰ کون ہیں؟ اور مولانا روشن خان کس مرتبے کے بزرگ ہیں؟ ایک دوسرا ''تحفۃ المفتاق'' تصنیف فرمادیں گے۔

اور مولانا! میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ علامہ دیجور نے حضرت تھانوی کے مجدد نہ ہونے اور ان کی مجددیت کے جھوٹ ہونے کی دوسری دلیل یہ پیش کی ہے کہ مجدد کے کارنامے ابتدائے صدی میں مشہور ہونے ضروری ہیں۔ اور اس وقت اسے زندہ بھی ہونا چاہئے۔ مولانا تھانوی چونکہ صدی کے شروع میں طالب علم تھے، اس لئے مجدد ہرگز نہیں ہوسکتے۔ کیا مجددیت کا یہ معیار حدیث میں موجود ہے؟۔

مجددیت کا یہ معیار خدا جانے کیا حقیقت رکھتا ہے؟ حدیث تجدید تو خود علامہ نے رسالہ میں نقل کردی ہے، دیکھ لو، اس میں تو اس کا کوئی اشارہ بھی موجود نہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر یہ معیار تسلیم کرلیا جائے تو کئی متفق علیہ مجددین کو سلسلہ تجدید سے باہر آجانا پڑے گا۔

مولانا! یہ ہمارا علامہ اتنا زبردست پہلوان ہے کہ جو کوئی اس کی زد میں آئے گا اسے بے تکلف نکال باہر کردے گا۔ میں نے عرض کیا۔

جی نہیں، مولانا نے نہایت وثوق سے جواب دیا۔ اس سلسلے کی بعض ہستیاں اتنی زبردست ہیں کہ ان کو ہاتھ لگاتے ہی منہ کے بل الٹ جائے گا۔ اور مفت کا مال ہضم کرکے دیگ جیسی جو توند تیار ہوئی ہے، پھوٹ کر رہ جائے گی۔

''مثلاً'' میں نے دریافت کیا۔

سب سے پہلے مجدد الف ثانی کو لو۔ ان کی مجددیت پر تو سب کا اتفاق ہے۔ ان کی ولادتِ شریفہ ۹۷۶ھ میں ہوئی، اور جب صدی ختم ہوئی تو وہ حضرت خواجہ باقی باللہ کی خانقاہ میں سلوک کے مراحل طے کر رہے تھے۔ اس وقت ان کا کوئی کارنامہ ظاہر نہیں ہوا تھا، اور نہ مشہور ہوئے تھے۔ پھر صدی ختم ہونے سے بہت پہلے ان کا انتقال ہوگیا تھا۔ علامہ دیجور سے پوچھو کہ کیا ان کی مجددیت کو بھی جھوٹا کہنے کی ہمت ہے؟۔

دوسری مثال لو۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کو سبھی علما بارہویں صدی کا مجدد قرار دیتے ہیں۔ ان بزرگ نے تو نہ صدی کی ابتدا دیکھی اور نہ انتہا۔ یعنی ۱۱۱۴ھ میں پیدا ہوئے، اور ۱۱۷۶ھ میں وصال فرماگئے۔ ان کی مجددیت تو بالکل ہی جھوٹی ہوگی۔

لاحول ولاقوۃ۔ گرد و پیش سے بے خبر آدمی کیسا ہوتا ہے کہ دعوی علم کا ہانکے چلا جاتا ہے۔

میں سمجھ گیا مولانا! میں بے زار ہو کر بولا۔ یہ شخص بد زبان اور بے لگام ہے۔ ازل میں جب علم و تحقیق کی سوغات تقسیم ہو رہی تھی تو یہ ہاتھی گھوڑا بیچ کر سو رہا تھا۔ جب جہالت و حماقت کی لوٹ پڑی تو وہ ڈھیر ساری سمیٹ لایا، اور اسی کو دکھا کر علما کو منہ چڑھانے لگا۔

مولانا میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا، یہ عبارت ذرا پڑھو تو سہی۔ تمہارا علامہ کیسی دادِ بلاغت دے رہا ہے؟ میں نے پڑھنا شروع کیا۔

”خوف تھا کہ اگلی صدی ختم ہونے سے پہلے ہی (حضرت تھانوی) انتقال فرماجائیں گے، اور یہ لقب مرید دادہ بے معنی ہوجائے۔ چنانچہ ہوا بھی ایسا ہی، حضرت تھانوی کا انتقال بھی صدی ختم ہونے سے بہت پہلے ہوگیا، نتیجہ بدیہی تھا کہ اب اطراف و اکنافِ عالم سے خطوط آنے شروع ہوں گے کہ کہاں گئی عنایت کردۂ مرید جھوٹی مجددیت، اور ہوا بھی ایسا ہی، اور مجددیت کے لئے شرط ہے کہ انتہاءِ صدی پر علمی اور تجدیدی کارناموں کی شہرت ہو، اور مجدد حینِ حیات ہو۔“

دیکھتے ہو کیسا زورِ بلاغت صرف کیا ہے، اور کیسی شاعری کی ہے۔ اس عقل مند سے پوچھو کہ حضرت تھانوی کے انتقال کے بعد اطراف و اکنافِ عالم سے ان کی جھوٹی مجددیت کے بارے میں کس کے پاس خطوط آئے؟ اور کتنے آئے؟ کتنے یقین کے ساتھ دعوی ہانکتا ہے کہ ”اور ہوا بھی ایسا ہی“ کہاں ہوا؟ کب ہوا؟ اس کا کوئی ثبوت ہے؟۔

اگر علامہ کا گندا معدہ اور اس سے اٹھنے والے بدبودار ابخرات ہی دلیل ہیں، تو اسے وہی رکھے۔ ذرا ارشاد تو فرمایئے کہ وہ خطوط کہاں ہیں؟۔

واہ مولانا! میں نے عرض کیا۔ ان خطوط کے تمام بنڈل علامہ دیجور کے کیسۂ گوز کے علاوہ اور کہاں ہوں گے؟ جھوٹ کا پلندہ جھوٹے کی تھیلی میں۔

لاحول ولاقوۃ۔ یہ کیا بے ہودہ لفظ بول گئے۔ مولانا نے جھڑکا۔

میں نہیں بولا ہوں، میں نے معذرت کی۔ خود علامہ نے یہ ترکیب ایجاد فرمائی ہے۔ میں نے صرف نقل کر دیا۔

کتابچہ الٹتے پلٹتے پھر ایک جگہ نگاہ کو ٹھوکر لگی۔ علامہ نے لکھا ہے:

’’حقائق سے چشم پوشی‘‘ یہ عنوان ہے۔ آگے مضمون ہے:

’’ملا.........لکھتے ہیں: تو پچاس مرد بعض گھروں میں ہوتے ہیں، پھر انہیں فتوی دینا چاہئے کہ ایسے گھر میں بھی جمعہ پڑھنا ضروری ہے۔

راقم عرض کرتا ہے کہ اگر پچاس مرد بعض گھروں میں رہتے ہوں گے تو ملا.........اسے گاؤں کہتے ہوں گے، جو جواز جمعہ کا فتوی مانگتے ہیں۔ مسئلہ گھر میں جمعہ کا نہیں، گاؤں میں جمعہ کا ہے۔‘‘

ذرا دیکھئے تو حوالہ کی عبارت مولانا محمد.........صاحب نے کہاں لکھی ہے؟

مولانا شمس وقمر صاحب رسالہ ’’القری‘‘ کے اوراق الٹتے رہے، بغور دیکھتے رہے، آخر تھک گئے۔ کہنے لگے کہ یہ عبارت بدلی گئی ہے، اصل عبارت پر ان کا تبصرہ چسپاں نہیں ہوتا۔

علامہ دیجور کو چسپاں ہونے سے کیا مطلب؟ وہ جب الگ الگ دو مصرعوں کو چسپاں کر سکتے ہیں، تو بھلا اپنا تبصرہ چسپاں کرنے کے لئے کیا دقت پیش آئے گی؟ اس کے لئے انہیں مفتی صاحب کی عبارت میں کتر بیونت بھی کرنی ہو تو کیا حرج ہے؟

ہاں یہی بات ہے۔ مولانا بولے۔ مفتی صاحب کی عبارت یہ ہے:

’’تو ایسا تو بہت ہوتا ہے، اور ہو سکتا ہے کہ ایک گھر میں پچاس مرد ہو جائیں، اور ہو سکتے ہیں، تو کیا اس گھر کو مفتی صاحب گاؤں کہیں گے؟‘‘

بات یہ ہے کہ علامہ دیجور نے دعوی کیا ہے کہ جہاں پچاس مرد مکلّف رہتے ہوں، وہ گاؤں ہے۔ اسی پر مفتی صاحب نے مذکورہ بالا اعتراض کیا ہے۔ مسئلہ گھر میں یا گاؤں میں جمعہ کا نہیں ہے، بلکہ پچاس مردوں والے گھر کے گاؤں ہونے کا ہے۔ علامہ کو اسے گاؤں کہنا ہی پڑے گا۔

یہ تو سراسر تحریف ہے۔ میں نے کہا۔ اور ایک جگہ مفتی صاحب نے علامہ کی عبارت کے درمیان میں بریکٹ میں ایک لفظ ’’مسئلہ مصریت‘‘ بڑھا دیا، جو تشریح کے لئے ضروری تھا، تو علامہ نے تحریف کا طوفان کھڑا کر دیا۔ اور اس عقل سے پیدل کو پتہ نہیں کہ وہ خود کیا کر رہا ہے؟

پیارے مرزا! مولانا نے شفقت سے فرمایا۔ اسی لئے تو میں کہہ رہا تھا کہ اس نے جو کچھ صلواتیں سنائی ہیں، اپنے کو سنائی ہیں۔ مفتی محمد.........صاحب کا دامن ان آلودگیوں سے بحمد للہ محفوظ ہے۔

مولانا نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کان پر ہاتھ رکھا، اور فرمایا کہ مرزا تم ادھر ادھر کی ہوائیاں مار رہے ہو، یہ نہیں دیکھ رہے ہو کہ ہاتھی پاگل ہو کر دوڑا تو کیسے کیسے لوگوں کو کچل کر رکھ دیا۔

دیکھو صفحہ ۳۳ پر یہ علامہ وقت گل افشانی فرماتا ہے کہ:

’’لیکن بعض جہلا اس بات میں شدت برت رہے ہیں، اور قیدِ مصریت جو ظنی اور غیر مقصود بالذات تھی، اس طرح دانت گڑائے ہوئے ہیں کہ دیگر امور ضروریہ شرعیہ مقصودہ جو قیام جمعہ سے وابستہ ہیں، فوت ہو رہے ہیں۔ اور عوام کاہلی اور سستی کے شکار ہیں، اس کی کچھ پرواہ ان کو نہیں ہے۔ ہفتہ کی پڑھتے تھے، ان کی ریشہ دوانیوں نے اب عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کا رکھا۔ خدا جانے آگے کون سا گل کھلائیں گے؟۔

’’خدا ہی کو معلوم ہے کہ ٹٹ پونجئے خود ساختہ شکاریوں کی ریشہ دوانیاں قوم کی ناؤ کو کس دھارے میں ڈبوئیں گی؟‘‘

پھر لکھتے ہیں:

’’دوسری بات تو بڑے ظلم کی معلوم ہوتی ہے کہ شدت اختیار کر کے صرف بڑے بڑے

قصبات اور شہروں میں جمعہ کے جواز و مشروعیت کا حکم دے کر برکات خطبہ اور فضیلت جمعہ جو احادیث میں وارد ہیں، سے گاؤں میں بسنے والے مسلمانوں کی سب سے بڑی تعداد کو صرف اس لئے محروم کر دیا جائے کہ وہ گاؤں میں رہتے ہیں؟ اگر گاؤں میں بسنا کوئی جرم ہے تو اس کا بھی فتویٰ صادر کیا جائے۔‘‘

علامہ دیجور سے کہو کہ پچاس مکلّف مردوں کا گاؤں جہاں جمعہ کے جواز کا فتویٰ تم دے رہے ہو، یہ اتنا بڑا گاؤں تو ہے نہیں جہاں تمہارے پیر و مرشد سمیت تمام علمائے دیوبند جمعہ جائز قرار دیتے ہوں۔ ان حضرات کے نزدیک تو ڈھائی یا تین، چار ہزار آبادی ہو تب جمعہ جائز ہوتا ہے۔

اب یہ بتاؤ، یہ القاب و آداب جو تم نے تصنیف کئے ہیں ’’ٹٹ پونجئے شکاری، بعض بعض جہلا، دانت گڑائے ہوئے، ان کی ریشہ دوانیاں، خدا جانے آگے کون سا گل کھلائیں، قوم کی ناؤ کس دھارے میں ڈبوئیں، بڑے ظلم کی بات۔‘‘

یہ ساری سوغاتیں کیا صرف مفتی.........صاحب کے لئے ہیں، یا مولانا گنگوہی، مولانا تھانوی، مفتی کفایت اللہ صاحب اور قبلہ کے پیر و مرشد مفتی محمود صاحب بھی ان سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔

میرے خیال میں آج تک کسی نے اپنے بزرگوں کو اس قدر بے نقط گالیاں نہیں سنائی ہوں گی، جیسے اس شیر بیشۂ جہالت اور گرگِ سفاہت نے سنائیں ہیں۔ شاباش!

ایں کار از تو آید مرداں چنیں کنند

ایک اور جگہ انہیں بزرگوں کی خدمت میں عقیدت و احترام کا یہ تحفہ پیش کرتے ہیں۔ سنو اور محظوظ ہو:

’’کم فہم، نادان، اور رموزِ شریعت سے ناواقف ملاؤں نے کم فہمی اور نادانی سے بعض شروط کے فقدان کو جو مقصود بالذات مطلوب ہی نہ تھیں، ترکِ جمعہ کا سبب سمجھ لیا، اور ظہر کی ادائیگی کا ذوق پیدا نہ کر سکے، تو خسارہ ہی خسارہ رہا۔‘‘ (ص ۳۶)

یہ ’’کم فہم، نادان، رموزِ شریعت سے ناواقف‘‘ ملا کون ہیں؟ وہی سب علما ہیں جو علامہ

دیجور کے مجوزہ گاؤں میں جمعہ کے جواز کا فتوی نہیں دیتے۔ اور وہ کون لوگ ہیں؟ تمام قدیم وجدید علماءِ احناف، بشمول تمام علماءِ دیوبند ہیں۔

علامہ کی جرأت ملاحظہ ہو کہ ان سب حضرات کو کم فہم، نادان، اور رموزِ شریعت سے ناواقف ملا بنا دیا۔ پندرہویں صدی میں ایک فہیم ودانا، اور رموزِ شریعت سے واقف عالم کی بعثت ہوئی، اور افسوس کہ اہل زمانہ نے اس کی قدر نہیں کی کہ وہ ایک چھوٹے سے گاؤں میں تنہا علم وتحقیق کی ڈکاریں لے رہا ہے۔ اسے تو کسی بڑے شہر میں لے جا کر پچیس پیسے کا ٹکٹ لگا دینا چاہئے کہ اہل انتظام کو کچھ آمدنی ہو، اور غریب وامیر اور عام وخاص مستفید ہوں۔

مولانا بڑے جوش میں بولے جا رہے تھے۔ میں نے قطعِ کلام کیا۔

واقعی مولانا! ایسا زبردست مرید تو کسی پیر کو آج تک نہ ملا ہوگا، جیسا خوبیٔ قسمت سے حضرت مفتی محمود صاحب کو مل گیا۔ مفتی صاحب معلوم نہیں اس کی حقیقت سے واقف ہیں یا نہیں؟ اس کو تو لگاتار سینکڑے کے حساب سے خلافت ملنی چاہئے۔

مولانا نے پھر فرمایا۔ اچھا آؤ! تمہیں علامہ کی وسعتِ معلومات کا کرشمہ دکھاؤں۔

کتابچہ کا یہ صفحہ ۴۲ ہے۔ اس پر تمہارا علامہ ''فریبِ نادر'' کا عنوان لکھتا ہے، اور تحریر کرتا ہے کہ:

''مولف القری حنفیوں کی فہرست گناتے ہوئے صفحہ ۸ پر صاحب تحفہ کا نام لیتا ہے۔ یہ بزرگ مولانا عبدالرحمان صاحب مبارک پوری ہیں، مسلکاً غیر مقلد ہیں، امام ابوحنیفہ اور جماعت دیوبند پر سخت تنقید کرتے ہیں، ان کو حنفی شمار کیا۔ واللہ راقم کو بالکل پتہ نہ چل سکا کہ یہ بزرگ مرنے کے بعد کب حنفی ہوگئے، جس کو مولف القری نے جان لیا۔ ممکن ہے الہام ہوا ہو، کیونکہ ''**ان الشیطان یوحی الی بعض اولیاءہ**''۔

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے

واقعی ناطقہ سر بگریباں ہے کہ اس علم ودانش کو کیا کہئے؟ جس کو یہ بھی احتمال نہ گزرا کہ شاید ''تحفۃ'' نام کی کوئی اور کتاب بھی دنیائے علم میں پائی جاتی ہو، اور شاید مولف القری نے وہی مراد لیا ہو، لیکن تمہارا یہ علامہ اس پندارِ علم میں ڈوبا ہے کہ جو کچھ وہ جانتا ہے دنیا میں صرف اسی کا

وجود ہے۔ اور کیوں نہ ہو؟ اب تک اتنا بڑا علامہ بطنِ گیتی سے پیدا ہی کہاں ہوا؟

میں نے کھوپڑی سہلائی، کیا واقعی کوئی اور بھی کتاب تحفہ نامی ہے؟ میں تو علامہ کا یہی اعتراض وزنی سمجھ رہا تھا۔

تم بھی نرے بدھو ہو۔ مولانا ہنسے۔ ارے میاں علامہ علاء الدین سمرقندی حنفی کی مشہور کتاب ہے ''تحفۃ الفقہا'' جس کی شرح بدائع الصنائع ہے۔ صاحب تحفہ سے مراد علاء الدین سمرقندی ہیں۔ ''تحفۃ الاحوذی'' والے کو کون پوچھتا ہے؟ بیشک علامہ دیجور شبِ دیجور کی پیداوار ہیں۔

میں نے سر کھجایا اور عرض کیا۔ حضرت ایک معمولی سا اشکال مجھے بھی ہے۔

ارشاد ہو۔ مولانا مسکرائے۔

مولانا! میں کچھ زیادہ پڑھا لکھا تو ہوں نہیں، میں نے مسکین بن کر کہا، یہ بتایئے کہ ''**ان الشیطان یوحی الی بعض اولیاء ہ**'' یہ کوئی آیت ہے؟ یا مثل ہے؟

مولانا جھلا گئے۔ مرزا تم بھی کمال کرتے ہو، ایک ایک لفظ پر شبہہ کی نگاہ ڈالتے ہو۔

مولانا کیا یہ کوئی گناہ ہے؟ میں نے صفائی دیتے ہوئے عرض کیا، میں تو الفاظ ہی کا آدمی ہوں، معانی تو آپ جانیں، پھر اپنے علامہ کو دیکھئے، یہ تو مفتی محمد.......... صاحب کی گرفت ایسی باتوں پر بھی کرتا ہے جو سرے سے انہوں نے کہی نہیں۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

برخوردار مرزا! مولانا پیار سے بولے۔ نہ تو یہ آیت ہے، اور نہ مثل۔ بات یہ ہے کہ علامہ دیجور کا دماغ تو غلاظتوں کا سنڈاس ہے، اس میں آیت کی گنجائش کہاں؟ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس نے آیت ہی کا مضمون سوچا تھا، لیکن جب آیت یاد نہیں آئی تو اس نے بنا لی۔ اصل آیت یہ ہے ''**وان الشیاطین لیوحون الی اولیاء هم.**''

اتنی گفتگو کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ مولانا کچھ بیزار سے ہونے لگے ہیں، اس لئے میں نے بھی رخصت کی اجازت چاہی، اور اٹھتے اٹھتے بولا کہ اب چل رہا ہوں، کتابچہ اور علامہ دونوں کا

جغرافیہ معلوم ہوگیا، میرے خیال میں پوری کتاب ایسی ہی شاندار ہوگی، اوراس کے اندر جو گالیاں بھری ہوئی ہیں وہ تو سنڈاس سے بدتر ہیں۔

ٹھیک کہتے ہو۔ مولانا نے تائید کی۔ اس کی ایک ایک سطر انتشارِ دماغ، بے ربطی و بدحواسی، دیوانگی وحواس باختگی، اورجنون وبدفہمی کی آئینہ دار ہے۔

اچھا یہاں سے جاؤ گے کہاں؟

یہاں سے میں مولوی بہرام علی کے پاس جاؤں گا۔ میں نے عرض کیا۔ انہوں نے علامہ دیجور سے ملاقات کا وعدہ کیا ہے، سوچا ہے لگے ہاتھ علامہ کا درشن بھی کرلوں۔

جاؤ مگر صرف درشن ہی کرنا۔ مولانا نے نصیحت کی۔ کہیں اپنا بھاشن نہ شروع کر دینا، آج کل وہ ایک جامعہ کے نام پر مفت کی تنخواہ لے رہا ہے۔ یہ خرافات اسی مفت کی تنخواہ کی کرشمہ سازی ہے، کہیں ایک ہاتھ تمہاری پیٹھ پر رکھ دیا تو زندگی بھر روؤ گے۔

نہیں حضرت! مفت کے مال میں دم خم کہاں؟ جو ہوگا دیکھ لوں گا۔ میں نے اعتماد بھرے لہجے میں کہا۔

میں مولوی بہرام علی کے پاس پہونچا، تو وہ سراپا انتظار بنے بیٹھے تھے، مجھے دیکھتے ہی حرکت میں آگئے۔ فورا باہر آئے، اور ہم لوگ چل پڑے۔ میں نے چلتے ہوئے کہا کہ اجی! آپ کا یہ علامہ دیجور! عجب بھینس کی اولاد ہے، اسے یہ خبر ہی نہیں ہے کہ سر کدھر ہوتا ہے اور دم کدھر ہوتی ہے؟

صاحبزادے! مولوی صاحب لہرائے۔ تم انہیں کیا جانو؟ وہ عجیب ہیں، ان کا ہر کام عجیب تر ہے۔ وہ جب چاہیں دن کو رات بنا دیں، اور جب چاہیں انہیں دن میں تارے نظر آنے لگیں۔ گالیوں کے پیش کار، الزام تراشی کے فنکار، تکبر وانانیت سے سرشار، ظلمتِ شب کی پیداوار، جہالتوں کے تاجدار، غلاظتوں کے بھنڈار، اور نہ جانے کیا کیا؟ چل کر خود دیکھ لوگے۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم علامہ کے مکان پر پہونچ گئے، وہاں میرے جیسے اور بھی مشتاقانِ دید جمع تھے، اوران کی کتاب پڑھ پڑھ کر برافروختہ تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ہی علامہ بطنِ کاشانہ سے پیدا ہوں گے، سب یکبارگی ان پر ٹوٹ پڑیں گے۔

معلوم ہوا کہ اب طلوع ہونے ہی والے ہیں، مجمع میں ایک کھلبلی مچی ہوئی تھی، لیکن ہاں ہاں، اچانک یہ خاموشی کیوں؟ سب کی نگاہیں جھک کیوں گئیں؟ آخر کیا ہوگیا کہ سب بیک وقت لاحول پڑھنے لگے۔

منظر ہی کچھ ایسا عجیب وغریب تھا، لوگوں نے دیکھا کہ ایک شخص مادر وپدر آزاد، ننگ دھڑنگ، سارا جسم تہمتِ لباس سے قطعاً بری، ہر قید سے آزاد، کالا بھجنگ، چہرہ سیاہ، قلب سیاہ تر، توند بے اندازہ بدن سے باہر نکلی ہوئی، اکڑتا ہوا، بھنبھناتا ہوا، غراتا ہوا باہر نکلا چلا آرہا ہے۔ منہ سے گالیوں کی پھلجھڑی چھوٹ رہی ہے، سب کی نگاہیں شرم سے جھک گئیں، شریف لوگ کھسکنے لگے، منچلے نوجوانوں نے قہقہے لگائے، بچوں نے ہاتھوں میں ڈلے اٹھائے۔ میں جی کڑا کر کے تماشا دیکھتا رہا کہ اس بھیانک آغاز کا انجام کیا ہوتا ہے؟۔

مادرزاد ننگا یہ آدمی کون ہے؟ میں نے مولوی بہرام علی سے پوچھا، جو کھسک جانے کے موڈ میں تھے۔

بھاگ چلو، یہی علامہ دیجور ہیں۔ اس وقت ان پر دیوانگی کا دورۂ شدید ہے، مولوی بہرام بولے۔

نہیں، ابھی دیکھنا ہے کہ یہ علامہ صاحب اور کیا گل کھلاتے ہیں؟ میں نے مستقل مزاجی کا مظاہرہ کیا۔

بکواس جاری تھی۔

بلاؤ بکر ملا کو۔ وہ نٹ کھٹ ملا۔ بے سند ہے۔ دارالاغنام سے فارغ گھمنڈی ملا ہے۔ راعی الاغنام ہے۔ عروج بالفروج کا طالب ہے۔ مردانگی ظاہر کرنی ہے تو میرے پاس آئے۔ وغیرہ........

علامہ دیجور یہ سب بکے جارہا تھا، مراد مفتی محمد..........صاحب تھے، اتنے میں گھر سے کچھ لوگ باہر نکلے، اور موٹر میں بیٹھ کر کہیں چلے گئے، اور تھوڑی دیر میں دو تین موٹروں کی آواز سنائی دینے لگی۔ ایک گاڑی سے چند پہلوان قسم کے لوگ ہاتھوں میں رسیاں لئے اترے، اور ایک دم سے علامہ پر ٹوٹ پڑے۔ علامہ بہت اچھلے کودے، کسی کو لات ماری، کسی کو گھونسہ جڑا، کسی کو دانت

کاٹ لیا، اور گالیوں کا تو فوارہ اچھل پڑا، مگر پہلوانوں نے آخر دبا ہی لیا۔ رسی سے ہاتھ پاؤں جکڑ دیئے، منہ میں زبردستی کپڑا ٹھونس دیا اور لاش کی طرح اٹھا کر گاڑی میں ڈال یہ جا وہ جا غائب۔

میں نے ان کے گھر کے ایک آدمی سے دریافت کیا کہ یہ لوگ علامہ کو کہاں لے گئے؟ اس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

پاگل خانے۔ میں بولا:

پہونچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

میں علامہ دیجور کے دروازے سے واپس آرہا تھا، خیالات کے طوفان میں ہچکولے کھاتا ہوا۔ کھوپڑی سنسنا رہی تھی، دماغ میں ہلچل مچ رہی تھی، بے خیالی میں نہ جانے کدھر نکل گیا۔ اچانک ایک جگہ شور وغل سنائی دیا، جگہ بڑی وحشت ناک اور نامانوس تھی۔ مجھ پر ایسی گھبراہٹ طاری ہوئی کہ دل و دماغ اور حواس سب کی چولیں ہل گئیں، بظاہر وہاں خوشی اور سرمستی کے شادیانے بج رہے تھے، اور بہت سی بھیانک صورتیں، سر پر کانٹوں جیسے کھڑے کھڑے بال، دانت خوفناک حد تک منہ سے باہر نکلے ہوئے، لال لال زبانیں باہر لٹکی ہوئی، آنکھوں سے شعلہ برستا ہوا، ایسا لگا جیسے یہ سب صورتیں ناچ رہی ہوں۔ میں نے ہڑبڑا کر بغل میں دیکھا تو مولوی بہرام علی غائب تھے، میں اکیلا کھڑا حواس باختہ ہو رہا تھا، تاہم تحقیقِ حال کی جستجو نے تھوڑی ہمت بندھائی، اور دل مضبوط کر کے میں نے ایک صورت کو جا پکڑا، وہ ہی ہی کرنے لگی، میں نے پوچھا یہ کیسا رقص ہے؟ اور تم لوگ کیا ہو؟

اس صورت کے منہ سے قہقہہ کا پٹاخہ چھوٹا، کہنے لگی کہ آج ہماری قیادتِ عظمی حضرت ابلیس علیہ ما علیہ کا دربارِ عام منعقد ہوا ہے۔ ان کا ایک بہت ہی خاص چیلا تمہاری برادری سے دستیاب ہو گیا ہے، اس سے ایک بہت ہی اہم کام لیا گیا ہے، اور اس نے بخوبی اسے انجام دے دیا ہے۔ اس پر ہماری قیادت نہایت مسرور ہے، اسی تقریب میں یہ دربار منعقد ہوا ہے، اور دو بہت پرانے چیلے لائے جائیں گے، اور انہیں بتایا جائے گا کہ اب نمبر ایک کی جگہ یہ نیا چیلہ لے گا، تم لوگ اس کے مقابلے میں نمبر دو کے آدمی ہو۔

میں نے پوچھا، وہ پرانے چیلے کب آئیں گے؟

بس آتے ہی ہوں گے۔ یہ کہہ کر وہ صورت پھر ناچنے لگی۔

اتنے میں دو شخص بڑا سا صافہ باندھے ہوئے عالمانہ شکل وصورت میں نظر آئے۔ میں دیکھ کر چونکا، ارے یہ کون ہیں؟

غور سے دیکھو۔ آگے والا شخص استاذ کا خلیفہ خاص......اور دوسرا والا اس کا شاگرد.....

ہے۔

میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا، ابلیس کا دربار سجا ہوا تھا، اس کے تمام وزراء اور مشیرِ کار اپنی اپنی کرسیوں پر براجمان تھے۔ ابلیس ایک اونچے تخت پر براجمان تھا۔ یہ دونوں اس کی بارگاہ میں پیش کئے گئے، سجدہ ریزی، قدم بوسی، اور دست بوسی کے تمام مراحل سے گزرنے کے بعد دونوں نے ادب سے عرض کیا:

’’حضور آقائے نعمت نے ہم خدام کو کس لئے یاد فرمایا؟‘‘

غور سے سنو! ابلیس نے بھاری آواز میں کہا۔ اب تک ہم نے تم دونوں کو اپنا خاص چیلہ بنا رکھا تھا، اور واقعی تم لوگوں کا کارنامہ بہت عظیم ہے۔ تم نے تمام علماءِ اہلِ حق کو کفر کے گڑھے میں اس طرح ڈھکیلا ہے کہ آج تک وہ اس دلدل سے نکل نہیں سکے ہیں۔

بیشک حضور! دونوں نے شکرگزاری کے لہجے میں کہا۔ ہم نے جناب والا کے اشاروں پر یہ خدمت انجام دی ہے، اور حضور کے قربِ خاص کے متمنی ہیں۔

بلاشبہہ تم قربِ خاص کے مستحق ہو۔ ابلیس نے کہا۔ اسی لئے اب تک ہمارے نزدیک تمہارا درجہ سب سے اونچا تھا، لیکن اب ہم کو ایک ایسا شاگرد ملا ہے، جس نے پہلی ہی جست میں تم دونوں کو پیچھے کر دیا۔

وہ کیسے حضور؟ دونوں حسد کی آگ میں جل اٹھے۔

تم دونوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں سب ملا کر جتنی گالیاں تصنیف کی ہوں گی ہمارا یہ شاگردِ خاص ۸۰؍صفحہ کے صرف ایک رسالے میں اس سے زیادہ ڈھیر لگا چکا ہے۔ وہ لاجواب ہے، وہ تمہارا استاذ ہے۔ اب تم دونوں کی ذمہ داری ہے کہ اس کے پاس خود بھی جاؤ اور اپنے شاگردوں کو بھی بھیجو کہ گالی کی اس نئی فیکٹری سے میٹریل حاصل کریں۔ کیا کہنے اس کے! میرا

جی خوش کر دیا۔ علماءِ حق کی مٹی پلید کر دی۔

حضور کا حکم ہے تو ہم ضرور اس بزرگ شخصیت کے پاس حاضر ہوں گے۔ دونوں نے مؤدبانہ لہجہ میں کہا۔

ہاں ایک بات اور یاد آئی۔ ابلیس نے خوش ہو کر کہا۔ یہ کمال اس پر ہے کہ اس نے اپنی کتاب ابتدائی مسودہ کے مقابلہ میں بہت حد تک نرم کر دی ہے، اس کا اصل مسودہ میری خدمت میں پیش کیا گیا تھا، وہ تو اتنا عمدہ تھا کہ میرے سارے نئے پرانے شاگرد عش عش کر اٹھے، لیکن اتنی بیوقوفی اس سے ہوگئی کہ اس سلسلہ میں اس نے ہمارے ایک مشہور دشمن سے مشورہ طلب کر لیا۔ اس نے لکھ دیا کہ فلاں اور فلاں کے حق میں بے ادبی نہ ہو۔ بس وہ ڈر گیا اور بہت کچھ اس سے حذف کر دیا۔ تاہم اب بھی جو کچھ موجود ہے تم دونوں کی تمام تحریر و تقریر پر بھاری ہے۔ تم لوگ وہاں جاؤ۔

حضور اس کا پتہ بتا دیں، اور کتاب کا نام بھی ارشاد ہو۔ دونوں نے عرض کیا۔

یہی تو کمال بالائے کمال ہے۔ ابلیس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ کتاب کا نام تو میرے بس کا بھی نہیں ہے۔ تم چلے جاؤ یہاں سے فلاں قصبہ، وہاں سے قریب جانب شمال ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ وہیں مل جائے گا۔

اس عظیم شخصیت سے ملاقات کیوں کر ہوگی؟ دونوں نے عرض کیا۔ ہمارے دل ابھی سے مرعوب ہوئے جا رہے ہیں۔

گھبراؤ نہیں۔ ابلیس نے تسلی دی۔ وہاں ہمارے لوگ متعین ہیں۔ وہ تمہیں بھی خوب پہچانتے ہیں، وہ ملاقات کرا دیں گے۔

کیا یہ لوگ محض ملاقات کرانے ہی کی غرض سے متعین کئے گئے ہیں؟ ان دونوں نے پوچھا۔

نہیں، ابلیس نے کہا۔ ان کو میں نے اس لئے بھیجا ہے کہ ہمارے دشمن نے جو زہر اس کے دل میں چڑھا دیا ہے، اسے اتاریں، اور مزید ایک نیا ڈوز ہمارا دیدیں، تاکہ وہ کام میں مستعد ہو جائے۔ ان حالات میں ہم تھوڑے وقت میں زیادہ کام چاہتے ہیں۔

بہت اچھا حضور ہم جارہے ہیں، حضور کی نیک خواہشات ہمارے ساتھ ہیں۔ دونوں نے ادب سے جھک کر سلام کیا۔ اس نے دونوں کے سر پر ہاتھ پھیرا، اور اذنِ رخصت دیدی۔

میں یہ سارا تماشا حیرت سے دیکھتا رہا، پھر جب دونوں وہاں سے نکلے تو ان کے تعاقب میں مَیں بھی چل پڑا۔ یہ دونوں تھوڑی دیر میں پاجی سرائے پہونچ گئے، وہاں علامہ کے دروازہ پر سناٹا تھا۔ دونوں حیران تھے کہ یہاں تو کوئی نہیں ہے۔ اتفاقاً ابلیس کا ایک شاگرد آ نکلا، اس نے ان دونوں کو پہچان لیا، اور کہا کہ غالباً آپ علامہ دیجور خلیفہ خاص حضرت ابلیس علیہ ما علیہ سے ملنے آئے ہیں۔

ہاں ہاں۔ نام تو جلدی میں ہم معلوم نہیں کر سکے، لیکن غالباً وہی ہیں، دونوں نے سر ہلایا

ہم لوگوں سے آج بڑی غلطی ہوگئی، اس نے متأسفانہ انداز میں کہا۔ ہم تو استاذ کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔

کیا بات ہوئی؟ دونوں تقریباً چیخ کر بولے۔

بات یہ ہوئی، اس نے بتانا شروع کیا۔ کہ ہم تو ایک خاص زہر جو اس کے دل میں انجیکٹ کر دیا گیا تھا، اسے زائل کرنے، اور اپنا تازہ ڈوز دینے آئے تھے۔ خیر زہر تو اتر گیا، لیکن جتنے پاور کا ڈوز دینا تھا، اس سے بہت زیادہ پاور کا ڈوز ہم نے دے دیا۔ ہم اس خیال میں تھے کہ اس کا اثر زیادہ اور جلد ہوگا، اور یہ حضور والا کے منشا کو جلد تکمیل تک پہونچا دے گا، لیکن ہمیں اس کی طاقت کا اور علامہ دیجور کی قوتِ برداشت کا صحیح اندازہ نہ ہو سکا۔ علامہ پر ہذیان اور جنون کا دورہ پڑنے لگا، اور لوگ انہیں پاگل خانے لے گئے۔

افسوس! یہ دونوں ہاتھ مل کر کہنے لگے۔ اب کیا ہوگا؟ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولے، خیر کوئی حرج نہیں، ہم بھی تو اکثر وہیں رہتے ہیں۔ ملاقات ہو ہی جائے گی۔ البتہ آقائے نعمت کی مصلحت نہیں تھی کہ ابھی علامہ پاگل خانے کی سیر کرتے، تم لوگ فوراً جا کر معافی مانگو۔

تم بڑے نالائق ہو۔ استاذ گرج رہا تھا۔ میری ہدایت کی خلاف ورزی کی! اسے پاگل بنا دیا۔ اب کون اس کی بات سنے گا؟ لوگ پاگل کہہ کر اسے نظر انداز کر دیں گے۔ تم لوگوں نے ہمارا اتنا کارآمد شاگرد کھو دیا۔ بہت احمق ہو۔

جلاد! فوراً حاضر ہو۔ ان دونوں کی گردن ماردو۔ ان کمبختوں نے سب کچھ کباڑا کردیا۔

تینوں اس حکم سے لرز اٹھے۔ استاذ کے پیروں پر گر کر گھگھیانے لگے۔

خیر! اچھا گردن زدنی معاف۔ عمر قید کی سزا لازم۔ ابلیس بولا۔ اور اگر اس سے بھی چھوٹنا چاہتے ہو تو اسے صحت مند کرکے میرے پاس حاضر کرو۔

حضور کا شکریہ۔ پیروں پر گر کر وہ بولے۔ حضور نے یہ موقع دیا ہم ابھی جاتے ہیں۔

یہ کہہ کر وہ اڑ گئے۔ میں بھی ڈر کر بھاگنے لگا۔

❑❑❑

حاشیہ

(۱) اشرف السوانح جلد ۱ صفحہ ۱۶۰ خواجہ عزیز الحسن مجذوب تحریر فرماتے ہیں کہ ”ممدوح الذکر کے ایک ثقہ مرید بھی خود احقر سے فرماتے تھے کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت والا کے مجدد ہونے کا پورا وثوق تھا۔ اسی طرح جناب مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے جو حضرت مولانا گنگوہی کے خادم خاص تھے، ایک بار احقر سے فرمایا کہ میرا اب تک یہ گمان تھا کہ اس صدی کے مجدد حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ العزیز تھے، لیکن اب میرا یہ خیال ہے کہ ہمارے مولانا کا فیض تو خاص تھا، اور زیادہ تر آپ سے علما فیضیاب ہوئے، لیکن میں اب دیکھ رہا ہوں کہ مسلمانوں کو اس وقت عام نفع مولانا تھانوی سے پہونچ رہا ہے۔ اس لئے مجددیت کی شان ان میں زیادہ پائی جاتی ہے، گو ممکن بلکہ مظنون ہے کہ حضرت کا درجہ مجددیت سے بھی عالی ہو۔

بودم بے دال

از ۔ رازدان

ناظرین باتمکین کی خدمت میں گزارش ہے کہ آپ لوگ اس عظیم القدر، شب بیدار اور مبارک ومسعود پرندے سے واقف ہوں گے جس کی آواز آبادیوں کو ویرانی، نغمہ شادی کو سوگواری و خاموشی اور تازگی وسرور کو افسردگی وغمگینی کا پیغام دیتی ہے، اگر کسی بلند وبالا اور مستحکم قلعہ پر اس کی ہلاکت آفریں آواز گونجے تو اس کی بنیادوں میں شگاف پڑ جائے، اگر سرسبز وشاداب گلشن میں جا بیٹھے تو یکایک بربادی وویرانی کی دھول اڑنے لگے۔ یہ وہ پرندہ ہے جو دن میں آرام کرتا ہے اور رات کے اندھیرے میں سفر شروع کرتا ہے، دن کی روشنی اس کی آنکھوں کو بیکار کر دیتی ہے اور رات کی اندھیاری اس کی آنکھوں کو سرمہ بصارت مہیا کرتی ہے۔ آبادی کی رونق سے نفرت اور ویرانی کی وحشت سے الفت اس کی اصل فطرت ہے۔ صحت مند پر اس کا سایہ پڑے تو بیمار اور بیمار کے اوپر سے گزرے تو موت کا شکار ہو جائے۔ اس کی وحشت ناک آواز سے آبادیوں میں لرزہ اور اس کے مہلک نالہ وفریاد سے دنیا میں زلزلہ پیدا ہوتا ہے۔ آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ اس درجہ عالی صفات کا حامل وامین کون سا پرندہ ہوگا؟۔

کبھی کبھی اس پرندہ کی روح انسانی قالب میں بھی سما جاتی ہے، انسانوں کے درمیان رہتا ہے، کھاتا پیتا، چلتا پھرتا، بات چیت کرتا ہے، لیکن اپنے مزاج کے لحاظ سے آدمیوں سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ آنکھ کان ناک کے اعتبار سے تو وہ انسانوں جیسا ہوتا ہے لیکن فطرت وخصلت، اثرات ونتائج سب میں اسی عالی صفات پرندے کے ٹو کاپی ہوتا ہے۔ کسی آبادی میں ہو تو ویران کر کے چھوڑے، ایک آواز حلق سے خارج کرے تو بستی کے تمام افراد ٹکرانے لگ جائیں، گھر والے

پناہ مانگیں، باہر والے لعنت بھیجیں۔ اپنے اور پرایوں میں ایک سخت قسم کی بلا خیز کشمکش جاری ہو جائے، کشمکش بھی کیسی؟ اس سے کوئی مفید اور مثبت نتیجہ کی امید نہیں، محض بربادی، فقط ویرانی، نری ہلاکت اور طوفان ایک سرے سے دوسرے سرے تک، یہاں تک کہ ہر شئی اپنے وجود سے محروم ہو جائے یا اپنی اصلی صورت کھو دے۔ انہیں خصوصیات کا پیکر ''بودم بے دال'' کہلاتا ہے۔

یوں تو بودم بے دال کہیں بھی پایا جا سکتا ہے لیکن چونکہ اس ذات شریف کو اس بے مثال گرو کا چیلۂ خاص ہونے کی سعادت حاصل ہوتی ہے جس نے روز ازل بیڑا اٹھایا تھا کہ جو بھی طریقہ ممکن ہوگا، مجھے انسانیت کو گمراہ کرنے کی خدمت انجام دینی ہے۔ اس لئے وہ اپنے اس خصوصی چیلے کو عموماً ایسی جگہ بھیجتا ہے جہاں ہدایت کا قلعہ مضبوط ہو، تا کہ وہ اس کی بنیادوں میں رخنہ ڈال سکے۔

ایک بودم بے دال کو ہم بھی جانتے ہیں، اس کی جنم بھومی قصبہ مبارکپور ضلع اعظم گڑھ ہے۔ مبارکپور کے مسلمانوں میں اسلامی غیرت بہت تھی، اس لئے گرو نے اس کوتا کا، اپنے چیلوں پر نگاہ ڈالی اور ایک فری اسٹائل چیلہ نگاہ میں بچ گیا اور اسے مامور کر دیا کہ اپنی بولی بول، وہ بولی جو فلک بوس عمارتوں کو زمین بوس کر دے، جڑے ہوئے دلوں کو توڑ دے، عقیدہ و عمل کی مستحکم دیواروں میں دراڑ ڈال دے، غیرت مندوں کی غیرت کا کس بل نکال دے۔

بودم بے دال کا جنم ایک بنکر گھرانے میں ہوا، ابھی بہت چھوٹا تھا کہ فطرت اصلی کے خلاف باپ کی زبردستی قاعدہ بغدادی لے کر ایک عربی مدرسہ میں جانے لگا، کتنے برسوں پاؤں گھستا رہا، اجالے میں اندھیرے کو ٹٹولتا رہا، آنکھوں میں روشنی نہ تھی، خدا جانے برسوں میں قرآن مجید کے آٹھ پارے کا ناظرہ کس طرح پورا کر لیا؟ تاریکیٔ فطرت کا تقاضہ بہر حال پورا ہونا تھا، پورا ہوا، قرآن پڑھنا چھوڑ دیا اور کپڑا بننے لگا۔ بیس سال کی عمر تک اپنا نام بھی نہیں لکھ سکتا تھا، پھر خیال آیا کہ جہالت میں اندھیرا تلاش کر لینا تو کچھ نہیں ہے، کمال تو جب ہے کہ روشنی میں دمکتی ہوئی دنیا سے ہم تاریکی حاصل کریں۔ چنانچہ مشق شروع کی، سب سے پہلے طے کیا کہ کسی استاذ سے راہ نمائی نہیں حاصل کرنی ہے، کیونکہ یقین ہے کہ وہ ہاتھ پکڑ کر اندھیرے سے اجالے میں پہونچا دے گا۔ اس لئے استاذ سے گریز ضروری ہے، پھر بودم بے دال کا جو اصل گرو ہے اس نے میدان خالی

دیکھا تو غیر محسوس طریقے پر آموجود ہوا، اور اس نے ہاتھ کی صفائی سے ہر اجالے کو اندھیرا بنا کر پیش کردیا۔ استاذ سے دامن چھڑانے کے بعد ضروری تھا کہ سفر کی ابتداء کسی ایسی وادی سے کی جائے جس میں گھپ اندھیرا ہو، روشنی کا جگنو بھی اس میں نہ چمکتا ہو۔ چنانچہ ناولوں کی وادی میں اس نے گھومنا شروع کیا، ہر طرح کی ناولیں جاسوسی، رومانی، جنسی، کوک شاستر مارکہ ناولیں، گندی سے گندی، پھوہڑ سے پھوہڑ اس حد تک کہ دل و دماغ کے تمام گوشوں میں سیاہی اور گندگی پھیل گئی اور ہر قسم کی روشنی بجھ گئی۔ جب یہ مشق مکمل ہوگئی تو آہستہ آہستہ ناولوں کا پڑھنا چھوڑ دیا، اب مذہبی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا، سیرت نبوی، تاریخ اور احادیث کے اردو تراجم اور مجموعے دیکھتا رہا، قلب و نظر میں تاریکی تو تھی ہی ان اجالوں میں بھی اندھیرا ہی محسوس ہوتا رہا، دوسری طرف یہ حال تھا کہ نہ صرف دن میں بلکہ رات میں بھی بودم بے دال ہینڈلوم پر کپڑا بنتا رہا، روز و شب کے کاموں سے جب تھک کر چور ہو جاتا، دل کی تاریکی خوب بڑھ چکی ہوتی، سر چکراتا ہوتا، دماغ کی رگ رگ ماؤف ہو چکی ہوتی تو گرو کا یہ بے نظیر چیلہ حدیث و سیرت کی کتابیں پڑھتا اور چکنا چور برتن میں پانی بھرنے کی کوشش کرتا، اور جب کچھ حاصل نہ ہوتا تو مزید سر چکرا جاتا۔ کچھ دنوں تک وہ اپنی کھال میں مست رہا، پھر پروگرام بنایا کہ اس کا سر کیوں چکرائے؟ دوسروں کو بھی چکر دینا چاہئے، گرو کا نصب العین یہی ہے، اب یہاں انتخاب کی ضرورت تھی کہ ابتداء کہاں سے کی جائے۔

ابتداء یہاں سے ہوئی کہ بودم بے دال نے ایک مرتبہ بریلوی اور شیعہ کے درمیان اپنی ڈراونی آواز لگائی، بس کیا تھا دیکھتے ہی دیکھتے دونوں طرف کے لوگ ٹکرا گئے، اس ٹکراؤ کا دائرہ جلسوں، کتابچوں سے بڑھ کر کشت و خون تک جا پہونچا، پوری آبادی کا ناطقہ بند ہوگیا، شیعہ تو سخت جان تھے ان کا کچھ نہ بگڑا البتہ بریلی فرقہ کے ٹکڑے اڑ گئے اور کئی حصوں میں پارہ پارہ ہو کر آج بھی اپنی بربادی کا ماتم کر رہا ہے۔ پھر بودم بے دال کو ادھر سے کچھ اطمینان نصیب ہوا تو اسے محسوس ہوا کہ دیوبندی گروہ میں میری ساکھ قائم ہو چکی ہے اور شیعہ و بریلی مسئلہ میں دیوبندیوں نے مجھے شاباشی میری حیثیت سے زیادہ دیدی ہے۔ پھر کیا تھا جہالت کی تاریکیوں میں گھورنا شروع کردیا، علم کی روشنی سے آنکھیں چوپٹ ہونے لگیں تو روشنی والوں کو کوسنا شروع کردیا اور چاہا کہ سب چراغ بجھا دے اور اپنا کام کر جائے۔ خود تو وہ نور علم سے محروم ہے پھر کیوں کر گوارا ہوتا کہ جن

لوگوں کے ہاتھوں میں قرآن وسنت کا چراغ اور دلوں میں علم کا نور ہے، ان کا گریبان سلامت رہ جائے۔ چنانچہ الجھا اور خوب الجھا، جس کا دامن ہاتھ آیا اس کو تار تار کرنے کی کوشش کی۔ روشنی سے فرار تو فطرت میں داخل تھا، ہر شمع پر پھونک مارنے لگا، اس سے ہوا تو کچھ نہیں، لیکن عوام میں غل مچ گیا کہ بودم بے دال کمال کی ہمت وجرأت رکھتا ہے، جن کے گریبانوں تک اس کا ہاتھ نہیں پہونچ سکتا، انھیں بھی نوچنے کی ہمت کر ڈالتا ہے، چاہے منہ کے بل گر کر اپنا ہی حلیہ بگاڑ لے۔ واقعی ڈھٹائی کا پتلا ہے۔

بودم بے دال نے اعلان کیا کہ وہ اللہ کے کلام، حضور اکرم محمد مصطفی ﷺ کی سنت، خلفائے راشدین، ازواج مطہرات، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے اسوۂ حسنہ کو تعلیمات اسلامی کا منبع سمجھتا ہے، لیکن چونکہ اس کو روشنی سے ضد ہے اور تاریکی سے پیار ہے، اس لئے اس کے مطابق جس زبان میں قرآن نازل ہوا، اس سے وہ بالکل جاہل ہے۔ قرآن کو اس کی اصل زبان میں نہیں سمجھتا، پھر بھی دعوی کرتا ہے کہ اللہ کے کلام سے تعلیمات اسلامی کو اخذ کرتا ہوں۔ غلط کہتا ہے، وہ تعلیمات اسلامی کو ترجموں سے اخذ کرتا ہے اور ترجمہ خدا کا کیا ہوا نہیں ہے، اللہ کے کلام والی بات ترجمہ میں نہیں آسکتی ہے۔ عقل وخرد کی یہ بہت اونچی معراج ہے، جہاں پہونچ کر بودم بے دال کلام الٰہی اور ترجمہ کو ایک باور کئے بیٹھا ہے۔ پھر مزید پر لطف بات یہ ہے کہ حضور کی سنت، خلفائے راشدین، ازواج مطہرات، صحابہ کرام کے اسوہ حسنہ کو تعلیمات اسلامی کا منبع تو ضرور قرار دیتا ہے لیکن جو حضرات اس سنت اور اسوہ حسنہ کے ناقل ومحافظ ہیں ان کو جھوٹا کہتا ہے، ان کا مذاق اڑاتا ہے، ان کی عقل وفہم پر ماتم کرتا ہے۔ معلوم نہیں جب یہ حضرات جھوٹے ہیں تو بودم بے دال کو یہ سنت اور یہ اسوۂ حسنہ کہاں سے دستیاب ہوتا ہے؟ جسے وہ منبع سمجھتا ہے۔ شاید اس پر براہ راست نازل ہوتا ہو، یا ممکن ہے اس کے گرو کے ہاتھ کی صفائی ہو۔ پھر یہاں بھی اسے ترجموں کا سہارا لینا پڑتا ہے، لیکن ٹھہرئے! ہمیں بودم بے دال کی عقل وخرد پر الزام دینے کا کیا حق ہے؟ اس کے اندر تو روح ہی دوسری ہے، اس کا معیار دوسرا ہے، ہم انسانوں کی عقل وفہم کے معیار پر اسے پرکھیں گے تو اس کی حلق سے وہی مکروہ آواز برآمد ہوگی جس سے آبادیاں لرز اٹھتی ہیں۔

مطالعہ کتب جاری رہا، اسی شان کے ساتھ جس کا اوپر ذکر ہوا، مطالعہ کے دوران بودم

بے دال کو متعدد ایسی احادیث ملیں، جو اس کے بقول نہ اسلام کے عقیدے کے مطابق تھیں، نہ عقل وفطرت کے مطابق۔ حدیثوں میں سے اس نے اپنے بقول اتنا تضاد پایا کہ سر چکرا کے رہ گیا، سر تو پہلے ہی سے چکرایا ہوا تھا، مزید چکرا گیا۔ اور یہ بات طے شدہ تھی کہ کسی استاذ سے راہ نمائی حاصل نہیں کرنی ہے ورنہ اندیشہ تھا کہ وہ احادیث کا صحیح مطلب بتا دیتا اور وہ اسلام کے عقیدے مطابق ہوجاتی، اور تضاد بھی دور ہوجاتا، اس طرح بودم بے دال نے جو تاریکی ڈھونڈھ رکھی تھی، وہ گم ہوجاتی۔ بودم بے دال اسی تاریکی میں مست رہا، نشہ بڑھتا گیا، جب رگ وریشہ پوری طرح سیاہی میں ڈوب گیا تو منہ سے دوستوں یا نجی محفلوں میں تاریکیاں بہنے لگیں، روشنی والوں نے روشنی دکھائی تو چیخ پکار کرنے لگا۔

ہاں تو ہم یہ عرض کر رہے تھے کہ بودم بے دال کی ایک آواز پر بریلوی اور شیعوں میں خوفناک ٹکراؤ ہو چکا تھا، پھر اسے خیال آیا کہ بریلوی اور شیعہ دونوں پہلے ہی سے غلط راہ کے مسافر ہیں انہیں ٹکرانے سے کیا حاصل؟ جو لوگ سیدھی راہ پر ہیں ان میں ہلچل مچانی چاہئے۔ یہی سوچ کر اسلام کے مسلمہ اور متفقہ عقائد کے خلاف آوازیں قعر معدہ سے نکالنی شروع کر دیں، آواز تو آواز ہے، گدھا بھی بولے تو تھوڑی دیر کے لئے فضا کو متاثر کر دیتا ہے، کچھ لوگ گرد جمع ہونے لگے۔ علما نے ٹوکا تو اندر کی گندگی باہر پھیلنے لگی اور منہ سے گالیوں کی پھلجھڑی چھوٹنے لگی۔ کھوپڑی تو الٹی ہے ہی خود جو گالیاں دیں وہ حق کی ترجمانی بن گئیں، اور علماء نے ٹوکا تو وہ فحش سے فحش تر گالیاں نظر آئیں۔ ظاہر ہے جس شخص کا سر رسول اللہ ﷺ کی احادیث سے چکراتا ہو، اس پر علماء کی باتوں کا ردعمل کیا ہوگا؟۔

پھر بودم بے دال ایک دن جوش میں آیا اور ایک کتاب لکھ دی، اس میں لکھا کہ آنکھوں والا مقلد ہوں اور بنیاد دیوبندی، لیکن یہ وہ آنکھ ہے جو صرف اندھیرے کا ادراک کرتی ہے، اجالے میں بیکار رہ جاتی ہے۔ خوب جی بھر کر مولویوں کو، اگلے پچھلے علماء ومحدثین کو، فقہا وصوفیہ کو پوری امت کے مسلمہ اکابر کو گالیاں دیں، اپنی کور چشمی کو ان کی جانب منسوب کیا۔ اپنے کو بے حد مظلوم ومعصوم ظاہر کیا اور بتایا کہ میں ملاؤں کی یلغار کی زد میں ہوں، جبکہ بہت سے دینی عقائد اس کی یلغار کے زد میں ہیں۔ بودم بے دال نے ہینڈلوم پر ساڑیاں بنی اور دین کی دھجیاں بکھیر دیں۔
یہ ہے کارنامہ بودم بے دال کا! شاباش بودم بے دال زندہ باد بودم بے دال

مکالمہ

س: السلام علیکم

ج: وعلیکم السلام

س: کہئے صوفی جی! آج کل کن اشغال واوراد میں مصروف ہیں؟ اور کیا احوال ومقامات طے ہو رہے ہیں؟۔

ج: ماشاء اللہ! آپ جب ملتے ہیں کچھ نہ کچھ طنز کے تیر ونشتر چلا ہی دیتے ہیں۔ ارے بھائی! میں تو ایک ادنی طالب علم ہوں، کتابیں پڑھتا ہوں، استعداد علمی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

س: اچھا آپ بھی طالب علم ہیں؟ بہت خوب! یہ تو بیسویں صدی کا عجوبہ ہے۔ ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ جس مدرسہ میں آپ پڑھتے ہیں، وہاں صرف تصوف پڑھایا جاتا ہے، وہاں تصوف وسلوک کے احوال ومقامات طے کرائے جاتے ہیں۔

ج: خیر! تصوف کے احوال ومقامات طے کرنا اور کرانا کوئی برا کام ہے نہیں! لیکن میں نہیں سمجھ پا رہا ہوں کہ آپ کے خیال شریف میں یہ بات کیوں کر آئی؟ کیا آپ نے ہمارے مدرسہ کو نہیں دیکھا؟ ہمارے یہاں کے اساتذہ کو نہیں دیکھا؟ طلبہ کو مذاکرہ ومطالعہ کرتے نہیں دیکھا؟ پھر آپ کو احوال ومقامات کی پھبتی کیوں سوجھی؟۔

س: بھئی! بات یہ ہے کہ آپ کی گول ٹوپی، آپ کا خوب اونچا پاجامہ، نیچا کرتا، بھولی بھالی صورت، چہرے پر فکر بھری سنجیدگی، جو بھی دیکھے گا یہی سمجھے گا کہ آپ طالب علم نہیں، کوئی صوفی صاحب ہیں۔

س: اچھا، تو یہ غلط فہمی کی وجہ ہے؟ تو بھائی صاحب! بتا دیجئے کہ طالب علم کو کیسا ہونا چاہئے؟ تا کہ اگر ہو سکے تو میں بھی ویسا ہی بننے کی کوشش کروں۔

ج: بھائی ہم تو طالب علم اسے سمجھتے ہیں جو خوب شوخ وشنگ ہو، تیز وطرارا ہو، بے جھجک ہو، کتاب بھی پڑھتا ہو لیکن معلومات عامہ زیادہ رکھتا ہو۔ اخبارات ورسائل کا مطالعہ زیادہ کرتا ہو۔ آخر اس کو دنیا میں جینا ہے تو دنیا والوں کی طرح اسے رہنا ہوگا۔ نرا ادب بن کر نہ رہنا چاہئے۔ اور پھر جانتے ہی ہیں کہ شرارت میں ذہانت پوشیدہ ہوتی ہے۔

ج: اچھا! اب میں سمجھا کہ اسے طلب علم کے علاوہ اور بہت کچھ کرنا چاہئے بلکہ شاید آپ کا مطلب یہ ہے کہ طلب علم کے علاوہ اور سب کچھ کرنا چاہئے۔

س: نہیں میرا مطلب یہ نہیں ہے، ہاں میں یہ کہتا ہوں کہ دنیا میں بے وقوف بن کر تو نہیں رہنا چاہئے۔

ج: بے وقوفی کسے کہتے ہیں؟ بھائی صاحب! مجھ کو میرے والدین نے گھر سے مدرسہ اس لئے بھیجا ہے کہ میں دین کا علم حاصل کروں اور صرف علم نہیں، اس کے مطابق اپنی زندگی کو بناؤں۔ ادب واخلاق سیکھوں، اپنے طور طریقوں کو جتنا ممکن ہو، رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرام اور امت کے صالحین کے طرز پر بناؤں۔ اب اگر میں یہی کام نہ کروں بلکہ اپنے آپ کو دوسروں کے طرز پر لگا دوں، کالج اور یونی ورسٹی کے اسٹوڈنٹوں کے طریقے پر چلنے لگوں اور اپنے مقصد کو بھول جاؤں تو یہ عقل مندی ہوگی یا بے وقوفی؟ آپ ہی بتائیے۔

س: یہ تو بے وقوفی ہوگی، لیکن صوفی جی! آپ کو اتنا تو ماننا پڑے گا کہ دنیا آگے جا چکی ہے۔ دنیا والے بہت ترقی کر چکے ہیں۔ اگر کسی ترقی یافتہ معاشرہ میں آپ ایسی ٹوپی، ایسا اونچا پاجامہ اور ایسا لمبا کرتا پہن کر جائیے گا تو لوگ سمجھیں گے کہ پرانے زمانے کا کوئی مردہ زندہ ہو کر آ گیا ہے۔ لوگ ڈر کر بھاگنے لگیں گے۔ آخر دنیا والوں کی بھی رعایت کرنی چاہئے یا نہیں؟۔

آپ مجھے دیکھئے، میں بھی دین کا طالب علم ہوں مگر قسم لے لیجئے، جو کبھی ٹخنوں سے اوپر پاجامہ پہنتا ہوں، گول ٹوپی تو بڑی بات ہے میرے بالوں کو تو اگر ٹوپی چھو جائے تو وہ برہم ہو جائیں۔ اور کرتے میں کون اتنا فاضل کپڑا خرچ کرے؟ کیا یہ فضول خرچی نہیں ہے؟ اور آج تو

غلطی سے میں نے اپنے چھوٹے بھائی کا پاجامہ اور بڑے بھائی کا کرتا پہن لیا ہے، اس لئے آپ میری یہ کیفیت دیکھ رہے ہیں۔

ج: ہاں بھائی! کرتے میں تو فضول خرچی ہے اور پاجامے میں زیادہ کپڑا لگا لینا عین اسلام ہے۔ میرے بھائی! ہمیں اپنے دین کی اور اپنے علم کی رعایت کرنی ہے۔ دنیا والے چاہے بھاگیں، دوڑیں۔ دین پہلے بھی اجنبی تھا اور حدیث میں آیا ہے کہ بعد میں اجنبی ہو کر رہ جائے گا۔ میں تو سوچتا ہوں کہ دین کی منشا کے مطابق اجنبی بن جانا بھی دینداری اور دین کے ساتھ وفاداری ہے۔ دنیا تو گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی ہے، کہاں تک اس کے ساتھ ہم اپنا رنگ بدلیں؟ کل کو لوگ آپ کی نماز سے بدکنے لگیں تو آپ اسے بھی چھوڑ دیں گے؟۔

س: جی ہاں! جہاں لوگوں کو نماز سے وحشت کا اندازہ ہوتا ہے وہاں تو ہم اس سے بھی دامن بچا ہی لے جاتے ہیں۔ سفر میں، ٹرین میں، بس کے اسٹیشنوں پر اگر ہم ہر جگہ مصلے بچھاتے رہیں، لوٹا لے کر وضو کے لئے دوڑتے پھریں تو نہ جانے لوگ کیا سوچنے لگیں؟ اس لئے ہم تو توفیق ہوتی ہے تو اکٹھا گھر یا مدرسہ پر ہی آکر پڑھتے ہیں اور ویسے بھی توفیق کم ہی ہوتی ہے۔ سوچتے ہیں کہ جب ادا نہیں پڑھی تو قضا کا کیا حاصل؟۔

ج: اب میں آپ کی بات کا کیا جواب دوں؟ بجز اس کے کہ ”انا للہ وانا الیہ راجعون“ پڑھوں۔ بھائی صاحب! آپ کہاں پڑھتے ہیں؟ اگر آپ کے مدرسہ میں یہی پڑھایا جاتا ہے تو وہ دین کی درس گاہ نہیں، قتل گاہ ہے۔

س: نہیں میرے مدرسہ میں یہ پڑھایا نہیں جاتا، دین کی تعلیمات اور دینی ثقافت کا ہمارے یہاں بہت چرچا ہے، لیکن عام ماحول ومعاشرہ یہی ہے۔ ہم لوگ تو دین کی خدمت یہی سمجھتے ہیں کہ اس کے سلسلے میں مضامین لکھیں، دینی احکام کی دنیوی حکمتیں بیان کریں، ہم جو کچھ نہیں کرتے اس کی لوگوں کو دعوت دیں۔ ہم سے کہئے تو نماز پر روزہ پر نہایت فصیح وبلیغ لکچر دیدیں لیکن کوئی فجر کی نماز کے لئے ہم کو جگا دے تو ہم اس کے سر پر چڑھ دوڑتے ہیں کہ رات بھر مضمون لکھ کر، تقریر کر کے اسلام کی خدمت کی ہے، اب ہم ہی نماز بھی پڑھیں؟۔

ج: بھائی! یہ باتیں میری سمجھ میں بالکل نہیں آتیں۔ ہم تو اب تک یہ جانتے تھے کہ آدمی

پڑھتا ہے اولاً اپنے عمل کے لئے، خود اس علم کے مطابق بنتا ہے تب دوسروں کو کچھ کہتا ہے۔ آپ نہ جانے کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں؟۔

س: صوفی جی! یہ سب پرانے زمانے کی باتیں ہیں، اب قدریں بدل گئی ہیں، افکار کی دنیا بدل گئی، معیار بدل گیا ہے۔ پہلے نمازوں کا اہتمام کرنا، جماعت کا التزام کرنا، قرآن کی تلاوت کرنی، تہجد و اشراق پڑھنا، اللہ سے ڈرتے رہنا، کسی پر تنقید و تبصرہ نہ کرنا، حلال وحرام کی تمیز کرنا، چھوٹی چھوٹی باتوں میں گناہ سے کانپتے رہنا، یہ سب باتیں اسلام اور ایمان کی تھیں۔ اب یہ سب باتیں لد گئیں۔ زمانہ الٹی چال چل گیا ہے، اب ہمیں اپنی چال بھی بدلنی پڑے گی۔ اب بھی وہی سب کام کرتے رہیں گے تو آپ بے وقوف کہلائیں گے۔

ج: پھر ہم کو کیا کرنا ہوگا؟

س وہی جو میں کہہ رہا ہوں، ہم تو اس وقت تک نماز نہیں پڑھتے جب تک نگراں صاحب کا ڈنڈا نہ ہو، یا آپ جیسے لوگوں کا خوف نہ ہو، اور پڑھتے بھی ہیں تو بس فرض کسی طرح اتار لیا، سنت و نوافل پڑھنے کو فیشن کے خلاف اور حماقت میں داخل سمجھتے ہیں۔ ارے بھائی! اسلام اور مسلمانوں کا نعرہ لگاؤ، بس کافی ہے۔ یہ کیا کہ اپنے اوپر یہ مصیبت طاری کر لی ہے۔

ج: بھائی! آپ کی بات سمجھنے سے میں قطعاً قاصر ہوں، میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ میں اللہ کا بندہ ہوں، اس کی بندگی بجالانا میرا فریضہ ہے۔ مجھے تو ہو بہو حضور اکرم ﷺ کی تصویر بننا ہے، آپ کی زندگی قرآن کی روشنی میں اور احادیث کے آئینے میں جو نظر آتی ہے، وہ اس سے بالکل مختلف ہے، جیسا بننے کی آپ تلقین کر رہے ہیں۔ پتہ نہیں آپ حدیثیں پڑھتے ہیں یا نہیں؟ قرآن کا نعرہ تو آپ کی زبان سے بہت سنا ہے۔

س: اجی صوفی جی! قرآن کا نعرہ اس لئے تھوڑا ہی لگاتا ہوں کہ جو آپ سمجھتے ہیں۔ میں تو قرآن پڑھتا ہوں اور جو معنی اور مطلب میرے دل پر وارد ہوتا ہے اسے بیان کرتا ہوں، اس میں میری ایک مستقل رائے ہوتی ہے۔ میں قرآن کی تشریح دور حاضر کے تقاضوں کے لحاظ سے کرتا ہوں۔ آپ لوگ حدیث و تفسیر میں اس کا معنی و مطلب ڈھونڈھتے ہیں اور میں دائیں بائیں دیکھ کر اس کی تفسیر بیان کرتا ہوں۔ اور رہی حدیث تو اس کا سبق جب ہوتا ہے تو سچی بات یہ ہے کہ ہم اس

وقت ناول پڑھتے ہوتے ہیں۔ کون پڑھے ان پرانی باتوں کو! ہاں اس میں کہیں ہمارے خیال کے مطابق دور حاضر سے ملتی جلتی کوئی بات آجاتی ہے تو ہم پھڑک اٹھتے ہیں، اسے نوٹ کر لیتے ہیں، پھر اسی پر نظریات کا پورا محل کھڑا کر دیتے ہیں۔

ج: اللہ اکبر! بہت اونچا کام کرتے ہیں، بھائی! ہم کو یہ کام نہیں آتا۔ ہم تو قرآن وحدیث کو عقیدت کی نگاہ سے پڑھتے ہیں، ہمارا دل اسے جذب کرنے کی کوشش کرتا ہے، پھر ہمارے اعضا، ہماری شکل وصورت پر اس کا رنگ جھلکنے لگتا ہے۔ یہی رنگ ہمارے اسلاف پر جھلکا تھا اور اب ہم پر جھلکتا ہے، تو ہم کو لوگ پرانے زمانے کا ہونے کی پھبتی کستے ہیں، لیکن یہ بات ہمارے لئے شکر کی ہے، ہم اس پر سو جان سے اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ آج کا انسان ہمارے اندر پچھلے دور کی جھلک محسوس کرتا ہے۔ آپ کو جدیدیت مبارک، ہم کو تو پرانی روش ہی پسند ہے۔

س: آپ جانئے، آپ کا کام! اسی لئے تو آپ لوگ مسجد کے مؤذن، نمازیوں کے امام، مکتب کے ملا بن کر رہ جاتے ہیں، نہ کہیں آپ کی عزت ہے اور نہ کوئی آپ کا مقام ہے۔ ہم کو دیکھئے، کرسی پر بیٹھتے ہیں، میز پر لکھتے ہیں، کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت کرتے ہیں۔ ہمارا نام چھپتا ہے، ہم دوسروں کے مضامین سے انتخاب کر کے غلط صحیح مضامین لکھتے ہیں اور ان کی اشاعت ہمارے نام سے ہوتی ہے۔ دنیا میں ہمارا کلمہ پڑھا جاتا ہے، ہمارے ساتھیوں میں کسی کو آپ نہ مسجد کا امام پائیں گے نہ مؤذن، نہ مکتب کا ملا! ہم علم دین پڑھتے ہیں، پھر کالجوں، یونی ورسٹیوں میں دنیا کا علم حاصل کرنے چلے جاتے ہیں۔ ہم جب پڑھ کر فارغ ہوتے ہیں تو بڑی بڑی تنخواہوں کی ہم کو ملازمت ملتی ہے اور آپ کو کیا ملا؟ ایک مکتب اور اس میں چند نادان بچے، ایک مسجد اور اس میں فقط جمن مقتدی! بھلا ہم کہاں، آپ کہاں؟۔

ج: یہ تو بہت ٹھیک آپ نے کہا، لیکن ایک بات مجھے بتایئے، دنیا میں تو آپ نے اپنے خیال کے مطابق عزت حاصل کر لی، لیکن کیا یہی عزت کے سامان لے کر آپ اللہ کے حضور بھی جائیں گے۔ وہاں بھی اسی سامان کی پوچھ ہوگی؟۔

س: صوفی جی! یہ سوال تو بہت ٹیڑھا ہے، یہ مت پوچھو، یہ دیکھو! دنیا کی رونق دیکھو، تقریروں کے بعد تعریفیں دیکھو، میرے مضامین پر یہ تبصرے دیکھو، دیکھو اس میں مجھے کتنا سراہا گیا ہے۔ یہ کیا

کچھ کم بات ہے؟۔

ج! نہیں! یہ بہت بڑی بات ہے لیکن مجھے بتاؤ تو سہی، یہی باتیں اللہ کے حضور بھی پیش کروگے؟۔

س: اجی! پھر وہی اللہ کے حضور والی بات چھیڑ دی۔ ہم لوگ دوسری طرح کے ہیں۔ آپ سب کو صوفی ہی بنانا چاہتے ہیں۔ آپ کو اگر وہی کچھ کرنا ہے جو آپ کہہ رہے ہیں تو کیجئے، مجھ کو ترقی کرنے دیجئے۔ میں دنیا میں اسلام کا بول بالا کروں گا۔ ساری دنیا سے اسلام کو منوا کر چھوڑوں گا۔ باطل نظریات کو تہ و بالا کردوں گا۔ آپ کی طرح مسجد میں بند کر کے نہیں رکھوں گا۔

ج: مسجد میں بند کر کے تو میں بھی نہیں رکھتا، زندگی کے تمام کاروبار میں دین کو نافذ کرنے، دین کی تعلیمات پر عمل کرنے ہی کے لئے دین سیکھ رہا ہوں، لیکن مجھے اپنی فکر ہے کہ کل کو جب میں خدا کے حضور پیش ہوں، اور وہاں رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرام اور صالحین امت موجود ہوں تو میں انہیں کے درمیان کا آدمی معلوم ہوں، اجنبی نہ محسوس ہوں۔ میں نے قرآن میں جو کچھ پڑھا ہے، حدیث سے جو کچھ سیکھا ہے، اپنے اساتذہ کو جیسا دیکھا ہے اور ان کے پہلے سے تسلسل کے ساتھ جو سنا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ حضور اکرم ﷺ سے قریب تر زندگی کا وہی طرز عمل ہے، اور اسی پر مجھے میرے اساتذہ چلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اگر آپ کے خیال میں یہ رسول اللہ ﷺ کے طریقے کے خلاف ہے، ان کا طریقہ وہی ہے جو آپ اختیار کئے ہوئے ہیں تو مجھے قرآن وحدیث اور تعامل امت کے حوالے سے بتائیے۔ مجھے تو دین سے محبت ہے، مجھے اسی پر چلنا ہے، اگر میں واقعۃً جان لوں گا کہ آپ کا طرز زندگی سنت سے قریب تر ہے تو میں بے تأمل اسے اختیار کرلوں گا۔

س: اجی حضرت! کس جنجال میں مجھے پھنسا رہے ہو؟ ہم لوگ تلاش اور استدلال کی دنیا کے لوگ نہیں ہیں، ہم تو زمانہ حال کے لوگ ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ قدریں بدل گئی ہیں، اب جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، اس کے لئے جستجو اور استدلال نہیں ہے، سنت نبوی کے اتباع کا خیال نہیں ہے۔ یہ باتیں تو زمانہ حال کی ہیں۔ آپ کو اپنا خیال مبارک ہو، ہم تو اپنی کھال میں مست ہیں۔ باقی اگر آپ کو قرآن وحدیث سے دلیل چاہئے تو ہمارے اساتذہ کی کتابیں اور ہم لوگوں کے لکھے ہوئے

مضامین پڑھئے، الفاظ وعبارات کی ایک نئی جلوہ گاہ نظر آئے گی۔

اچھا، اب میں چلا

ج: خیر! جائیے، لیکن جو کچھ آپ نے کہا ہے، ذرا اس پر نظر ثانی کیجئے گا۔ کہیں آخرت میں یہ سودا خسارہ کا نہ ثابت ہو۔

س: اچھا فرصت ملی تو غور کروں گا۔ اچھا خدا حافظ

ج: بہت خوب۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

❑❑❑

اس وقت علم بڑھ رہا ہے، عمل گھٹ رہا ہے، جو چیز گھٹ رہی ہے اس میں اضافہ کرو، جو چیز پہلے ہی سے زیادہ موجود ہے اس پر زیادتی اس وقت کر سکو گے جب اس کے لئے اپنے کو فنا کر دو، اور پہلی چیز میں تھوڑا اضافہ بھی زیادہ محسوس ہوگا، اگرچہ یہ بات بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ عمل کے بغیر علم ایک لایعنی شئے یا دماغی عیاشی ہے جس کا فائدہ ممکن ہے کہ دنیا میں کچھ نظر آئے، مگر آخرت میں سراسر باعث خسران ہوگا، میرا منتہائے نظر یہ ہے کہ تم سچائی کے ساتھ علم دین حاصل کرو، اور دیانت داری کے ساتھ اس پر عمل کرو۔ (حدیث دوستاں)

سنئے کہ وہ جن کی زبان پر صدق وراستی کا نزول ہوا تھا، ان کی زبان صدق ترجمان نے ان اجنبیوں کو بشارت سنائی ہے: فطوبیٰ للغرباء، ہم کو اجنبی بننے کی ضرورت ہے، اگر دنیا کی نگاہوں نے ہمیں اجنبی نہ سمجھا، یا اجنبیت میں انھیں کمی محسوس ہوئی تو سمجھ لیجئے کہ اسی کے بقدر ہمارے اندر روحِ دینی کی کمی ہے۔ ہمیں دنیا والوں کے ساتھ سازگاری نہیں کرنی چاہئے، ناسازگاری درکار ہے، جس قدر آدمی اعمال دنیاوی میں لگے گا، اسی قدر دنیا سے موافقت حاصل ہوگی، اور اس کی اجنبیت میں کمی ہوتی چلی جائے گی، اور جس قدر اعمال دینی میں انہماک رہے گا، اسی مقدار سے دنیا والوں کی نگاہ میں اوپرا اور اجنبی محض ہوتا چلا جائے گا۔ اس معیار پر ہم اپنے کو پرکھ سکتے ہیں۔ (حدیث دوستاں)

مکالمہ

س: آیئے جناب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ج: آرہا ہوں، کہئے کیا بات ہے؟

س: ارے آپ نے سلام کا جواب نہیں دیا؟۔

ج: جی وہابیوں، دیوبندیوں کے سلام کا جواب دینے سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔

س: اچھا! تو آپ کا نکاح ہو چکا ہے؟

ج: نہیں، ابھی تو نہیں ہوا ہے۔

س: تو کیا آج اگر آپ سلام کا جواب دیدیں گے تو آئندہ ہونے والا نکاح بھی ٹوٹ جائے جائے گا؟

ج: اور کیا، ہمارے علماء اہل سنت والجماعت یہی فرماتے ہیں، اور ایمان بھی جاتا رہتا ہے۔

س: آخر ہم لوگوں سے ایسا کون سا قصور ہوا ہے کہ ہمارے سلام کا جواب دودھاری تلوار بن جاتا ہے؟ جو ماضی و مستقبل دونوں نکاحوں کو کاٹ دیتی ہے، اور ایمان بھی اس سے مقتول ہو جاتا ہے؟

ج: وہابی، دیوبندی گستاخ رسول ہوتے ہیں، حضور کی شان میں کفر بکتے ہیں، حضور کو عالم الغیب نہیں مانتے، حاضر وناظر نہیں مانتے، آپ کو بشر کہتے ہیں، اپنا بڑا بھائی بتاتے ہیں، اولیاء اللہ کو نہیں مانتے۔ غرض بہت طرح کے کفر میں مبتلا ہیں، اس لئے یہ قطعی مرتد ہیں اور مرتد سے سلام و کلام سب حرام ہے۔

س: بھائی! مرتد تو اسے کہتے ہیں جو مسلمان رہا ہو، بعد میں کفر کر کے دین سے پھر گیا ہو۔ تو آپ دیوبندی کو پہلے سے مسلمان مانتے ہیں؟

ج: نہیں، وہ پیدائشی مرتد ہیں۔ یہ مرتد کی نئی قسم ہے، ہمارے اعلیحضرت بریلوی قدس سرہ نے یہ عجیب وغریب قسم کی دریافت کی ہے۔ انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ”برہمن اگر کسی مسلمان کا نکاح پڑھائے تو ہوجائے گا مگر دیوبندی پڑھائے گا تو نہیں ہوگا۔“

س: واقعی آپ کے اعلیحضرت نادر تحقیقات کے امام ہیں۔

ج: اور کیا، انہوں نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ ”دیوبندی، وہابی کا نکاح نہ کسی مسلمان سے نہ کافر سے، نہ انسان سے نہ حیوان سے، نہ جن سے نہ فرشتے سے، کسی سے درست نہیں ہوتا۔ دیکھا دیوبندیوں پر زمین وآسمان کے دروازے کیسے بند کردیئے ہیں؟ اور کرو گستاخی رسول، اعلیحضرت آپ لوگوں کو کہیں کا نہیں چھوڑیں گے۔ جنت تو خیر جنت ہے، جہنم میں بھی گھسنے نہیں دیں گے۔

س: بھائی! جہنم میں جگہ کہاں ہوگی؟ اس کو اعلیحضرت کا شکم مبارک تن تنہا بھر چکا ہوگا۔

ج: دیکھئے آپ اعلیحضرت کی شان میں گستاخی نہ کیجئے، ورنہ ان کی روح کو جلال آجائے گا تو ابھی آپ کا وجود ہوا میں اڑتا ہوا نظر آئے گا۔

س: اچھا خیر! یہ بتایئے کہ ہم نے حضورﷺ کی شان میں گستاخی کب کی ہے؟ جہاں تک ان باتوں کا ذکر ہے جن کو آپ نے بیان کیا ہے، وہ تو قرآن کی تعلیم کے مطابق ہیں۔ دیکھئے اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں کہ ”**قل لا یعلم من فی السموات والارض الغیب الا اللہ**“. آپ کہہ دیجئے کہ آسمان وزمین میں غیب بجز اللہ اور کوئی نہیں جانتا۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ غیب کا علم صرف اللہ کو ہے تو حضورﷺ کیسے عالم الغیب ہوجائیں گے؟ یہ تو قرآن کے خلاف ہے۔

ج: یہی تو دیوبندیوں کی گستاخی ہے، ہر بات میں قرآن پڑھنے لگتے ہیں۔ قرآن پڑھنے اور سمجھنے کا تمہارا منہ ہے؟ قرآن تو اعلیحضرت نے پڑھا ہے، انہوں نے اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے، اسی آیت سے ثابت کیا ہے کہ حضور عالم الغیب ہیں۔ اعلیحضرت کا رسالہ ”خالص الاعتقاد“ پڑھ لیجئے۔

س: آپ ذرا سمجھا دیجئے کہ انہوں نے کیا لکھا ہے؟

ج: میں بھلا اتنے بڑے عالم کے فلسفیانہ نکتوں کو سمجھ سکتا ہوں، انہوں نے تو ایسی بات لکھی ہے جس کو میں اور تم تو کیا؟ کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا!

س: تب اس سے کیا حاصل؟ جب کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا۔

ج: جی! نہیں سمجھ میں آتا تو اسے ماننا ضروری ہے۔

س: اچھا! اسے چھوڑیئے۔ دیکھئے! اللہ تعالی فرماتے ہیں ”**وما کنت بجانب الطور** اور **ماکنت بجانب الغربی**“ آپ طور کے کنارے نہیں تھے، آپ مغربی کنارے پر نہیں تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ وہاں حاضر نہ تھے، پھر آپ کو حاضر وناظر ماننے کا کیا مطلب؟

ج: اجی! تم تو پھر قرآن پڑھنے لگے، یہی تو دیوبندی کفر کرتے ہیں کہ قرآن سے استدلال کرنے لگتے ہیں۔ ارے اعلیحضرت کے اقوال دیکھو، تب ایمان روشن ہوگا، تم لوگ قرآن کیا سمجھو گے؟

س ارے بھائی! یہ بات تو بالکل واضح ہے، اچھا اور دیکھو، اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ ”**قل انما بشر مثلکم یوحی الی**“. تم کہہ دو کہ میں تمہاری طرح ایک بشر ہوں، البتہ میرے اوپر وحی کا نزول ہوتا ہے۔

ج: دیکھو! تم نے محبوب کبریاﷺ کی شان میں گستاخی کی، تم ان کو اپنے جیسا بشر کہتے ہو؟

س: بندۂ خدا! میں تھوڑا ہی کچھ کہہ رہا ہوں۔ میں تو اللہ تعالی کے ارشادات کا ترجمہ کررہا ہوں، اور تمہاری طرح کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بس عام انسانوں کی طرح آپ بھی ہیں بلکہ اس سے تو مَلکیت اور الوہیت کی نفی مقصود ہے۔ اور بتانا یہ ہے کہ میں بھی بشر کی جنس سے تعلق رکھتا ہوں، لیکن پھر میری خصوصیت یہ ہے کہ مجھ پر اللہ کا پیغام اترتا ہے۔ اس میں گستاخی کا کیا معنی ہے؟

ج: یہی تو بات ہے، تم لوگ گستاخی کرکے بات بنانے لگتے ہو۔ اچھا مان لیا کہ اس میں گستاخی نہیں ہے لیکن ہمارے علما نے ثابت کردیا ہے کہ گستاخی ہے۔ اس لئے ماننا پڑے گا، کیوں کہ وہ لوگ معتبر ہیں۔

س: ہاں بھائی! وہ قصہ سنا ہے نا کہ ایک شخص بیٹھا رورہا تھا، لوگ جمع ہوگئے، پوچھا گیا کہ کیوں روتے ہو، اس نے کہا کہ گھر سے آدمی آیا ہے، اس نے بتایا کہ بی بی نے سب چوڑیاں توڑ دی ہیں، اور سینہ پر ہاتھ مار کر بین کررہی ہے، اور کہہ رہی ہے کہ وہ بیوہ ہوگئی ہے۔ لوگوں نے کہا کہ تم تو اچھے خاصے زندہ ہو، بیوی بیوہ کیسے ہوجائے گی؟ وہ بولا آپ لوگ ٹھیک کہتے ہیں لیکن گھر سے جو

آدمی آیا ہے، وہ معتبر ہے۔

اور وہ جو آپ نے کہا کہ ہم حضور ﷺ کو بڑا بھائی کہتے ہیں تو یہ ہماری بات نہیں ہے بلکہ خود رسول اللہ ﷺ نے کہا ہے۔ قصہ یہ ہوا کہ ایک مرتبہ ایک اونٹ نے رسول اللہ ﷺ کو سجدہ کیا، آپ کے اصحاب نے جب یہ منظر دیکھا تو عرض کیا کہ آپ کے سامنے جانور اور درخت سجدہ ریز ہوتے ہیں، تو ہم کو زیادہ حق پہونچتا ہے کہ آپ کو سجدہ کریں۔ اس پر آپ نے فرمایا ”اعبدوا ربکم واکرموا اخاکم“ اپنے رب کی عبادت کرو اور اپنے بھائی کی تعظیم کرو۔ اسی حدیث کی شرح میں حضرت مولانا محمد اسماعیل شہید علیہ الرحمہ نے لکھا ہے کہ تمام انسان بھائی بھائی ہیں، جو بہت بزرگ ہو، وہ بڑا بھائی ہے۔ اس کی بڑے بھائی کی سی تعظیم کرو، باقی سب کا مالک اللہ ہے، عبادت اسی کی کرنی چاہئے۔

بتایئے! اس میں کیا گستاخی ہوگئی۔ آخر صحابہ میں بعض آپ کے چچا تھے، بعض آپ کے چچازاد بھائی تھے، بعض آپ کے پھوپھی زاد بھائی تھے، تو کیا وہاں بھی بھائی کہنا غلط ہے۔ تم لوگ تو خوامخواہ مسلمانوں کے جذبات سے کھیلتے ہو۔

ج: ہاں! اس میں گستاخی تو نہیں ہے مگر کیا کریں ہمارے علما ایسا ہی کہتے ہیں۔ اور ہاں آپ نے اسماعیل دہلوی کا نام لیا۔ یہی وہ ہیں جنہوں نے لکھا ہے کہ نماز میں حضور کا خیال آنا، گدھے اور کتے کے خیال آنے سے بدتر ہے۔

س: استغفراللہ ربی! کھلا ہوا بہتان ہے، صریح تہمت ہے، سفید جھوٹ ہے۔ یا اللہ! تیری زمین پر ایسا جھوٹ بولا جاتا ہے، اور پھر بھی زمین و آسمان قائم ہیں، تھرا کے گر کیوں نہیں پڑے، لیکن بے چارے مولانا اسماعیل شہید کی کیا حقیقت ہے؟ یہاں تو انبیا پر بھی تہمت رکھی گئی۔ اللہ کے خلاف بھی جھوٹ کا طوفان اٹھایا گیا، بس اللہ کا حلم ہے کہ دنیا میں سب کچھ ہو رہا ہے اور دنیا چلی جارہی ہے۔

ج: ارے میاں! یہ سب کیا کہنے لگے ہو، میرے سوال کا جواب دو۔

س: ہاں میں جواب ہی دے رہا ہوں لیکن اس سے پہلے اس جھوٹ پر ماتم کرلوں۔ سنو! مولانا اسماعیل شہید نے نہیں، حضرت سید احمد شہید علیہ الرحمہ کے ملفوظات ”صراط مستقیم“ کے نام

سے ہیں، اس کے دو حصے ہیں، ایک حصے کے مرتب مولانا شہید ہیں، دوسرے حصے کے مرتب مولانا عبدالحی صاحب ہیں، جس حصے کو مولانا عبدالحی صاحب نے مرتب کیا ہے اس میں نماز کے اندر رسول اللہ ﷺ کی جانب ‘‘صرف ہمت’’ کرنے کا تذکرہ ہے۔

ج: یہ ‘‘صرف ہمت’’ کیا چیز ہے؟

س: یہی تو سمجھنے کی چیز ہے، اسی لفظ کی تحریف نے سارا بہتان کھڑا کیا ہے۔ صرف ہمت حضرات صوفیہ کی ایک اصطلاح ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ سالک اپنے دل کو کوشش کر کے تمام خطرات وخیالات سے پاک کر لیتا ہے اور پوری تعظیم اور ادب سے کسی بڑی شخصیت مثلاً رسول اللہ ﷺ یا اپنے شیخ کی طرف دل کی توجہ مرکوز کر دیتا ہے۔ یہ ایک مشق ہے، جس سے دل کے وساوس کو ختم کرنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ عمل اگر نماز کے باہر کیا جائے تو بعض شرائط کے ساتھ مقید ہے لیکن اگر اسی کو نماز کے اندر کیا جائے، جو سراپا خدا کی تعظیم اور عبادت کے لئے ہے، اس میں ہر خیال سے اپنے آپ کو خالی کر کے، حتی کی اللہ کے خیال سے بھی خالی ہو کر پورا دھیان حضور اکرم ﷺ کی طرف لگا دے تو تمہیں بتاؤ کہ اب یہ عبادت اللہ کی ہوئی یا حضور کی؟

ج: اس صورت میں تو حضور کی عبادت ہوگئی۔

س: اچھا بتاؤ نماز میں حضور کی عبادت کرنا شرک ہے یا نہیں؟

ج: ہاں یہ تو شرک ہے۔

س: تو صراط مستقیم میں اسی صرف ہمت کو گدھے اور کتے کے خیال سے برا کہا گیا ہے، کیوں کہ گدھے اور کتے کے خیال سے آدمی کی عبادت کا رخ دوسری طرف نہیں ہوگا بلکہ اس خیال کو دور ہی کرے گا۔ اس کے برخلاف جب حضور کی طرف صرف ہمت کرے گا تو اس سے شرک میں مبتلا ہو جائے گا۔ اب خود ہی بتاؤ شرک بدترین جرم ہے یا نہیں؟

ج: ہاں وہ تو ہے۔

س: پھر کیا اعتراض ہے؟ بھائی! بات یہ ہے کہ تمہارے علما نے جان بوجھ کر ہمارے علما کو بدنام کیا ہے۔ یہ صرف پیٹ کا چکر ہے اور کچھ نہیں! ورنہ اپنے علما اور اپنے عوام کو دیکھو، ان کی زندگیاں دین سے بہت دور رہتی ہیں۔ تمہارے اندر حافظ قرآن بہت کم ہوتے ہیں۔

ج: ہاں بہت دن سے غور کر رہا ہوں۔ ہمارے علما کے قول وعمل میں بہت تضاد ہے، قریب سے ان کو دیکھئے تو یہ لوگ جھوٹ، مکر وفریب اور عیاری وچالاکی کے بڑے کرتب باز معلوم ہوتے ہیں۔ یہ عام زندگی میں جب بے تکلف مکر وفریب کر لیتے ہیں تو اپنی خاص اغراض کے لئے کیا کچھ کرتے ہوں؟ مجھے تو ان سے بیزاری سی ہو چکی ہے۔

س: تمہارا احساس بہت صحیح ہے، ان لوگوں نے امت کو بہت فریب دیا ہے، ان کے صرف قول وعمل ہی میں تضاد نہیں ہے بلکہ ان کے اقوال میں بھی تضاد ہے۔ احمد رضا خاں صاحب نے ایک جگہ مولانا اسماعیل شہید کو ایک سو ایک وجہوں سے کافر کہا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ ”**من شک فی کفرہ فھو کافر**“۔ جو ان کے کفر میں شک کرے وہ بھی کافر ہے۔ پھر دوسری جگہ لکھا ہے کہ مولوی اسماعیل دہلوی کو کافر نہ کہا جائے، یہی اسلم ہے، یہی احوط ہے وغیرہ وغیرہ۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ خان صاحب کو خود انہیں کے کفر کے فتوی سے کیسے بچایا جائے؟۔

ج: تف ہے۔ اس تضاد بیانی پر۔ میں تو اب ان سے رشتہ منقطع کرتا ہوں۔

س: اللہ تعالی نے آپ کو صحیح سمجھ عطا کی ہے۔ آپ کا فیصلہ بالکل برحق ہے۔ اللہ تعالی مجھ کو بھی اور آپ کو بھی سیدھی راہ پر چلائے اور قائم رکھے۔

ج: آمین۔ اچھا اب چلیں۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

س: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

❑❑❑

آج دنیا میں ہر چیز کی کثرت ہے، اگر کمی ہے تو ذکر وطاعت کی، ورع وتقویٰ کی، اعتماد وتوکل کی، فراغت قلبی کی، اگر اس دولت سے مالا مال چند لوگ بھی نہ رہیں تو دنیا کسی طرح نہ مانے گی کہ یہ بھی کوئی چیز ہے، نمونوں کی کمی کی وجہ سے کتنے دینی حقائق انکار وتردید کی زَد میں آچکے ہیں۔ پرانے بزرگوں کے مقاماتِ عالیہ آج کسی کو سمجھانا بھی چاہیں تو نہیں سمجھا سکتے۔ (حدیث دوستاں)

حصہ منظوم:

تأثر بر وفات عارف باللہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی نور اللہ مرقدہ

از۔ مفتی عزیز الرحمان شہید فتح پوری صاحب

حیف اے بزم تمنا تری دنیا سے اٹھا
جس کی فطرت میں رہا علم و عمل کا سودا
جس کے ہر وصف میں کر دار کی رعنائی تھی
جس کی ہر بات میں سچائی کی دانائی تھی
خوئے اخلاص و مروت کی فضا لے کے جیا
دل میں ہم رنگِ یقین شمعِ وفا لے کے جیا
وہ محض علم نہیں علم کا اک دریا تھا
اپنے اس وصف میں کامل ہی نہیں یکتا تھا
عمر بھر مسندِ تدریس کو زینت بخشی
علم کے ساتھ جیئے اس کی تو فطرت ہی یہ تھی
شہر در شہر جو پایا گیا اس کا چرچا
جائے حیرت نہیں وہ شخص تو ایسا ہی تھا
علم کی شمعِ فروزاں سے منور چہرہ
روشنی پا کے بنا نور کا پیکر چہرہ
جس جگہ بیٹھ گیا علم کا میخانہ بنا
جس نے اک بار ملاقات کی پروانہ بنا

علم کے ساتھ جو فطرت میں عمل کی خو تھی
اس کی سانسوں میں تقدس کی عجب خوشبو تھی
اس کے کردار میں کردار کا ہر جوہر تھا
حق کی بات آئے تو وہ حق کے لئے خود سر تھا
حق نگر حق کا طلبگار وہ حق آگاہ
حق تعالی نے اسے دی تھی بصیرت کی نگاہ
بن گئے علم و عمل اس کے لئے گھر آنگن
مسندِ رشد و ہدایت پہ رہا جلوہ فگن
اس میں اخلاص تھا اخلاص میں تاثیر بھی تھی
ساتھ ہی ساتھ خوبی تدبیر بھی تھی
شخصیت سازی کے فن میں اسے حاصل تھا کمال
دور تک ڈونڈھو نہ پاؤگے کہیں ایسی مثال
جو تھے نا پختہ اسے پختہ بنایا اس نے
سب کو حیرت ہے مگر کرکے دکھایا اس نے
رہبری کی تو بنا ایک مثالی رہبر
اس کی سیرت ہی تھی پاکیزگئی قلب و نظر
وعظ و ارشاد کی محفل بھی سجائی اس نے
جا کے خود کتنوں کو یوں راہ دکھائی اس نے
دَین تھی حق کی اسے یہ بھی ہنر آتا تھا
وہ خطابت میں بھی بے مثل نظر آتا تھا
ہم نے دیکھی ہے ہر ایک شان نرالی اس کی
اس کی تحریر بھی بے مثل ہوا کرتی تھی

مرنے والوں پہ لکھا لکھ کے انہیں زندہ کیا
جب قلم زندوں پہ اٹھا انہیں تابندہ کیا
اس کی تربت پہ بصد رنج و ملال آیا ہوں
غم میں ڈوبا ہوا خود بن کے سوال آیا ہوں
یہ سوال اس سے ہے جو خالق و مالک سب ہے
ہاں وہی ہستیِ مطلق جو ہر اک کا رب ہے
غم میں اعجاؔز کے ڈوبے ہوئے بیٹھے ہیں سبھی
اصل حاکم تو ہے دنیا میں مشیت تیری
اب کہاں ڈھونڈھیں اسے تو ہی بتا دے یارب
غم کو تسکین کا سامان بنا دے یارب

❑❑❑

شیخ طریقت عارف باللہ حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمیؒ کے انتقال پُر ملال پر

مسترشد عارف خیرآبادی کے درد بھرے تاثرات

گلشن علم و عمل کا عندلیب خوشنوا
یک بیک خاموش ہوکے حشر برپا کر گیا
کھو گیا ہے ہم سے اک گنجینۂ علم و ہدا
ہر کس و ناکس غم و اندوہ میں ڈوبا ہوا
ہائے محرومی! متاع کارواں جاتا رہا
ہوگیا ہے کتنے ارمانوں کا آخر خاتما
گلستان علم کو جھلسا گئی باد سموم
باد صرصر نے بجھایا ناگہاں روشن دیا
کررہا تھا جو ابھی ’’کھوئے ہوؤں کی جستجو‘‘
وادریغا! حسرتا!! وہ آج خود ہی کھو گیا
کچھ زبانیں گنگ ہیں، کہتی ہیں کچھ یہ کیا ہوا؟
سینۂ گیتی پہ ایسا روح فرسا حادثا!
سسکیاں ہیں ہچکیاں ہیں اور آہ و زاریاں
نالۂ و فریاد کا اک سلسلہ در سلسلا
غم زدہ اندوہگیں، چاروں طرف اہل زمیں
آسمانوں میں مگر گونجی صدائے مرحبا

اس قدر محبوبیت مقبولیت ان کو ملی
جس کو دیکھو کررہا ہے بس انہیں کا تذکرا
صاحب صدق و صفا اعجاز احمد اعظمی
اہل دل بھی مانتے تھے ان کو اپنا مقتدا
’’پاس انفاس‘‘ ان کا ہردم ہر گھڑی کا مشغلہ
زیر و بم سانسوں کا ذکر اللہ میں ڈوبا رہا
اک چمن کی آبیاری کے لیے کوشاں تھے وہ
تھی مقدر میں مگر فردوس کی آب و ہوا
ڈھونڈنے والے انہیں مت ڈھونڈ، یہ بے سود ہے
رہنمائی کے لیے کافی ہے ان کا نقش پا
دوستو! شاید قیامت آئے گی اب عنقریب
اس جہان آب و گل سے جارہے ہیں اولیا
مغفرت اور جنت الفردوس سے ہوں ہم کنار
غم زدہ عارفؔ خدا سے کررہا ہے یہ دعا

❑❑❑

ماہ علم مکین جناں مولانا اعجاز احمد اعظمی رحمہ اللہ

۲۰۱۳ء

نتیجہ فکر۔ ابو عمار اترانوی جامعہ فاروقیہ اتراؤں۔ الہ آباد

زباں پر کس طرح آئے بیان درد پنہانی
نہ پوچھو کس قدر دل میں ہے اب غم کی فراوانی
ہوا ہے سرد بالکل دل مرا اب عیش دنیا سے
بدلتا دیکھ کر ہر دم یہ رنگ عالم فانی
ہوائے دہر بگڑی اور مزاج آسماں بدلا
تریسٹھ سال پورا کر چکا جب مرد حقانی
مرے محسن مربی حضرت اعجاز احمد نے
سدھارا سوئے جنت آگیا جب حکم ربانی
وہی وہ نیک سیرت عاشق دین حنفی کا
جو تھا حامیٔ سنت عامل احکام ربانی
شرف بخشا خدا نے آپ کو حج و زیارت کا
کہ نو حج تین عمرے کی ہوئی توفیق یزدانی
ولی پاک باطن صاحب صدق و صفا صوفی
تھا زیب مسند عرفاں سراج بزم ایمانی
شریعت کا تھا عالم اور کلام اللہ کا حافظ
تھے اس کے باطنی احوال بھی ازبسکہ نورانی

فہیم و عاقل و دانا تھا اور ایسا مربی تھا
فلاح و رشد کو پہنچا وہ جس نے گفتگو مانی
توکل اور استغناء کا تھا جو مظہر کامل
جسے بخشا تھا حق نے جذبہ ایثار و قربانی
نظر آتا تھا جس میں زہد عیسیٰ صبر ایوبی
جو کوہ علم و تقویٰ تھا جو تھا محبوب سبحانی
جو اک اعجاز تھا اللہ کے محبو ب کا بیشک
فرشتہ گویا تھا لیکن بظاہر شکل انسانی
اصول و فقہ و تفسیر و بلاغت کا معلم تھا
حدیثوں سے سبق دیتا تھا اخلاقی و روحانی
شعاع نور بن کر جس نے طلبہ کو جلا بخشی
لحد پر اس کے برسے تا قیا مت نور یزدانی
بہار مدرسہ تھا اور جو مسجد کی رونق تھا
سجا کر سوئے جنت چل دیا جو بزم ایمانی
تیرا جب ذکر آتا ہے تو آنسو تھم نہیں پاتے
زباں میں ہے کہاں طاقت کرے جو مر ثیہ خوانی
عدد ”مقبول خالق جاں بحق شد پاک دل“ گن لو۱۴۳۴ء
نکل آئے گی تاریخ وفات اس کی بآسانی
سماعت بارہا حاصل ہوئی اس کے مواعظ کی
ہوئی جس وقت بھی اتراؤں میں تشریف ارزانی
اثر ہوتا تھا دل پر اس کے ہر وعظ و نصیحت کا
ہواکرتی تھی ہر تقریر بالتحقیق لاثانی
محبت اور عقیدت حضرت فاروقؒ سے جس کی
رہی باہم دگر از بسکہ ایمانی و روحانی

تعلق جس طرح دنیا میں قائم تھا محبت کا
کریں ویسے ہی دونوں رہ کے جنت میں گل افشانی
تڑپتا چھوڑ کر سب کو سدھارا ہے سوئے جنت
کیا ویران دنیا کو بسائی خلد رضوانی
کیا جب زور عشق حق نے علّیین جا پہونچا
نہ دیکھا مڑ کے دنیا کی طرف جانے کی جب ٹھانی
نظر آئے گی یا رب اس کی صورت کیا کبھی ہم کو
وہ ہنس مکھ اس کا چہرہ ہائے وہ لب ہائے خندانی
گماں ہم کو نہ تھا وہ چھوڑ دے گا پر خبر کیا تھی
مقدر میں لکھی ہے درد فرقت کی پریشانی
تمنا تھی ابھی کچھ اور جیتے حضرت والا
ابھی کچھ دین کے کاموں کی کرتے اور نگرانی
ہوئے اس کی بدولت لوگ کتنے حافظ وعالم
تھا پوری زندگی کا مشغلہ تعلیم قرآنی
دیا ہے درس اس نے دنیوی بھی اور دینی بھی
مگر ہوتا تھا یہ سب درس اخلاقی و روحانی
زمانہ اس کی تحریرات پاکیزہ کا قائل ہے
قلم کا وہ دھنی تھا اس کی تھی تحریر لاثانی
قلم شمشیر براں اس کا تھا باطل کی گردن پر
نہیں کرنے دیا اعدائے دیں کو جس نے من مانی
مثالی اس کا تھا احقاق حق، نہی عن المنکر
تھی اس میں ضرب خالدؓ زہد بوذرؓ فہم سلمانیؓ
ضیااسلام کی ''ضوباریاں'' قائم ابھی تک ہیں

فضا ہوتی رہے گی تاقیامت جس سے نورانی
وہ عارف عادل و عابد بہت رنجیدہ خاطر ہیں
تعلق باپ سے جن کا تھا روحانی و جسمانی
وہ عامر راشد و عرفات اور احمد میاں کو بھی
ستاتی ہے یتیمی اور پدر کی لطف سامانی
یقیناً واسطے اس کے جو صدقہ جاریہ ہوں گے
بنایا اپنی جن اولاد کو علمائے ربانی
بظاہر مرگیا لیکن حقیقت میں وہ زندہ ہے
اسے مرنے نہ دے گی اس کی یہ بے لوث قربانی
غلامی حضرت حماد شہہ ہالیجوی کی
اسے حاصل ہوئی وہ ہوگیا مقبول ربانی
مشام جاں معطر فیض سے جن کے ہوا اس کا
درخشاں کعبہ دل میں ہوا ہے شمع ایمانی
ملائک بھی بشارت دیں اسے نعمائے جنت کی
میسر ہو اسے اپنے رب کی خاص مہمانی
دعا ہے مالک جود و کرم سے اپنی یہ ہر دم
برابر اس کی جانب سے ہو لطف خاص ارزانی
رہے ضوبار روزو شب تجلی عرش اعلیٰ کی
خدا کے فضل و رحمت سے لحد ، ہو اس کی نورانی
کمر ہمت کی ٹوٹی ہے مری محسن کی رحلت سے
تحیر کا ہے عالم ہوگئی ہے عقل دیوانی
نہ لگنے پائے دل تیرا ، عمر اس دار فانی سے
مبادا تجھ کو لاحق ہو قیامت میں پشیمانی

ہو تیرا خاتمہ ایمان پر فضل الٰہی سے
حیات و موت کا ہر مرحلہ ہو طے بآسانی
تھی یکشنبہ کی شب تاریخ بھی تئیس ذیقعدہ
تھا سن چونتیس ہجری کا کہ پہنچا حکم ربانی
امڈ آئی تھی خلقت آخری دیدار کرنے کو
کہ جیسے آگیا ہو ’’چھپرا‘‘ میں سیلاب انسانی
علامت اس کی ہے مقبول عنداللہ ہونے کی
شہادت دے رہے ہیں اس کی یہ اولاد روحانی
خدارحمت کرے اس پر نوازے اس کو بخشش سے
رہے یوں تا ابد وہ موردِ الطاف ربانی

❑❑❑

''نالہائے غم اشکہائے پیہم''

از۔مولانا فضل حق عارف خیرآبادی

سنت خیرالوری کے ترجمان خوش بیاں
چھپ گئے آخر کہاں وہ چھپ گئے آخر کہاں
غنچہ وگل باغ ہستی کے ہوئے ہیں سینہ چاک   اف خدایا! ہر طرف اڑتی نظر آتی ہے خاک
ایسی وحشت ہوگیا ماحول پورا دردناک   آہ وشیون کا فضائے آسمان میں ہے دھواں
چھپ گئے آخر کہاں وہ چھپ گئے آخر کہاں
سنت خیرالوری کے ترجمان خوش بیاں
ڈھونڈتی ہیں ان کو نظریں کو بہ کو اور چار سو   ذرہ ذرہ روئے گیتی کا ہے محو جستجو
مے کدہ ہے سونا سونا خالی ہیں جام وسبو   ''ہو کا عالم'' چار سو ویرانیاں ویرانیاں
چھپ گئے آخر کہاں وہ چھپ گئے آخر کہاں
سنت خیرالوری کے ترجمان خوش بیاں
دامن دل میں ہمارے لگ گئی ہے ایسی آگ   نوجوانی میں لٹے جس طرح عورت کا سہاگ
ہر طرف ہلچل مچی ہے ہر طرف ہے بھاگا بھاگ   کیسی درد انگیز کیسی دکھ بھری ہے داستاں
چھپ گئے آخر کہاں وہ چھپ گئے آخر کہاں
سنت خیرالوری کے ترجمان خوش بیاں
''چشم گریاں سینہ بریاں آہ بے تاثیر ہے''   ہل نہ پائیں پاؤں، ایسی پاؤں میں زنجیر ہے
دامن صبر وسکوں پر آتش شمشیر ہے   آہ جب بھرتے ہیں تو منہ سے نکلتا ہے دھواں
چھپ گئے آخر کہاں وہ چھپ گئے آخر کہاں
سنت خیرالوری کے ترجمان خوش بیاں

نازش علمائے دین وہ ضوفشان بھیروی   جس کو دنیا نے کہا اعجاز احمد اعظمی
وہ ہزاروں آدمیوں میں نمایاں آدمی   گلستان علم ودیں کے باغبان وپاسباں
چھپ گئے آخر کہاں وہ چھپ گئے آخر کہاں
سنت خیرالوری کے ترجمان خوش بیاں
آسمان علم کے تھے آفتاب و ماہتاب   سیرت ان کی اک نمونہ باتیں ان کی لاجواب
ان کے جانے سے ہوئے ہیں ہم تو اب خانہ خراب   دل گرفتہ سوختہ جاں الاماں صد الاماں
چھپ گئے آخر کہاں وہ چھپ گئے آخر کہاں
سنت خیرالوری کے ترجمان خوش بیاں
کردیئے روشن جنھوں نے علم کے لاکھوں چراغ   وہ بڑے پرنور تھے بافیض تھے عالی دماغ
دیکھ کر ان کو خدا یاد آئے دل ہو باغ باغ   ہجر میں ان کے فقط اب سسکیاں ہیں ہچکیاں
چھپ گئے آخر کہاں وہ چھپ گئے آخر کہاں
سنت خیرالوری کے ترجمان خوش بیاں
جانے والوں کا لگا ہے سلسلہ ہاں سلسلا   **کل شئی ھالک** اللہ نے فرمادیا
ذات حق ہی دائمی ہے بس اسی کو ہے بقا   عارفؔ اندوہگیں کرتے ہو کیوں آہ وفغاں
چھپ گئے آخر کہاں وہ چھپ گئے آخر کہاں
سنت خیرالوری کے ترجمان خوش بیاں

❑❑❑

تیری رحلت پر قمر تنہا نہیں سواگوار

از۔حضرت مولانا حافظ قمرالدین صاحب نوناری مدظلہ

دار فانی سے ترا جانا بھی اک اعجاز ہے
عالم بالا میں تیرا کس قدر اعزاز ہے
حور غلماں جنت الفردوس کا ہے آبشار
درمیاں ان کے گزرتے ہیں ترے لیل و نہار
کس قدر کتنی مبارک تھی وہ تیری زندگی
زندگی میں تیری اس پر تھی نہ مجھ کو آگہی
چھوڑ کر ہم سب کو تو نے آخرت کی راہ لی
کتنی خاموشی سے تو نے رفعت پرواز کی
ایک مدت سے رہے پرواز کی اس گھات میں
’’اڑ گئی سونے کی چڑیا رہ گئے پر ہاتھ میں‘‘
تو نے جب پرواز کی ذی قعدہ کی بائیس تھی
یوم شنبہ اور ستمبر کی بھی اٹھائیس تھی
سن ہجری میں نے دیکھا چودہ سو چونتیس تھا
دو ہزار تیرہ بھی اس کے ساتھ دامن گیر تھا
تیری رحلت پر مرا دل اس قدر بے چین ہے
گو خدا کے فضل سے کوئی نہ شور و شیون ہے
درحقیقت تیرا رشتہ مجھ سے تھا بے حد قوی
میرے پیارے! ہر گھڑی اس پر تھی مجھ کو آگہی

تھی ترے نزدیک دلآویز میری شخصیت
مجھ کو تھی اچھی طرح معلوم اپنی حیثیت
مجھ سے پہلے داستان غم ہوئی تیری تمام
آخری تیری دعا میرے لئے بالالتزام
کیا خبر تھی تجھ کو حاصل تھا مقام مستجاب
میرے حق میں جو دعا کی کتنی سچی تھی کتاب
یا الٰہی! میرے اس ممدوح کو تو بخش دے
جنت الفردوس کا اعلی سے اعلی فرش دے
اللہ اللہ کس قدر تھے تم زعیم روزگار
مہرباں بے حد تھی تجھ پر رحمت پروردگار
شک نہیں علمائے ربانی کے تم تھے تاجدار
اہل باطل ہر گھڑی رہتے تھے تجھ سے شرمسار
دین حق کی تیرے ہاتھوں میں عجیب قندیل تھی
تیری ہر ہر بات گویا ایک سنگ میل تھی
تم تو ہنستے چل دیئے ہم ہاتھ مل کر رہ گئے
شمع کے مانند تری رحلت پہ جل کر رہ گئے
میں نے دیکھا چاہنے والا مرا جب چل بسا
یا الٰہی کس جگہ جاکر اسے میں دوں صدا
میرے لب پر ''ربنااغفرلہ'' کا ورد ہے
اور مرے ممدوح کا میری زبان پر ذکر ہے
یاد اس کی اب مرے دل سے کبھی جاتی نہیں
بات کوئی اب سمجھ میں میری اب آتی نہیں

تم مرے اسلاف کی بے شک تھے زندہ یادگار
چل دیئے تم ، کس طرح آئے مرے دل کو قرار
کیا بتاؤں کس قدر کتنے تھے تم عمدہ خصال
یاد آتا رہتا ہے مجھ کو ترا حسن و جمال
علم ظاہر عالم باطن کے رہے تم شاہکار
فکر میں جس کی گزرتے تھے ترے لیل و نہار
تیرے اوپر ہر گھڑی انسانیت کو ناز تھا
اسم تیرا بامسمی نام جو اعجاز تھا
یاد کرتے کرتے تجھ کو ہم کبھی مل جائیں گے
تیری الفت اور محبت کا صلہ پاجائیں گے
فیض تیرا مشرق و مغرب شمال اور تھا جنوب
تیری بخشش کے لئے کافی ہے علام الغیوب
کشمکش کے ساتھ گزری چند روزہ زندگی
اپنے مولی کی نہ چھوڑی پھر بھی تو نے بندگی
زندگی گویا کلام اللہ کی تفسیر تھی
میں نے دیکھا وہ حدیث پاک کی تنویر تھی
دین کی نشر و اشاعت کا ہمیشہ تھا خیال
جذبہ دل تیرے سینے میں تھا کیسا بے مثال
دین کی نشر و اشاعت کے لئے تخلیق تھی
حق تعالی کی طرف سے تجھ کو یہ توفیق تھی
درس و تدریس کا حاصل تھا وہ عالی مقام
تیرے ہاتھوں میں رہا ہر وقت تعلیمی نظام

دیکھتا ہوں مسند تدریس سونی پڑ گئی
مسند تدریس پر جیسے خزاں سی آ گئی
کس قدر کتنے رہے تم طالب دیں پر شفیق
طالب دیں کو بنایا ہر گھڑی اپنا رفیق
در حقیقت تھا تو علم دیں کا بحر بے کنار
رومی و رازی غزالی تھے تیرے یار غار
تیرے ہر تلمیذ روحانی تری اولاد ہیں
ہر عدوئے دین و ملت کے لئے فولاد ہیں
زندگی میں ہر کوئی تجھ سے رہا جو فیضیاب
فیضیابی سے تری بنتا گیا عزت مآب
فیض تیرا میں نے دیکھا ہر کسی پر عام تھا
تیرے ہاتھوں میں ہمیشہ معرفت کا جام تھا
تجھ کو قدرت نے بنایا تھا عجب ایک جوہری
بھولے بھٹکوں کی بہت تو نے کی تھی رہبری
تیری ذات پاک دیکھا میں نے تھی وہ بے مثال
تجھ کو قدرت نے عطا فرمایا تھا ایسا کمال
فیض سے تیرے ہمیشہ کے لئے محروم ہیں
تیرے اوصاف کمال سب کے سب منظوم ہیں
یاد آتے ہیں رہ رہ کے ہر وہ خد و خال
تجھ کو بخشا تھا خدا نے کتنے اوصاف کمال
ہر گھڑی نظروں میں ہے میری ترے حسن و جمال
تیرے اوصاف حمیدہ کی میں دوں کس سے مثال

تو یہاں سے جا کے پہونچا رحمت آغوش میں
حق تعالی کی بنائی جنت الفردوس میں
ہر گھڑی ہر وقت جنت کے مزے لیتے رہو
آرزو میری ہے تم مجھ کو دعا دیتے رہو
تیرے گھر سے جس گھڑی تیرا جنازہ تھا اٹھا
میں نے دیکھا ہر بڑا چھوٹا جو تھا وہ رو پڑا
یہ بھی دیکھا کتنی اچھی اور بڑی بارات تھی
حق تعالی کی طرف سے گویا ایک سوغات تھی
اس میں کوئی شک نہیں ہے قدسیوں کا اک ہجوم
میں نے دیکھا ان کے اندر تھا زمین پر کالنجوم
ہر طرف سے آرہی تھی میرے کانوں میں صدا
جاتا ہے کس شان سے دیکھو غلام مصطفیٰ
مغفرت فرما مرے مولا! مرے ممدوح کی
لاج رکھ لے اے خدا! اس کے دل مجروح کی
حضرت مولانائے اعجاز احمد اعظمی
ہر کسی منزل پہ پائیں گے تری رہ رہ کمی
حسن اخلاق کریمانہ وہ تیرا یاد ہے
خانماں دل تیری رحلت پر مرا برباد ہے
رحمتوں کے ہر فرشتے آئے استقبال کو
محو حیرت دیکھ کر تھے سب ترے احوال کو
یک بیک کہنے لگے سب مرحبا صد مرحبا
تجھ سے خوش ہے ہر گھڑی تجھ سے ترا رب العلی

مرضی مولی پہ قائم اور تم دائم رہے
اس طرح قائم رہے جیسے کوئی صائم رہے
مرد مومن زندگی تیری بہت ہے کامیاب
کھل گیا ہے دیکھ وہ تیرے لئے جنت کا باب
حور و غلماں منتظر ہیں دیکھ سب تیرے لئے
کھل گئے ابواب جنت سب کے سب تیرے لئے
تیری رحلت پر خدائے پاک ہم کو صبر دے
صبر کرنے پر ہر اک چھوٹے بڑے کو اجر دے
تیری بتلائی ہوئی باتوں پہ ہم چلتے رہیں
بخششوں کی تیرے حق میں ہم دعا کرتے رہیں
دیکھتا ہوں مل گیا ہے اب تجھے آب حیات
میرے پیارے تیری کوشش پر مگر بعد ممات
سامنے تیرے ہمیشہ جنت الفردوس ہے
شک نہیں ہے آب کوثر کا حسیں وہ حوض ہے
عالم برزخ میں ملنا تجھ سے اہل الله کا
شاد و خرم ہو کے ملنا تجھ سے حزب الله کا
میرے پیارے ہے تری یہ کامیابی کی دلیل
جب خدا کے نیک بندے بن گئے تیرے خلیل
میں گیا چھپرہ میں جس دم تعزیت کے واسطے
تیرے ہر بچوں کی لینے خیریت کے واسطے
یاد آئی تیری الفت اور عقیدت اور خلوص
مجھ سے محو گفتگو وہ .... تیرے جلوس

لاکھ ڈھونڈھیں اب کہاں پائیں گے ایسی محفلیں
اب تصور میں بھی آئیں گی نہ ایسی مجلسیں
تیری رحلت کا رہے گا میرے دل پر ایک داغ
ہے کہاں تو اب نہیں ملتا کہیں تیرا سراغ
اڑ گیا میرے چمن سے عندلیب خوشنوا
شاخ گل پر بیٹھ کر ہوتا تھا جو نغمہ سرا
کچھ سمجھ میں میری اب آتا نہیں میں کیا کروں
اس کی رحلت پر کہاں تک کب تلک آہیں بھروں
زندگی بھر تھا کلام اللہ سے تیرا شغف
تیرے ہاتھوں میں رہا کتنا حسیں در نجف
کہہ رہا ہے وہ کلام اللہ تجھ سے لا تخف
تیری بخشش کے لئے کتنا بڑا ہے یہ سبب
کتنی اچھی یہ کلام اللہ کی آواز ہے
کتنا پیارا اور نرالا اس کا یہ انداز ہے
رچ گیا تھا تیرے دل میں ہر گھڑی عشق رسول
سنت نبوی تھا تیری زندگی کا ہر اصول
مشغلہ تھا علم قرآں اور علم حدیث
شک نہیں امراض روحانی کے تم تھے اک طبیب
میرے پیارے ہر کسی فن کے رہے بن کر امام
دیکھتا تھا ہر کسی منزل پہ تجھ کو خوش خرام
کتنا آداب محبت سے رہے آگاہ تم
اللہ اللہ ہر کسی مجلس میں تھے عالی جاہ تم

تیری مجلس میں ہمہ دم قلب کی تسخیر تھی
ہر گھڑی انسانیت کی اک نئی تعمیر تھی
اہل مجلس مان لیتے تھے تجھے پیر مغاں
وہ سمجھتے تھے ترے کوچے کوئے بتاں
کس قدر تجھ پر رہا اللہ کا فضل و کرم
تجھ کو بخشا تھا خدا نے کس قدر جاہ وحشم
میں نے دیکھا ہر گھڑی میرے رہے تم یار غار
ختم لیکن ہوگئی وہ زندگی مستعار
دنیوی آلائشوں سے مل گئی تجھ کو نجات
مل گیا قدرت کی جانب سے تجھے آب حیات
جب تلک تھے انتم الاعلون کے مصداق تھے
جس طرف دیکھا ادھر تم شہرہ آفاق تھے
شمع جو جلتی رہی خاموش جس دم ہوگئی
دل کی دنیا اس گھڑی مدہوش ہو کر رہ گئی
تیری رحلت کی خبر ایک صور اسرافیل تھا
حق تعالیٰ کی طرف سے یوم سنگ میل تھا
ہر کسی منزل پر جس دم یاد تیری آئے گی
درحقیقت اس گھڑی دل کو مرے تڑپائے گی
ایک دنیا کو تم اپنا فیض پہونچاتے رہے
درمیاں ان کے پہونچ کر کیسے سمجھاتے رہے
اپنا احوال شکستہ کہتا ہوں بے قیل و قال
ہر گھڑی ہر وقت رہتا ہے مرا اب خستہ حال

کتنی آسانی سے پہونچے اپنے مولی کی طرف
دار فانی سے چلے دار عقبی کی طرف
چاہتا ہوں ہر گھڑی تیرا ذکر خیر ہو
عالم بالا کی میری بھی کسی دن سیر ہو
تیری رحلت سے ملا مجھ کو شعور زندگی
ہر گھڑی کرتے رہے اپنے خدا کی بندگی
زندگی گزرے نہ ہرگز کوئی سنت کے خلاف
ہو نہ ہرگز میرے اوپر میرے مولی کا عتاب
کتنی اچھی صاف ستھری تھی وہ تیری زندگی
حق تعالی سے رہی کتنی تری وابستگی
تیری رحلت کس طرح درس وفا دیتی گئی
دیکھ کر تجھ کو ہر اک آنکھ شرماتی گئی
میرے دل کا یہ تأثر تیرے حق میں بالیقیں
کس کے در پر جا کے جھکتی تھی تری روشن جبیں
اپنے میں خون جگر سے جو لکھا یہ بر ملا
میرے دل کی کیفیت کو کیسے سمجھے دوسرا
وہ تری پیاری ادائیں جس گھڑی آتی ہیں یاد
سینہ شفاف میں ہوجاتا ہے دل پاش پاش
چارہ گر مجھ کو بتا میں کیا کروں تیرے بغیر
کس طرح اجڑے چمن میں میں کروں جا کر کے سیر
تیرے حق میں ہر گھڑی رہتی ہے میری یہ دعا
اپنے رب سے کرتا رہتا ہوں یہی میں التجا

حشر کے دن انبیا و اولیا کا ساتھ ہو
تیرے سر پر ہر گھڑی ہر وقت ان کا ہاتھ ہو
مسکرادیں دیکھ کر تجھ کو امام المرسلیں
ساتھ میں لے لیں تجھے اپنے شفیع المذنبیں
حضرت والا کی بیوہ نیک خو اور صابرہ
دیکھتا ہوں مرضی مولا پہ ہیں شاکرہ
حضرت مرحوم کی ہیں سات اولاد ذکور
درحقیقت سب کے سب ہیں صاحب عقل وشعور
حافظ عارف حافظ عادل مولوی عابد ہیں یہ
عامر وراشد کو دیکھا صابر و شاکر ہیں یہ
بعد ان کے مولوی عرفات و محمد ہیں یہ
جو محمد ہیں خدا کے فضل سے احمد ہیں یہ
زیور علم و عمل سے یہ سب ہیں آراستہ
جاہدوا فی اللہ سے ان سب کا ہے اب واسطہ
حضرت والا کے میرے تین یہ داماد ہیں
شکر ہے اللہ کا تینوں پہ سب آزاد ہیں
سب سے پہلے مفتی اعجاز احمد قاسمی
دوسرے مولانا ہیں ابرار احمد قاسمی
تیسرے داماد ان کے مولوی یہ فیض ہیں
سب کے سب علم وعمل کی رسیوں میں قید ہیں
اے خدا! ان سب کا بے شک حامی و ناصر ہے تو
اول و آخر ہے تو اور باطن و ظاہر ہے تو

صبر کی دولت عطا فرما انہیں رب کریم!
دیکھتا ہوں ذات تیری ہے رحمان و رحیم
ہے تاثر ایک سو انیس جو اشعار پر
ہو نہیں سکتا کبھی ہرگز کسی اغیار پر
تیری رحلت پر قمرؔ تنہا نہیں سوگوار
دیکھتا ہوں اک ہجوم عاشقاں ہے زار زار

* * *

اختتامیہ:

غزل

از۔عارف باللہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی نوراللہ مرقدہ

مبارک ہو تجھے اے دل کہ اس کی آرزو پائی
طلب پائی ہے اس کی اور تلاش و جستجو پائی

دلِ بے مدعا پایا کہ دنیا کی ہوس نکلی
دلِ بامدعا پایا کہ تیری آرزو پائی

سبھی جھگڑوں سے ہم چھوٹے تمنا دل کی بر آئی
ہوس دنیا کی نکلی اور تیری آرزو پائی

پڑا رہ تو اسی در پر، پڑا رہ تو اسی در پر
یہیں حاصل ہوئی ہے جس نے جو کچھ آرزو پائی

عنایت ہے، نوازش ہے، کرم ہے، مہربانی ہے
محبت تیری دل نے اور میں نے ہاوہو پائی

زہے قسمت ، زہے خوبی یہ کیا ہی خوش نصیبی ہے
کہ اس کی آرزو پائی ، اسی کی جستجو پائی

اسی کی یاد اے ہمدم رہے دل میں مرے قائم
ترے در پر جو ہم آئے یہی ہے آرزو لائی

یہ دنیا آئینہ خانہ ہے اس حسن منور کا
جدھر بھی کی نظر ہم نے وہ صورت رو برو پائی

چلا ہی جارہا ہے گرتا پڑتا اس کی منزل تک
جہاں سے جس نے جس حالت میں اس دلبر کی بو پائی

یہ کس کے عشق کا سودا ترے سر میں سمایا ہے
کہ رسوائی تری اعجاؔز ہم نے کو بہ کو پائی

❑❑❑